قرآنی حقائق پر مشتمل

بصیرت اَفروز

اِقتباسات

ترتیب وتہذیب
منظور الحسن
0333-4300474
042-35123062

نام کتاب : بصیرت افروز اقتباسات

ترتیب وتہذیب : منظور الحسن

ریٹائرڈ ایڈمن آفیسر 1999ء پنجاب یونیورسٹی لاہور

ملنے کا پتہ : منظور الحسن، مکان نمبر 111، بلاک نمبر 3، سیکٹر سی ون،
قائداعظم ٹاؤن لاہور
فون: 0333-4300474/042-35123062
ای میل:manzoorulhasan39@gmail.com

قیمت :

ایڈیشن اوّل : 2018ء

کمپوزنگ : آئیڈیل پرنٹرز، قائداعظم ٹاؤن لاہور۔
فون:042-35213337 موبائل: 03004602749

مطبع :

اِنتساب

قرآنِ حکیم کے ابدی حقائق ومعارف سمجھنے
اوراس پرعمل کرنے والوں کے نام

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
(علامہ اقبال)

تعارفِ کتاب

میری پہلی قلمی کاوش گزرگاہِ خیال (آپ بیتی) کا پہلا ایڈیشن 2013ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ دوسرا 2014ء میں، تیسرا 2015ء اور چوتھا 2016ء میں چھپوایا۔ اب بھی اگر کوئی صاحب ذوق میری مذکورہ بالا کتاب طلب فرمائیں تو میں ان کی خدمت میں اعزازی نسخہ بصد احترام پیش کرسکتا ہوں۔ میری دوسری علمی کاوش ''شعریت'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ میں نے شعریت میں منضبط شدہ منظومات کو ماہنامہ شمع دہلی (ہندوستان) 1954ء تا 1964ء کے مختلف شماروں سے اپنی بیاض میں لے لیا تھا۔ میری بیاض خستہ حالت میں تھی اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کو مدون کر کے شائع کردوں تاکہ یادگار رہے اور صاحب ذوق حضرات بھی اس سے محظوظ ہوں۔

میری تیسری کتاب ''اِقتباسات'' ہے جو آپ کے دست مبارک میں ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک بہت بڑے اور اعلیٰ پائے کے مفکر قرآن جناب غلام احمد پرویز (1903-1985ء) ہوگزرے ہیں وہ 1960ء سے اپنے دولت کدے پر گلبرگ لاہور میں درسِ قرآن حکیم دیا کرتے تھے۔ میں ان کے درس میں بیس سال تک شریک ہوتا رہا ہوں۔ انہوں نے پینتیس کے قریب کتابیں صرف قرآنِ حکیم کی تشریح وتعبیر میں لکھی ہیں۔ انہیں اپنی سب کتابوں میں سے تین کتابوں پر بڑا فخر تھا جو حسب ذیل ہیں:

1۔ لغات القرآن Dictionary of Quranic Words
2۔ مفہوم القرآن Exposition of the Holy Quran
3۔ تبویب القرآن Chapterisation of the Holy Quran

میں نے ان کی کتاب لغات القرآن کو اپنی کتاب ''اِقتباسات'' کی بنیاد بنایا ہے۔ بس آپ یوں سمجھ لیجئے ''اقتباسات'' لغات القرآن کے خلاصے (Summery) کی صورت میں آپ کے سامنے ہے جس میں قرآنی تصورات تابندہ ستاروں کی طرح نگاہِ بصیرت کے سامنے ابھر کر آجاتے ہیں اور کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔

منظور الحسن
ریٹائرڈ ایڈمن آفیسر 1999ء
پنجاب یونیورسٹی، لاہور
موبائل: 0333-4300474
فون: 042-35123062

پتہ: مکان نمبر 11، بلاک نمبر 3
سیکٹر سی ون، قائداعظم ٹاؤن ①
لاہور

① یاد رہے کہ ٹاؤن شپ کا نام ''قائداعظم ٹاؤن'' اس وقت سے تبدیل ہو چکا ہے جب 12 نومبر 1994ء میں لاہور ترقیاتی ادارہ (LDA) نے اسے اپنی تحویل میں لیا تھا۔

حمد

نہ سیم و زر سے ملا کچھ، نہ کرّو فر سے ملا
ثمر سکوں کا قناعت کی شاخ پر سے ملا

نہ دشمنی کے تسلسل، نہ بغض و شر سے ملا
قرار جب بھی ملا، عفو و درگزر سے ملا

نہ میں نے مانگا بشر سے، نہ کچھ بشر سے ملا
مرے خدا! جو ملا مجھ کو، تیرے در سے ملا

نہیں ملا وہ کسی سے جو تیرے در سے ملا
نہیں ملے گا کسی سے، جو تیرے گھر سے ملا

ملا سراغ بہرحال، تیرے ہونے کا
کبھی خبر سے ملا، تو کبھی نظر سے ملا

بھٹک رہا تھا میں، صحرائے خود سرابی میں
جو اعتماد ملا مجھ کو، تیرے در سے ملا

مجھے نکال مری گم رہی کے جنگل سے
جو شاخ ٹوٹ رہی ہے، اِسے شجر سے ملا

مجھے دھکیل، مری خواہشوں کے ساحل سے
مری ہوس کے سفینے کو اب بھنور سے ملا

میں ہجرتوں کے تواتر سے کس طرح نکلوں
قرار کیوں نہیں مجھ کو، کبھی سفر سے ملا

کہا یہ تو نے، کہ بخشے گا تو نہیں ہرگز
بشر کا حق، نہ بشر کو، اگر بشر سے ملا

مری بساط ہی کیا، دل میں کیسے لاؤں تجھے
جواب اس کا مجھے، سیپ میں گہر سے ملا

رہِ حیات میں، جب کوئی موڑ آنے لگے
اِلٰہی اس کو ، محمد [1] کی رہ گزر سے ملا

ابصار عبدالعلی
ڈائریکٹر حمید نظامی پریس انسٹیٹیوٹ،
لاہور۔ پاکستان

حوالہ: روز نامہ نوائے وقت لاہور، 4 اگست 2013ء

---

[1] مراد ہے، اُسوۂ حسنہ (ملاحظہ ہو سورت الاحزاب، آیت نمبر 21) ملاحظہ ہو افتتاحیہ

ایک قرآنی نعت

محمدؐ کی ڈگر پر، جن کو چلنے کا ہنر آیا
تو سمجھو اپنی تقدیریں بدلنے کا ہنر آیا

نبیؐ آئے تو آئی چاند کی کرنوں میں زیبائی
نبیؐ آئے تو سورج کو نکلنے کا ہنر آیا

جو حق کی راہ میں سچے نبیؐ کے ہم رکاب آئے
انہیں ہر موڑ پر رُک کر، سنبھلنے کا ہنر آیا

نہ جن کے ہاتھ کچھ آیا، محمدؐ کا عدو بن کر
اُنہیں اپنے کیے پر ہاتھ ملنے کا ہنر آیا

وُہ جن کے ذہن و دِل روشن ہوئے عشق محمدؐ سے
اُنہیں شمع عقیدت بن کے جلنے کا ہنر آیا

ہنر آتا تھا جن کو، نت نئے بُت ڈھال لینے کا
اُنہیں اِسلام [1] کے سانچے میں ڈھلنے کا ہنر آیا

وہی جو صدق دِل سے حلقۂ احبابؓ میں آئے
اُنہی کو نفس اَمّارہ کچلنے کا ہنر آیا

ابصارعبدالعلی

حوالہ: روزنامہ نوائے وقت لاہور، 27 اگست 2010ء

---

(1) علامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام (اسرارِخودی، رموزِ بےخودی) میں ایک نظم لکھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ حکیم کی رو سے حریم کعبہ میں شکار [1] کی اجازت نہیں۔ اور وہاں (حریم کعبہ) میں جو بھی داخل ہوجائے اسے پناہ [2] مل جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے ''ہرن'' کو مسلمانوں سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا ہے

از سوادِ کعبہ چُوں آہو رمید — ناوکِ صیّاد پہلویش درید

جس کا ترجمہ ہے: جب ہرن نے کعبے کی چاردیواری سے باہر قدم رکھا تو شکاری کے تیر نے اُس کا پہلو چیر کر رکھ دیا۔
اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک مسلمان ''قرآنِ حکیم'' کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنی زندگی کے اعمال انجام دیتے رہے، اُس وقت تک وہ دنیا کی آفات سے محفوظ رہے۔ جونہی وہ اِس چاردیواری سے باہر آئے تو دنیا بھر کی مصیبتیں اُن کے گلے پڑ گئیں یعنی

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر — اَور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر
(اقبال: بانگ درا)

(۱) ملاحظہ ہو المائدہ:96
(۲) دیکھئے سورت البقرۃ آیت نمبر 126، سورت آل عمران آیت نمبر 97 اور سورت ابراہیم آیت نمبر 35۔

تلاشِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (الانبیاء:107)

رواں ترجمہ: (اے رسول) ہم نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ تمام عالم کے لیے آپ اور آپ کی رسالت باعث رحمت ہے۔

مفہوم:

(وہ ضابطہ قوانین جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وراثت ارضی حاصل ہوتی ہے) اب اے رسول! دنیا کو تمہاری وساطت سے دیا جارہا ہے۔تم اقوام عالم سے کہہ دو کہ ان کی صحیح نشوونما، جس سے انسانی صلاحتیں بیدار ہوتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں، اسی ضابطہ کی اطاعت سے ہو سکتی ہیں۔(جو قوم اس حقیقت سے انکار کرے گی، وہ رحمت ایزدی سے محروم ہو جائے گی۔9/61) یوں تمہاری بعثت تمام اقوام عالم کے لیے حقیقی رحمت کا موجب بن جائے گی۔

علامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام ''جاوید نامہ'' میں اس آیت کا جو ترجمہ شعری انداز میں کیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔ اگرچہ فارسی زبان تو دور کی بات ہے اب تو اردو زبان سے بھی لوگ ہٹتے جارہے ہیں لیکن اس کے باوجود میں ان کے دو اشعار کو قلم بند کرنے پر مجبور ہوں۔ وہ اس لیے کہ میری نگاہ میں اتنے حسین پیرائے میں اس آیت کا ترجمہ علامہ اقبال (ایک عاشق رسول) ہی کر سکتے تھے۔فرماتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروئید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

تشریح:

دنیا میں آپ کو جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے یہ صدقہ ہے خدا کی اس رحمت کا جسے اس نے تمام اقوامِ عالم کے لیے عام کر دیا ہے۔دنیا قرآنی اصولوں اور ان کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے [1]۔بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی، اس لیے کہ ان

1۔ وضاحت کے لیے دیکھئے پمفلٹ ''عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا''، شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام (ٹرسٹ)، 25بی گلبرگ لاہور

کے بغیر نہ تو انسانی صلاحیتیں اپنی نشوو ارتقاء کی تکمیل تک پہنچ سکتی ہیں، نہ حسن کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بزم ہستی میں جہاں بھی روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتاب عالم تاب ﷺ کی ضیا باریوں کے تصدق ہے اور گلشن عالم میں جہاں کوئی پھول کھلتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جان بہار ﷺ کی نگہت پاشیوں کا رہین منت ہے۔ ①

1۔ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟ (خطاب مفکر قرآن جناب غلام احمد پرویز برموقع کنونش طلوع اسلام منعقدہ نومبر 1972ء، ادارہ طلوع اسلام، 25۔ بی گلبرگ لاہور۔ (پمفلٹ کی شکل میں ادارہ ہذا سے مل سکتا ہے)

افتتاحیہ

حضور نبی اکرم ﷺ کے اُسوہ حسنہ کی بنیاد

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ [1]

رواں ترجمہ: بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔

مفہوم:

تم اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل رہو اور ان کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو اپنے حسن عمل سے دور کرتے رہو۔ جھوٹ، فریب، بددیانتی، ظلم و استبداد کا مقابلہ انہی حربوں سے مت کرو۔ اس سے ان برائیوں کا استیصال نہیں ہوگا۔ تم ایسا معاشرہ قائم کرو جس کی بنیادیں صداقت، دیانت، امانت، عدل اور احسان پر اُستوار ہوں، اس کے خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج ان برائیوں کے راستے خودبخود روک دیں گے۔ ایسا کرنے میں تم ان لوگوں کی باتوں کی قطعاً پروا نہ کرو، ہم ان کی سب باتوں کو جانتے ہیں۔ [2]

1۔ المومنون: 96
2۔ ماخوذ: مفہوم القرآن از قلم غلام احمد پرویز، شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام، 25۔بی، گلبرگ لاہور

ایک شاہکار تحریر

اُسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے اِرشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات واعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس ''اسوۂ حسنہ'' کو خود قرآن مجید میں محفوظ کر دیا ہے۔

1۔ حوالہ قرآن۔ سورۃ الاحزاب آیت: 21، سورۃ النساء آیت: 80-79

2۔ حوالۂ تحریر۔ ماہنامہ طلوع اسلام، شمارہ اگست 1981ء
شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام، 25۔ بی گلبرگ لاہور

3۔ حوالۂ اقتباس۔ ''شرح جاوید نامہ'' (قرآنِ حکیم کی روشنی میں)
مفکر قرآن غلام احمد پرویز کے 27 لیکچروں پر مشتمل کتاب
شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام، 25۔ بی گلبرگ لاہور
(سرورق کا اندرونی صفحہ)

اظہارِ خیال

میری پہلی قلمی کاوش ''گزرگاہِ خیال'' (آپ بیتی) کے نام سے 2013ء میں اِشاعت پذیر ہوئی تو زیرِ نظر کتاب کا نام میں نے اُس وقت سوچ لیا تھا جب میں نے اشفاق احمد ورک کا طنز و مزاح پر مشتمل ایک مضمون ① بعنوان ''عشق میں دوہری مشقت کی ہے ②'' پڑھا۔ اِس مضمون میں حسبِ ذیل پیراگراف میرے دِل پر نقش ہو گیا۔

> ''ہمسایہ ملک ''بھارت'' گیا تو ہمارے نام نہاد دانش وروں کی طرح چندی گڑھ ③ کے پبوں میں انٹا غفیل ④ ہو کے مالی خوش نودی کی خاطر ''درمیانی لکیر'' ''نظریہ پاکستان'' یا بنیاد پرستوں کو گالیاں نہیں دیں بلکہ جس طرح خواجہ حسن نظامی نے عمر بھر ہندوؤں کی نیچر کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد فرمایا کہ ہندوؤں کی ''ہ'' اور مسلمانوں کی ''م'' مل کر بھی ''ہم'' نہیں بن سکتے۔ بعینہٖ اس نے بھی ریشنل (Rational) یعنی عقل و فکر کی رو سے دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ صاحبو! دِلّی دور است۔ بھارت کے موجودہ روَیّے نے ایک بار پھر اس کے موقف پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔''

میں نے سوچا کہ اِس قسم کے بصیرت افروز اور حقائق و معارف لیے ہوئے تصورات سے مزین تحریریں جمع کروں اور پھر اسے کتابی شکل میں لے آؤں لیکن ایک مسلمان اور دوم پاکستانی ہونے کی حیثیت سے اوّل اہمیت قرآن حکیم کی ہے، لہٰذا اسی سے متعلق تحریروں کو کتاب میں شامل کر کے دل آویز اور سبق آموز بنایا گیا ہے تا کہ کتاب ہٰذا اس مصرعہ کی مصداق بن جائے ؎

یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی ⑤

اُمید ہے صاحبانِ بصیرت اور فکر و تدبّر کے حامل حضرات اس کتاب کو مفید پائیں گے۔ چونکہ ہمارے 90 فی صد تصوراتِ زندگی غیر قرآنی ہیں اس لئے میں نے اس کتاب کے اقتباسات غلام احمد پرویز مرحوم و مغفور کی تالیف کردہ کتاب

---

① سہ ماہی کارواں، بہاولپور، شمارہ جنوری تا مارچ 2010ء

② پورا شعر اس طرح ہے ؎ عشق میں دوہری مشقت کی ہے — حالت ہجر میں ہجرت کی ہے

③ ہندوستان کا ایک بڑا شہر ④ یعنی شراب کے نشے میں چُور ہو کر

⑤ اصل شعر یوں ہے ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تو نے

وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی (مرتضیٰ برلاس)

لغات القرآن (چاروں مجلدات) سے منتخب کیے ہیں۔ وہ اپنی اس تالیف کے سرورق پر لکھتے ہیں:

''قرآنی مطالب کا اِنسائیکلوپیڈیا جس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی ومطالب مستند کتبِ لغت (عربی) کی بنیاد پر اس انداز سے متعین کئے گئے ہیں کہ قرآن حکیم جو تصورات پیش کرتا ہے ان کا مکمل نقشہ سامنے آجائے اور اس کا مفہوم سمجھنے میں کوئی اُلجھاؤ پیدا نہ ہو۔''

چنانچہ میں نے محولہ بالا کتاب سے عبارتی پیراگراف لئے ہیں جو انہوں نے قرآن حکیم کی آیات سے استنباط کرتے ہوئے تحریر فرمائے ہیں جس کی وجہ سے قرآن حکیم کے حقائق ومعارف تابندہ ستاروں کی طرح نگاہِ بصیرت کے سامنے اُبھر کر آجاتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب اصل دیکھنا چاہیں تو وہ لغات القرآن کی چاروں جلدیں بہ ترتیبِ حروف مادہ ملاحظہ فرمائیں۔

پیراگراف تالیف کرتے ہوئے ان میں ہلکا سا لفظی تغیر کیا گیا ہے لیکن اس سے سیاق وسباق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس طرح کوشش کی گئی ہے کہ دیگر اقتباسات بھی اسی انداز سے ضبطِ تحریر میں لائے جائیں تاکہ بات کا پس منظر سمجھنے میں کوئی دِقّت نہ ہو۔

جنوری 2018ء

ترتیب وتہذیب
منظور الحسن

تعارفِ قرآن حکیم

قرآنِ حکیم کا اسلوب بیان، انسانی تصانیف کے انداز سے مختلف ہے۔ انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب ایک خاص موضوع سے متعلق ہوتی ہے۔ پھر اسے مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جس مضمون سے متعلق وہ باب ہوتا ہے وہ پورے کا پورا اس باب میں آ جاتا ہے۔ اس طرح جب اس کتاب کا قاری، باب در باب آگے بڑھتا ہے، کتاب کا مفہوم ساتھ کے ساتھ سمجھ میں آتا چلا جاتا ہے اور جب وہ کتاب ختم کر لیتا ہے تو اس کا مفہوم مربوط شکل میں اس کے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔

''قرآنِ کریم'' کا انداز اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک موضوع کو مسلسل و متواتر ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ وہ ایک جگہ، ایک بات کہتا ہے دوسری جگہ اس میں اضافہ کرتا ہے۔ تیسرے مقام میں اس کی استثنا آ جاتی ہے۔ کسی اور جگہ اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ کسی اور سلسلہ میں اس کا ضمنی تذکرہ آ جاتا ہے۔ تو اس کا ایک اور گوشہ نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس اسلوب بیان کا نام قرآن حکیم کی اصطلاح (Terminology) میں ''تصریفِ آیات'' ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے مفہوم کی وضاحت کرتے چلے جانا۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب کس قدر بلیغ اور عمیق ہے اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت یہ کہنا ہے کہ اس کا انداز عام انسانی تصانیف سے مختلف ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس انداز سے قرآن کریم نے اپنی تعلیم کو پیش کیا ہے اسے کما حقہ سمجھنے کے لیے قرآن مجید پر اتنا عبور ضروری ہے کہ جو بات آپ کے سامنے آئے اس سے متعلق قرآن کے دیگر مقامات آپ کے پیش نظر ہوں۔

---

① ابلیس و آدم، تعارف (دیباچہ)، ایڈیشن دوم 1972ء، مصنف و مؤلف غلام احمد پرویز، ادارۂ طلوع اسلام، 25 بی، گلبرگ لاہور

ترجمۂ قرآن کریم

قرآنِ کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہوسکتا۔ مشہور مستشرق (Orientalist) ایچ اے آر گب (H.A. R Gibb) اپنی کتاب (Modern Trend in Islam) میں لکھتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح کسی بلند پایہ شاعری کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے۔۔۔قرآنِ کریم کا انگریزی میں ترجمہ کروتو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے، عربی زبان کے، تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کی بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقیّد کردیں گے۔ ایسی آیات جن میں عام واقعات یا قوانین واحکام مذکور ہوں، ترجمہ کا نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو لیکن بایں ہمہ جو مدوجزر، جو نشیب وفراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں اور اس کے ساتھ جوش وخروش، اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا۔ ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجئے اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ وَ نُمِيْتُ وَ اِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (سورہ ق:43) (ہم ہی تو زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور آخر کار سب کو ہمارے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے۔) اور انگریزی ہی نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کرکے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں جو پانچ دفعہ ''ہم'' (We) کی تکرار ہے، اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی۔''

حوالہ: مفہوم القرآن از غلام احمد پرویز، صفحہ ''د''، شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام، 25۔ بی گلبرگ II، لاہور، ایڈیشن اوّل 1961ء

تکمیلِ تمنا

جب میری زیرِ نظر تالیف، ترتیب وتہذیب کے مراحل میں تھی تو میں نے سوچا کہ اس کی حروف خوانی (Proof Reading) کے بغیر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا مشکل ہے اور اس کے لیے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو صاحبِ علم بھی ہو اور اسے ایسی کتاب سے دلچسپی بھی ہو۔ میں اسی خیال میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن کے دوست مسمیٰ محمد افتخار صاحب مقیم جوہر ٹاؤن لاہور کی بیٹی ''شہزادی حنا'' جسے میں نے خود ہی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں داخلہ کرایا تھا، اگر اُس (بیٹی) کی معاونت میسر آجائے تو میری کتاب کا حسن نکھر سکتا ہے۔ چنانچہ میں اُن کے گھر گیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو دونوں باپ بیٹی نے مجھے خوش آمدید کہا اور اس ضمن میں اپنی پوری تائید وحمایت کا یقین دلایا جس سے میرا حوصلہ دوچند ہو گیا۔

میں نے اپنی پہلی کتاب ''گزرگاہِ خیال'' (آپ بیتی چوتھا ایڈیشن 2016ء) میں صفحہ 248 پر مذکورہ بالا دوست اور ان کی بیٹی کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''تعلیم کے معاملے میں میں بڑا حساس واقع ہوا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہے۔ لہٰذا ان کے بچوں کو سکول میں داخل کرانے میں بھر پور کردار ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دونوں بیٹے اور دونوں بیٹیاں تعلیم یافتہ ہیں۔ حتیٰ کہ بڑی بیٹی (شائستہ کنول) نے ایم اے انگریزی کیا ہوا ہے اور چھوٹی بیٹی ایم اے فلسفہ ہے۔ جب چھوٹی بیٹی (شہزادی حنا) کا ایم اے فلسفہ کا نتیجہ نکلا تو بھابی شکیلہ (خدا انہیں سلامت رکھے) نے مجھے اطلاع دی اور مبارک باد کہی کہ آپ کی بھتیجی پاس ہو گئی ہے۔ چونکہ بیٹی مذکورہ کے داخلہ کرانے میں میرا زیادہ ہاتھ تھا اس وجہ سے انہوں نے بطور خاص مجھے یہ خوش خبری سنائی اور کہا کہ جب آپ آئیں گے تو ہم آپ کو مٹھائی کھلائیں گے۔ میں نے جواباً کہا کہ چونکہ بیٹی کا داخلہ کرانے میں میری کوششیں بارآور ہوئی ہیں اس لیے مجھے اس کامیابی پر زیادہ خوشی ہے اور میں ہی آپ کا منہ میٹھا کراؤں گا۔ پھر دوسرے دن میں مٹھائی کا ڈبہ لے کر ان کے ہاں گیا اور اس خوشی میں ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔''

سو اسی حوالے سے دونوں باپ بیٹی کی سعیٔ تمام سے میری یہ کتاب مکمل ہوئی اور میں اس کارِ خیر کے لیے اُن کا ممنونِ احسان ہوں اور دست بہ دعا ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

منظور الحسن

مرتّب ومہذّب

ایک وضاحت

عربی زبان کا ہر لفظ اپنی ایک جڑ یا اصل رکھتا ہے جس سے وہ وجود میں آتا ہے، اِسی جڑ یا اصل کو مادہ (Root) کہتے ہیں۔ اس ایک مادہ سے سینکڑوں الفاظ بنتے ہیں۔ ان الفاظ کی شکلیں مختلف ہوں گی لیکن ان میں سے ہر ایک میں اس ''جڑ'' یعنی مادہ (Root) کی خصوصیت موجود ہوگی۔ مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ پر غور فرمائیں:

1۔ معلوم، 2۔ معلومات، 3۔ عالم، 4۔ علما، 5۔ علم، 6۔ مُعلّم، 7۔ مُتعلّم، 8۔ مُتعلّمہ، 9۔ مُعلّمہ، 10۔ تعلیم، 11۔ علوم، 12۔ علیم، 13۔ علمی، 14۔ علامت، 15۔ علمیت، 16۔ علامہ

یہ تمام الفاظ عربی زبان کے ہیں جنہیں ہم بے تکان اپنی زبان میں لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔ آپ ان الفاظ کی ساخت پر غور کیجئے۔ ایک بات نمایاں طور پر نظر آجائے گی۔ یعنی کچھ حروف ایسے ہیں جو ان تمام الفاظ میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہ حروف ہیں ''ع ل م''۔ ان کے علاوہ باقی حروف ایسے ہیں جو کسی ایک لفظ میں پائے جاتے ہیں لیکن دوسرے میں موجود نہیں۔ مثلاً عالم میں الف ہے جو تعلیم میں نہیں۔ متعلم میں ت ہے جو معلوم میں نہیں۔ وہ حروف جو تمام الفاظ میں مشترک پائے جاتے ہیں ان الفاظ کا مادہ (اصلی حروف) کہلاتے ہیں۔ اس اصول کے مطابق مندرجہ بالا 16 الفاظ کا مادہ ''ع ل م'' (علم) ہے۔

اسی لیے میں نے اپنی کتاب کی ترتیب حروف تہجّی کے حساب سے مادہ سے شروع کی ہے۔

میں نے اپنی اس کتاب میں جو عبارتی اقتباسات مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز مرحوم و مغفور کی کتاب 'لغات القرآن' سے لیے ہیں وہ بھی مادہ کے لحاظ سے بہ ترتیب حروف ابجد یعنی الفابائی (Alphabetical) ہیں۔

اگر کوئی صاحب اصل متن دیکھنا چاہیں تو وہ ''لغات القرآن'' [1] کی چاروں جلدیں بہ ترتیب حروف تہجی ملاحظہ فرمائیں۔

ترتیب وتہذیب
منظور الحسن

2018ء

0333-4300474
042-35123062

① حوالہ: لغات القرآن، جلد اول، دوم، سوم اور چہارم، مؤلف غلام احمد پرویز، طبع کردہ ادارہ طلوع اسلام (ٹرسٹ)، 25۔ بی، گلبرگ لاہور

قرآنی حقائق پر مشتمل

بصیرت اَفروز

اِقتباسات

کوہِ سخن تراش کے لایا ہوں میں ندیم
یہ کام کوہ کنی سے کسی طَور کم نہ تھا

منظور الحسن

0333-4300474
042-35123062

حسن ترتیب بلحاظ مادہ

انسان ہے حُباب، سمندر کتاب ہے
ہر علم کی بقا کا، مقدر کتاب ہے

نامعلوم

اَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ①

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ②

جب تم قرآنی پروگرام پر عمل درآمد شروع کرو گے (تو لوگوں کی ذاتی مفاد پرستیاں اور سرکش قوتیں اس کی سخت مخالفت کریں گی) اس وقت ضرورت ہوگی کہ تم اور زیادہ شدت کے ساتھ قوانین خداوندی سے وابستہ رہ کر، تخریبی عناصر کی مضرت رسانیوں سے سامانِ حفاظت طلب کرو (16/98)۔

خدائے رحمٰن و رحیم نے اس کتاب عظیم کو اس لیے نازل کیا ہے کہ اس نے اشیائے کائنات اور نوع انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری لے رکھی ہے وہ پوری ہوجائے (6/19، 6/54) یہ نشوونما، وحی کی راہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں (10/57-58، 17/82) چونکہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں اس لیے خدا کے بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بھی ارادہ کریں اس میں مقصد خدا کے پروگرام کی تکمیل ہو (6/163)۔

① مفہوم القرآن، صفحہ 618، سورت النحل، آیت نمبر 98

② ۔ایضاً۔ صفحہ 866، سورت النمل، آیت نمبر 30

مفہوم القرآن، مؤلف و مترجم غلام احمد پرویز (1903-1985ء)، 25بی گل برگ لاہور

ا ب د

ابدی اور ازلی اصطلاحات قرآنی نہیں۔(اَزَلٌ کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا)۔جن معنوں میں ہم خدا کے لیے ازلی اور ابدی بولتے ہیں وہ مفہوم صرف خدا کے لیے مخصوص ہے، کسی اور کے لیے نہیں۔

ا ب ق

قرآن نے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق اَبَقَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (الصافات: 140) ''جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگا'' رسول کو خاص مشن دے کر اس کی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ اسے اس مشن کی تکمیل میں ہزار مشقتیں اٹھانی پڑتیں، وہ کسی حالت میں بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔لیکن جب مشیت خود دیکھتی کہ اس کا اس جگہ زیادہ عرصہ کے لیے رہنا اس مشن کے لیے مفید نہیں تو اسے اس مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانے کا حکم مل جاتا اسے ہجرت کہتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کی قوم سرکشی سے باز نہیں آتی تو انہوں نے خود ہی فیصلہ کرلیا کہ یہ ماحول پیغام خداوندی کے لیے سازگار نہیں رہا۔ اس لیے وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ چونکہ ان کا یہ فیصلہ مشیت کے پروگرام سے قبل از وقت تھا (اور انہوں نے خدا کے حکم کا انتظار کیے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی تھی) اس لیے ان کے اس عمل کے لیے اَبَقَ کہا گیا۔ یعنی اپنے فریضۂ منصبی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ واضح رہے کہ یہ خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی۔ اپنا اجتہادی فیصلہ تھا۔ چونکہ یہ فیصلہ مشیت کے پروگرام کی رُو سے ذرا قبل از وقت تھا اس لیے خدا نے اسے پسند نہیں کیا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ ایک رسول کی زندگی کس قدر احکام خداوندی کے تابع ہوتی تھی اور جن معاملات میں فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہوتا تھا ان میں رسول اپنی طرف سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دوسرے معاملات میں البتہ اسے آزادی ہوتی تھی کہ وہ وحی کے دیئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اپنا پروگرام آپ مرتب کرتا جائے۔

ا ث م

اثم کے معنی ہوں گے ایسے جرائم جن کا اثر انسان کی اپنی ذات تک ہی محدود رہتا ہو۔ مثلاً ایک شخص افیون کھا کر چپکے سے لیٹے رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس عمل کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود ہے۔لیکن قرآن کریم کی رو سے یہ بھی جرم ہے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ لہٰذا ہر وہ کام جس سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جرم ہوگا خواہ وہ انسان کے اپنے ہاتھوں سے ہی پیدا کیوں نہ ہو۔ قرآن کی رو سے انسان کا خود اپنے آپ کو

نقصان پہنچانا بھی جرم ہے۔خودکشی بھی قتل نفس میں شامل ہےاس لیےاِثْمٌ میں داخل ہے۔اورزنا کی وجہ اثم ہونے کے لیے توکسی ثبوت اور شہادت کی بھی ضرورت نہیں۔اس لیے قتل نفس اور زنا کے لیے کہا گیا ہے کہ مَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ يَلۡقَ اَثَامًا (25/68)۔''اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا۔''اسی طرح اگرکسی شخص کو بغیر محنت کیے مفت میں دولت حاصل ہوجائے (خواہ وہ کسی طریق سے ملے)اوروہ کسی کونقصان بھی نہ پہنچائے،تو وہ بھی اِثْمٌ ہے۔اس لیے کہ محنت نہ کرنے سے اس کےقوائے عملیہ مضمحل ہوجائیں گےاور یہ چیز قرآن کی رو سے جرم ہے۔

ا ج ج

سورۃ انبیاء میں اگرچہ نام یاجوج وماجوج ہی کا لیا گیا ہےلیکن اس سے مفہوم''یاجوجیت وماجوجیت''ہے،خواہ وہ کسی قوم میں پائی جائے۔قرآن نے کہا یہ ہے کہ جواقوام قعرِ مذلت میں گرجائیں گی ان کے دوبارہ ابھرنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔بجزایک صورت کے۔اوروہ یہ ہے کہ جب دنیا کی ایسی قومیں جن میں اپنے ملک سےنکل کردوسرے ممالک پر چھاجانے کی صلاحیت ہوگی ان پسماندہ اقوام کےملکوں میں پہنچیں گی تاکہ وہاں اپنی استعماریت قائم کریں تو ان کے اس تصادم سےان کمزورقوموں کی قوتیں بیدار ہوجائیں گی اورانہیں دوبارہ زندگی حاصل ہوجائے گی۔ہمارا دوراس پر شاہد ہے کہ یورپ کی اقوام کس طرح کمزوراقوام (بالخصوص مسلمان ممالک) میں پہنچیں تاکہ ان کا خون پیا جائے۔لیکن آہستہ آہستہ یہ کمزوراقوام انہی سے سبق سیکھ کران کے مقابلہ میں اٹھ کھڑی ہوئیں اوراس طرح دوبارہ زندگی سے متمتع ہوگئیں۔ اس حقیقت کواقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

مسلماں کو مسلماں کردیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خداخود یہ چاہتا ہے کہ طاقت ورقومیں کمزورقوموں کواپنا غلام بنائیں تاکہ کمزورقوموں کواز سرِنو زندگی مل جائے۔قرآن کریم کی تعلیم تو یہ ہے کہ طاقتورقوموں کا فریضہ ہے کہ وہ کمزورقوموں کی کمزوریوں کورفع کرکے انہیں انسانیت کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بنادیں۔اس نے کہا یہ ہے کہ اگر طاقت ورقومیں ایسا نہ کریں توکمزورقومیں خودایک دِن اٹھ کران کی غلامی کے جوئے کو گلے سے اتار پھینکیں گی۔

ا ج ل

قرآن کریم نے اقوام عالم کے استخلاف واستبدال کے متعلق تفصیلی پروگرام دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں

قوموں کا عروج وزوال محض اتفاقیہ نہیں ہوتا بلکہ ایک محکم قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر ایک عمل کا نتیجہ تو اسی وقت مرتب ہونا شروع ہوجاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مدت معینہ کے بعد سامنے آتا ہے۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے اس طرح محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کو بھی اجل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسے مہلت کا وقفہ بھی کہا جائے گا۔ یہ وقفہ بھی قانونِ خداوندی کے مطابق متعین ہوتا ہے جیسے بیج کے درخت بننے تک کی مدت۔

موت کے متعلق سورۃ آل عمران میں ہے کہ یہ خدا کے قانون کے مطابق وارد ہوتی ہے اور یہی قانون اس کے لیے مدت مقرر کرتا ہے۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران:145) کوئی ذی حیات خدا کے قانون کے بغیر نہیں مرتا (موت اس کے قانون طبعی کے مطابق واقع ہوتی ہے)۔ اور یہی قانون انسان کی عمر کی مدت کا تعین کرتا ہے۔ یہ قانون، قانون طبعی ہے جس کے مطابق (مثلاً صحت خراب کر لینے سے) عمر کم ہوجاتی ہے اور (صحت کا خیال رکھنے اور ہلاکتوں سے بچنے سے) عمر بڑھ جاتی ہے۔ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (فاطر:11) ''کسی بڑی عمر والے کو عمر نہیں دی جاتی اور نہ ہی کسی کی عمر میں سے کمی کی جاتی ہے مگر (یہ سب کچھ) ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے۔'' یعنی عمر کا بڑھنا اور گھٹنا سب خدا کے قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔

ا ح د

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (الاخلاص:1) میں احد کے معنی یگانہ، بے مثل و بے نظیر (Unique) ہیں۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت اس کی انفرادیت (Uniqueness) ہوتی ہے۔ اور چونکہ خدا کی ذات مکمل ترین ہے اس لیے اس میں یہ صفت بھی اپنے انتہائی کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔

ا خ ر

سوہ المومنون میں اس لفظ کے یہ معانی بڑی عمدگی سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں انسانی پیدائش کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اس کی ابتدا مٹی کے خلاصے سے ہوئی۔ پھر نطفہ بنا اس سے حمل قرار پایا۔ پھر نطفہ سے لوتھڑا بنا، لوتھڑا گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہوا، پھر اس میں ہڈیاں بنیں، ہڈیوں پر گوشت چڑھا۔ یہاں تک پیدائش کے وہ مراحل ہیں جو قانون طبعی کے مطابق سلسلہ وار چلے آتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی کڑی نہیں آتی جو اس قانون کی رو سے سابقہ کڑی سے الگ ہو۔ (حتیٰ کہ اس منزل تک حیوان کے بچے اور انسانی جنین میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔) اس کے بعد ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (23/14) ''پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی تخلیق میں اٹھا کھڑا کیا۔'' یہاں خَلْقًا اٰخَرَ کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ تخلیق کی یہ کڑی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں انسانی ذات کی طرف اشارہ ہے جو طبعی قوانین کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اسے دور حاضر کی اصطلاح میں فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کہتے ہیں۔ یعنی جس میں اچانک، غیر متوقع طور پر

ایک ایسی تخلیق سامنے آجاتی ہے جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

لہٰذا آخَرُ اور آخِرُ کے معانی کے اعتبار سے انسانی زندگی کا یہ تصور سامنے آیا کہ انسانی پیکر میں آکر زندگی نے اپنی سابقہ کڑیوں سے ایک بالکل مختلف شکل اختیار کر لی۔ اب یہ سلسلہ اس کی طبعی موت تک جاری رہے گا۔ اس کے بعد ایک دوسری زندگی ہوگی جو اگرچہ اس زندگی سے بالکل متصل ہوگی لیکن اس سے موجودہ کڑیوں کا خاتمہ ہوجائے گا اور اس کے بعد زندگی ایک نیا اسلوب اختیار کرے گی۔ جو لوگ اس زندگی کے متعلق موجودہ زندگی کے قوانین (Physical Laws) کے مطابق سوچتے ہیں انہیں اس پر یقین پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن جو دل و دماغ، قدرت کے اچانک انقلابات کی تخلیقی کارفرمائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں وہ آخرت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آخرت، اس مستقبل کا نام ہے جو انقلاب آفرینی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ گردش دولابی [1] (کولہو کے بیل کی حرکت) کے ذریعے۔ یہ انقلاب اس زندگی میں (قرآن کے ذریعے) پیدا ہوتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی بھی ایک نئے انقلاب سے ظہور میں آتی ہے۔

''آخرت'' کے مفہوم میں، پیش پا افتادہ مفاد کی بجائے مستقبل کی خوشگواریاں، موجودہ نسل کی بجائے آنے والی نسلیں (انسانیت عامہ)، انقلاب آفرینی کے ذریعہ ایک نئی زندگی کی نمود، اور اس طبعی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کے تصورات، سب شامل ہیں۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر گرنہیں پڑتے بلکہ ہمیشہ اپنے سامنے مستقبل کا مفاد رکھتے ہیں۔

غور کیجئے دنیا میں وہی قوم زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے جس کے سامنے مستقبل کی بہبود ہو۔ مومن کو مستقبل پر یقین رکھنے والا کہا گیا تھا۔ لیکن آج اس آسمان کے نیچے جماعت مومنین (مسلمان) سب سے زیادہ عاقبت فراموش (مستقبل سے بے نیاز) ہے اور اس لیے سب سے پیچھے۔ حالانکہ اس کا مستقبل اس قدر حدود فراموش تھا کہ اس کا احاطہ اس دنیا کی چار دیواریوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ موت کے بعد بھی برابر آگے چلتا۔

ادم

ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ''آدم'' جن کے جنت سے نکلنے کا قصہ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں آیا ہے (مثلاً البقرہ:3) نبی تھے۔ قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قصۂ آدم کی جو تفاصیل بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔ بالفاظ دیگر، قصہ آدم کسی خاص فرد (یا جوڑے) کا قصہ نہیں بلکہ خود ''آدمی'' کی داستان ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز

1۔ دولابی یعنی Cyclic

میں بیان کیا ہے۔اس داستان کا آغاز انسان کی اس حالت سے ہوتا ہے جب اس نے قدیم (Primitive) انفرادی زندگی کی جگہ پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی۔ اُدْمَۃٌ خود اس تمدنی زندگی (Social Life) کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔لہٰذا ''آدمیت'' انسانی زندگی کی اس حالت کا نام ہے جس میں اس نے مل جل کر رہنا شروع کیا۔اس طرح مل جل کر رہنے سے باہمی مفادات کا تصادم ہوا۔اس تصادم کا حل تنہا عقل انسانی کے بس کی بات نہ تھی۔اس کا حل وحی کے ذریعے دیا گیا۔

قرآن کریم میں البتہ ایک مقام ایسا ہے جس میں آدم کا لفظ اس انداز سے آیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی فرد کا نام ہے۔وہ آیت یہ ہے: اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران:33) ''یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو (ان کی ہم عصر اقوام پر) فضیلت دی تھی۔۔۔'' یہاں آدم کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے اور وہ (حضرت نوح علیہ السلام کی طرح) نبی تھے۔(اگرچہ اصْطَفٰی کا لفظ قرآن میں غیر نبی کے لیے بھی آیا ہے مثلاً حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق۔دیکھئے (2/41)۔اور خود امت محمدیہ کے متعلق، دیکھئے (35/32) بہر حال جس آدم کا ذکر سورۃ آل عمران کی مندرجہ بالا آیت (3/33) میں آیا ہے وہ ''جنت سے نکلنے والے آدم'' سے مختلف تھے۔ہوسکتا ہے کہ وہ نبی ہوں (اور ان کا نام آدم ہو) قرآن نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔اس نے سلسلہ نبوت کا آغاز عام طور پر حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر ہی سے کیا ہے۔مثلاً سورہ نساء میں ہے اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (النساء:163) بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی ہے جس طرح ہم نے نوح اور اس کے بعد کے انبیاء پر وحی کی۔۔۔'' اگرچہ قرآن کریم سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قوم نوح میں حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے اور انبیاء بھی آچکے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی کے جس تمدنی دور سے قرآن کریم نے اس تمثیلی داستان کا آغاز کیا ہے، اس میں کوئی عظیم شخصیت ''آدم'' کے نام کی ہو اور اس دور کو اسی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔یا اس دور کی نسبت سے اس شخصیت کو اس نام سے پکارا گیا ہو۔ہم نے انہیں بالیقین ''نبی'' اس لیے نہیں لکھا کہ قرآن کریم نے زمرہ انبیاء میں ان کا ذکر بصراحت نہیں کیا۔

قرآن کریم میں ''قصہ آدم'' بیان کرنے سے ایک مقصد تو یہ تھا کہ انسان کو بتایا جائے کہ اگر اس نے وحی کا دامن چھوڑا تو اس کی حالت کیا ہوگی اور اس حالت سے نکل کر پھر سے جنتی زندگی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے وحی سے تمسّک۔

ارض

اَرْضٌ وَ سَمٰوٰتٌ کے معنی کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہوں گے۔اور جہاں ان الفاظ کا تعلق زندگی کے کسی پہلو

سے ہوگا تو سَمَاءٌ کے معنی خدا کا کائناتی قانون اور اَرْضٌ کے معنی انسان کی معاشی زندگی ہوں گے۔ قرآن نے ارض کے متعلق کہا ہے کہ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (7/10) ''ہم نے تمہارے لیے زمین میں سامانِ معیشت رکھے ہیں۔'' اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ سامانِ زیست کا اصلی سرچشمہ ارض ہی ہے۔ اس لیے یہ لفظ وسائل و ذرائع رزق کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اسر

سورہ الدھر میں ہے نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ (76/29) ''ہم نے انہیں (انسانوں کو) پیدا کیا اور ان کے اَسْرٌ کو مضبوطی سے جکڑ دیا۔'' اَسْرٌ کے معنی انسانی جسم یا ہیئت (Form) کے ہیں۔ دورِ حاضر کی علمی تحقیقات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ یہ لفظ حقیقت کے ایک بہت بڑے گوشے کو بے نقاب کرتا ہے۔ ہم کسی چیز کو محسوس نہیں کر سکتے جب تک اس کی کوئی شکل (Form) نہ ہو۔ سائنس کی تحقیق نے بتایا ہے کہ مادہ (Matter) درحقیقت کسی ٹھوس چیز کا نام نہیں۔ یہ جوہروں (Atoms) کا مجموعہ ہے جو ایک خاص نظام کے ماتحت ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہوتے ہیں۔ اگر ان میں یہ باہمی جکڑ بندی نہ رہے تو کسی شے کی شکل (Form) باقی نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا یہ اَسْرٌ (باہمی جکڑ بندی) ہی ہے جس سے اشیاء کا وجود قائم ہے۔ سر جیمز جینس نے اسے ''مقیّد لہروں'' (Bottled-up-Waves) سے تعبیر کیا ہے۔

اسمٰعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بڑے بیٹے تھے۔ انہی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کو حکم خداوندی سمجھ کر خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے لے گئے تھے (37/102) لیکن خدا نے انہیں وقتی قربانی کے بجائے، عمر بھر کی قربانی کے لیے زندہ رکھا (37/107)۔ یہ بڑی قربانی (ذبحِ عظیم) تھی، بیت اللہ کی تولیت، خانۂ خدا کی پاسبانی۔ چنانچہ ان دونوں باپ بیٹوں (حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام) نے مل کر کعبہ کو تعمیر کیا (21/127) اور اس کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اس کی پاسبانی کے لیے وہیں بس گئے۔ خدا نے انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا (2/136)۔ اور صَادِقَ الْوَعْدِ (19/54) کہہ کر پکارا۔ ''اسمٰعیل'' عبرانی زبان شاع سماع (سننا) اور ایل (خدا) سے مرکب ہے۔ چونکہ آپ کی پیدائش حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا نتیجہ تھی اس لیے آپ کا نام اسمٰعیل (اللہ کا سننا) رکھا گیا۔ آپ کی اولاد میں حضور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

ا س ن

جنتی معاشرہ میں کسی چیز کو روک کر نہیں رکھا جاتا۔ استعمال کی ہر شے گھومتی پھرتی اور رواں دواں رہتی ہے۔ یہ تو جہنمی معاشرہ ہے جس میں یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (الماعون:7) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی رزق کے جن چشموں کو بہتے رہنا چاہیے انہیں ارباب قوت واقتدار اپنے ذاتی مفاد کے لیے روک رکھتے ہیں اور اس طرح رکنے سے ان میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔

اس دنیا کے جنتی اور جہنمی معاشرہ کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ آخرت کی جنت اور جہنم پر ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کریم میں ان کا بیان تمثیلی ہے۔(47/15؛13/35)

ا س ی اور ا س و

جنگ احزاب میں جن لوگوں نے دوں ہمتی اور عدم استقلال کا ثبوت دیا تھا ان سے کہا گیا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: 21) تمہیں وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جو رسول اللہ ﷺ نے کیا۔ جس طرح وہ ہمت و استقلال سے قانون خداوندی سے کامل ہم آہنگی کے ساتھ تمام مصائب کا مقابلہ کرتے رہے، تمہیں بھی اسی طرح کرنا چاہئے تھا۔ ان کی مثال تمہارے لیے نہایت عمدہ نمونہ تھی۔ اس سے تمہیں اپنی مشکلات میں تسلی حاصل کرنی چاہئے تھی۔

ا ص ر

سورہ اعراف میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ (الاعراف:157) وہ اس بوجھ کو اتار دے گا جس کے نیچے نوع انسانی دبی چلی آرہی ہے۔ اور ان گراں بار پابندیوں کو اٹھا دے گا جو انسانوں کے لیے ناقابل برداشت ہوں۔ اور اس طرح انسانیت کو صحیح حریت فکر و عمل عطا کر دے گا۔ یہی وہ حقیقی آزادی ہے جسے قرآن عطا کرتا ہے۔ یعنی اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہوگی، اس کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے حکم کی اطاعت نہیں ہوگی، خواہ وہ مذہبی پیشوا ہوں یا دنیاوی ارباب اقتدار (3/78)۔

ا ف ف

قرآن کریم میں والدین کے متعلق ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا (بنی اسرائیل: 23) ''ان کی تحقیر نہ کرو۔ انہیں جھڑکو نہیں بلکہ نرمی سے بات کرو۔''

ا ف ک

سورۃ الذاریات میں ہے یُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (الذاریات:9) ''اس سے اس کو پھیرا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا

ہے۔'' یہ آیت ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے۔یعنی خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا، انسان خود ہی گمراہ ہوتا ہے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو گمراہ ہونا چاہے اسے صحیح راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا۔ یہاں ابتداءِ کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ یہ کرتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہوجاتا ہے۔ اگر یہ اپنے اندر پتھر جیسی سختی پیدا کرلے تو ہر شیشہ اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجائے گا اور اگر یہ شیشے جیسا نازک بن جائے تو پتھر کی چھوٹی سی کنکری بھی اسے پاش پاش کردے گی۔ غرضیکہ وہ جدھر اپنا رخ کرلے اسی سمت کی منزل اس کے سامنے آجائے گی۔ خدا زبردستی کسی انسان کا رخ نہیں پھیرتا۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصّف:5)''جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانونِ مکافات) نے ان کے دل ٹیڑھے کردیئے۔۔۔۔''

سورہ نور میں قرآن کریم نے مومنین کو نصیحت اور تاکید کی ہے کہ وہ جھوٹے الزامات نہ وضع کیا کریں اور معاشرہ میں اس قسم کی باتوں کو نہ پھیلایا کریں۔ (دیکھئے 24/4 و 24/18)۔ اس ضمن میں اس نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک گروہ نے کسی پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (24/11)۔''جو لوگ اس جھوٹ کو افترا کرکے لائے ہیں وہ تمہی میں سے ایک گروہ ہے۔'' اس سارے واقعہ میں قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ وہ کون تھا جس کے خلاف یہ الزام لگایا گیا تھا۔ اس نے کہا صرف یہ ہے کہ جب یہ خبر جماعت مومنین تک پہنچی ہے تو ان کا پہلا ردعمل یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ حسن ظن سے کام لیتے اور کہہ دیتے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (24/12)۔ اور هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (24/16)۔ یہ وہی بات ہے جس کی دوسری جگہ یہ کہہ کر وضاحت کی گئی ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی بات تم تک پہنچائے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو (47/6)۔ قرآن کریم نے صرف اتنا کہا ہے لیکن ہماری تاریخ (روایات) میں اس واقعہ کو (معاذ اللہ) حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کرکے اس پر افسانہ طرازی کی ایک عمارت قائم کردی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی اس باب میں سخت متردد تھے اور انہوں نے حضرت عائشہؓ کو ان کے میکے بھیج دیا تھا۔ جہاں ان کی حالت غیر ہوگئی۔ حتی کہ خدا نے بذریعہ وحی ان کی براءت کی۔ تب حضور اکرم ﷺ انہیں گھر لائے۔

صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک گھڑا ہوا قصہ ہے جسے خاص مقصد کے ماتحت وضع کیا گیا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اسے مستند واقعہ کی حیثیت سے لیے چلے آرہے ہیں، اور جب مخالفین اسلام اس پر اعتراض کرتے ہیں تو ہم طیش میں آجاتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اس کے جواب میں وہی کہہ دینا چاہئے جو قرآن نے کہا ہے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (24/12)۔ یعنی یہ واقعہ جسے حضرت عائشہؓ اور نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، افک مبین اور بہتان عظیم ہے۔

افل

ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خارجی حوادث سے تغیر پذیر نہیں ہوتی۔ اس کی تعریف،

برگسان کے مفہوم کے مطابق یہ ہے کہ (Changelessness in Change) ''تغیرات ① کی دنیا میں عدمِ تغیر''۔ اس لیے خدا جو مکمل ترین ذات (The most complete and Perfect Personality) ہے تغیرات سے یکسر ماوراء ہوگا۔ لہٰذا جو آفل ہے وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ ''آفلیت'' ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت کے منافی ہے۔ جس انسان کی ذات کی نشوونما ہوجائے اس میں بھی یہی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں کا پکا ہوتا ہے اور خارجی احوال وظروف کے ساتھ (مرغ بادنما کی طرح) ہر آن بدلتا نہیں رہتا۔ اسی کو ایمان کی پختگی اور عمل کی استقامت کہتے ہیں۔ ایسے ہی انسان ہیں جن کی بات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جن کا خدا ''آفل'' نہیں وہ خود بھی ''آفل'' نہیں ہوتے۔ جیسا کسی انسان یا قوم کا ''خدا'' ویسا ہی وہ انسان یا قوم۔ خدا کے تصور کا انسان کی ذات یا قومی خصوصیات پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ قرآن کریم نے خدائے حقیقی کا جو تصور پیش کیا ہے، اس پر ایمان رکھنے والی قوم کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نہ قوت وثبات میں، نہ شرف وسعادت میں۔ ②

ا ک ل

اَکَلَ کے حقیقی معنی تو کھانے کے ہیں لیکن اس کے مجازی معنی کسی چیز کے لینے کے بھی آتے ہیں۔ لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا (آل عمران:130) کے معنی ہیں سود مت لو۔ اگرچہ ہمارے ہاں بھی ''سود کھانا'' ہی کہتے ہیں اور سود لینے والے کو سود خور۔

ا ل ف

قرآن کریم میں جماعت مومنین کے متعلق ہے اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران:103) ''تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ہم آہنگی پیدا کردی اور اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہوگئے۔'' یہاں سے اِئْتِلَافٌ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ اِئْتِلَافٌ درحقیقت تعاون اور اجتماع سے اگلا درجہ ہے۔ اس میں جماعت کے افراد بالکل ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں اور دلوں میں ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں افراد کے باہمی تعلقات ایسے نہیں تو وہ مومنین کا معاشرہ نہیں۔

ا ل ک

''یہ امر ثابت ہے کہ کائنات کی ہر شے کے اندر ایک قوت ایسی ہے جس پر اس چیز کا دارومدار ہے اور جس کے ساتھ اس شے کا قوام ونظام قائم ہے۔ جو لوگ وحی پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان قوتوں کو طبیعی قوتیں (Physical Forces) کہتے ہیں اور شریعت کی زبان میں انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ لیکن انہیں ملائکہ کہئے یا کائناتی قوتیں، حقیقت ایک ہی ہے۔ اور عقلمند آدمی وہ ہے جس کے لیے ''رکھے ہوئے نام'' اصل مسمیات سے حجاب نہ بن جائیں۔''

---

① ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ② یعنی 'خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ (اقبال)

قرآن کریم میں ملائکہ کو پیغام رساں کہا گیا ہے۔ اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ۔۔۔ (22/75) ''اللہ ملائکہ میں سے پیغام رساں چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔'' لیکن یہ چیز (پیغام رسانی) ملائکہ کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ جامع طور پر انہیں فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا (79/5) اور فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا (51/4) کہا گیا ہے یعنی ''تدبیر امور اور تقسیم امور کرنے والی قوتیں یا جماعتیں۔''

کائنات میں اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ مختلف اسکیمیں کارفرما ہیں۔ جو ملکوتی قوتیں خدا کے قانون کے مطابق ان تدبیرات کو بروئے کار لاتی ہیں، انہیں ملائکہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ان قوتوں کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ (اختیار و ارادہ خدا کے بعد صرف انسان کو حاصل ہے)۔ اس لیے یہ قوتیں بلا چون و چرا قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں۔ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (النحل:50) ''جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ وہی کچھ کرتی ہیں۔'' جس قانون کے مطابق یہ قوتیں مادی کائنات میں کارفرما رہتی ہیں اس کا علم انسان کو دے دیا گیا ہے۔ (یعنی انسان میں اس امر کی امکانی صلاحیت موجود ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کی کارفرمائی کے قانون کا علم حاصل کر لے۔) اس لیے یہ قوتیں انسان کے تابع تسخیر آسکتی ہیں۔ ملائکہ کے سجدہ آدم سے یہی مفہوم ہے۔ اسی کو تسخیر فطرت کہتے ہیں۔

لیکن ملائکہ صرف انہی قوتوں کو نہیں کہا گیا جو خارجی کائنات میں تدبیر امور کرتی ہیں بلکہ ان قوتوں کو بھی کہا گیا ہے جو انسان کی داخلی دنیا (نفسیاتی زندگی) پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا (حم السجدہ: 30) ''یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اللہ کی ربوبیت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کسی قسم کا غم اور اندیشہ مت کرو۔'' اس میں ''نزول ملائکہ'' سے مراد وہ نفسیاتی تغیر ہے جو خدا کی ربوبیت پر یقین محکم سے انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ (اس کے برعکس جو قوتیں انسان کے دل میں خوف و ہراس اور یاس و ناامیدی پیدا کرتی ہیں (خواہ وہ خارجی قوتیں ہوں یا خود انسان کی داخلی قوتیں) انہیں ابلیس اور شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہی وہ ''ملائکہ'' تھے جو بدر و حنین کے میدان میں مجاہدین کے لیے تسکین خاطر اور تثبیت قلب کا موجب بنے تھے (9/26؛ 8/12)۔ اسی قسم کی قوتیں ان تغیّرات کا بھی موجب بنتی ہیں جو انسان کے طبعی جسم میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور آخرالامر موت تک منتج ہوتے ہیں (4/97؛ 16/28)۔ نیز ملائکہ اعمال انسانی کے ''رجسٹرار'' (لکھنے والے، محفوظ رکھنے والے) ہوتے ہیں۔ یعنی قانون مکافات کو بروئے کار لانے کا موجب بنتے ہیں (10/21)، (43/80)۔ ان آیات ''کتابت اعمال'' کو ملائکہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری جگہ ہے کہ ان امور کو اللہ تعالیٰ خود لکھ لیتا ہے (19/79) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نامہ اعمال خود انسان کے اپنے گلے میں لٹکا رہتا ہے (17/13-14)۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت

واضح ہوجاتی ہے کہ یہ ملائکہ وہ ملکوتی قوتیں ہیں جو خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہر عمل کا نتیجہ مرتب کرتی رہتی ہیں اور وہ نتیجہ انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔

چونکہ ملائکہ کائنات کی غیر مرئی قوتیں ہیں اس لیے ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم ان کے لشکروں کو دیکھ نہیں سکتے (9/40؛ 9/26)۔ باقی رہا وہ نظام جس کے مطابق ملائکہ، انبیاء کرامؑ کی طرف وحی لاتے تھے تو اس کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وحی کی حقیقت و ماہیت ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر کی چیز ہے۔ ہم اس پر ایمان لانے کے مکلف ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنے پر مامور۔ البتہ وحی کی رو سے دیئے ہوئے حقائق کی صداقت اور عظمت کو علم کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ وحی ہی نہیں بلکہ پورے کے پورے عالم امر میں یہ قوتیں کس طرح کام کرتی ہیں ہم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ ہماری عقل کا دائرہ محسوسات تک محدود ہے۔ یعنی جو قوتیں محسوس کائنات میں کام کرتی ہیں ہم صرف ان کے متعلق تحقیق کرسکتے ہیں۔

قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان کو ''اجزائے ایمان'' میں سے قرار دیا ہے۔ (مثلاً 2/285) یعنی ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ، کتب، رسل، آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ملائکہ پر بھی ایمان لائے۔ سوال یہ ہے کہ ملائکہ پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملائکہ کے متعلق وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا ہے انہیں وہی پوزیشن دی جائے جو قرآن نے ان کے لیے متعین کی ہے۔ ملائکہ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہوں نے آدم کو سجدہ کیا (4/43) یعنی وہ آدم کے سامنے جھک گئے۔ لہٰذا ملائکہ کے آدم کے سامنے جھکنے سے مراد یہ ہے کہ یہ قوتیں وہ ہیں جنہیں انسان مسخر کرسکتا ہے۔ انہیں انسان کے سامنے جھکا ہوا رہنا چاہئے۔ کائنات کی جو قوتیں ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئیں، انہیں چھوڑیئے۔ جو قوتیں ہمارے علم میں آچکی ہیں ان کے متعلق صحیح ایمان یہ ہوگا کہ ان سب کو انسان کے سامنے جھکنا چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے کائناتی قوتیں نہیں جھکتیں وہ قوم (قرآن کی رو سے) صف آدمیت میں شمار ہونے کے بھی قابل نہیں، چہ جائیکہ اسے جماعت مومنین کہا جائے۔ (کیونکہ مومن کا مقام، عام مسلمانوں کے مقام سے کہیں اونچا ہے)۔

اب آپ سوچئے کہ جس قوم کے ایمان میں یہ چیز داخل تھی کہ کائناتی قوتوں کو آدمی کے سامنے جھکنا چاہئے، وہ اگر ان قوتوں کے سامنے جھکی ہوئی ہو (ان قوتوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان قوموں کے سامنے جنہوں نے ان قوتوں کو اپنے سامنے جھکایا ہوا ہے) تو اس قوم کی پستی کی کوئی انتہا ہوسکتی ہے؟ یاد رکھئے ''مقام آدم'' یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرکے ان کے ماحصل کو قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کیا جائے۔ بادنیٰ تدبّر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آسکتی ہے کہ ہمیں مقام مومن تو کجا، مقامِ آدم بھی نصیب نہیں۔

ا ل ل

پڑوسی یا قرابت دار کے ساتھ حسن سلوک، یہ ہر معاشرہ کی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے جس کے ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔قرآن کریم میں مخالفین (قریش) کے متعلق ہے لَا یَرْقُبُوْا فِیْکُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (9/8) ''یہ اپنی مخالفت میں اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ معاشرہ کے وہ مسلّم اصول جن کا ہر شخص خیال رکھتا ہے،تمہارے معاملے میں یہ ان تک کا بھی خیال نہیں کرتے۔نہ ہی کسی حق اور حرمت کا پاس کرتے ہیں۔'' ان لوگوں کی بھی یہی روش تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے ان سے کہا تھا کہ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (42/23) میں تم سے اپنی پیغام رسانی کا کوئی اجر نہیں مانگتا لیکن تم میری مخالفت میں اس حد تک تو نہ بڑھ جاؤ کہ جو عام رشتہ داروں کے حقوق ہوتے ہیں انہیں بھی نظر انداز کردو! واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ اس چیز کو بھی بطور اجر رسالت نہیں مانگتے۔(اجر مانگنے سے تو تمام انبیاء انکار کرتے رہے ہیں) بلکہ ان کی توجہ عام معاشرتی حقوق وواجبات کی طرف دلاتے ہیں۔

ا ل ہ

جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ (26/29) ''اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ تسلیم کیا تو میں تجھے قید کردوں گا۔'' تو وہاں الٰہ کے معنی صاحب اقتدار ہی کے ہیں۔اسی طرح جہاں کہا گیا ہے اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (25/43) ''کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنالیا۔'' تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ اپنے جذبات ہی کے پیچھے چلتا ہے، اُن ہی کا اقتدار تسلیم کرتا ہے۔وہ اپنے جذبات کا بندہ بن چکا ہے۔اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے: وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43/84) ''وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی الٰہ ہے اور پستیوں میں بھی۔'' (یا جو کائناتی اور معاشی دنیا میں الٰہ ہے) تو اس کے معنی بھی صاحب اقتدار کے ہیں۔یعنی کائنات میں بھی اقتدار و اختیار اسی کا ہے اور انسان کی معاشی اور معاشرتی دنیا میں بھی اسی کا۔

قرآن کریم میں ''اللہ'' خدا کی ذات کے لیے استعمال ہوا ہے۔باقی تمام اسما (نام) اس کی صفات ہیں۔

لہٰذا، اللہ (قرآنی اِلٰهٌ) وہ بلند و بالا ہستی ہے جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔جس کی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل وادراک متحیر رہ جاتے ہیں۔جس کا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔جس کی اطاعت نہایت ضروری ہے۔لیکن ہم اس کی اطاعت اس کے اس قانون کی رو سے کرسکتے ہیں جو اس نے اپنی طرف سے (بذریعہ وحی) ہمیں دیا ہے (اور جو اَب قرآن کریم میں محفوظ ہے)۔لہٰذا اَطِیْعُوا اللّٰهَ کے معنی ہوں گے خدا کے قانون کی اطاعت کرو۔اسی طرح کائنات میں بھی جو کچھ

ہوتا ہے سب اسی قانون کے ماتحت ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں یہ آئے گا کہ ''اللہ یوں کرتا ہے'' تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے قانون کے مطابق اس طرح ہوتا ہے۔ عالم امر میں بھی اسی کا قانون کارفرما ہے اور عالم خلق میں بھی یہ قوانین اس نے اپنی مشیت سے بنائے ہیں اور اسی کی قدرت (کنٹرول، قبضہ، اختیار) سے یہ قوانین نافذ العمل اور کارفرما ہیں۔ یہی وہ سنۃ اللہ ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعلق ہے، ہم اس کی ماہیت اور کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ محدود (Finite) کسی لامحدود (Infinite) کا ادراک نہیں کرسکتا۔ البتہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات (الاسماء الحسنیٰ) کا ذکر کیا ہے ہم ان سے خدا کے متعلق (اپنی حدود ذہنی کے اندر رہتے ہوئے) اندازہ کرسکتے ہیں۔ اللہ پر وہی ایمان قرآن کریم کی رو سے صحیح ایمان ہے جو قرآن میں بیان کردہ صفات کے مطابق ہو۔ اس لیے دنیا میں جو لوگ اپنے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہیں انہیں قرآن کی رو سے ''اللہ پر ایمان رکھنے والے'' نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بڑی اہم حقیقت ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ ''خدا پرستی اور نیک عملی'' وہی درست ہے جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہو۔ نہ وہ جو مختلف افراد، اقوام یا مذہب کے اپنے اپنے تصور کے مطابق ہو۔

امر

سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں آیا ہے: اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا (17/16) تو اس کے معنی ہیں ''ہم مترفین کو کثرت سے مال و دولت دے دیتے ہیں۔'' اور قوموں کی ہلاکت کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ آرام پرست، کثرت کی طالب، تعیش پسند اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی مالک ہوجاتی ہیں۔ جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کردیتے ہیں اور اس سے قوم تباہ ہوجاتی ہے۔

قرآن کریم میں خَلْقٌ کے مقابلہ میں اَمْرٌ کا لفظ آیا ہے (7/54)۔ اور اس کا ایک خاص مفہوم ہے جس کے سمجھنے کے لیے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یعنی علامت، اشارہ، راہنمائی۔ خَلْقٌ کے معنی ہیں مختلف عناصر میں نئی نئی تراکیب سے نئی نئی چیزوں کو پیدا کرنا۔ خَلْقٌ پیدائش کا یہ وہ مرحلہ ہے جب اشیاء بالعموم اپنی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اشیاء کے اس طرح وجود میں آنے سے پہلے بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے جب یہ ہنوز تدبیری حالت (In the Process of Becoming) میں ہوتی ہیں۔ یہ ''تدبیری مرحلہ'' عالم امر سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ کائنات میں ایک تو اشیائے کائنات ہیں (مثلاً سورج، چاند، ستارے، زمین، درخت وغیرہ) اور دوسرے وہ قانون ہے جس کے مطابق یہ تمام اشیائے کائنات ایک نظم و ضبط کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ اس قانون کو بھی اَمْرٌ کہتے ہیں۔

اشیاء کی ''تدبیری حالت'' کے متعلق قرآن کریم میں ہے: اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (2/117)

''جب وہ ایک تدبیر (امر) کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس امر سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔'' یہ امر کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح متشکل ہوتا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمارا علم محسوسات کی دنیا تک محدود ہے اور یہ امور عالم محسوسات سے آگے کی باتیں ہیں۔ مشہور مفکر (Pringle Pattison) کہتا ہے کہ یہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے جس میں تخلیق کے لیے صرف ایک لفظ (Creation) ہے۔ حالانکہ محسوس کائنات کی تخلیق اور غیر مرئی و غیر محسوس کی تخلیق میں قرآن نے اس کے لیے خلق اور امر الگ الگ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

امر کا دوسرا حصہ جس سے مفہوم وہ قانونِ خداوندی ہے جو کائنات کے رگ و پے میں کارفرما ہے، ہمارے سامنے ہے اور اس کے متعلق ہم علم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی صرف اس حد تک کہ فلاں چیز کس قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ وہ قانون ایسا کیوں ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ یہ اس کا قانون ہے۔ لیکن پانی کو کیوں ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اَمْرٌ (یعنی قانونِ کائنات) کی شہادتوں سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ (7/54) سورج، چاند، ستارے خدا کے امر (قانون) کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (22/65) کشتی سمندر میں اس کے امر (قانون) کے مطابق چلتی ہے۔ آیت (34/11) میں اِذْنٌ اور اَمْرٌ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی کائنات (Physical World) میں تمام اشیاء ایک خاص قانون کے تحت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ہر نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے اسی طرح انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی (اقوام کا) عروج و زوال اور زندگی اور ہلاکت ایک خاص قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ یہ مکافاتِ عمل کا قانون ہے اور اسے بھی اَمْرٌ ہی کہا گیا ہے۔ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (8/42) ''(یہ سب اس لیے ہے کہ) خدا کا امر پورا ہو کر رہے۔ یعنی جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کے مطابق زندہ رہے۔'' یہ امر (قانون مکافاتِ عمل) وہ ہے جس کی نتیجہ خیزی میں کسی انسان کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کوئی انسان اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ رسول بھی نہیں۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (3/127) ''اے رسول تجھے اس قانون میں کوئی دخل نہیں۔'' یہ امر (قانون) جس کا تعلق انسانی اعمال سے ہے وحی کے ذریعے (رسولوں) کو ملتا ہے اور ان کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ (45/17) ''اور ہم نے انہیں امر کی واضح باتیں دیں۔'' یا ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ (65/5) ''یہ خدا کا امر (قانون) ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔''

لہٰذا خدا کے امر کے تین گوشے ہیں۔ گوشۂ اول میں خدا اپنے ارادے اور مشیت کے مطابق جس طرح کا قانون چاہتا ہے مرتب کرتا ہے۔ گوشۂ دوم میں خدا اپنی سکیم کو اپنے مرتب فرمودہ قوانین کے مطابق چلاتا ہے اور اشیائے کائنات اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ گوشۂ سوم میں خدا کا قانون وحی کے ذریعہ ملتا ہے لیکن انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو

اس کی اطاعت کریں اور جی چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کرلیں۔جس قسم کی روش انسان اختیار کرے گا اسی کے مطابق نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ خدا کا امر (قانون) خارجی کائنات سے متعلق ہو یا انسانی زندگی سے، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ یہ بھی خدا کا فیصلہ ہے۔

امم

اَلْاُمِّیُّ ایک ایسا لفظ ہے جس کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔اس کے بنیادی معنی ہیں ایسا شخص جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو (جیسا ماں نے جنا تھا ویسا ہی رہے۔اسے مادرزاد بھی کہتے ہیں) اور لکھنا پڑھنا نہ سیکھے۔ نبی اکرم ﷺ کو اسی اعتبار سے اُمّیؐ کہا جاتا ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔لیکن یہ چیز زمانہ قبل از نبوت کی بات ہے۔ نبوت کے بعد آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس کی واضح شہادت خود قرآن کریم میں موجود ہے۔سورہ عنکبوت میں ہے: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (العنکبوت:48) ''تو اس (قرآن کے نزول) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا۔'' اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن سے پہلے آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔لیکن نزول قرآن کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔اس لیے قرآن نے مِنْ قَبْلِهٖ کی تخصیص کردی۔

اُمّیؐ کے معنی اُمُّ القُرٰی (مکہ) کا باشندہ بھی ہیں۔جیسے حضرمی، حضرموت کے رہنے والے کو کہتے ہیں۔

امن

قرآن کی رو سے پانچ[1] بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر ایمان لانے سے انسان مومن ہو جاتا ہے۔سورہ بقرہ میں ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ:177) ''کشادگی کی راہ اس کی ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، ملائکہ پر، کتب پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔'' ان کا (یا ان میں سے کسی ایک کا) انکار کفر ہے۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (النساء:136) ''جو اللہ سے اور اس کے ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخرت سے انکار کرتا ہے تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل جاتا ہے۔'' اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اس کی ہستی پر یقین، اس کی ہر بات پر اعتماد، اس کے قوانین پر پورا پورا اعتماد اور ان کی اطاعت کا اقرار۔ یوم آخرت پر ایمان کے معنی ہیں خدا کے قانون مکافات عمل کی محکمیت پر یقین اور اعتماد۔اور موت کے بعد تسلسل حیات پر یقین۔ ملائکہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ ملکوتی قوتیں نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہیں اور خدا نے انہیں

---

[1] گویا مسلمان ہونے کے لیے قرآن کریم کی رو سے (2/285) پانچ باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے: (1) اللہ پر، (2) اس کی طرف سے انبیاء کو بھیجی ہوئی کتابوں پر (انجیل، قرآن وغیرہ)، (3) رسولوں پر، (4) ملائکہ پر اور (5) آخرت پر

انسان کے سامنے جھکا دیا ہے، مسخر کر دیا ہے۔ اس لیے ان میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے سامنے انسان جھکے۔ انبیاء پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان، تنہا عقل کی رو سے شاہراہ زندگی پر چلنے کی راہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ راہنمائی وحی کی رو سے ملتی ہے اور وحی ہر فرد کو براہ راست نہیں ملتی بلکہ خدا کے منتخب کردہ افراد کی وساطت سے ملتی ہے، جنہیں انبیاء کہا جاتا ہے۔ وحی کا یہ سلسلہ نبی اکرم ﷺ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ کتابوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ ضابطہ حیات وحی کی رو سے ملا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منزل تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔ چونکہ نزولِ قرآن کے بعد کوئی اور کتاب ضابطۂ حیات نہیں بن سکتی اس لیے نبوت پر ایمان لانے کی عملی شہادت اس نبی کی کتاب کو ضابطۂ زندگی بنانا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہود و نصاریٰ وغیر کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ تو پہلے ہی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے انہیں ''مومن'' ہونے کے لئے نئے سرے سے ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ ان سے واضح طور پر کہہ دیا کہ جب تک ان تمام امور پر اس طرح ایمان نہ لایا جائے جس طرح قرآن نے بتایا ہے (یعنی ان کی جو تشریحات قرآن نے بیان کی ہیں انہیں اُسی طرح نہ مانا جائے) کسی کے (بزعم خویش) ایمان کو ایمان نہیں کہا جائے گا۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (البقرہ: 137)۔ ''اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ لوگ صحیح راستے پر ہیں''۔ ایمان وہی ایمان ہے جو قرآن کے مطابق ہے اور عمل وہی صالح ہے جسے قرآن صالح قرار دے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے بنایا ہے اور اس کا قانون اس میں کارفرما ہے، لیکن اپنی زندگی (یا انسانی معاملات) میں خدا کی راہ نمائی (وحی) کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو وہ مومن قرار نہیں دیتا اس لئے کہ مومن کے معانی صرف یہی نہیں کہ وہ خدا کی ہستی پر ایمان رکھتا ہو۔ مومن وہ ہے جو وحی پر بھی ایمان رکھے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔

قرآن نے خدا کو اَلْمُؤْمِنُ (23/59) کہا ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام کائنات کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور جو اس کے قانون پر بھروسہ کرتا ہے وہ اسے تخریبی قوتوں کی تباہیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس عتبار سے بندہ مومن وہ ہوگا جس پر تمام انسان اعتماد اور بھروسہ کر سکیں اور جو تمام دنیا میں امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہو۔

انس

قرآن کا خدا بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ (الناس: 3-1) ہے۔ اور خود قرآن بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (الجاثیہ: 20) اس لیے یہ دعوت بلا حدودِ زمان و مکان، تمام نوع انسان کے لیے اور خدا کی ربوبیت، ربوبیت عالمینی ہے۔

اہل

بے شک قرآن کریم قرابت اور رشتہ داری کو اہمیت دیتا ہے لیکن اس کے نزدیک انسانوں کی بنیادی تقسیم کا ایک ہی معیار ہے۔ یعنی کفر اور ایمان (Ideology)۔ جو لوگ ایک دین کے رشتہ میں پروئے جائیں، وہ ایک گروہ، جماعت اور قوم کے افراد۔ لہٰذا اپنے۔ جو اس رشتہ سے باہر ہوں، وہ دوسری جماعت اور قوم سے متعلق۔ لہٰذا بیگانے۔ ان اپنوں میں سے جو قرابت دار ہوں وہ اس قرابت داری کی بنا پر قریبی ہو جاتے ہیں لیکن اگر قرابت دار، دین میں مشترک نہ ہوں تو وہ اپنوں میں سے نہیں رہتے۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے حضرت نوحؑ پر یہ کہہ کر منکشف کیا گیا کہ تمہارا بیٹا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (ھود:46) وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ھود:46) اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ اس سے پہلے بتا دیا گیا کہ وہ بیٹا جماعت مومنین میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ (ھود:42) لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کا باپ ہو یا حضرت نوحؑ کا بیٹا، حضرت لوطؑ کی بیوی ہو یا نبی اکرم ﷺ کے قریب ترین رشتہ دار (مثلاً چچا) اگر وہ دین کے رشتہ میں منسلک نہیں ہوتے تو وہ اَهْلٌ میں سے نہیں ہو سکتے۔ اہل کی امتیازی خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ اس جماعت کے افراد ہوں گے جو قرآن کے نظام ربوبیت کی حامل ہوگی، یعنی جن کے ذمہ نوع انسانی کی پرورش کا اہم فریضہ ہوگا۔

اوب

حضرت ایوبؑ کے متعلق ہے: اِنَّهٗ اَوَّابٌ (38/44) یعنی بڑی تیزی سے قانونِ خداوندی کی طرف دوڑنے والا۔ اطاعت گزار۔ انہی معنی میں حضرت داؤدؑ کی قوم کے سرداروں سے کہا گیا ہے: يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ (34/11) داؤد کے ساتھ تم بھی نہایت سرگرمی سے قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ (لفظی اعتبار سے يٰجِبَالُ کے معنی ہیں ''اے پہاڑو'' لیکن اس کے مجازی معنی سردارانِ قوم ہیں۔)

اول

قرآن میں خدا کے لیے الْاَوَّلُ (57/3) آیا ہے۔ اس سے اس کی وہ لامحدودیت (Infinity) مراد ہے جس کا احاطہ ذہن انسانی نہیں کر سکتا۔

قرآن میں ''تاویل'' کا لفظ بات کے آخری نتیجہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ انجام کار، مآل کار۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (4/59) ''یہ روش سب سے بہتر ہے اور اس کا نتیجہ نہایت عمدہ نکلے گا۔'' هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ (7/53) اب انہیں صرف اس کا انتظار ہے کہ اس کتاب کے دعاوی کی صداقت ان کے سامنے آ جائے۔ یعنی اس کتاب نے ان کے

اعمال کے جونتائج بتائے تھے وہ ان کے سامنے آجائیں۔حضرت موسیٰؑ اوران کے ہم سفر بزرگ کے قصے کے آخر میں ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا (18/78) یعنی میں اب تجھے ان باتوں کی حقیقت کی خبر دیتا ہوں جسے معلوم کرنے کے لیے تو اس قدر مضطرب و بے قرار تھا۔حضرت یوسفؑ کے متعلق حضرت یعقوبؑ نے کہا تھا کہ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (12/6) خدا تجھے ایسی بصیرت وفراست عطا کرے گا کہ تو بات سن کرفوراًاس کی تہہ تک پہنچ جایا کرے گا۔تمہاری فراست کی یہ کیفیت ہوگی کہ

خارے دید و احوال چمن گفت

خواب کی تعبیر کوبھی اسی لیے ''تاویل'' کہتے ہیں (12/36) کہ اس سے انسان خواب کے مبہم اشارات سے اس کی حقیقت کا اندازہ لگا لیتا ہے۔

قرآن کریم میں آیاتِ متشابہات کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ (آل عمران: 7) یعنی یہ بات کہ فلاں تشبیہ اور مثال سے اصلی مقصود کیا ہے، اس کا علم خدا کو ہوتا ہے یا ان لوگوں کو جو علم میں پختگی حاصل کرتے رہتے ہیں۔اگر اس آیت میں ''جبال'' کے حقیقی معنی (پہاڑ) لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت داوٗدؑ پہاڑوں سے وہ کام لیتے تھے جن کے لیے فطرت نے انہیں بنایا ہے۔حفاظت کا کام، جنگلات اگانے اور لکڑی حاصل کرنے کا کام، معدنیات نکالنے اور پتھروں کو مختلف مصارف میں لانے کا کام وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھی پہاڑوں کی طرف قانونِ خداوندی کے مطابق اطاعت۔

ای م

قرآن کریم میں ہے وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ (النور:32) جو تم میں مجرّد ہوں (خواہ عورتیں، خواہ مرد۔غیر شادی شدہ ہوں یا رنڈوے مرد اور بیوہ عورتیں اس میں سب شامل ہیں) ان کی شادیاں کردیا کرو۔اس سے واضح ہے کہ اسلامی معاشرہ کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ایسے حالات اور سہولتیں پیدا کرے جن میں افرادِ معاشرہ ازدواجی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوجائیں۔

ای ی

خدا کی ذات، انسانی ادراک کے احاطہ کے اندر نہیں آسکتی۔لہٰذا اس کے متعلق ان ظاہری علامات ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔اس لیے یہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء آیات اللہ ہیں۔یہ وہ نشاناتِ راہ ہیں جس سے ہم اس ''منزل'' کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔انسانوں کی دنیا میں وحی، خدا کی سب سے بڑی نشانی ہوتی ہے اس لیے یہ

بھی آیات اللہ ہے۔قرآن کریم کے ہرٹکڑے کوآیَۃٌ کہتے ہیں۔اس اعتبار سے پیغام (رِسَالَۃٌ) کوبھی آیَۃٌ کہتے ہیں۔حتیٰ کہ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم قانون خداوندی کا احترام کرتے ہو یانہیں، میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس اونٹنی کو کھلا چھوڑ تا ہوں۔اگر تم نے اس کی باری پر اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم قانونِ خداوندی کا پاس رکھتے ہو اور اگر تم نے اسے روکا تو یہ علامت ہوگی کہ تم اس قانون کا کوئی پاس نہیں کرتے۔اس اعتبار سے اونٹنی کو آیَۃٌ کہا گیا۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (الاعراف:73)''یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے۔''اسی طرح حضرت نوحؑ کی کشتی کو بھی اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (العنکبوت:15) کہا گیا ہے۔کیونکہ وہ اس غیر مرئی حقیقت کی نشانی تھی کہ جو قوم قانون خداوندی کا اتباع کرے گی وہ خطرات سے محفوظ رہے گی۔مختصراً یہ کہ ہر وہ محسوس شے جو انسان کی توجہ کو خدا اور اس کے قانون کی طرف منعطف کردے آیَۃُ اللّٰہ ہے۔

''ٹھہر کرغور وفکر کرنے'' کی خصوصیت سے آیۃ کے مفہوم پر بڑی بلیغ روشنی پڑتی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں ہر ایک آیَۃُ اللّٰہ ہے لیکن یہ اسی کے لیے آیت ثابت ہوسکتی ہے جو ان پر ٹھہر کر، رک کر غور وفکر کرے گا۔اس غور وفکر سے اس کی توجہ ان اشیاء کے خالق کی طرف منعطف ہوجائے گی۔اسی طرح قرآن کریم کی آیات پر بھی رک کر، غور و فکر سے انسان اصل مقصود کو پاسکتا ہے۔اگر کسی آیت پر رک کر، غور وفکر نہ کیا جائے تو وہ انسان کو اصل وغایت کا پتہ نشان نہیں دے سکتی۔یعنی وہ حقیقی معنوں میں ''آیت''، نہیں بنتی۔

ب خ ع

قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کے متعلق ہے فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ (الکہف:6)''تو اس غم میں (کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے) اپنے آپ کو ہلاک کردے گا۔''غور کیجئے کہ ایک داعی الی الحق، طبیب مشفق کی طرح کس قدر غمگسار اور بہی خواہ ہوتا ہے۔

ب خ ل

قرآن کریم میں ہے الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔۔۔ (النساء:37)''وہ لوگ جو (رزق) کو روک رکھتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیتے ہیں کہ وہ (سامانِ زیست کو) روک کر رکھ لیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہوتا ہے اسے چھپاتے ہیں۔''قرآن کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان پوری محنت سے کمائی کرے۔پھر اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے لیے لے اور باقی سب کچھ نوع انسانی کی ربوبیت کے لے کھلا رکھ دے۔بخل اس تعلیم کی عین ضد ہے جس میں انسان سب کچھ اپنے لیے روک رکھتا ہے اور

دوسروں کی پرورش کے لیے نہیں دیتا۔ اس طرح وہ معاشرہ کی ہمواریوں اور خوشگواریوں کی عملاً تکذیب کرتا ہے (92/6-9)۔قرآن کریم انفاق کی تاکید اور بخل کی مذمت کو مختلف انداز میں پیش کرتا ہے۔اپنی محنت کی کمائی کو، خدا کے قانون کے مطابق،نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لیے کھلا رکھنا اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔یہی تقویٰ ہے(92/18)۔اسی سے دنیا کی مشکلات حل ہوتی ہیں اوراسی سے انسان کی مستقبل کی زندگی (آخرت) سنورتی ہے۔قرآن کریم واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جوقوم بخل کی روش اختیار کرلیتی ہے اسے بساطِ زندگی سے الگ کردیا جاتا ہے اوراس کی جگہ دوسری قوم آجاتی ہے جواس قوم جیسی نہیں ہوتی(47/38)۔اس لیے کہ خدا کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد:17)''دنیا میں بقاءاسی کے لیے ہے جونوع انسانی کے لیے منفعت بخش ہے۔''

ب د ع

کائنات کوعدم سے وجود میں لانا تو صرف خدا کے لیے ہے،لیکن اس کائنات میں نئی نئی چیزیں دریافت کرنا اور ایجاد کرنا انسان میں صفت خداوندی کا منعکس ہونا ہے اور وجہ شرفِ انسانیت۔اس شرط کے ساتھ کہ ان ایجادات کو قانون خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی تعمیر میں صرف کیا جائے، نہ کہ تخریب کے لیے۔لیکن یہ ایجادات طبیعی دنیا کے اندر ہوں گی۔خدا کے قوانین جونوع انسانی کی راہنمائی کے لیے (قرآن کے اندر) ہیں ان میں سے کسی نئے قانون کو شامل نہیں کیا جائے گا۔اس لیے کہ یہ قوانین عقل کی رو سے وضع نہیں کیے جاسکتے،صرف وحی کی رو سے مل سکتے ہیں۔اور وحی، قرآن کریم کے اندر پہنچ کر مکمل ہوچکی ہے۔دین میں اپنی طرف سے کسی قسم کا اضافہ جائز نہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رہبانیت کو بدعت کہہ کراس کی مذمت کی ہے(57/27)۔البتہ دین کے غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین مرتب کیے جاسکتے ہیں۔

ب د ن

قرآن کریم میں فرعون کے متعلق ہے کہ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ(یونس:92)۔''آج ہم تیرے بدن (لاش) کو محفوظ کردیں گے۔''مصر میں رواج تھا کہ وہ بڑے بڑے لوگوں کی لاشوں کو ممی بنا کر محفوظ کرلیتے تھے۔چنانچہ فراعنہ مصر کے قدیم مقبروں سے اس قسم کی بہت سی ممی شدہ لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔جس فرعون نے حضرت موسیٰؑ کا پیچھا کیا تھا وہ پانی میں غرق ہوگیا تھا۔اس لیے اس طرف خیال جاتا تھا کہ اس کی لاش ضائع ہوگئی ہوگی۔لیکن قرآن نے آج سے قریباً1400 سو برس پہلے بتادیا کہ اس کی لاش بھی موجود ہے۔دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔

ب ذر

قرآن کریم میں ہے وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ○ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (بنی اسرائیل:27-26) ''تم مال کو بے جا صرف مت کرو۔اس طرح مال کوضائع کرنے والے لوگ شیاطین کے بھائی ہیں۔''

ب رأ

خدا کو اَلْبَارِئُ کہا گیا ہے (89/24)۔اس میں درحقیقت تخلیق اشیاء کے تین مراحل میں سے ایک مرحلہ کا ذکر ہے۔ یعنی اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (الحشر:24)۔کائنات میں تمام عناصر باہمی ملے جلے رہتے ہیں۔اللہ کے سامنے جب کسی نئی چیز کی پیدائش کی تدبیر (اسکیم) ہوتی ہے تو وہ مختلف عناصر کو ایک نئی ترتیب دیتا ہے۔یہ خَلْقٌ ہے پھر انہیں باقی عناصر سے الگ کرتا ہے۔یہ بَرْأَةٌ ہے اوراس کے بعد انہیں ایک متعین شکل (Form) عطا کر دیتا ہے، یہ مُصَوَّرِیَّتْ ہے۔اس اعتبار سے وہ خالق، باری اور مصور کہلاتا ہے۔

ب رج

اس انداز کی نمائش جو مردوں کے جذبات کے مشتعل ہونے کا سبب بن جائے۔دراصل ابریج بلونی یا مشک کو کہتے ہیں جس میں دودھ بلو کر اس سے مکھن نکالا جاتا ہے۔لہٰذا تَبَرُّجْ کے معنی ہیں حسن اور زینت کی اس انداز کی نمائش کہ عورت کی آنکھوں میں شوخی جھلک رہی ہو اور اس سے مردوں کے جذبات متحرک اور مشتعل ہوجائیں۔ایسی نمود ونمائش جو مردوں کے سینوں میں (بلونی کی طرح) تلاطم برپا کردیں۔اس کی ممانعت ہے۔جنسی جذبات ازخود بیدار نہیں ہوتے انسانی خیالات انہیں بیدار اور مشتعل کرتے ہیں۔لہٰذا قرآن کریم ان تمام محرکات کو روکتا ہے جن سے ان جذبات میں انگیخت پیدا ہو۔اس نے مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاط (میل جول) کے لیے جو حدود مقرر کیے ہیں ان سے یہی مقصود ہے۔

ب رد

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں ہے يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیاء:69) ''اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوجا۔'' یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مخالفین نے ابراہیم کے خلاف تدبیریں اور سازشیں شروع کیں اور آمادہ بہ فساد ہوگئے لیکن ہم نے ان سے ان کی شعلہ سامانیوں سے محفوظ رکھا اور خیریت سے نکال کر دوسرے ملک میں لے گئے۔فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (العنکبوت:24) ''انہوں نے اسے زندہ جلا دینے تک کی بھی ٹھان لی۔لیکن ہم نے ان کی تدبیروں کو ناکام بنادیا اور ابراہیمؑ کو صحیح وسلامت بچا کر لے گئے۔'' (37/97-99)۔وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ

الْاَخْسَرِیْنَ (الانبیاء:70)''انہوں نے اس کے خلاف سازش کا ارادہ کیا لیکن ہم نے انہیں ناکام بنا دیا۔'' یعنی ان کا ارادہ کامیاب نہ ہوسکا۔ حضرت ابراہیمؑ بحفاظت وہاں سے نکل کر دوسرے ملک میں چلے گئے (37/99؛21/71؛29/26) ان مقامات سے ظاہر ہے کہ یہاں آگ سے مراد ان لوگوں کی آتش انتقام تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈا کر دیا تھا اور وہ اپنی سازش میں ناکام رہ گئے تھے۔

ب ر ر

قرآن کی رو سے ''نیک کام'' (بِرٌّ) وہ ہوں گے جن سے کشادگی راہیں کھل جائیں۔ جن سے انفرادی طور پر نگاہ میں فراخی، قلب میں کشادگی اور انسانی ذات میں وسعت پیدا ہوجائے۔ اور اجتماعی طور پر سامان زیست میں کثرت اور وسعت آجائے اور معاملات میں فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا جائے۔ بِرٌّ اور تقویٰ کے الفاظ اسی لیے اکٹھے آئے ہیں (مثلاً 2/224؛ 5/2) کیونکہ تقویٰ (قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے) سے انسان سے تنگ نظری دور ہوجاتی ہے اور کشادہ ظرفی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی عزیز ترین متاع (مال و دولت حتیٰ کہ جان تک کو) قوانینِ خداوندی کے مطابق، نوع انسانی کی ربوبیت کے لیے کھلا رکھے۔ چنانچہ ارشاد ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران:92) ''جب تک تم ان چیزوں کو جو تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہیں (نوع انسان کی ربوبیت کے لیے) کھلا نہیں رکھو گے تمہیں کشادگی اور وسعت نصیب نہیں ہوسکے گی۔'' جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ''مذہبی شعائر'' کو رسمی طور پر ادا کر لینے کا نام بر (نیکی) ہے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ۔۔۔(البقرہ :177) کشادگی راہ یہ نہیں (تم معیارِ خداوندی پر اس طرح پورے نہیں اتر سکتے) کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی راہ یہ ہے کہ تم ایمان کے بعد اپنے مال کو اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود ضرورت مندوں کے لیے دے دو۔

نیک آدمی عام طور پر اسے کہا جاتا ہے جو برائیوں سے بچے۔ لیکن برائیوں سے بچنا سلبی پہلو (Negative Aspect) ہے۔ قرآن کریم اس کے ساتھ مثبت جوہروں (Positive Virtues) کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ بنابریں جس فرد میں کشادہ نگہی اور فراخ حوصلگی نہیں اور جس قوم کو ربوبیت کا سامان وسعت و کثرت کے ساتھ نصیب نہیں اور وہ اسی وسعت و کشادگی کے ساتھ نوع انسانی کی نشوونما کے لیے صرف نہیں کرتی، وہ قرآن کی رو سے حامل بِرٌّ (نیک) نہیں ہوسکتی۔

برزخ

سورہ مومنون میں ہے کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار اگر تو مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تو میں ضرور اعمال صالحہ کروں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کے کہنے کی باتیں ہیں۔ مرنے کے بعد کوئی اس دنیا

میں واپس نہیں آ سکتا۔ وَ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ (23/99-100)۔ ''ان کے پیچھے ایک روک ہے یوم بعث تک۔''

ب ر ص

قرآن کریم نے اخلاقی ذمائم کو بیماریوں سے تشبیہ دی ہے۔ کہیں ایسے لوگوں کو بہرے، گونگے، اندھے (صُمٌّ، بُكۡمٌ، عُمۡیٌ ؛2/17) کہہ کر پکارا ہے۔ کہیں کہا ہے کہ ''ان کے دلوں میں روگ ہے'' (فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ :2/10)۔ حتیٰ کہ انہیں مردہ (27/80) بھی کہا گیا ہے۔ اسی اعتبار سے آسمانی تعلیم کو ھُدًی وَّ شِفَآءٌ (41/44) ''ہدایت اور شفاء'' اور شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10/57) ''جو کچھ سینوں میں ہے اس کے لیے شفاء کہا گیا ہے۔ حضرات انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد اور زندگی کا مشن جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں ہوتا۔ حضرت عیسیٰ کے الۡاَكۡمَہَ (اندھے) کو بینائی عطا کرنے اور الۡاَبۡرَصَ (کوڑھی) کو اچھا کرنے سے بھی یہی مراد ہے۔ یہ الفاظ بطورِ استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔

ب ر ک

بَرَکَۃٌ کے معنی ثبات۔ استحکام۔ نشوونما۔ ہر قسم کا خیر اور فلاح ہیں۔ لیکن یہ چیزیں متعلقہ اسباب کے ذریعے ملتی ہیں اس لئے مجازاً خود ان اسبابِ خیر کو بھی بَرَکَۃٌ کہا جائے گا۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ ایمان وتقوی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کو بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ (7/96) ملتی ہیں۔ یعنی تمام استحکام بخش اسبابِ حیات کی کثرت وفراوانی۔ آسمانی راہ نمائی بھی اور معاشی سہولتیں بھی۔ اور قرآن کریم کو بھی كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ اِلَیۡکَ مُبٰرَکٌ (29-38) یعنی وہ ضابطہ حیات جس میں ایسے اصول وقوانین ہیں جو دائمی خیر وفلاح کا موجب ہیں۔ جن سے انسان کا ثبات واستحکام اور نشوونما وابستہ ہے۔ اور اُس لیل کو بھی مُبٰرَکٌ کہا جس میں یہ نازل ہوا (2-44)۔ مکہ کو (جو قرآن کے نظام ربوبیت کا مرکز ہے) مُبٰرَکٌ کہا (3-95)۔ خود خدا بھی اپنی ربوبیت عالمینی کی وجہ سے مُبٰرَکٌ ہے تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ (7/54) یعنی وہ سرچشمہ جہاں سے تمام نوع انسانی کو سامانِ ثبات ونشوونما مل جائے۔ لہٰذا جو قوم اس کے قانون کے مطابق نظام قائم کرے اسے بھی اِسی طرح تمام عالمِ انسانیت کے لئے موجب برکات ہونا چاہیے۔

ب ر ہ

قرآن کریم نے اپنے آپ کو بُرۡھَانٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (4/175) کہا ہے۔ ''تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل''۔ اس لئے کہ اس کا ہر دعویٰ دلیل وبرہان پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بھی دلیل وبرہان ہی کا مطالبہ کرتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ ھَاتُوۡا بُرۡھَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (2/111)۔ ''اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلیل پیش

کرو،،۔ اسے اپنے دعوے کی صداقت پر اس قدر یقین ہے کہ اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیتا ہے کہ تمہارے پاس کوئی دلیل قاطع نہیں ہوسکتی۔ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ (23/117)۔ ''کسی کے پاس شرک کی تائید میں دلیل نہیں ہوسکتی''۔ ①

مذہب کو (جسے ہمیشہ عقل کا حریف اور دلیل کا دشمن سمجھا جاتا تھا) علم و عقل اور دلیل و برھان کی رو سے پیش کرنا اور منوانا، قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہے۔ وہ اپنے ہر دعوے کو علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔

ب س ط

قرآن کریم میں حضرت طالوت کے متعلق ہے کہ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ (2/247) اس کے عام معنی یہ ہیں کہ اسے علم اور جسمانی قوت بہت زیادہ دی ہے۔ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تم اپنی قوتوں کو اپنی ذاتی منفعت کے لئے صرف کرتے ہو لیکن طالوت اپنے علم اور توانائی سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اسے ہم نے تمہارے اوپر کمان کے لئے منتخب کیا ہے۔ کمانڈر ہونے کے لیے جسمانی اور دماغی دونوں قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس خصوصیت کی بھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔

ب ش ر

قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ جہاں یہ کہتے ہیں کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (میں بھی تمہارے جیسا بَشَر ہوں) تو اس سے بشریت کے طبعی تقاضوں کا اشتراک مقصود ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ مومنون میں ہے (33:23)

> انہوں نے کہا کہ ''یہ رسول تمہارے جیسا ایک بشر ہی ہے۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے، جو تم پیتے ہو، وہی یہ پیتا ہے۔ یعنی اگر اس وحی کو الگ کر لیا جائے جو اسے خدا کی طرف سے ملتی ہے تو نبی کی طبعی خلقت عام انسانوں کی سی ہوتی ہے۔ لیکن نبوت (خدا کی طرف سے وحی پانا) ایسی خصوصیت نہیں تھی جسے ہر انسان اپنے کسب و ہنر سے حاصل کر سکتا۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ نبی کی بشری حیثیت موت سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی نبوت (وحی) آگے چلتی ہے۔

ب ص ر

قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ اگر عقل و بصیرت سے وحی کی روشنی میں کام نہ لیا جائے تو وہ افراد یا اقوام کو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ذرا دیکھئے کہ عقل کرتی کیا ہے۔ انسان اپنے ساتھ حیوانی جذبات (Animal Instincts) لے کر

---

① قرآن نے دین عطا کیا ہے۔ مذہب کا لفظ قرآن میں نہیں ہے۔ ہم نے یہ لفظ عام استعمال کے پیش نظر لکھ دیا ہے۔ ورنہ اسلام کو الدین کہنا چاہیے۔ یعنی خدا کا مقرر کردہ ضابطہ، حیات، طریق زندگی، نظام معاشرہ۔

پیدا ہوتا ہے۔ یہی جذبات اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات (Desires) پیدا کرتے ہیں۔ اگر اس کی عقل خام، اور جذبات غالب ہیں تو عقل اس خواہش کے جواز کے لیے دلائل (Justificatory Reasons) تراشے گی اور اس کے حصول کے لیے طرح طرح کی تدابیر سوچے گی۔ اس طرح وہ خواہش (Desires)، تمنا (Wish) بن جائے گی۔ اور جب انسان آخری فیصلے کے بعد اس کے حصول پر تُل جائے گا تو وہ ارادہ (Will) ہو جائے گی۔ اس صورت میں انسانی عقل اس کی خواہشات یا جذبات کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوگی۔

اگر عقل ذرا پختہ ہے، تو وہ اس انسان کو سمجھائے گی کہ اس خواہش (جذبہ) کے پورا کرنے میں تمہارا کتنا بڑا نقصان ہے۔ یعنی عقل زیادہ سے زیادہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل، خیر و شر میں تمیز کر ہی نہیں سکتی۔ یہ تمیز صرف وحی کے ذریعے ہوتی ہے جو نوعِ انسانی کے عالمگیر نفع نقصان، اور انسانی ذات کے ضعف وقوت کے لیے حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے۔ اس لیے، انسان تباہی سے اسی صورت میں بچ سکتا ہے جب وہ عقل و بصیرت سے وحی کی روشنی میں کام لے۔ [1]

آج دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ قومیں جو تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل و علم کو وحی کے تابع نہیں رکھتیں۔ اور ہم اس لیے ذلیل وخوار ہو رہے ہیں کہ ہم نہ وحی سے مستفید ہوتے ہیں، نہ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

ب ط ل

بَاطِلٌ ان چیزوں کو کہتے ہیں کہ جن مفادات و مقاصد کے لئے وہ بنائی گئی تھیں ان میں وہ مفادات مِنْ كُلِّ وَجْهٍ (پوری طرح) باقی نہ رہیں اور ان کی صرف صورت باقی رہ جائے۔

اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے مذہب کے وہ تمام اعمال باطل قرار پا جاتے ہیں۔ جنہیں محض رسماً ادا کیا جائے اور ان سے وہ فائدے حاصل نہ ہو رہے ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔

حق پر عمل پیرا ہونے کا لازمی نتیجہ نعمائے حیات کا ملنا ہے۔ اور جہاں نعماء نہ ہوں ظاہر ہے وہاں حق نہیں باطل کارفرما ہے، خواہ ہم اپنے ذہن میں اسے کیسا ہی حق کیوں نہ سمجھ لیں۔

قرآن میں ہے جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (81:17) حق آ گیا اور باطل تباہ ہو گیا۔'' باطل کہتے ہی اسے ہیں جو باقی رہنے والا نہ ہو۔ لہٰذا باطل کو مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے والے پروگرام

[1] غلام احمد پرویز مرحوم ومغفور نے درسِ قرآن دیتے ہوئے فرمایا جذبات، عقل کے تابع رہیں اور عقل قرآن کے مطابق عمل کرے تو انسانی زندگی ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ سکتی ہے۔ (منظور الحسن، صاحب کتاب)

(حق) کوعمل میں لایا جائے۔تعمیری کوششیں کی جائیں۔ان کے محکم نتائج سے تخریبی اور بیکار کوششیں خود بخود مٹ جائیں گی۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (114:11) ہمواریوں اور خوشگواریوں سے ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں خود بخود مٹ جاتی ہیں۔

باطل کے معنوں میں لکھا گیا ہے کہ یہ ایسی کوشش کا نام ہے جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا میں ایسے کام بھی ہیں جو بلانتیجہ رہ جاتے ہیں۔خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے نتیجہ تو ہر کام کا مرتب ہوتا ہے۔باطل ان کوششوں کا نام ہے جن کا نتیجہ وہ نہ نکلے جو ان سے مقصود ہو۔

ب ط ن

قرآن کریم میں اللہ کے لئے هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (57/3) آیا ہے۔جب نگاہِ بصیرت کائنات کے تخلیقی مظاہر پر غور کرے تو وہ خالق کائنات کے متعلق اندازہ کرسکتی ہے۔یعنی اس سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس مخلوق کا کوئی خالق بھی ہے اور اس محیرالعقول مشینری کے پیچھے کوئی بڑی علیم وحکیم قوت کام کر رہی ہے۔اس اعتبار سے خدا الظَّاهِرُ ہے۔لیکن وہ اپنی کنہ حقیقت کے اعتبار سے نگاہوں سے پوشیدہ ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6/103)۔''وہ نگاہوں کے ذریعے ہمارے ادراک میں نہیں آسکتا۔''اس لحاظ سے وہ الْبَاطِنُ ہے۔

یاد رکھئے، هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ سے یہ مراد لینا کہ جو کچھ کائنات میں ظاہر ہے وہ بھی خدا ہے اور جو اس کے باطن میں ہے وہ بھی خدا ہے۔یعنی ان محسوسات کے پردوں میں خدا ہے، باطل عقیدہ اور قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔اس عقیدہ کو تصوف کی اصلاح میں ''وحدت الوجود'' یا ''ہمہ اوست'' کہا جاتا ہے جو ہندوؤں کے فلسفہءویدانت کا چربہ ہے۔

ب ع ث

سورۃ تطفیف میں ہے کہ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (83:4-5) اس سورۃ میں قرآن کریم نظامِ معیشت کے ایک بنیادی اور عظیم اصول کو سامنے لایا ہے۔اس نے پہلے یہ کہا ہے کہ نظام سرمایہ داری میں ''تاجرانہ ذہنیت'' یہ ہوتی ہے کہ سرمایادار جب دوسرے سے لیتا ہے تو پورا پورا لیتا ہے اور جب (مزدور کو) دیتا ہے تو جس قدر وہ پیدا کر کے دیتا ہے، اُسے اُس سے کم دیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد ہی اس ذہنیت اور منہاج پر ہے۔لیکن خدا کا قانون یہ نہیں چاہتا۔وہ کسی کو اس سے کم نہیں دینا چاہتا جو وہ پیدا کرتا ہے۔اس سے پورے کا پورا معاشی نظام بدل جاتا ہے۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کے حامل یہ سمجھتے ہیں کہ جو نظام انہوں نے قائم کر رکھا ہے اسے کوئی بدل

نہیں سکتا۔قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ یہ نظام ضرور الٹ کر رہے گا۔اس لئے ان لوگوں کو جو یوں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے تو یہ اس انقلاب عظیم تک کے لیے ہے جس میں تمام نوع انسانی اس غلط نظام سے تنگ آ کر خدا کے نظام ربوبیت عالمینی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگی یَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6)۔نظام سرمایہ داری جو اِس طرح بے روک ٹوک (ناقہء بے زمام کی طرح) بڑھے جارہا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ تنگ آ کر، بہ ہیئت مجموعی، نظام ربوبیت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے، جس میں لینے اور دینے میں کم اور بیش کا سوال ہی نہیں ہوگا۔

يَوْمُ الْبَعْثِ یا يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۔ يَوْمِ الدِّيْنِ کی طرح قرآن کی اہم اصطلاحات ہیں جن کا صحیح مفہوم ہر مقام پر سیاق وسباق کے مطابق متعین کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی معنی ان کے حیاتِ نو یا ظہور نتائج کے وقت کے ہیں۔خواہ یہ حیاتِ نو اسی دنیا میں (قوموں کی اجتماعی موت کے بعد) ملے یا مرنے کے بعد دوسری زندگی (حیاتِ آخرت کی شکل میں)۔

ب غ ت

بَغْتَةٌ اُس انداز کو کہیں گے جس میں کوئی واقعہ تدریجی یا ارتقائی طور پر (By Evolution) نمودار نہ ہو بلکہ انقلابی طور پر (By Revolution) یا دورِ حاضر کی تحقیق کے مطابق، فجائی ارتقاء کے طریق سے (By Emergent Evolution) واقع ہو۔اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہر عمل کا نتیجہ تو اُسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے کچھ وقت کے بعد آتا ہے۔سطح بین قومیں اپنی تباہی کے اسباب کا اندازہ ان واقعات اور عناصر سے لگانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو تباہی واقع ہونے کے وقت محسوس طور پر ان کے سامنے آتے ہیں۔لیکن ان اسباب کا سراغ درحقیقت پیچھے جا کر لگانا چاہیے۔

ب غ ی

سورہ یٰس میں ہے: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (36/69) ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی ایک داعی انقلاب کی نفسیاتی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ اس پر حقائق کے مقابلہ میں جذبات غالب ہوں۔(یہی شاعر کی نفسیات ہے)۔سورہ نور میں البِغَاءُ کا لفظ زنا کاری کے لیے آیا ہے (24/33)۔لیکن سورۃ مریم میں بَغِيًّا کا لفظ حدود شکن کے لیے (19/20) آیا ہے۔خاص طور پر زنا کار کے لیے نہیں۔یعنی حضرت مریمؑ نے کہا کہ میں ہیکل میں راہبہ (Nun) کی زندگی بسر کر رہی ہوں اور راہبہ (Nun) کے متعلق ''قانون شریعت'' یہ ہے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ میں نے اس قانون کو نہیں توڑا۔ واضح رہے کہ ہیکل کے احبار و رہبان حضرت مریمؑ کے خلاف یہ الزام عائد کرتے تھے کہ اس نے ہیکل سے نکل کر متاہل زندگی اختیار کر لی ہے اور یہ چیز شریعت خانقاہیت کے خلاف ہے۔اس لیے انہوں نے کہا تھا کہ تیری ماں تو ان حدود شریعت کو نہیں توڑتی تھی (19/28)۔تو نے حدود شکنی کیسے اختیار کر لی؟ حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ یہ حدود

تمہاری خود ساختہ شریعت کی ہیں۔ مجھے اللہ نے نبی بنایا ہے اور کتاب دی ہے۔ اس کتاب میں ایسا کوئی قانون نہیں۔ اس لیے میری والدہ نے قانون خداوندی کے خلاف کچھ نہیں کیا۔

قرآن کریم میں کھانے پینے کی حرام اشیاء کے تذکرہ کے بعد فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (2:173) بھوک سے جس شخص کی جان پر آبنے تو اس پر کوئی جرم نہیں (کہ وہ ان حرام چیزوں کو استعمال کرلے) بشرطیکہ وہ اتنا لے جتنی اسے ضرورت ہے اور حد سے نہ بڑھے اور نہ ہی اس کی نیت قانون شکنی کی ہو۔ یعنی نہ وہ محض اس لئے کھائے کہ اس کا جی چاہتا ہے اور نہ ہی زائد از ضرورت لے۔

ب ق ی

کائنات میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لیکن ذاتِ خداوندی تغیرات سے بلند ہے۔ اسی طرح اس کا قانون بھی تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ یہی مستقل اقدار ہیں۔ جو اعمال اُس کے قانون کے مطابق سرزد ہوں ان کے نتائج بھی غیر متبدل ثمرات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس سے انسانی ذات میں بھی ایسا استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ وہ تغیرات سے بلند ہو جاتی ہے۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغیرات کی دنیا میں غیر متغیر رہتی ہے (Changelessness in Change)[1]۔

ب ک ک

مکہ مکرمہ کا نام بَكَّةُ بھی ہے۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا (3/95)۔ ''یقیناً پہلا گھر جو نوع انسان کے لئے مقرر کیا گیا ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت''۔ اس نام کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ لوگ اس کی طرف ہجوم کر کے آتے ہیں اور طواف میں بڑا اژدہام ہوتا ہے اس لئے اسے بَكَّةُ کہا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ یہاں سرکشوں اور ظالموں کی گردن ٹوٹ جاتی ہے اس لئے اس کا یہ نام ہے۔

ب ل س

کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ کائنات کی کسی اور شے کو معصیت (قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی) کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان، قانونِ خداوندی کی اطاعت سے سرکشی اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ جذبات اسے (عالمگیر مفاد کلی کے مقابلہ میں) ذاتی مفاد پرستی پر ابھارتے ہیں اور وہ قوانین خداوندی کو پس پشت ڈال کر ان مفادات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ پھر اس کی عقل اُسے وہ طریقے بتاتی ہے جس سے وہ ان مفادات کو حاصل

---

[1] ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں (علامہ اقبال)

کر سکے۔قرآن کریم نے ایسے جذبات اوران کے بروئے کار لانے والے سامان وذرائع،عقل حیلہ جو کے بتائے ہوئے طرق وحِیَل کو اِبْلِیسْ کہہ کر پکارا ہے۔اوراس کی سرکشی کی بنا پراس کے متعلق کہا ہے کہ اس کی تخلیق آتش (نَارٌ) سے ہوئی ہے(7:12)اور چونکہ انسانی جذبات آنکھوں سے پنہاں ہوتے ہیں اور غیر محسوس طور پر مصروف عمل رہتے ہیں اس لئے کَانَ مِنَ الْجِنِّ (18:50) کہا ہے(جِنّ کے معنی ہے چھپا ہوا)۔ نیز چونکہ انسان کے یہ جذبات اوراس کے یہ اختیارات جس کی رو سے یہ قوانین خدوندی سے سرکشی برت سکتا ہے۔انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور جب تک انسان زندہ رہتا ہے اس وقت تک یہ ساتھ رہتے ہیں،اس لیے قرآن نے جو آدم کی سرگزشت بیان کی ہے اس میں ابلیس آدم کے ساتھ ہی نمودار ہوجاتا ہے اوراسے انسانوں کے ساتھ ہی اس وقت تک مہلت دی گئی ہے جب تک انسان دنیا سے اُٹھ نہیں جاتے۔قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (15/36)۔

لیکن اگر بَعْثٌ کے مفہوم کی گہرائی پر نگاہ ڈالیے تو یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ کے معنی اور ہوں گے۔بَعْثٌ کے معنی ہیں ان موانع کو دور کردینا جو کسی کی آزادی کے راستے میں حائل ہوں۔کھلا چھوڑ دینا۔ابلیس سے کہا یہ گیا کہ تمہارا کام انسانوں کی اخلاقی بندھنوں کو توڑ کر انہیں ''مادر پدر آزاد'' کر دینا ہے۔تمہاری ضرورت اس وقت تک رہے گی جب تک انسان ان اخلاقی حدود کو توڑ کر یکسر آزاد نہ ہوجائیں۔جب وہ اس طرح آزاد ہوجائیں تو پھر ان کے لیے تمہاری ضرورت نہیں رہے گی۔اس لیے تمہیں اس وقت تک مہلت کی ضرورت ہے سو وہ مہلت تمہیں دی جاتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی بندھنوں کو ابتداً توڑنے میں کچھ دِقّت محسوس ہوتی ہے لیکن جب یہ ایک مرتبہ ٹوٹ جائیں تو پھر انسان غیر شعوری طور پر خود بخود،اس سیلاب میں بہے چلا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں ابلیس اور شیطان کو ایک ہی سکے کے دورخ،اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو بتایا گیا ہے۔مثلاً قصہء آدم میں دیکھئے۔سجدے سے انکار۔سرکشی وتکبر۔ذریت آدم کو بہکانے کا چیلنج۔سب ابلیس کی طرف سے ہے لیکن اس کے بعد جب آدم کی لغزش کا ذکر ہے تو اسے شیطان کی طرف سے منسوب کیا گیا ہے فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا (2:36) نیز دیکھئے (20:116-120/7:11-20)۔اس سے ظاہر ہے کہ ابلیس ایک خاص ذہنیت کا نام ہے اور جس انداز سے وہ ذہنیت کام کرتی ہے اُسے شیطان کہہ کر پکارا گیا ہے۔ابلیس اور شیطان (ناامیدی وسرکشی) درحقیقت وہ موانع ہیں جو انسانی خودی کی نشوونما کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔اگر انسانی خودی ان موانع پر غالب آکر اپنے استحکام کا ثبوت دیتی ہے تو سلسلہ ارتقاء میں اس کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔لیکن اگر یہ موانع اس پر غالب آجاتے ہیں تو وہ زندگی کی نچلی (حیوانی) سطح میں دب کر رہ جاتی ہے۔ زندگی درحقیقت ''ابلیس وآدم'' کی اس کشمکش کا نام ہے۔اس لئے آدم کے ساتھ ابلیس کا وجود ناگزیر ہے۔مخالفت (Opposition) اور تصادمات (Clashes) کے بغیر انسانی ذات میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔یا یوں کہئے کہ اس کی قوت

واستحکام کا امتحان (Test)[1] نہیں ہوسکتا۔ نہر کی مسلسل روانی کے لئے ٹھوکر (Fall) کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کیا ٹھوکر کے پتھر، نہر کے پانی کے لئے بند بن کر اُسے جوئے رواں سے جوہڑ بنا دیتے ہیں۔ یا نہر کا پانی اپنے زوردروں سے ان پتھروں کو پھاند کر آگے نکل جاتا ہے؟ ایسے راستے تلاش اور اختیار کرنا جن میں پتھر نہ ہوں (یعنی مسلک، رہبانیت وخانقاہیت) اپنی روانی کو اپنے ہاتھوں ختم کر لینا ہے۔ زندگی مسلسل جدوجہد (جہاد) کا نام ہے۔ یعنی ابلیس و آدم کی پیہم کشمکش کا۔

ابلیس (ناامیدی) اور شیطان (سرکشی) ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ علم النفس (Psychology) کی تحقیقاتِ حاضرہ اس نظریئے کی تائید کرتی ہیں کہ نااُمیدی (Frustration) سے سرکشی کے جذبات (Aggressiveness) پیدا ہوتے ہیں۔ جب انسان دیکھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہو رہا جو کچھ وہ چاہتا ہیں تو اس کا غصہ اُبھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس غصے کو اگر وہ خود اپنے آپ کے خلاف نکالتا ہے تو یہ پریشانی (Worry) یا افسردگی وغمگینی (Gloominess) ہوتی ہے جس کی آخری شکل خودکشی (Suicide) ہے۔ جب اس غصہ کا مظاہرہ اس شخص یا شے کے خلاف ہو جو اس کی مایوسی کا باعث تھی تو اسے انتقام کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس سے انتقام نہ لے سکے تو غیر متعلقہ چیزوں کے خلاف اپنا غصہ نکالتا ہے۔ یہ پاگل پن کی ابتدا ہوتی ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ مایوسی اور سرکشی میں کس قدر گہرا تعلق ہے یہی تعلق ابلیس اور شیطان میں ہے۔ یہ انسان کی نفسیاتی کیفیات ہیں۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں افراد کے لئے مایوسی کے موقع پیدا نہیں ہوتے۔

ب ل غ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (14/52) کہا ہے۔ یعنی وہ ذریعہ جس سے انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اور کسی ذریعہ یا سامان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا قانون کیا ہے؟ انسانیت کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانے کا کافی ذریعہ ہیں۔ لیکن یہ انہی کو منزل تک پہنچا سکتا ہے جو اس کی اطاعت اختیار کریں۔ جو اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اس لیے کہ اِنَّ فِیۡ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوۡمٍ عٰبِدِیۡنَ (21/106)''یہ اسی قوم کے لیے بلاغ ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کرے۔'' یہ چیز انسان کے اپنے اختیار پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ قرآن کی بتائی ہوئی صحیح روش پر چلے یا کسی دوسری (غلط) روش پر۔ کسی کو کسی خاص روش پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مجبور کرنا ہوتا تو خدا انسانوں کو پیدا ہی اس انداز سے کر دیتا کہ وہ اس روش کے سوا کوئی دوسری روش اختیار نہ کر سکتے، جس طرح کائنات کی دوسری چیزیں قوانین فطرت پر چلنے کے لیے مجبور ہیں۔

---

[1] علامہ اقبال نے امتحان کے عنوان سے ضربِ کلیم میں لکھا ہے:

جہاں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج

ب ل و

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ کشمکش میں زندگی کے مختلف پہلو بدل بدل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی مشقتوں کے ہمت آزما پہلو اور کبھی خوشگواریوں کے سکون افزا پہلو۔ اس طریق کو بھی قرآن نے اِبْتَلٰی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا سامنے آتے رہنا۔ سورۃ الفجر میں یہ مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ (دیکھئے 89/15-16)۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان خود دیکھ لے، پرکھ لے کہ اس کی صلاحیتیں کس حد تک نشوونما پاچکی ہیں۔ کیونکہ وہ مزاحمتوں کا مقابلہ اسی حد تک کر سکے گا جس حد تک اس کی مضمر قوتیں بیدار ہوچکی ہوں گی۔ یہ حوادث جن سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے درحقیقت اس کی نمودِ ذات کے مواقع ہوتے ہیں۔ یہ ہے مفہوم اِبْتِلَاءٌ کا۔

جسے آزمائش کہتے ہیں وہ قرآنی تصور نہیں۔ خدا کسی کو آزماتا نہیں۔ وہ ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے جس سے انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے اور دیکھے کہ وہ کس حد تک نشوونما پاچکی ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کا اندازہ کرتا ہوا اپنی صلاحیتوں کی مزید نشوونما و بالیدگی کے لیے کوشش کرتا جائے۔

بنی اسرائیل

حضرت یعقوبؑ (حضرت ابراہیمؑ کے پوتے) کا لقب اسرائیل (یعنی مردِ خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

ب ہ ل

قرآن کریم میں یہ لفظ (3/60) میں آیا ہے جہاں رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ اگر یہ اہل کتاب ان دلائل و براہین کے بعد بھی نہ مانیں تو ان سے کہو کہ ہم اور ہمارے اہل وعیال ایک طرف ہوجاتے ہیں اور تم اور تمہارے اہل وعیال ایک طرف ہوجائیں۔ (ثُمَّ نَبْتَهِلْ)۔ اور اس طرح فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (3/60) اس کے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ اس کے بعد تمہارے اور ہمارے درمیان یہ معاملہ ہونا چاہیے کہ تم ہمارے معاشرہ میں دخیل نہ ہو اور ہم تم لوگوں سے کچھ واسطہ نہ رکھیں۔ (یعنی ایک دوسرے کو اس کی فکر ورائے میں آزاد چھوڑ دیا جائے) اور طرفین اپنی اپنی جگہ اپنا پروگرام مکمل کرتے جائیں۔ اس کے بعد یہ پتہ چل جائے گا کہ کون سی جماعت خدا کی نوازشوں سے محروم (یعنی ملعون) ہوجاتی ہے، (لعنت کے یہی معنی ہیں)۔ بس وہی اپنے دعویٰ میں جھوٹی ہوگی۔ یہ وہی بات ہے جسے دوسرے مقامات پر ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73/10) نیز فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (15/85) ''نہایت عمدگی سے ان سے کنارہ کش ہوتے ہوئے انہیں چھوڑ دے۔'' اور اس کے بعد ان سے کہہ دے کہ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ

تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ (3/136) ''تم اپنی جگہ کام کرتے جاؤ اور میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامرانی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ اس سے خدا کے اس قانون کی صداقت واضح ہو جائے گی کہ ظالمین کی کھیتیاں کبھی ثمر بار نہیں ہوا کرتیں۔'' یہی لعنت اللہ علی الکاذبین ہے۔

ب و ر

قرآنِ کریم میں ہے: وَّاَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ (14/28) وہ اپنی قوم کو ایسی جگہ لے آئے جہاں اس جنس کا سدکا کوئی گاہک نہ ہو۔ جہاں کوئی اس کی بات تک نہ پوچھے۔ جہاں اسے کوئی پیغام نہ دے۔ جہاں یہ سخت خسارے میں ہو۔ جہاں اس کے لیے تباہی اور ہلاکت سامانی ہو۔

راہ نماؤں کی غلط اندیشیوں اور مفاد پرستیوں سے قومیں ایسے ہی مقام میں پہنچ جاتی ہیں۔ اسے قرآن نے ''جہنم'' کہہ کر پکارا ہے (14/29)۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے نعمت خداوندی کی جگہ کفر اختیار کر لیا اور اپنے کاروانِ ملت کو اُس منڈی میں جا اُتارا جہاں اس جنس کا کوئی خریدار نہ ہو یعنی جہنم میں۔ اور اس میں وہ داخل ہو گئے اور وہ بہت بری جگہ ٹھہرنے کی ہے۔ جو لیڈر، نعمائے خداوندی کی قدر نہیں کرتے وہ اپنی قوم کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں لے آتے ہیں، جہاں لیڈر اور ان کے متبعین، سب تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے ''جہنم''[1] میں لیڈروں اور ان کے متبعین کے باہمی مکالمات (Dialogues) بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ مقامات بڑے عبرت انگیز ہیں۔ دیکھئے 14/21، 33/67، 34/32، 37/29، 40/47، 38/10۔

ب ی ض

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ''ید بیضاء'' کا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے۔ (مثلاً 7/107 و 20/22 و 26/34 و 28/32) اس کے مجازی معنی روشن اور واضح دلائل کے ہیں۔

اِبۡيَضَّتۡ یا اَبۡيَضَّتۡ کے معنی ہیں بھر جانا۔ آنکھوں میں آنسو بھر جانا۔ وَابۡيَضَّتۡ عَيۡنٰهُ مِنَ الۡحُزۡنِ (12/82) اس کے یہی معنی ہیں۔ یعنی غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔

ب ی ع

ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے (اور اسی کے مطابق عمل بھی ہوتا ہے) کہ بیع، یعنی خرید و فروخت میں جس قدر منافع لے لیا

---

[1] قائداعظمؒ کے بعد اب تک (2016ء) ہمارے ملک کے ارباب بست و کشاد نے ہمیں اسی جہنم میں لا اُتارا ہے۔ اس لفظ ''دار البوار'' میں قرآنِ حکیم نے ہمارے موجودہ حالات کی بڑی عبرت ناک تصویر کشی کی ہے۔ (منظور الحسن۔ صاحب کتاب)

جائے وہ جائز ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ سورۂ تطفیف میں ہے: وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ○ وَ اِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّ زَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ ○ (83/1-3)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے: ''تباہی ہے ان کے لیے جو کمی کرتے ہیں۔ یعنی ان کے لیے کہ وہ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا ماپ لیتے ہیں۔ اور جب دوسروں کو ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔'' ان آیات کا یہی مفہوم نہیں کہ ''ماپ تول پورا رکھنا چاہیے۔'' یہ آیات، قرآنی نظام معیشت کے ایک بہت بڑے اصول کو بیان کرتی ہیں۔

ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ (مثلاً) ایک کاریگر جوتا بنا کر دکاندار کے پاس لاتا ہے۔ دکاندار کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے کم سے کم دام دے کر جوتا خرید ے۔ پھر جب اسی جوتے کا گاہک آتا ہے تو دکاندار اس سے زیادہ سے زیادہ دام وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ تاجرانہ ذہنیت ہے جسے قرآن کریم نے تباہی کا موجب بتایا ہے اور اس کمائی کو ''تطفیف'' کہہ کر پکارا ہے۔ یہ دکاندار، کاریگر کو کم از کم دام کیوں دیتا ہے یا یوں کہئے کہ کاریگر، کم از کم داموں پر اپنی چیز بیچنے پر کیوں مجبور ہو جاتا ہے؟ اس لیے کہ اس کے پاس ''سرمایہ'' نہیں۔ لہٰذا یہ ''منافع'' (جو اس طرح گاہک سے وصول کیا جاتا ہے) سرمایہ پر بڑھوتی ہے جو جائز نہیں ہو سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ دکاندار کو کس قدر منافع لینا جائز[1] ہے۔ اس کا جواب آسان ہے

قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) ''انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ محنت کرے''۔ لہٰذا یہ دکاندار اپنی محنت (Labour) کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ پر زیادہ لینے کا حقدار نہیں۔ اس کے لئے یہ مقرر ہونا چاہیے کہ اس دکاندار کی دن بھر کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ اس کاروبار میں سے اس سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ یعنی وہ گاہک سے ''رأس المال + اپنی محنت'' لے سکتا ہے۔ اس لئے اس میں صرف رأس المال کا واپس لینا جائز ہے (2:279) اور بیع میں چونکہ ساتھ محنت بھی ہوتی ہے اس لئے اس میں رأس المال اور محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ صورت بھی اس وقت تک ہوگی جب تک قرآن کا معاشی نظام اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوتا۔ اُس وقت تمام افراد کی ضرورت زندگی کی ذمہ داری معاشرہ (مملکت) پر ہوگی اور اشیاء کے تبادلہ میں منافع لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

لہٰذا جس کاروبار میں صرف سرمایہ سے آمدنی ہو جائے اسلامی معاشرہ میں وہ جائز نہیں ہوگا۔ بیع اور ربوٰ میں فرق یہ ہے کہ بیع میں سرمایہ کے ساتھ محنت بھی ہوتی ہے اور ربوٰ میں فقط سرمایہ ہوتا ہے۔ بیع میں محنت کا معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔

ب ی ن

قرآن کو کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (5/15) کہا گیا ہے۔ حقائقِ مستورہ کو ظاہر کرنے والا ضابطہ حیات۔ یا وہ ضابطہ حیات جو کھلے

---

[1] منافع چاہیے اتنا کہ جتنا نمک ہو کھانے میں (منظور الحسن)

کھلے حقائق اپنے اندر رکھتا ہے۔ جن حقائق کا تعلق دنیائے محسوسات سے ماوراء ہے ان کا معلوم کر لینا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ انسانی عقل کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں۔ انہیں خود خدا وحی کے ذریعے رسول پر منکشف کرتا ہے۔ اس طرح حقیقت کو منکشف کر دینے کا نام تِبْیَانٌ ہے۔ اسی لیے قرآنی حقائق کو بَیِّنٰتٌ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ حقیقتیں جنہیں خدا نے خود ظاہر کیا ہے۔ اگر وہ انہیں بَیَانٌ (ظاہر) نہ کرتا تو وہ مستور ہی رہتیں۔

قرآن کریم کی رو سے خدا کی طرف سے انسانوں پر انکشاف حقیقت کا ایک ہی طریق ہے جسے وحی کہتے ہیں۔ اور وحی، حضرات انبیاء کرامؑ کے لیے مخصوص تھی۔ لیکن انسانی ذہن نے غیر از انبیاء پر بھی انکشاف حقیقت کا تصور پیدا کر لیا اور اسے کشف و الہام کا نام دے دیا اور کشف و الہام کے متعلق یہ عقیدہ پیدا کر لیا کہ اس سے صرف وہی شخص کیف اندوز ہو سکتا ہے جس پر حقائق منکشف ہوں۔ انہیں دوسروں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

جو کتاب رسول اللہ ﷺ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن کریم) اس کے متعلق بتا دیا کہ

① وہ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (16/89) ہے۔ یعنی جن باتوں کو بذریعۂ وحی دیا جانا مقصود تھا اس نے ان سب باتوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ کوئی بات چھپی نہیں رہی۔ دوسری جگہ ہے: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (2/187) ''اس طرح اللہ اپنے احکام کو لوگوں کے لیے ظاہر کر دیتا ہے تا کہ وہ ان کی نگہداشت کریں۔''

② لہٰذا یہ کتاب تمام نوع انسانی کے لیے اظہار حقیقت ہے۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (3/137)۔

③ اس میں صحیح اور غلط راستے بالکل ظاہر ہو گئے ہیں۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (2/256)۔

④ یہ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (5/15) ہے یعنی بالکل واضح اور ظاہر۔ کھلے اور واضح راستے کو اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (15/79) کہتے ہیں۔

یہ روشنی ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (5/15) ''یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور (روشنی) یعنی واضح کتاب آ گئی۔'' روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی چیز کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ خود روشن ہوتی ہے اور ہر اس شخص پر جو آنکھوں سے کام لے دوسری چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اس سے ہر شے نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس لیے اسے تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (12/111) بھی کہا گیا ہے۔ ''تَفْصِيْلٌ'' کے معنی ہیں الگ الگ کر کے دکھا دینا۔

یہ ہیں اس کتاب (قرآن) کی خصوصیات جسے اللہ تعالیٰ نے بوساطت نبی اکرم ﷺ تمام نوع انسانی کو دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ قرآن کا انداز تبیین کیا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے: وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا

دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6/105) ''اس طرح ہم اس کی آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ ہم اسے ان لوگوں پر ظاہر کر دیں جو علم سے کام لیتے ہیں''۔ یعنی قرآن تصریفِ آیات سے تبیانِ حقیقت کرتا ہے اور اسے علم و فکر کی رُو سے سمجھا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے انسان کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے: عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (55/3) اللہ نے اسے اظہارِ خیالات کی صلاحیت دی ہے۔ یعنی یہ صلاحیت کہ وہ زبان اور قلم کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ یہ خصوصیت انسان کو باقی حیوانات سے متمیّز کرتی ہے اور انسانی تہذیب و تمدن کے عروج و ارتقاء کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

ت ج ر

قرآن کریم نے ایمان (اسلام) کو بھی ایک قسم کی تجارت قرار دیا ہے جس میں بیع و شریٰ (خرید و فروخت) کا معاملہ ہوتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لئے ہیں اور ان کے بدلے میں انہیں جنت عطا کر دی ہے''۔ اس تجارت میں جماعتِ مومنین اپنی وہبی اور اکتسابی صلاحیتوں کے نتائج (جان اور مال) کو اس معاشرہ کے سپرد کر دیتے ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے اور یہ معاشرہ ان کے لئے دنیا میں جنتی زندگی کے سامان مہیا کر دیتا ہے (اور آخرت میں بھی انہیں جنت ملتی ہے)۔ یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (61:10-11)۔ ''اے جماعتِ مومنین! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ نشان دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟۔ (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو۔ اگر تم علم و بصیرت سے کام لو گے تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ یہ تجارت تمہارے لئے کس قدر اچھی ہے''۔ اس تجارت کا ماحصل عام کاروبار سے کہیں زیادہ نفع رساں ہے۔ (62:11)

اصول یہ ہے کہ منافع صرف محنت کے معاوضہ کے برابر لیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ پر کچھ نہیں لیا جا سکتا۔ یہی اصول تجارت پر بھی صادق آئے گا۔ اس اصول کی روشنی میں قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آئے گا جس میں کہا گیا ہے کہ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (4:29) تم ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ سوائے اس کے کہ باہمی رضامندی سے تجارت ہو''۔ آج کل ''باہمی رضامندی سے تجارت'' سے مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ تم جس قدر جی چاہے منافع گاہک سے طلب کرو اور کہہ دو کہ جی چاہے تو خریدو نہ جی چاہے نہ خریدو۔ اس کے بعد اگر وہ خرید لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا منافع دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔ ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔ گاہک اپنی ضرورت

سے مجبور ہو کر منہ مانگی قیمت دیتا ہے۔

ت ر ب

قرآن کریم میں جنت کے سلسلہ میں عُرُبًا اَتْرَابًا (56:37) یا کَوَاعِبَ اَتْرَابًا (78:33) کا ذکر آیا ہے۔ اس کے معنی عام طور پر ہم عمر بیویاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن دراصل اس کے معنے ایسے ساتھیوں کے ہیں جو عادات واطوار میں ایک دوسرے سے مماثل (ملتے) ہوں۔ ہم گل۔ ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے۔ کَوَاعِبَ اَتْرَابًا اور عُرُبًا اَتْرَابًا میں اَتْرَابًا صفت ہے کَوَاعِبَ اور عُرُبًا کی۔ اس اعتبار سے اس کے معنی ایسی عورتیں ہونگے جو ہم مزاج اور مماثل ہوں۔ یہ ہم مزاجی اور مماثلت، عورتوں میں، ایک دوسرے کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے۔[1] یعنی ان میں ایک دوسرے کے خلاف جذبات، عداوت ورقابت اور بیگانگی و مغایرت نہیں ہونگے بلکہ ان میں موافقت اور مماثلت بھی مراد ہوسکتی ہے۔ یعنی ایسی عورتیں جو اپنے خاوندوں کے ہم مزاج وہم خیال ہونگی۔ اخروی جنت میں ان تعلقات کی کیا کیفیت ہوگی، اس کا ہم مزاج وہم خیال ہونا جس طرح گھر کو جنت بنا سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

ت ر ف

مُتْرَفِیْنَ۔ قرآن کریم کی اہم اصطلاح ہے۔ اس نے کہا ہے کہ شروع ہی سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ خدا کی طرف سے جب کوئی صحیح نظام کی طرف دعوت دینے والا آیا تو قوم کے مُتْرَفِیْنَ نے اس دعوت کی سخت مخالفت کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر ان لوگوں پر حکومت بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحیح نظام ربوبیت میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ ہمیشہ اس دعوت کی مخالف کرتے ہیں۔ دیکھئے قرآن کس حصر کے ساتھ کہتا ہے کہ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (34:33) ''ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا جس کے مترفین نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تمہیں دیکر بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر اور مخالف ہیں''۔ اس سے اگلی آیت نے مترفین کی وضاحت کردی۔ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا (34:34) ''وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس مال ودولت اور افراد خاندان بڑی کثرت سے ہیں'' اس لئے ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جو عصر حاضر میں سرمایہ داروں کا طبقہ کہلاتا ہے اور جو محض اپنی دولت کے زور پر قوت واقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ انہی میں وہ مذہبی پیشوا بھی شامل ہیں جو خود کوئی کام نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر انہی لوگوں پر حکومت بھی کرتے ہیں جو انہیں لا لا کر کھلاتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ طبقہ بھی ہمارے قوانین ونظام کی مخالفت میں پیش پیش رہتا ہے اور

---

[1] ہمارے ہاں تو دو بیویوں کے درمیان سوتن (سو+تن) یعنی Hundred Bodies کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (منظور الحسن)

لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتا رہتا ہے کہ دیکھو یہ داعی انقلاب اس مذہب کی مخالفت کرتا ہے جو تمہارے آباواجداد سے چلا آتا ہے۔ یہ سب مُتْرَفِيْنَ ہیں جنہیں قرآن نے انسانیت کے بدترین دشمن قرار دیا ہے اور یہی اہل جہنم ہیں۔اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ (56:45)۔سورۃ مومنون میں ہے وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (23:33) ''یہ لوگ ہمارے قوانین کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں سامان زندگی بڑی فراوانی سے حاصل ہے اور اس نے انہیں سرکش و متکبر بنادیا ہے''۔

قرآنی نظام میں نہ سرمایہ داری باقی رہتی ہے نہ مذہبی پیشوائیت۔اس میں ہر شخص کام کرتا ہے اور کوئی دوسرے کی محنت پر عیش نہیں اڑا سکتا۔

ت ق ن

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنیٰ (الاسماء الحسنیٰ) بیان کرنے سے جہاں صفاتِ خداوندی کا صحیح صحیح تصور سامنے لانا مقصود ہے وہاں یہ بتانا بھی مطلوب ہے کہ جو افراد،قوم،معاشرہ یا نظام قوانین خداوندی کا اتباع کرے گا اس میں (تابہ حد بشریت) یہی صفات اجاگر ہوتی چلی جائیں گی۔مثلاً جب خدا کے متعلق کہا گیا ہے کہ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (27:88) یہ اس خدا کی سنت ہے جس نے ہر شے کو نہایت درست اور محکم بنایا ہے،،تو اس سے مقصود یہ بھی ہے کہ جماعت مومنین کی بنیادی صفت یہ بھی ہوگی کہ وہ جو چیز بنائے گی محکم اور درست بنائے گی۔اس میں نہ کسی قسم کا جھول ہوگا نہ سلوٹ،نہ نقص ہوگا نہ عدم تناسب،نہ ہی وہ ناپختہ اور ناتمام ہوگی۔جس طرح کارگہ کائنات کے متعلق پورے حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (67:3) تو رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھے گا''اسی طرح اس قوم کی مصنوعات کے متعلق بھی پورے پورے یقین اور اطمینان سے کہا جا سکے گا کہ تم ان میں کہیں تناسب و توازن کی کمی نہیں دیکھو گے۔دنیا میں ایسی قوم،نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے جس قدر سکون و اطمینان کا موجب ہوسکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اور یہ تو صرف ایک صفتِ خداوندی کے انعکاس کا ذکر ہے۔جس قوم میں تمام صفات خداوندی اسی انداز سے جھلک رہی ہوں'اس کی نفع رسائیوں اور سکون بخشیوں کا کیا ٹھکانہ ہے؟

ت ل و

تلاوت قرآن کریم کے معنی ہیں قرآن پر عمل کرنے کے لئے اسے پڑھنا (نہ کہ صرف پڑھتے رہنا)۔

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (2:121)۔''جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے،یہی لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان

رکھتے ہیں''۔ظاہر ہے کہ اس میں تلاوت کے معنی اتباع کرنے کے ہی ہو سکتے ہیں۔کیونکہ ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہی لوگ درحقیقت اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ورنہ اگر اس کے معنی فقط پڑھنے کے ہوں تو قرآن کو تو غیر مسلم بھی پڑھتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔لہٰذا قرآن کی تلاوت سے مراد اس کے احکام کا اتباع ہے۔اسے پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ اسے سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جا سکے۔قرآن کا اس طرح پڑھنا کہ وہ سمجھ میں نہ آئے یا اُسے فقط سمجھ لینا اور اس پر عمل نہ کرنا، کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کے متعلق جو فرمایا ہے کہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ (3/163)''وہ جماعت مومنین کے سامنے خدا کے احکام پیش کرتا ہے''۔ وَ يُزَكِّيْهِمْ (3/163)۔وہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ تلاوتِ قرآن سے مقصود یہ ہے کہ خدا کا نظام عملاً متشکل ہو جائے جس کے تعمیری نتائج (یعنی افراد معاشرہ کی نشوونما) محسوس صورت میں سامنے آجائیں۔

ت م م

قرآن کریم میں ہے وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (2:124)''جب اُس کے نشوونما دینے والے نے ابراہیم کے لئے نمود ذات کے مختلف مواقع بہم پہنچائے تو وہ دوام وثبات سے ان میں پورا اترا اور اس طرح اس نے بتا دیا کہ اس میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔'' سورۃ المائدہ میں ہے۔ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (5:3) اب ہم نے تمہارا غلبہ واقتدار انتہا تک پہنچا دیا۔(کوئی سرکش قوت باقی نہیں رہی) تمہارے نظام زندگی کی تکمیل ہوگئی۔اور ہماری نعمتوں میں سے جس جس کی کمی تھی ہم نے وہ سب پوری کر دی''۔سورۃ انعام میں ہے: وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:116) قوانین خداوندی میں سے جو کچھ باقی رہتا تھا وہ بھی سب کا سب صدق وعدل سے پورا ہو گیا، اور اب اس میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں''۔اس طرح دین کی تکمیل ہوگئی اور نبوت ختم ہوگئی۔اس لئے کہ جب قوانین خداوندی میں نہ کسی اضافے کی ضرورت باقی رہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش، تو پھر اور نبی آئے گا کس کام کے لئے۔

ت و ب

آپ شاہراہ حیات پر چلے جا رہے ہیں۔راستہ میں ایک چوراہا آیا جہاں سے آپ ایک طرف کو مڑ گئے۔چند قدم آگے جا کر آپ کو محسوس ہو کہ آپ کا قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے۔صحیح راستہ یہ نہیں۔اب آپ کو صحیح راستہ کی طرف جانے کے لئے اُس مقام تک لوٹ کر آنا ہو گا جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کو اٹھا تھا۔اس واپسی کو تَوْبَةٌ کہتے ہیں۔ظاہر ہے کہ اس کے لئے آپ کو چل کر واپس آنا ہوتا ہے۔وہیں کھڑے کھڑے اگر آپ عمر بھر بھی افسوس کرتے رہیں گے کہ میں نے غلط سمت کی طرف کیوں قدم اٹھا لیا تو یہ تَوْبَةٌ نہیں ہوگی۔تَوْبَةٌ ایک عملی اقدام ہے جس سے غلط کام کو بے اثر (Un-Do) کیا جاتا ہے۔اس

کے مضر اثرات کی تلافی کی جاتی ہے۔ تَابَ عَنْہُ اور مِنْہُ کے معنی ہیں اس نے اپنی غلطی کا احساس کر کے غلط روش کو چھوڑ دیا اور صحیح راستہ کی طرف لوٹ آیا۔ غلطی کا احساس، احساس کے بعد غلط روش سے اجتناب اور پھر صحیح روش کا اختیار کرنا، یہ تینوں مراحل تَوْبَۃٌ کے اندر شامل ہیں۔ ایسا کرنے والے کو تَآئِبٌ کہتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم میں آیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْہِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114)۔ ''اعمال حسنہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ غلط اعمال کے نقصاں رساں نتائج کا ازالہ کر دیں''۔ اسی کو تَوْبَۃٌ کہتے ہیں۔ یعنی غلط کام کے نقصاں رساں نتائج کی تلافی کے لئے صحیح کام کرنے۔ اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ آپ نے کسی شخص کا کوئی حق دبا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اپنی اس غلط حرکت کا احساس ہوا۔ آپ کے دل میں ندامت کے جذبات پیدا ہوئے۔ آپ کی توبہ یہ ہے کہ آپ اس شخص کا حق واپس دے دیں اور آئندہ کے لئے عہد کریں کہ آپ کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے شراب پی لی۔ کچھ وقت کے بعد آپ کو اپنی غلط کاری کا احساس ہوا۔ اس میں توبہ کی شکل یہی ہے کہ آپ اپنے عمل پر نادم ہوں اور آئندہ کے لئے اس کے مرتکب نہ ہوں۔

شروع میں بیان کردہ مثال میں، جب آپ نے اس چوراہے سے غلط راستہ اختیار کیا تھا تو صحیح راستہ نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جب آپ نے اپنی غلطی کے احساس کے بعد غلط راستہ کو چھوڑ دیا اور صحیح راستہ کی طرف رخ کیا تو صحیح راستہ نے بھی (جو اُس وقت تک آپ سے منہ موڑے ہوئے تھا) آپ کی طرف رخ کر لیا۔ رخ نہیں کر لیا بلکہ آپ نے اس کی طرف ایک قدم اٹھایا تو وہ دو قدم اٹھا کر آپ کی طرف بڑھ آیا۔ دو قدم اس طرح کہ ایک قدم وہ کم ہوا جو آپ پہلے مخالف سمت میں جاتے وقت اٹھا رہے تھے اور دوسرا قدم وہ جو آپ نے اُس کی طرف اٹھایا۔ اِسے تَابَ عَلَیْہِ کہتے ہیں۔ اور ایسا کرنے والے کو تَوَّابٌ۔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (110:3) خدا کے متعلق ہے اور اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (2:222) بندوں کے متعلق۔ یعنی جب انسان غیر خدائی قانون کو چھوڑ کر قانون خداوندی کی طرف رخ کرتا ہے تو یہ قانون اپنے تمام خوشگوار نتائج کو لئے ہوئے اس انسان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس لئے (3:127) میں یہ لفظ عَذَابٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ نیز (9:106) میں۔ بالالفاظ دیگر انسان کسی جرم کے ارتکاب سے ابدی طور پر زندگی کی خوشگواریوں سے محروم نہیں ہو جاتا۔ وہ جب بھی قانونِ خداوندی کو اختیار کرے گا اس قانون کے خوشگوار نتائج اس کی طرف لپک کر آ جائیں گے۔ یعنی ہر شخص کے لئے بازآفرینی کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ہر قوم کے لئے نَشْاءَۃِ ثَانِیَۃ کا امکان۔ (قوموں کی زندگی میں وہ مرحلہ کب آتا ہے جب ان کی حیاتِ نو ناممکن ہو جاتی ہے) لیکن یہ بازآفرینی اسی وقت تک ممکن ہے جب انسان کے لئے عملِ صالح کرنے کا امکان ہو۔ جب عمل کا موقع ختم ہو جائے تو پھر بازآفرینی ناممکن ہو جاتی ہے۔

ت ی ن

اَلتِّیْنُ۔ انجیر یا انجیر کے درخت کو کہتے ہیں۔ نیز ایک پہاڑی کا نام ہے، جس طرح زَیْتُوْنٌ بھی ایک پہاڑی کا نام ہے۔

اَلتِّیْنُ سے مراد وہ مقام ہے جہاں سے حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت کی آواز بلند کی تھی۔ جس طرح زَیْتُوْنٌ وہ مقام ہے جہاں سے دعوتِ حضرت عیسیٰؑ کا آغاز ہوا تھا۔ قرآن کریم نے ان مقامات (تین، زیتون، طور سیناء اور مکہ) کو اس حقیقت پر شاہد ٹھہرایا ہے (95:1) کہ حق و باطل کی یہ کشمکش شروع سے اِسی طرح چلی آ رہی ہے۔ یعنی آسمانی پیغام جہاں جہاں بھی آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ وہ دعوت حضرت نوح علیہ السلام کی تھی (التین) یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی (الزیتون)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تھی (طور سیناء) یا نبی اکرمؐ کی (البلد الامین)۔ ہر دعوت الی اللہ کی یکساں مخالفت ہوئی۔

ت ی ہ

بنی اسرائیل کے متعلق ہے فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ (5/26) ''وہ (چالیس سال تک) حیران و سرگرداں پھرتے رہیں گے۔'' یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو قوانین خداوندی سے گریز کی راہیں تلاش کرے اور ان میں حجتیں نکالے۔ وہ سفر زندگی میں حیران و پریشان ماری ماری پھرتی ہے اور اسے کہیں نشانِ راہ اور سراغِ منزل نہیں ملتا۔ (جیسا کہ خود ہمارے ساتھ صدیوں سے ہو رہا ہے۔)

ث ر ب

يَثْرِبُ. مدینہ منورہ کا قدیمی نام ہے۔ قرآن کریم میں ہے يَاَهْلَ يَثْرِبَ. ''اے یثرب کے رہنے والو''۔ (33:13)۔

ث ق ف

قوموں کی اولین ثَقَافَت شمشیر وسناں[1] ہوتی ہے اور آخر الامر اس سے مفہوم شعر گوئی اور افسانہ طرازی رہ جاتا ہے۔ ایک زندہ قوم کی ثقافت، نگاہ کی تیزی اور شمشیر کی خارہ شگافی (دونوں) کا مجموعہ ہوتی ہے۔

ث م د

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے لئے سامان رزق زمین کے دسترخوان پر بافراط بچھا دیا تا کہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لے۔ لیکن مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت بنا لیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزور انسان بھوکے مر جاتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ رزق کے چشموں کو مستبد

---

[1] علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے — شمشیر وسناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

قوتوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر نوع انسانی کے لئے عام کردیں۔

ثمن

قرآن کریم میں ہے وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (2/42) ''میری آیات کوتھوڑی سی قیمت کےعوض مت بیچو۔'' اس کے یہ معنی نہیں کہ انہیں زیادہ قیمت پر بیچو، کم قیمت پر مت بیچو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حقیقی قیمت وہی ہے جوان پر عمل پیرا ہونے سے ان کے نتائج کی صورت میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جو قیمت بھی ہوگی وہ ثمنِ قلیل ہوگی۔ دین کو ذاتی اغراض ومصالح کے حصول کا ذریعہ بنانا بدترین جرم ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا مدار ہی اس پر ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا باہمی گٹھ جوڑ اسی متاع کے لئے ہوتا ہے (29:25)۔ اسی لئے پیشوائیت اور اسلام متضاد تصور ہیں۔

ثنی

سورۃ الحجر میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (15/87)۔ ''ہم نے تجھے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ اور الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ عطا کیا''۔ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ خدا کے مقرر کردہ بنیادی اصول ہیں۔ جن کے مطابق اعمال اپنا اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور اَلْمَثَانِيْ وہ تاریخی حقائق ہیں جو اپنے آپ کو دھراتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ایک تو ان بنیادی اصولوں کو بیان کردیا جن کی رو سے قوموں کو عروج وزوال حاصل ہوتا ہے (یعنی قرآن کریم) اور اس کی تائید میں وہ متعدد تاریخی شواہد بیان کردئے جو ہر زمانہ میں بار بار سامنے آتے ہیں۔ قرآن کی ابدی صداقتوں کے پرکھنے کا ایک اہم طریق یہ بھی ہے کہ تاریخ میں دیکھا جائے کہ فلاں قوم نے جب وہ روش اختیار کی جسے قرآن حق کی روش قرار دیتا ہے تو اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے اور جس قوم نے باطل کی روش اختیار کی تو اس کے عواقب کیا ہوئے۔

قرآن کی ساری تعلیم، یہاں سے وہاں تک، ایک دوسرے سے ملتی جلتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کہیں تضاد نہیں۔ تخالف نہیں۔ لیکن اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لاکر بات صاف کر دیتا ہے۔ مثلاً ظُلُمٰت کے مقابلہ میں نُوْر۔ حَيَات کے مقابلہ میں مَوْت۔ اِيمَانْ کے مقابلہ میں کفر۔ یعنی متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لاکر مطلب کی وضاحت کردینا) لہٰذا قرآن مُتَشَابِةٌ بھی ہے اور مَثَانِيْ بھی۔ ایسی کتاب جس کی ایک کڑی دوسری کڑی سے ملتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن جس کے مطالب کو متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لاکر واضح کیا گیا ہے۔

ثوب

آپ جو کام بھی کرتے ہیں اس میں آپ کا کچھ نہ کچھ صرف ہوتا ہے۔ اگر اور کچھ صرف نہ ہو تو بھی آپ کے جسم کی توانائی۔ وقت اور ذہن کی صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔ اگر آپ کا وہ کام بیکار ہے تو آپ کی یہ سب توانائیاں (جو آپ نے

صرف کی ہیں) ضائع چلی جاتی ہیں۔لیکن اگر وہ کام نتیجہ خیز اور صلاحیت بخش ہے تو آپ نے جو کچھ صرف کیا ہے وہ سب آپ کو واپس مل جاتا ہے۔اس بحالی (Restoration) کا نام ثَوَابٌ ہے۔

قرآن نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا حتمی اور یقینی نتیجہ اس دنیا کی حکومت اور سطوت بھی بتایا ہے (24:55)۔اس لئے ثَوَاب (نتائجِ اعمال) سب سے پہلے اس دنیا میں سامنے آجانے چاہیں۔اس کے بعد اُخروی زندگی میں بھی۔چونکہ زندگی کی یہ تمام آسائشیں اور خوشگواریاں انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اور ارتقاء، اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لئے ثَوَاب کے معنی اعمال کا نتیجہ بھی ہیں۔یعنی قانون مکافات کی رو سے اعمالِ انسانی کا نتیجہ مرتب ہونا۔عام طور پر اچھے نتائج کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات غلط کاموں کے خراب نتائج کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، (مثلاً 3:152 اور 83:36 میں)۔یعنی انسان نے جو کچھ کیا ہے اس کا اس کی طرف لوٹ کر آجانا۔اس کی (Return)۔هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (83/36)۔''کفار کے اعمال ہی نتیجہ بن کر ان کی طرف لوٹ کر آجاتے ہیں''۔قرآن کریم نے مکافات عمل کے ضمن میں یہ بڑا باریک نکتہ بیان کیا ہے کہ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔خود عمل کے اندر اس کا نتیجہ مضمر ہوتا ہے۔آپ صبح کے وقت سیر کے لئے جاتے ہیں۔دو تین میل کا چکر لگاتے ہیں۔اس سے آپ کی طاقت خرچ ہوتی ہے۔وقت بھی صرف ہوتا ہے۔لیکن اس سے آپ کو صحت و توانائی، شگفتگی اور بشاشت حاصل ہوتی ہے۔یہ صحت اور بشاشت کیا ہے۔آپ کی سیر کا نتیجہ ہے۔یعنی آپ کی سیر کا عمل خود اپنا آپ نتیجہ بن گیا ہے۔اسے ثَوَاب کہتے ہیں ثَوَاب کے اس مفہوم کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو اِیْصَالِ ثَوَاب کہتے ہیں وہ کس قدر غیر قرآنی تصور ہے۔کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ سیر تو آپ کریں اور اس سیر کا نتیجہ آپ میری طرف منتقل کر دیں؟ یہ ناممکن ہے۔اگر آپ سیر کرتے ہیں تو آپ ہی کی صحت ٹھیک ہوگی۔اگر میں سیر نہیں کرتا تو آپ کا سیر کرنا میرے کسی کام نہیں آسکتا۔آپ ہزار چاہیں لیکن اس سیر کا نتیجہ (ثَوَاب) آپ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے۔اس لئے آپ کا کسی دوسرے کو ثواب پہنچانا ایک موہوم عقیدہ ہے جس کا حقیقت (قرآن) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ملتا ہے۔ہر عمل کا اثر انسان کی اپنی ذات پر ہوتا ہے اس لئے اس کے (کسی دوسرے کی طرف) منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4) ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ثَوَاب کے معنے انسانی شخصیت اور سیرت و کردار کے ہیں۔

اس لئے اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ اپنی سیرت و شخصیت کو پاکیزہ رکھو۔اور اگر تَثْوِيْبٌ کے مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اپنی دعوت کو ان لوگوں سے پاک اور صاف یا دور دور) رکھو جو دل میں نفاق وغیرہ کی خباثتیں لئے ہوں۔لہٰذا اس میں سیرت و شخصیت یا دعوت اور پکار کی پاکیزگی اور بلندی کا حکم ہے۔نہ کہ کپڑوں کو صاف رکھنے کا۔

ج ب ت

قرآن میں اہل کتاب کے متعلق ہے: یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (4:51) طَاغُوْت انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی قوتیں اور جِبْتٌ ہر بے حقیقت اور بے معنے چیز۔ توہم پرستیاں۔ رسومات جن میں روح باقی نہ رہی ہو۔ جو اندر سے کھوکھلی (مُجَوَّف) ہو چکی ہوں۔ جو قوم بھی خدا کی طرف سے دیئے ہوئے الدین کو چھوڑ دیتی ہے وہ جبت اور طاغوت کو اپنا ''معبود''[1] بنا لیتی ہے۔

ج ب ر

اَلْجَبَّارُ۔ خدا کی صفت ہے۔ یعنی کائناتی نظام یا انسان کی ہر شکستگی کو قوانین کی لکڑی کی تختیوں (Splints) میں رکھ کر جوڑنے والا۔ اس کے معنے ضرورتوں سے بے نیاز کر دینے کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: [جَبَرَ الْفَقِیْرَ مِنَ الْفَقْرِ] اس نے محتاج کو اس کی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا۔ [تَجَبَّرَ الشَّجَرُ] درخت سرسبز ہو گیا۔ [تَجَبَّرَ الْمَرِیْضُ] مریض کی حالت سدھری۔ ان مثالوں سے خدا کی جَبَّارِیَّت (جَبَرُوْت) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس کی ربوبیت اور رحمانیت ہی کا ایک پہلو ہے البتہ اس میں انسان کو قانون کی حدود میں گھیر کر چلانا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن جب انسانی قوتیں قوانین خداوندی کی حدیں توڑ کر سرکش ہو جاتی ہیں تو یہ جوئبار سیلابِ بلا انگیز بن جاتی ہے۔ اس لیے اس حالت میں جبر کے معنی استبداد اور جبار کے معنی مستبد، ظالم، سرکش اور حد سے بڑھ جانے والا ہوں گے۔ چنانچہ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے: وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (19/32) ''خدا نے مجھے مستبد، سرکش اور بد بخت نہیں بنایا۔''

سورۃ ق میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ (50:45)۔ ''تو ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے والا نہیں ہے''۔ جبراً کوئی بات منوانے والا نہیں ہے۔

آپ نے غور کیا کہ انسان کی کوئی قوت نہ بجائے خویش خیر ہے نہ شر۔ یہ اس کا مقصد استعمال، یعنی جس مقصد کے حصول کے لیے اس قوت کو استعمال کیا جائے اس کی نوعیت ہے جو اسے خیر یا شر بنا دیتی ہے۔ اگر قوت کو ٹوٹی ہوئی ہڈی کے جوڑنے کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ خیر ہے اور اگر اسے کسی مظلوم کی ہڈی توڑنے کے لیے صرف کیا جائے تو وہ شر ہے۔ ظلم روکنے والا ''جبار'' نوع انسان کے لیے آیہ رحمت ہے اور ظلم کرنے والا ''جبار'' موجب عذاب۔

---

[1] اور ہم مسلمانوں نے بھی مجموعی طور پر ''جبت'' اور ''طاغوت'' ہی کو معبود بنا رکھا ہے۔ (منظور الحسن)

جِبْرِيْلُ

جِبْرِيْلُ۔ عبرانی لفظ ہے۔قرآن کریم میں اس سے مراد خدا کی وہ قوت ہے جو قلب نبویؐ پر وحی خداوندی کا القاء کرتی تھی۔فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (2/97)اس نے اللہ کے قانون کے مطابق اسے تیرے قلب پر نازل کیا۔'' اسے رُوْحُ الْقُدُسِ (16/102)اور الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (26/193) بھی کہا گیا ہے۔لفظ جبریل دو بار سورہ بقرہ میں (2/97-98)اور ایک بار سورہ تحریم میں آیا ہے (66/4)۔

چونکہ کوئی غیر نبی وحی کی ماہیت کو سمجھ نہیں سکتا (کیونکہ وحی اس علم کا نام ہے جس کا سرچشمہ انسانی ادراک سے ماوراء ہے) اس لئے ہم نہیں جان سکتے کہ جِبْرِيْلُ کی ماہیت کیا ہے۔ ہمارا واسطہ اس وحی سے ہے جو قرآن کے اندر ہے اور اس کا مفہوم ہم سمجھ سکتے ہیں۔اس قوت (رُوْحٌ) کو قُدُسٌ اور اَمِيْنٌ کہنے سے مطلب یہ ہے کہ وحی خداوندی میں (جو قلب نبوی پر نازل کی جاتی ہے) نہ کسی قسم کی آمیزش ہوتی ہے نہ خیانت۔نہ اس میں نبی کے اپنے جذبات کا کوئی شائبہ ہوتا ہے مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53/3) نہ وہ اس میں کسی قسم کی خیانت کرتا ہے(3/160)۔اور نہ ہی کوئی کائناتی قوت وحی میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکتی ہے۔وحی میں آمیزش اور خیانت رسول کے بعد اس کے دین کے دشمن کرتے ہیں (خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے)۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ میں نہ کوئی آمیزش کر سکتا ہے نہ خیانت۔اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے خود لے رکھی ہے۔

ج ح م

قرآن کریم میں اَلْجَحِيْمِ جہنم کے لیے آیا ہے۔قرآن کریم میں غلط اعمال کے نتائج کو عذابِ نار سے تشبیہ دی ہے کیونکہ آگ سب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔لیکن اگر زندگی اور اس کے مقاصد کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اس کے سلسلہ ارتقاء کی ایک کڑی ہے جسے ابھی بہت آگے چلنا ہے۔ قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے انسانی صلاحیتوں میں ایسی نشوونما آجاتی ہے جس سے وہ (مرنے کے بعد) زندگی کی اگلی ارتقائی منزل تک پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔قرآن کریم کی رو سے فرد یا قوم، جس مقام پر رک جائے، وہ جحیم ہے۔ زندگی تو ایک جوئے رواں ہے جسے رواں دواں آگے بڑھتے چلے جانا چاہیے۔جونہی اس کی روانی بند ہوئی، وہ جوئے رواں نہ رہی جوہڑ بن گئی اور اس میں سڑاند پیدا ہونی شروع ہو گئی۔

ج د ل

حج مسلمانوں کا بین الملّی اجتماع ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ اُمت کے اجتماعی مسائل کا حل باہمی مشاورت سے تلاش

کیا جائے۔قرآن کریم کہتا ہے کہ اس مقصد کے لئے باہمی گفتگو میں ایسی روش اختیار نہ کرو جس سے مقصد یہ ہو کہ تم فریق مقابل کو مناظرانہ شکست دے دو اور اس کے لئے خواہ مخواہ بات بڑھاتے اور اس پر اصرار کرتے چلے جاؤ۔تم متانت اور سنجیدگی سے بات کرو اور مقصد یہ سامنے رکھو کہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مسائل کا تصفیہ ہو جائے۔

قرآن کریم میں ہر معاملہ کے متعلق بات واضح طور پر کہہ دی گئی ہے لیکن اس سے راہنمائی حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان خالی الذہن [1] ہو کر قرآن پر غور و فکر کرے اور مقصد پیش نظر یہ رکھے کہ مجھے حق اور صداقت کو تلاش کرنا ہے۔اس طرح قرآن سے صحیح راہنمائی مل جائے گی۔

ج ز ی

جس چیز کو عام طور پر ''عمل کا بدلہ'' کہا جاتا ہے وہ درحقیقت اُس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔یعنی نتیجہ، عمل کا قائم مقام ہوتا ہے۔آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں یہ آپ کا عمل ہے۔آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس میں سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔یہ اس عمل کا نتیجہ ہے۔عمل فوراً ختم ہو گیا لیکن اس کے نتیجہ نے اس کی جگہ لے لی۔اس سے جزا اور سزا کا قرآنی تصور سامنے آجاتا ہے۔اس تصور کی رُو سے نہ سزا خارجی طور پر (باہر سے) ملتی ہے۔نہ جزا ہی کہیں باہر سے انعام ملنے کا نام ہے۔ لیکن آپ نے سنکھیا کھایا اور آپ کی موت واقع ہو گئی۔یہ چیز آپ کے عمل کا نتیجہ ہے۔یعنی عمل کی جانشین۔اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ(7/147)۔اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ہر عمل کا نتیجہ اُس عمل کی جگہ آجاتا ہے۔اس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔

جِزْيَةٌ (9:29) وہ ٹیکس جو غیر مسلموں سے ان کی حفاظت کے بدلے میں لیا جائے۔یعنی جو اُن کی جان، مال،، آبرو، معابد وغیرہ کی حفاظت کے لئے کافی سمجھا جائے اور جس کی وجہ سے ان پر (جنگ وغیرہ میں شریک ہونے کی) ذمہ داری نہ ڈالی جائے۔یہ تھوڑا سا مالی معاوضہ ان تمام آسائشوں کے بدلے لیا جاتا ہے جو غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں حاصل ہوتی ہیں اور جن کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہوتی ہے۔

ج س س

قرآن میں ہے لَا تَجَسَّسُوْا(49:12) پوشیدہ باتوں کی خواہ مخواہ کرید مت کرو۔یعنی کسی کے ایسے اندرونی اور نجی حالات جنہیں وہ راز میں رکھنا چاہتا ہے اور اس سے اجتماعی فساد کا کوئی امکان نہیں، اپنے ذاتی غرض سے انہیں معلوم کرنے میں دلچسپی نہ لو۔خواہ مخواہ اپنے قیمتی وقت کو ایسے فضول، لایعنی کاموں میں خرچ نہ کرو۔مندرجہ بالا معانی کے اعتبار سے اس

---

[1] بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے (علامہ اقبال)

میں ارادے کی برائی بھی شامل ہے۔یعنی بری نیت سے (شرانگیز مقصد کے لئے) ایسا معیوب ہے۔حکومت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ باشندگان ملک اور بیرونی دشمنوں کے اندرونی حالات تک سے باخبر ہو۔یہ چیز اس تجسس میں نہیں آئے گی جس سے قرآن نے منع ① کیا ہے۔

ج س م

قرآن نے علم کے ساتھ جسمانی توانائی ② کی اہمیت کو کس انداز سے اجاگر کیا ہے جو فرد یا قوم جسمانی طور پر (Physically) کمزور ہوجائے اس کا علم زیادہ نفع رساں اور نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔جسمانی قوت میں ہر قسم کی طبیعی قوت (Physical Force) آجاتی ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ مقصودِ حیات، انسانی ذات (Personality) کی نشوونما ہے لیکن زندگی کی موجودہ سطح پر یہ نشوونما جسم کے بغیر نہیں ہوسکتی۔اس کے لئے جسم کی پرورش ایسے ہی ضروری ہے جس طرح انڈے میں بچہ بننے کے لئے انڈے کے خول کا صحیح وسالم ہونا ضروری ہے۔قرآنی نظام میں جسم اور ذات دونوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچتا ہے۔

ج ف و (ج ف ا)

قرآن میں مومنین کے متعلق ہے تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (32:16)۔''ان کے پہلو بستروں سے الگ ہوجاتے ہیں''۔خداوندی پروگرام کی تکمیل میں ان پر راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے۔

ج ل ب

اَلْجِلْبَاب۔اوڑھنی سے بڑا اور چادر سے چھوٹا کپڑا ہوتا ہے جس سے عورتیں اپنے سر اور سینے کو چھپاتی ہیں۔قرآن میں ہے یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ (33/59)''اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں۔''

ج ل د

ہر عمل کا اثر انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔اس لیے انسانی اعمال کی بنیادی شاہد خود انسان کی ذات ہوتی ہے خواہ عقلِ حیلہ جو ان کے جواز میں کتنی ہی دلیلیں کیوں نہ تراشے۔بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ○ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ○

---

① وہ اس لیے کہ قرآنِ حکیم پر عمل کرنے سے جو معاشرہ متشکل ہوتا ہے اس کی ہیئت اجتماعی ہے اور اس کا مقصدِ وحید اسلامی مملکت کی حفاظت۔ (منظورالحسن)

② اسی طرح انگریزی زبان میں بھی کہتے ہیں ''Sound Mind in a Sound Body''یعنی ایک صحت مند جسم میں ہی توانا ذہن ہوتا ہے۔

(75/14/15)''انسان اپنی ذات کے خلاف خود دلیل ہے۔خواہ (ویسے) وہ (اپنے اعمال کی مدافعت میں) کتنے ہی عذر کیوں نہ پیش کرے۔'' یہی ''سمع وبصر وجلود'' کی شہادت ہے۔ظہورِنتائج کا وقت بھی کیسا عبرت انگیز اور دلدوز ہوتا ہے جب انسان کا کوئی خفیہ سے خفیہ عمل بھی چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال تک بھی نہیں۔

ج م ع

يَوْمُ الْجُمُعَةَ۔ اسلام سے پہلے قریش، ہفتہ میں ایک دن، جسے وہ يَوْمُ الْعَرُوْبَةِ کہتے تھے، دارِقُصیؔ کے پاس دارالندوہ (اپنے قومی دارالمشاورت) میں جمع ہوا کرتے تھے۔قرآن کریم میں ہے کہ جماعت مومنین کا شیوہ یہ ہے ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ (42/38)''وہ صلٰوۃ کے نظام کو قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔'' صلٰوۃ کے اجتماعات میں خدا کے حضور جھکنا اور سجدہ ریز ہونا اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم اس کے قوانین واحکام کی اطاعت کے لیے جمع ہوئے ہیں اور اسی مقصد کے لیے ہماری مشاورت ہوگی۔

ج م م

قرآن میں ہے وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (89:20)۔تم بڑی شدت سے دولت سے محبت رکھتے ہو۔تم چاہتے ہو کہ جس طرح گڑھے میں اردگرد کا پانی جمع ہو جاتا ہے اسی طرح سب کی دولت، وہ تھوڑی ہو یا زیادہ، سمٹ سمٹا کر تمہاری طرف آجائے۔نظام سرمایہ داری میں ہوتا ہی یہ ہے کہ دولت سمٹ سمٹا کر چند افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔قرآن اس نظام کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

ج ن ح

جب نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ آپ مخالفین سے الگ ہٹ کر اپنی جماعت کی تنظیم کریں۔(15:94)۔تو اس کے لئے ان الفاظ میں تاکید کی گئی کہ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (15:88)''اپنی جماعت کے افراد کے لئے اپنا بازو جھکا دے۔'' انہیں اپنے پروں کے نیچے ایسے سمیٹ لے جس طرح مرغی اپنے نوزائیدہ بچوں کو اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔۔۔سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے کہ فرعون کے ساتھ کشمکش میں گھبرانا نہیں۔اپنے بال و پر سمیٹ کر رکھنا۔ وَ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (28:32) خوف کے وقت پھڑ پھڑانا نہیں بلکہ اپنے بال و پر سمیٹ کر رکھنا، حواس قائم رکھنا۔یا اپنے افرادِ جماعت کی حفاظت کرنا، ان کی تنظیم کرنا۔یہ سب معانی اس میں آجاتے ہیں۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ماں باپ کی پرورش وحفاظت کی تاکید کے لئے کہا گیا ہے کہ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (17:24)۔نرمی اور رحمت سے اپنے بازو کو ان کی طرف اور جھکا دو۔ان کی حفاظت اور خدمت نہایت نرم روی

سے کرو کیونکہ وہ معذور ہو چکے ہیں۔

جنن

دور تو ہم پرستی میں تمام وہ قوتیں جو انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتیں اور جن کے متعلق اُس زمانے کے انسان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا، دیوی دیوتا بن جاتی تھیں۔ انہی کو عرب (ان کے نگاہوں سے پوشیدہ ہونے کی بنا پر) جِنٌّ کہتے تھے۔ وہ فرشتوں کو بھی جِنٌّ کہا کرتے تھے، حالانکہ ان کی پرستش بھی کرتے تھے۔ الجن کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک تو ان تمام مخفی قوتوں (روحانیین) کے لیے جو حواس سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے جِنٌّ میں فرشتے بھی شامل ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان مخفی قوتوں (روحانیّین) میں سے بعض کو جِنٌّ کہتے ہیں، اس طرح کہ جو روحانیّین نیک ہوتے ہیں وہ فرشتے کہلاتے ہیں، جو بد اور سرکش ہوتے ہیں وہ شیاطین کہلاتے ہیں۔ اور جن میں نیک و بد دونوں شامل ہوتے ہیں وہ جِنٌّ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کے کئی مقامات میں جہاں جاہلیت عرب میں جنوں کی پرستش کا ذکر ہے وہاں جِنَّةٌ سے مراد فرشتے ہی ہیں (مثلاً 37/158) وغیرہ۔

ہماری زمین ابتدا میں ایک آتشیں گولہ تھی جسے ٹھنڈا ہو کر انسانی آبادی کے قابل بننے کے لئے لاکھوں اور کروڑوں برس لگ گئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب کرۂ ارض پر ہنوز انسانوں کی آبادی نہیں ہوئی تھی تو اس میں جو مخلوق یہاں بستی تھی اس میں حرارت برداشت کرنے کی قوت اور صلاحیت زیادہ تھی۔ اس کے بعد وہ مخلوق ختم (Extinct) ہو گئی اور اس کا جانشین انسان ہوا۔ چونکہ اس (پہلی) مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی اور چونکہ اب وہ انسانوں کے سامنے نہیں ہے، ان کی نسل ختم (Extinct) ہو چکی ہے، اس لیے قرآن نے کہا ہے کہ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (15/27)۔ انسان سے پہلے ہم نے ایک مخلوق کو جلتی ہوئی ہوا کی حرارت سے پیدا کیا تھا۔ وہ مخلوق اب تمہاری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اسے اَلْجَانُّ کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اشیائے کائنات مادہ کی مرئی اور محسوس شکل میں آنے سے پہلے، مخفی توانائی (Energy) کی حالت میں تھیں۔ یہی توانائی اب مادہ کے اندر (Latent) صورت میں ہے۔

نگاہوں سے پوشیدہ ہونے، نیز اس کی خوئے سرکشی کی وجہ سے ابلیس کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔

قرآن کریم میں جِنٌّ اور اِنْسٌ کے الفاظ متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ہیں۔ عربوں میں اَلْاِنْسُ اُن قبیلوں کو کہتے تھے جو ایک مقام پر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جائیں۔ لیکن جِنٌّ وہ قبائل تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ بہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ انہیں خانہ بدوش قبائل (Nomadic Tribes) کہا جاتا ہے۔ اب بھی دنیا میں جہاں جہاں اس قسم کے قبائل پائے جاتے ہیں وہ شہر والوں سے دور دور، جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے

ہیں۔آج کل وسائل رسل ورسائل کے عام ہوجانے سے، ان قبائل اور شہر والوں کی زندگی میں بہت سے امور مشترک ہو چکے ہیں، اس لیے ان میں کوئی بنیادی بُعد محسوس نہیں ہوتا۔لیکن جس زمانے میں ملنے جلنے کے وسائل اور نشر واشاعت کے طریق عام نہیں تھے، شہر والوں اوران خانہ بدوش، صحرا نشینوں کے تمدن ومعاشرت، عادات واطوار، خصائص وخصائل اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات وغیرہ میں اس قدر فرق تھا کہ یہ دونوں ایک نوع کے افراد نظر نہیں آتے تھے۔عربوں میں یہ صحرا نشین قبائل بہت زیادہ تھے (انہیں بدو یا اَعۡرَابٌ کہا جاتا تھا) چونکہ قرآن کا پیغام شہریوں اور صحرانشینوں سب کی طرف تھا اس لیے اس نے جن وانس دونوں گروہوں کو مخاطب کیا ہے۔ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہاں جن سے مراد انسان ہی ہیں۔یعنی وہ وحشی قبائل (Gypsis) جو جنگلوں اور صحراؤں میں رہا کرتے تھے۔مثلاً سورۃ انعام میں ہے: یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ (6/131) اے گروہ جن وانس، کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے۔قرآن نے کسی رسول کا ذکر نہیں کیا جو جن تھا۔اور سورہ اعراف میں اس کی تصریح کردی کہ رسول، بنی آدم میں سے، انہی کی طرف بھیجے گئے تھے (7/35)۔سورہ جن اور سورہ احقاف میں مذکور ہے کہ جنوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کے پاس قرآن سننے کے لیے آئی (دیکھئے 72/1، 46/29)۔اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ''جنوں'' کی طرف رسول انسانوں میں سے ہی ہوتے تھے۔انہی سورتوں (سورۃ جن اور سورۃ احقاف) سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جو جن رسول اللہ ﷺ کے پاس قرآن سننے کے لیے آئے تھے وہ انسان ہی تھے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ اگر ''جن وانس'' اکٹھے ہوجائیں تو بھی اس قرآن کی مثل نہ بنا سکیں۔سورہ انعام میں ہے کہ ''انس وجن'' کے سرکش لوگ انبیاء کی مخالفت کیا کرتے تھے (6/113)۔سورۃ اعراف میں ہے کہ ''جن وانس'' میں اکثریت ان کی ہے جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے اس لیے وہ اہل جہنّم ہیں (7/179)۔سورۃ حم السجدہ میں ہے کہ اہل جہنّم کہیں گے کہ ہمیں ''جن وانس'' میں سے بعض نے گمراہ کیا تھا (41/29)۔سورہ انعام میں ہے کہ انس کہیں گے کہ ہم جنوں سے فوائد حاصل کیا کرتے تھے اور جن کہیں گے کہ ہم انس سے فائدے اٹھایا کرتے تھے (6/129)۔سورۃ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جن وانس کے لشکر تھے (27/17)۔ان جنوں کے متعلق سورۃ سبا میں ہے کہ وہ ہیکل کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔مجسمے تراشتے تھے۔لگن اور دیگیں بناتے تھے (34/13)۔سمندروں میں غوطہ خوری سے موتی نکالتے تھے (21/82)۔انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا (38/37-38)۔تورات میں اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صور کے بادشاہ سے صیدونی قوم کے آدمی جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے لیے مانگے۔چنانچہ یہ قبائل اور ''جبلیم'' پہاڑی قبائل ان کے لیے لکڑیاں کاٹتے اور پتھر تراشتے تھے۔ان کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فلسطین کی پہاڑی اور جنگلی (غیر بنی اسرائیل) قبائل میں سے ستر ہزار آدمیوں کو بطور مزدور اور دس ہزار کو درخت کاٹنے اور پتھر تراشنے پر متعین کیا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن میں 'جن وانس' سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں۔ اِنس جو مانوس تھے اور جن، جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے۔

قرآن کریم میں جنّۃٌ کا لفظ بڑی جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ قرآنی نظام پر عمل پیرا ہونے سے اس دنیا میں جس قسم کا فردوس بدوش معاشرہ متشکل ہوتا ہے اسے بھی جنت سے تعبیر کیا گیا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں حسن عمل سے جو خوشگوار نتائج سامنے آتے ہیں انہیں بھی جنت ہی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآن پر عمل کرنے والوں (مومنین) کو اس دنیا میں جس قسم کا جنتی معاشرہ نصیب ہوتا ہے اس کی تفاصیل قرآن کے مختلف مقامات میں مذکور ہیں۔ لیکن اسے اگر دو لفظوں میں سمجھنا چاہیں تو اس آیت کو سامنے لے آنا چاہیے جو آدم کی سرگزشت سے متعلق ہے۔ اس جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2/35) ''اس میں سے جہاں جی چاہے نہایت فراغت سے کھاؤ لیکن اس شجر کے قریب نہ جانا۔'' یعنی جنت اس معاشرہ کا نام ہے جس میں زندگی کی تمام آسائشیں بافراط موجود ہوں۔ جہاں سامان زیست کی تمام فراوانیاں ہوں (صرف غذا ہی نہیں بلکہ لباس، مکان، یعنی تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی 20/118-119) لیکن اس کا استعمال حدود اللہ (قوانین خداوندی) کے مطابق کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو اس معاشرہ کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ اسی لیے اسے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (2/25) کہا گیا ہے۔ یعنی اس باغ کے نیچے آب رواں ہمیشہ جاری رہے گا۔ قرآن نے اس کی تفسیر ان الفاظ سے کردی ہے اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (13/35) ''اس کے پھل اور دیگر آسائشیں ہمیشہ رہیں گی۔'' باقی رہے اعمال حسنہ کے وہ نتائج جو مرنے کے بعد سامنے آئیں گے، سو اگرچہ انہیں بھی جنت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (32/17) ''خدا نے اعمال کے بدلے میں آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان چھپا کر رکھا ہے وہ کسی انسان کے حیطہ ادراک میں نہیں آسکتا۔'' اُس زندگی کی کیفیات کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت کی اس قدر تفاصیل دینے کے باوجود یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ سب تمثیلی بیان ہے۔ (13/35)

لیکن اس دنیا کی جنت ہمارے سامنے آسکتی ہے، اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآن کے متعین کردہ خطوط پر متشکل کرلیں۔ اس میں انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کی تمام آسائشیں اور راحتیں موجود ہوں گی۔ لیکن اس سے بعد کی زندگی کی جنت کی کیفیت ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ ہمارا موجودہ شعور محسوسات کی حد سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس دنیا میں جنتی زندگی بسر کرنے سے نہ صرف طبعی آسائشیں ہی ملتی ہیں بلکہ انسانی ذات (Personality) کی بھی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ اس سے انسانی ذات اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ اس زندگی کے بعد اگلے ارتقائی مراحل طے کرکے اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ اس قسم کی انسانی ذات مرنے کے بعد جس مرحلہ میں پہنچتی ہے اس کا نام جنت ہے۔

وہ انسانی زندگی کی آخری منزل نہیں بلکہ آگے بڑھنے کا مقام ہے۔ اس لیے کہ وہاں بھی ''انسان کا نور اس کے آگے آگے چل رہا ہوگا'' (57/12) اس کے برعکس جن کی ذات کی نشوونما (Development) رک چکی ہوگی، جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی، وہ اہل جہنم ہوں گے۔ بہرحال مرنے کے بعد کی جنت اور جہنم، مقامات نہیں ہیں۔ انسانی ذات کی کیفیات ہیں جن کی حقیقت ہم آج سمجھ نہیں سکتے۔ آج ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی طرح اس دنیا کی جہنم (جس میں ہم سب مبتلا ہیں) جنت سے بدل جائے۔ یہ قرآنی نظام کی رو سے ہوگا۔

ج ن ی

کسی کا پھل توڑ کر لے جانا جرم ① ہے۔ اس سے اَلْجِنَایَۃُ اس جرم کو کہتے ہیں جس سے سزا لازم آتی ہو۔ جب ایک شخص کسی دوسرے کا پھل توڑ کر لے جانے سے مجرم بنتا ہے تو جو لوگ دوسروں کی محنت کے محاصل کو غضب کر لیں وہ مجرم کیوں نہیں؟

ج ہ ل

جاہلیت سے مراد ان کی جہالت نہیں بلکہ اُس دین سے ناواقفیت ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ ان تک پہنچا۔ لہٰذا رسوم جاہلیت سے مراد وہ رسوم ہی نہیں جو زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں رائج تھیں۔ اس سے مراد وہ تمام غلط اعتقادات اور غیر قرآنی اعمال ہیں جو دین سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمانوں میں پھیل رہے ہیں۔ نیز علم ہو جانے کے بعد بھی اسی روش پر جمے رہنا (محض اس لیے کہ وہ روش اسی طرح چلی آ رہی ہے) جاہلیت ہے۔

قرآن کریم کی رو سے علم حاصل نہ کرنا جرم ہے اور علم حاصل ہو جانے کے بعد اپنی غلط روش میں تبدیلی نہ کرنا اس سے زیادہ سنگین جرم۔ سورہ بقرہ میں یہ لفظ هُزُوًا (2/67) کے ساتھ آیا ہے، لہٰذا اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو زندگی کے مسائل اور احکام و قوانین کو سنجیدگی (Seriously) سے نہ لیں، انہیں مذاق ہی سمجھیں جاہلیت کہلائے گی۔

ج ہ ن م ۔ جہنم

خدا کے قانون ربوبیت کا منشا یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ انسانیت برومند اور ثمر بار ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں انسانیت نشوونما پائے جنتی معاشرہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ معاشرہ جس میں انسانیت ذبح ہو جائے اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے جہنمی معاشرہ ہے۔

سورہ بنی اسرائیل میں جہنم کے متعلق کہا ہے وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا (17/8) جہنم ان لوگوں کے لیے روک کا

① ایک روٹی کو چرانے کی مقرر ہے سزا ملک جو لوٹ لے، اس کی کوئی تعزیر نہیں؟ ممتاز کرن

مقام ہے جو قانون خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

چونکہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لیے جس کی نشوونما یہاں رک جاتی ہے وہ زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لیے اس زندگی میں بھی وہ جہنم میں رہتا ہے۔ اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اُس زندگی میں جہنم کی کیفیات کیسی ہوں گی، اس کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ موجودہ زندگی میں جہنم کا عذاب ہم ہر وقت محسوس کر سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ اجتماعی طور پر جو قوم غلط راستے پر چلتی ہے اس کی سعی و عمل ثمر بار ہونے کی بجائے جل کر خاکستر ہو جاتی ہے یہ جہنم ہے۔ اور اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی۔ اسی طرح اس معاشرہ میں رہنے والے افراد کے جوہرِ انسانیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

جہنم، انسان کے اپنے اعمال ہی سے بنتی ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (29/54) ''یقیناً جہنم کفار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔'' وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (82/16) یہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ وہ انہیں اب بھی دیکھ رہی ہے۔ ان کے سامنے ہی ہے، لیکن ان کا عدم احساس اسے ان کی نظروں سے اوجھل کیے ہوئے ہے۔ جب ان کی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ ابھر کر سامنے آجائے گی۔ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (79/36) وہ دیکھنے والے کے لیے ابھر کر سامنے آجائے گی۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اس میں ''یوم الدین'' میں داخل ہوں گے۔ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ (82/15)۔ يَوْمَ الدِّيْنِ، ظہورِ نتائج کا زمانہ ہے، اس دنیا میں یا مرنے کے بعد۔

جوب

قرآن میں ہے: اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (11/61) ''یقیناً میرا رب قریب ہی ہے اور بات کا جواب بھی دیتا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے: اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2/186) ''میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''

دعا سے مفہوم ہے خدا کے قوانین کا اتباع کرنا اور اس کی طرف سے جواب کے معنی ہیں ان قوانین کا نتیجہ خیز ہونا۔ چنانچہ سورۃ المومن میں ہے وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (40/60) ''تمہارا نشوونما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا'' سورہ بقرہ میں جہاں یہ کہا ہے کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2/186) ''میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں'' تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ (2/186) ''لہٰذا انہیں چاہیے کہ میرے قوانین پر ایمان رکھیں اور میری اطاعت کریں۔'' یہ لوگ یہ کچھ کریں اور میں ان کی سعی و عمل کو نتیجہ خیز کروں گا۔ یہ ہے دعا اور اجابت دعا کا قرآنی مفہوم۔ یعنی جو کچھ خدا کے تقاضے ہیں تم انہیں پورا کرو۔ جو کچھ تمہارے تقاضے

ہوں گے خدا انہیں پورا کر دے گا۔ یہی خدا کا قانون ہے۔

ج و ع

قرآن کریم نے جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں بھوک (رزق کی تنگی) نہیں ہوگی۔ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا (20/118) ''تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں بھوکا نہیں رہے گا۔'' کفرانِ نعمت (خدا کی طرف سے ملے ہوئے سامان زیست کو چھپا کر رکھنے یا غلط طور پر استعمال کرنے) کا نتیجہ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (16/112) بتایا ہے۔ یعنی بھوک اور خوف کا عذاب۔ لہٰذا کسی قوم میں سامان رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے اور اس کی فراوانی جنتی معاشرہ کی خصوصیت۔ قرآن کی رو سے جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نظام میں ہر فرد کو روٹی مل جائے اسے نظام خداوندی اور اس معاشرہ کو جنتی معاشرہ کہا جائے گا۔ نظام خداوندی اور جنتی معاشرہ کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اور جب تک وہ سب موجود نہ ہوں اسے جنتی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس نظام یا معاشرہ میں لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی نہ ملی اسے نہ نظام خداوندی کہہ سکتے ہیں نہ جنتی معاشرہ۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کوئی قوم ایسے ہنگامی حالت سے گزرے جس میں کچھ وقت کے لیے رزق کی تنگی آ جائے (مثلاً جنگ کے زمانہ میں) لیکن کسی قوم میں نہج زندگی ایسا قائم ہو جانا ہے جس میں تمام افراد کو پیٹ بھر کر، بااِطمینان، کھانے کو نہ ملے، خدا کا عذاب ہے، اور جو قوم ایسی حالت سے نکلنا نہیں چاہتی وہ جہنم میں رہنا چاہتی ہے۔

ح ب ب

قرآن میں اللہ کی محبت کا ذکر آیا ہے وہ مقامات تشریح طلب ہیں۔ مثلاً سورہ البقرہ میں ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (2/165) ''اور ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور قوتوں کو اس کا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوتوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی محبت بہت بڑھ کر کرتے ہیں۔'' (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے)۔ اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○ (3/30-31) ''ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصوروں کو معاف کر دے گا اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔'' (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے)۔

ان آیات سے اللہ سے محبت اور اللہ کی محبت کی سند لی جاتی ہے۔ اور پھر اس پر تصوف کی پوری عمارت استوار کر لی جاتی ہے جس کا اصل الاصول خدا کی محبت ہے۔ اور محبت بھی ایسی شدت کی محبت کہ اس ذات میں اپنے آپ کو جذب کر دینا اس کا منتہیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سارا تصور لفظِ محبت کو اُن معنوں میں لے لینے سے پیدا ہوتا ہے جن معنوں میں ہم اسے انسانوں سے محبت کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

خدا سے اس قسم کے تعلق کا تصور غیر قرآنی ہے۔ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے ہمارے حیطہ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس سے اس قسم کی محبت کا سوال پیدا نہیں ہوتا جس قسم کی محبت انسانی محبوب سے کی جاتی ہے۔ (خواہ وہ کسی کی اولاد ہی کیوں نہ ہو)۔ کسی اَن دیکھی چیز سے اس قسم کی محبت کا پیدا ہونا نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔ یہی وہ دشواری تھی جس کے پیش نظر لوگوں کو خدا کو بشکل انسان (اوتاروں کے روپ میں) ڈھالنا پڑا یا اس کی مورتیاں بنانی پڑیں۔

حُبٌّ کے معنی ہیں کسی چیز پر ثابت قدمی اور خلوص کے ساتھ جمے رہنا۔ لہٰذا خدا کے ساتھ انسان کی محبت کے معنی ہیں، احکامِ خداوندی کی خلوص اور استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ ان پر نہایت ثابت قدمی سے جمے رہنا۔ ان سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہٹنا۔

اب رہا خدا کا بندے سے محبت کرنا، تو اس کے لیے اس لفظ کے دوسرے معانی کو سامنے لائیے یعنی حفاظت کرنا، تھامے رکھنا، مضمر صلاحیتوں کا نمودار کرنا، اعمال کا نتیجہ خیز ہونا۔ لہٰذا خدا کی طرف سے محبت کے معنی ہیں ان تمام ثمرات و نتائج کا حاصل ہو جانا جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا فطری ماحصل ہیں۔

یہ ہے قرآنی مفہوم، انسان کے خدا سے محبت اور خدا کے انسان سے محبت کرنے کا۔ یہی مفہوم اللہ کا انسان کے ولی (دوست) ہونے یا انسان کا اللہ کا ولی ہونے سے ہے۔

ح ب ر

لغت میں اَلْحَبْرَۃُ عمدہ گانے کو کہتے ہیں۔ درحقیقت اس میں حسن و جمال اور زیبائی و رعنائی نیز خوشی اور مسرت کے تمام مظاہر آ جاتے ہیں خواہ وہ جنت، نگاہ ہوں یا فردوسِ گوش۔ آرٹ کے شاہکار ہوں یا حیات افروز موسیقی۔

اَلْحَبْرُ عالم کو اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے علم کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی رہتا ہے اور اس کے عمدہ آثارِ قدم کی پیروی کی جاتی ہے۔

قرآن، کائنات کی ہر حسین شے کی تحسین (Appreciation) کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی تاکید کرتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ انسان حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے۔ ایک جنتی معاشرہ اس قسم کے حسن کا مظہر ہوتا ہے جس میں آرٹ، نغمہ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر وجہِ شادابیٔ قلب و نظر بنتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں حدود اللہ کا ہر وقت خیال

رکھا جاتا ہے اس لیے اس سے مضر اثرات مرتب نہیں ہونے پاتے۔ حسن وزیبائی کا وہ کون سا گوشہ ہے جس کا ذکر، قرآن نے، جنتی زندگی کے ضمن میں نہیں کیا؟ لیکن زندگی، جنتی بنتی اس وقت ہے جب وہ قوانینِ خداوندی کے تابع رہے۔

ح ب ط

قرآن کریم نے حَبْطِ اَعْمَال (اعمال کے رائیگاں جانے) کی اصطلاح نہایت پُرمعنی طریق سے استعمال کی ہے (2/217)۔ جانور جو کچھ کھاتا ہے وہ اگر اچھی طرح ہضم ہو کر اس کا جزو بدن بن جائے تو اس سے اس کی صحت قائم رہتی ہے اور وہ فربہ وتوانا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کا چارہ ہضم نہ ہو تو اس کا پیٹ پھول جاتا ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بہت فربہ ہے۔ لیکن یہ درحقیقت فربہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہلاکت کی علامت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان بہت سے کام ایسے کرتا ہے جو اسے بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے بڑے خوشگوار نتائج کی توقع وابستہ رکھتا ہے لیکن وہ درحقیقت اس کی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں۔ اسے قرآن حَبْطِ اَعْمَال سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جن اچھے نتائج کی توقع ان سے وابستہ کی گئی ہو اُن نتائج کا مرتب نہ ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی اعمال خوشگوار نتائج مرتب کر سکتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کے مطابق صحیح نظام کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (2/217) انہی کے لیے آیا ہے۔ یعنی وہ جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں رائگاں جاتے ہیں۔ ان کے اعمال کے صرف نشانات رہ جاتے ہیں۔ نتائج کچھ نہیں نکلتے۔ اور وقت اور توانائی، سب ضائع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اچھے اعمال وہ نہیں جنہیں ہم اپنے تصور یا عقیدہ کے مطابق اچھے سمجھ لیں۔ اچھے اور برے اعمال کا معیار، اللہ کی کتاب ہے۔ جو اعمال اس کی رُو سے اچھے نہیں وہ کبھی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے خواہ ہم انہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور کتنی ہی اچھی نیت سے انہیں کیوں نہ کریں۔

کائنات کی میزان میں فیصلے انسانوں کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نہ صرف اچھے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلے گا تاکہ ہم قدم قدم پر اس کا محاسبہ کرتے جائیں کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں۔ اگر ہمارے اعمال کے وہ نتائج نہیں برآمد ہوتے جو قرآن کریم نے بتا رکھے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اعمال قرآن کریم کے مطابق سرزد نہیں ہو رہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں اور اپنی خوش فہمی کے ماتحت ان اعمال کو ویسے ہی کرتے جائیں تو یہ سب رائگاں جائیں گے۔ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18/105) ''سو ان کے اعمال بے نتیجہ رہ گئے۔ لہٰذا ہم ان کے لیے ظہورِ نتائج کے وقت میزان تک کھڑی نہیں کریں گے۔'' ان کے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ غور کیجئے کہ ہمارے کس قدر اعمال ہیں جو یوں بے نتیجہ چلے جا رہے ہیں اور ہم کبھی رک کر نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا

ہے، حالانکہ خدا کی کتاب (اعمال کے نتائج کی زندہ کسوٹی) ہمارے پاس ہے۔ خود یہی احساس کیا کم الم و تکلیف کا موجب ہے کہ جن کاموں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ان کے نتائج ایسے خوشگوار مرتب ہوں گے، وہ آخرالامر بے نتیجہ ثابت ہوں۔

انسان کا کوئی عمل، حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال تک بھی خدا کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتا۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (50/17) نے اس کی مزید وضاحت کر دی ہے۔ یعنی انسان کی ہر بات پر ایک نگہبان (چوکیدار۔ محاسب) موجود ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کے رگِ جان سے بھی قریب تر ہونے کا مفہوم۔ یعنی خدا کا قانونِ مکافات جو انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات کو بھی محیط ہے۔

ح ج ج

حج، عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو اس اُمت کے مرکزِ محسوس (کعبہ) میں اس غرض کے لیے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل و حجت کی رو سے تلاش کیا جائے، اور اس طرح یہ اُمت اپنے فائدے کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (22/28) ''تاکہ یہ اپنے فائدے کی باتوں کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھ لیں۔'' نظام کے قیام کے لیے مرکزی اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ غور کیجئے! قرآن نے اُس زمانے میں مشاورتی نظام (42/38) اور اس کے لیے اجتماعات کا تصور دیا جب ساری دنیا پر بادشاہی نظام مسلط تھا اور دنیا اسے خدا کی رحمت سمجھتی اور بادشاہ کو ''ایشور کا اوتار'' اور خدائی اختیارات (Divine Rights) کا حامل خیال کرتی تھی۔ صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات سے لے کر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ اُمت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوعِ انسان کی بہبود کے سامان و ذرائع پر غور کریں۔

ح ج ر

غلط راستے پر چلنے والے عوام اور خواص (لیڈر اور ان کے متبعین) سب جہنم میں ہوں گے۔ اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہو جاتی ہے (مثلاً 14/21؛ 33/67) اور اگر اس کے معنی سونے چاندی کے لیے جائیں تو اس کے معنی ہوں گے سرمایہ پرستی جو ایک جہنمی معاشرہ پیدا کر دیتی ہے، کیونکہ سورۃ توبہ میں ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی (دولت) جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی ربوبیت کے لیے کھلا نہیں رکھتے تو اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیوں پر اور پشت پر داغ دیا جائے گا (35-9/34)۔ لہٰذا جہنم کا ایندھن سرمایہ پرست اور ان کی وہ دولت ہے جسے وہ نوع انسانی کی منفعت کے لیے عام نہیں کرتے بلکہ انفرادی مفاد کی خاطر جمع رکھتے ہیں۔

ح ج ز

حِجَازٌ کواس لیے حِجَازٌ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ نجداورتہامہ کے درمیان روک ہے۔

ح د ث

شرعی اصطلاح میں الحدیث اس قول یا عمل کو کہتے ہیں جسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔(واضح رہے کہ حدیث کی تفصیلی تعریف طویل ہے۔ہم نے اسے یہاں مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے)۔قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا۔

ح د د

قوانین الٰہیہ کوحُدُوْدُاللہِ سے تعبیر کرنے میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔قرآن کریم نے (عام طور پر) صرف اصولی احکام دیئے ہیں اور یہ چیز انسانوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانوں کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین ایک نظام کے تابع خودمرتب کریں۔قرآن کے اصول توغیر متبدل رہیں گےلیکن ان کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی قوانین بنائے جائیں گے وہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہیں گے۔اس طرح انسان کو غیرمتبدل حدود کے اندر سعی وعمل کی پوری آزادی رہتی ہے،جس طرح کھیل کے میدان میں چندلکیروں اور ضابطوں کے اندرٹیم کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اختیاروارادہ کے مطابق کھیلے۔لہٰذاقرآن ایک ایسانظامِ زندگی پیش کرتا ہے جس میں انسان، مستقل اقداراورتبدیل ہونے والے تقاضے، دونوں کا ساتھ دیتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ وہ نہ تو انسان کی آزادی کوقاطبتہً سلب کرتا ہے کہ اس کی ہرنقل وحرکت پرغیرمتبدل پابندی عائد کردے،اورنہ ہی اسے ایسا بےزمام چھوڑتا ہے کہ وہ مستقل اقدار کی پابندی سے بھی بے نیاز ہوجائے۔ یہ ہے مقصد حُدُوْدُ اللہِ کا۔ یہ قوانین کی وہ آخری حدیں یا سِرے ہیں جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔لیکن ہم نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال کر اپنے لیے ایسے جامد احکام وضع کرر کھے ہیں جس سے اسلام ایک زندہ حرکت بننے کے بجائے منجمد اور متحجّر نظریات ورسمیات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ ہی نہیں دے سکتا۔

چندحدود(Limitations) کے اندرکھلی آزادی۔ یہ ہےقرآن کا عطا کردہ دین۔

ح ر ج

سورۃ حج میں ہے:وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (22/78)’’اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی

نہیں رکھی۔'' اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ دین زبردستی قبول نہیں کرایا جاسکتا۔ اسے بہ طیب خاطر اختیار کیا جائے گا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2/256) اور یہ معنی بھی کہ دین میں جن قوانین کی اطاعت کرائی جاتی ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ تم سے کوئی بیگار لی جاتی ہے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ خود تمہاری ذات میں وسعت اور استحکام پیدا ہو۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2/286) ''اللہ کسی نفس کو کسی کام کے لیے مکلف نہیں ٹھہراتا بجز اس کے کہ اس سے مقصد خود اس ذات (نفس) میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے۔'' یاد رکھئے! ''دین میں تنگی نہیں'' سے مراد یہ نہیں کہ آپ دین (نظام) کے اندر بھی رہیں اور اس کے بعد جن باتوں میں آسانی محسوس کریں انہیں مانیں اور جن میں کچھ گرانی نظر آئے انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیں کہ دین میں تنگی نہیں۔ جب تک آپ اس نظام کے اندر ہیں اس کے تمام قوانین وضوابط کو بہ طیب خاطر ماننا ہوگا۔ جس وقت آپ اس میں تنگی محسوس کریں اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائیں۔ نظام کے اندر رہتے ہوئے نظام کے ہر حکم اور ضابطہ کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ جبر نہیں بلکہ ایسی پابندی ہے جسے انسان خوش دلانہ اور رضا کارانہ اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ یعنی اس کا بہ طیب خاطر دین قبول کر لینا اس امر کا اقرار ہے کہ وہ دین کی عائد کردہ پابندیوں کو اپنے اوپر لازم قرار دے گا۔ دین میں تنگی نہ ہونے سے یہی مراد ہے۔

ح ر ض

قرآن میں نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے: وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ (8/65) اس کے عام معنی ہیں ''تو انہیں جنگ کے لیے برانگیختہ کر۔'' لیکن اس کے اصلی معنی ہوں گے تو ان مومنین (یعنی اپنے رفقاء) کی تمام کمزوریوں اور کمیوں کو دور کر دے تاکہ وہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار شریک ہونے کے قابل ہو جائیں۔ اِسی کا نام تزکیہ ہے۔ وَيُزَكِّيْهِمْ (62/2) یعنی نشوونما دینا، بالیدگی اور نمو پیدا کرنا۔ کمزوری اور کمی کو رفع کرنا اس پروگرام [1] کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔

ح ر ف

اہل کتاب نے اپنی آسمانی کتابوں میں جو تحریف کی ہے اس کے متعلق سورۃ نساء میں ہے: يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (4/46) ''وہ کلمات کو ان کے مقامات سے ہٹا دیتے ہیں۔'' نیز (5/41)۔ اس سے تحریف لفظی بھی مراد ہو سکتی ہے اور تحریف معنوی بھی۔ اور سورۃ بقرہ میں ہے: يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ--- (2/79) ''یہ لوگ الکتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔'' اس سے تحریف لفظی مراد ہے۔

---

[1] قرآنی پروگرام مراد ہے۔

حرام

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم، ہر انسان محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17/70) ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے)۔ اس لیے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے، اس پر اپنی مرضی چلائے، اسے اپنے احکام کے تابع رکھے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3/78) ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ نے اسے ضابطۂ قوانین، یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو۔'' لہٰذا قرآن کریم کی رُو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً:

(الف) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم نے اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے اختیار کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیب خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہے، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون کی پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہٰذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رُو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑہا مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی اُمت مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لیے کوئی واضح اور متعین سند (Authority) ہونی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

قرآن کریم نے اس قسم کی پابندی کے لیے ''حرام'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو ''حلال'' کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں رسیاں کھول کر آزاد کر دینا۔ اس لیے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا، منع کر دینا، اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن کریم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔۔۔ (2/172-173)

''اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔''

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

''(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامان زیست کو حرام قرار دیا ہے؟'' (7/32)

اس سے آگے ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (7/33)

''ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔''

ان آیات سے ظاہر ہے کہ

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(ii) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔

(iii) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(iv) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن خدا ہر شخص سے براہ راست [1] کلام نہیں کرتا اس لیے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رو سے دیئے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ سورہ انعام میں ہے:

---

[1] اب قرآنِ کریم کی وساطت سے ہر شخص (مسلم ہو یا غیر مسلم) اللہ سے براہِ راست بات کر سکتا ہے۔ اور قرآنِ حکیم کی آیات کے ذریعے ہی اُسے اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔ (منظور الحسن مرتب و مؤلف)

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ (6/146)

''(اے رسول ان سے) کہہ دو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں اس میں کسی چیز کو جو کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے (مردار، بہتے ہوئے خون، لحم خنزیر، اور اس کے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو۔)''

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام وحلال کا فیصلہ اس وحی کی رو سے کر دیا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سورۃ حج میں ہے:

وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ... (22/30)

''اور تمہارے لیے چوپائے حلال ہیں بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں اس وحی کی رو سے بتادیا گیا ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنائی) جاتی ہے۔

یہ ''مَا يُتْلٰى'' وہ وحی ہے جو 'الکتاب' میں ہے۔ سورۃ عنکبوت میں ہے: اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ (29/45)

''اسے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے۔''

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3/78) ''اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم وتدریس کرتے ہو۔'' سورۃ نمل میں واضح الفاظ میں بتادیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنَّمَآ اُمِرْتُ ...... اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (27/91-92) ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کروں۔''

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور

(ii) اسے جو کچھ حرام قرار دینا تھا اسے قرآن میں بتادیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۃ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں جس میں پوری تحدی سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7/32) ''ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟'' اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دے دے۔ اس بارے میں، اور تو اور، خود نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ... (66/1)

''اے نبی جس چیز کو اللہ نے تیرے لیے حلال قرار دیا ہے، تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے؟''

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یا بات) تھی جسے نبی اکرم ﷺ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ (اس لیے کہ یہ گوشہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حق نبی اکرم ﷺ کو بھی نہیں دیا کہ دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف، خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسے شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

اس مقام پر ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طیباً کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے یَاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوۡا مِمَّا فِی الۡاَرۡضِ حَلٰلًا طَیِّبًا (2/168) ''اے نوع انسانی! زمین کی پیداوار جو تم پر حلال کی گئی ہے، اسے طیب انداز سے کھاؤ۔'' طیب کے معنی ہیں خوشگوار، پاکیزہ، مفید، نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے چاہو اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انہیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق، میلان طبع، طبی ضرورت اور دیگر تضمنات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لیے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے ناپسند ہے، اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے گویا اس نے اسے اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف، یا عقیدتمندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اُس چیز میں کوئی دینی قباحت ہوگی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح بالواسطہ (Indirectly) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے۔ پہلی قوموں میں ایسا ہو چکا تھا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی شے کو اپنے لیے ممنوع قرار دے لیا۔ ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے لیا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) ''خدا نے حرام قرار دیا تھا'' اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ: کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِہٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىۃُ ... (3/92) ''یہ تمام کھانے (جو اَب مسلمانوں کے لیے حلال قرار دیئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھے سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوبؑ) نے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔''

وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر

ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہوگی۔ اس واقعہ کے پیش نظر، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ آپ نے اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی) لیکن ہوسکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی امت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کرلیں۔ اس لیے آپ کے لیے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے بھی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث نا تمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۃ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اُس سورت میں نبی اکرم ﷺ کی خصوصیات کبریٰ کے ضمن میں فرمایا کہ: وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (7/157) ''وہ ان کے لیے طیبات کو حلال قرار دے گا اور خبائث کو حرام ٹھہرائے گا۔'' اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرم ﷺ کو بھی حاصل تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ جب

(i) اللہ تعالیٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلت و حرمت کا حق صرف خدا کو ہے

(ii) اور خود نبی اکرم ﷺ سے بہ نص صریح کہتا ہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (66/1) ''جس چیز کو اللہ نے تیرے لیے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔''

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ حلت و حرمت کا اختیار نبی اکرم ﷺ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رو سے بیان ہوئے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کردیتا ہے اور کبھی رسول کی طرف (کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول ہی کی وساطت سے پہنچے تھے) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی (یعنی قرآن کریم) ہوتا ہے، سورہ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کردیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ: وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (2/89) ''جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں۔'' الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے، خدا، وحی، کتاب، رسول، ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد، اب آیت زیر نظر کو دیکھئے یہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ: وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (7/157) یعنی رسول ان کے لیے طیبات کو حلال کرتا ہے اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن

سورۂ مائدہ میں ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ (5/87) ''اے ایمان والو! جن طیبات کو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت کرو۔'' یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طیبات کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔(اسی) سورۂ اعراف میں ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ (7/33) ''اے رسول! ان سے کہہ دے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے تو صرف فواحش حرام کیے ہیں۔'' یہاں خود رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (2/274) ''اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوٰ کو حرام۔'' لہٰذا قرآن نے جہاں حلت وحرمت کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ .... (9/29)

''(اہل کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسول نے جسے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے، ان سے جنگ کرو۔''

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول دونوں کو ہے۔ اس آیت میں ''يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ'' سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے حرام کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسول واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انہیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضامند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) حرام وحلال کا اختیار صرف خدا کو ہے۔

(۲) جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳) خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

قرآن کریم نے اس بات کو سنگین جرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھہرایا) انہیں حرام قرار دے دیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷

(5/87) ''اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنہیں اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت ٹھہراؤ۔ اور (اس طرح) حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یعنی حلال کو حرام قرار دینا، انسان کا اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ شروع میں کہا جاچکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ... (16/116) ''اور جو تمہاری زبانیں یونہی جھوٹ بیان کردیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پر محض بہتان باندھو۔ ایسی باتیں مت کیا کرو۔''

یہاں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جو مذہبی پیشوا حرام وحلال کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ (یا وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ اسے مانیں گے نہیں) اس لیے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب ''شریعت خداوندی'' کے مطابق ہے۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افترا ہے، کذب ہے، بہتانِ عظیم ہے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (10/59) ''ان سے کہا کیا تم اس پر غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لیے بطور رزق نازل کیا ہے، تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کردو) یا تم اللہ پر افترا باندھتے ہو۔''

قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پر افترا باندھتا ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پر بطور سزا حرام قرار دے دی گئی تھیں۔ سورۃ انعام میں ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ (6/147) ''اور ہم نے یہودیوں پر سب ناخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دے دیئے تھے اور گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کردی تھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا ہڈیوں کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔''

سورہ نساء میں ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ ... (4/160) ''یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں، حرام قرار دے دیں۔''

اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں۔ سورۂ نحل میں کہا گیا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے (16/118)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا انہیں حرام قرار دے دینا، لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لیے حضرت عیسیٰ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے: وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ... (3/49) ''تاکہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دے دی گئی ہیں ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔''

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر لیا۔ آپ کے بعد نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہ بتایا کہ:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (7/156)

وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرے گا اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی بھی مخالفت کی اور اس طرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا جن میں وہ اب تک ماخوذ ہیں۔

اہل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کے فتاویٰ کے مطابق حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں جن کے لیے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکین عرب، سو ان کے ہاں حرام و حلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں، جو محض توہم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ مویشیوں میں سے فلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے۔ سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (6/139)۔ فلاں چیز مردوں کے لیے حلال ہے اور عورتوں کے لیے حرام (6/140)۔ اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے، گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ہیں (6/144) ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمہارے یا تمہارے آباؤ اجداد کی مرتب کردہ ہیں (6/149)۔ تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کرتے ہو (6/141)۔ اس کے بعد انہیں چیلنج دیا گیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ (6/151)۔

ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حرام و حلال کے لیے سند صرف حکم خداوندی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور سند اور کوئی اتھارٹی نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناطے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کون سا حلال ہے اور کون سا حرام۔ سورۂ نساء کی آیت 24-12 میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے حلت و حرمت کی پوزیشن جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لیے کہ وہ حرام

ہے قرآن کریم کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ہنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت کسی شے کا استعمال عارضی طور پر ممنوع قرار دے دے۔ مثلاً برسات (یا ہیضہ) کے زمانہ میں ہیلتھ آفیسر حکم دے دیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے۔ یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ سول آبادی کے لیے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے۔ وقس علی ذالک۔ ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرم ﷺ اور خلافت راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے اور کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے۔ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں۔

ح ر ی

حراء مکہ میں ایک پہاڑ تھا جس کے غار میں (کہا جاتا ہے کہ) حضور ﷺ قبل از نبوت (رشد و ہدایت کی طلب صادق میں) جایا کرتے تھے۔ یہ صرف تاریخ کا بیان ہے۔ قرآن کریم میں اس کی صراحت نہیں۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ قبل از نبوت حضور ﷺ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں [1] رہتے تھے۔

ح ز ب

قرآن نے حِزْبُ اللهِ (58/22) اور حِزْبُ الشَّيْطٰنِ (58/19) دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ حِزْبُ اللهِ سے مراد وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی پر نہایت سختی سے کاربند ہوں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں، اور حِزْبُ الشَّيْطٰنِ وہ ہیں جو غیر خدائی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں، خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک سے متعلق ہوں۔ قرآن کریم قوموں کی تشکیل، نظریہ زیست یا نصب العین حیات کی بنیادوں پر کرتا ہے نہ کہ وطن، نسل یا زبان وغیرہ کے اشتراک پر۔ سورۃ مومن میں اَحْزَابِ (40/30) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے خدا کے رسولوں کی مخالفت کی تھی۔ سورۃ احزاب میں الْاَحْزَابَ (33/22) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے مل کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کی تھی۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30/32) ہر فرقہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ حق پر ہے (اور باقی سب فرقے باطل پر ہیں)۔ قرآن کریم نے

---

[1] جب رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے تلاشِ حقیقت میں حیران و سرگرداں پھرتے تھے تو قرآنِ کریم نے اس کیفیت کو وَوَجَدَكَ ضَآلًّا (93/7) سے تعبیر کیا ہے۔ ایک ہونے والا نبی، نبوت سے پہلے بھی، غلط تصوراتِ زندگی سے غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ صحیح تصورات اس کے سامنے نہیں ہوتے اس لیے وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے بعد اسے خدا کی طرف سے راہنمائی مل جاتی ہے تو یہ سرگردانی ختم ہو جاتی ہے۔

''كُلُّ حِزْبٍ'' (تمام فرقے) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ جب دین میں فرقے پیدا ہو جائیں تو پھر یہ سمجھنا غلط ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہے اور باقی باطل پر۔ فرقوں کا تو وجود ہی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے (30/32)۔ جب تک الدین کا نظام (یعنی اسلامی مملکت کا نظام) قائم رہے، فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب وہ نظام باقی نہیں رہتا تو دین انفرادی چیز بن جاتا ہے جس میں فرقے پیدا ہونے لازمی ہیں۔ جب فرقے پیدا ہو جائیں تو انہیں مٹانے کی ایک ہی شکل ہے۔ یعنی اسلامی نظام مملکت کا قیام۔ اس کے سوا اس ''شرک'' سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

ح ز ن

خَوْفٌ اس پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی متوقع خطرہ سے پیدا ہو (یعنی اس کا تعلق مستقبل میں واقع ہونے والے حادثہ سے ہوتا ہے)۔ جب ان معانی کے مقابل میں حُزْنٌ کا استعمال ہو تو اس سے مراد وہ غم ہوتا ہے جو اس حادثہ کی وجہ سے ہو جو گزر چکا ہے۔ کسی نقصان سے پہلے جو کیفیت ہوتی ہے وہ خَوْفٌ ہے۔ اس نقصان (یا حادثہ کے واقع ہو جانے) کے بعد خوف ختم ہو جاتا ہے اور غم یا حزن شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ (3/138) ''تم کسی قسم کا غم نہ کرو اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''

جو قوم خوف، بھوک، حزن وغیرہ کی پریشانیوں میں مبتلا ہو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی کا اتباع نہیں کر رہی۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی اور حتمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی یہاں کی زندگی بھی مرفہ الحالی اور سرفرازی کی ہو اور آخرت کی زندگی بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی۔

ح س ب

سورہ بقرہ میں ہے: وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (2/212) ''جو ایسا چاہتا ہے اسے اللہ بغیر حساب رزق دیتا ہے۔'' وہ اسے دیتا ہے لیکن اس سے لیتا نہیں۔ یا لوگوں کے عام اندازے اور شمار کے مطابق نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔ جب معاشرہ خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہو جائے تو اس میں رزق کی فراوانیاں عام اندازوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

ح س د

قرآن کریم نے حَسَدٌ کو بڑی تخریبی ذہنیت قرار دیا ہے اور اس سے اور ایسی ذہنیت رکھنے والوں کی تخریبی کوششوں سے بچنے کی تاکید کی ہے (113/5)۔ یہ بچاؤ، قانونِ خداوندی کے ساتھ گہرے تمسک (تَعَوُّذٌ) سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ح س ن

اَلْاِحْسَانُ کے معنی ہیں کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کر دینا۔ یعنی اگر کسی وجہ سے افرادِ معاشرہ میں کسی کی کسی قوت وصلاحیت میں کمی واقع ہو گئی ہے تو اس کمی کے پورا کرنے کا نام اِحْسَانٌ ہے۔

عَدْلٌ تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ذمہ ہو وہ دے دو اور جتنا تمہارا حق ہے وہ لے لو اور اِحْسَانٌ یہ ہے کہ اس سے زیادہ دو جتنا تمہارے ذمہ ہے اور اس سے کم لو جتنا تمہارا حق ہے۔ یعنی اِحْسَانٌ میں نگاہ واجب (Due) پر نہیں ہوتی بلکہ مقصد، توازن برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔

خدا کے اسماء کو اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (59/24) کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ خدا کی ذات وہ ہے جس میں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب وتوازن کو لیے، انتہائی حسن کارانہ انداز سے یک جا جمع ہیں۔ جملہ صفات اور ان میں کامل تناسب۔ یہ ہے خدا کا تصور قرآن کریم کی رو سے۔ چونکہ انسانی زندگی کا مقصود یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لے (2/138)۔ اس لیے خدا کا ''مقرب'' وہ ہے جس کی ذات (Personality) کی مختلف صلاحیتیں نشوونما حاصل کرتی جائیں، بایں نمط کہ ان میں پورا پورا توازن قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِہَا (اسمائے خداوندی، صفاتِ الٰہیہ۔ پورا پورا توازن لیے ہوتی ہیں اس لیے خدا کو انہی کے مطابق پکارو) یعنی خدا کے متعلق وہی تصور درست ہے جو ان صفات کے مطابق قائم ہو۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ: وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ (7/180) جو لوگ ان صفات میں سے کسی ایک میں بھی (توازن کی راہ چھوڑ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ لہٰذا خدا کی صفات کا اپنے اندر منعکس کرنا (یعنی انسانی ذات کے مضمر جوہروں کی نمود اور بالیدگی) ہی مقصود نہیں بلکہ ان میں حسن وتوازن قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ جس زندگی میں حسن نہیں سمجھ لیجئے کہ وہ قرآنی قالب میں ڈھلی ہوئی نہیں ہے۔ زندگی کا مقصود یہ ہے کہ تم اپنے اندر کس قدر حسن پیدا کرتے ہو اور کائنات میں کس قدر حسن کا اضافہ کرتے ہو۔ خارجی دنیا میں اس اِحْسَانٌ (حسن پیدا کرنے) کی ابتدا اپنے رفقائے سفر (دوسرے افرادِ معاشرہ) کے ساتھ حسن معاملہ سے ہوتی ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (2/83)۔ لوگوں سے ایسی باتیں کرو جن سے حسن پیدا ہو۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ: اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عامہ کے لیے کھلا رکھو اور اس طرح اَحْسِنُوْا (2/195) معاشرہ میں حسن پیدا کرتے رہو۔ اسی کا دوسرا نام اِحْسَانٌ ہے (2/83)۔ [1]

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم سے جو حسن پیدا کرنے (اِحْسَانٌ) کی تاکید کی گئی ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری

---

[1] ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہیے یعنی کسی آدمی پر کوئی وقت آ پڑا، وہ دوسرے کے پاس مدد کے لیے گیا۔ اس نے اس کی مدد کی۔ یہ اس کا احسان ہوا۔ اب یہ دوسرا شخص اس انتظار میں رہے کہ کب اس پہلے شخص پر کوئی مصیبت پڑے اور یہ اس کے احسان کا بدلہ اتارے۔ اور جب تک اس کا بدلہ نہ اتارے اس کا بے دام غلام بنا رہے۔ اگر اس نے اس کی کسی بات سے بھی اختلاف کیا تو اس نے جھٹ کہہ دیا کہ یہ کس قدر احسان فراموش ہے؟ یہ ہے احسان سے مراد ہمارے معاشرے میں، اور وہ ہے احسان کا مفہوم قرآن کی رو سے۔

ہے کہ یہ چیز کسی معاوضہ کی خاطر نہیں کی جائے گی۔ اس لیے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ(55/60)۔حسن پیدا کرنے (احسان) کا بدلہ (یعنی نتیجہ) یہ ہے کہ اس سے حسن پیدا ہوجاتا ہے اور یہی مقصود بالذات ہے۔یعنی احسان کا بدلہ یہ ہے کہ تم احسان کرتے جاؤ اور اس کے معاوضہ کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ۔اس لیے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ جب کسی کے ساتھ احسان کرتے ہیں تو ان سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ :لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76/9) ''ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں۔'' لہٰذا قرآنی تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ انسان حسن پیدا کرے۔خود اپنی ذات میں، دوسرے انسانوں میں اور خارجی کائنات میں (Make it more Beautiful)۔ یہ چیز اپنا بدلہ آپ ہوگی۔اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جہاں دیکھو کہ توازن بگڑ گیا ہے، اسے درست کردو۔اس کے درست کرنے کا طریقہ ہے کہ وہاں حسن پیدا کردو (توازن قائم کردو) اس سے بگاڑ خود بخود دُور ہوجائے گا۔اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ (23/96)۔ پہلے خود اپنا جائزہ لو۔اگر تمہاری ذات متوازن (Balanced Personality) نہیں تو اس میں احسان (توازن پیدا کرنے) کی کوشش کرو۔اس کے بعد جب کسی دوسرے شخص کو دیکھو کہ وہ اپنا توازن کھو رہا ہے تو اس سے احسان کرو۔یعنی اس کا توازن قائم کرنے کی کوشش کرو۔جب معاشرہ کا توازن بگڑ جائے تو معاشرے میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔اس طرح خارجی کائنات میں علم و تحقیق کی رو سے حسین اضافے کرتے جاؤ۔تمہاری یہ کوششیں اپنا بدلہ آپ ہوں گی۔حسن پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسن پیدا ہوجائے گا۔یعنی بگڑا ہوا توازن قائم ہوجائے گا۔زندگی سے یہی مقصود ہے۔یعنی تخلیق حسن۔اور خدا کی ذات وہ ہے جس میں حسن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے (الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى)[1]۔اس لیے انسانی ذات کی صحیح صحیح نشوونما اور تکمیل کے لیے خارجی معیار (Objective Standard) خدا کی ذات ہے جس کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے۔

ح ش ر

ہمارے ہاں حشر سے مراد صرف مرنے کے بعد (قیامت کے دن) حساب کتاب کے لیے جمع ہونا لیا جاتا ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی جامع اصطلاحات ہیں جن سے مفہوم صرف جی اُٹھنا نہیں بلکہ اس دنیا میں قوموں کی نشاۃِ ثانیہ بھی ہے۔

ح ص ر

سورۃ بنی اسرائیل میں جَهَنَّمَ کو حَصِيْرًا کہا گیا ہے (17/8)۔یعنی وہ مقام جہاں کسی کی نشوونما (Development) رک جائے، جہاں کسی کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔

---

[1] قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفات جسے اُس نے ''الاسماء الحسنیٰ'' کہا ہے وہ پچیس کے قریب ہیں جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر وہ تمام صفات انسان اپنے اندر اُجاگر کرے تو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مومن قرار دیا جاسکتا ہے۔

ح ص ن

عورت کی پاکدامنی دوطریق پر ہوتی ہے۔ایک تو یہ کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ شادی کر کے (صرف ایک کی ہو جائے) اور اس طرح اس کی عصمت (غیروں کے ہاتھوں سے) محفوظ ہو جائے۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے لیے دو لفظ استعمال کیے ہیں: مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (4/24)۔اس کے معنی ہیں اپنے مادہ کو یوں ہی بہادینا یا گرادینا۔یعنی اگر یہ اختلاط محض مادہ کو نکالنے کے لیے (جسے شہوت رانی کہتے ہیں یعنی جنسی اشتعال کی تسکین۔زنا کا مقصد یہی ہوتا ہے) تو یہ ناجائز ہے۔اور اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ اس طرح مادہ (استقرارِ حمل کی رو سے) محفوظ ہو جائے اور یونہی بہہ کر ضائع نہ چلا جائے، تو یہ اختلاط جائز ہے۔اسے نکاح کہتے ہیں۔

ح ض ض

قرآن کریم میں ہے: وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (69/34) ''وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔''

سورۃ فجر میں وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ (89/18) آیا ہے۔''وہ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے۔'' ایسا کرنے والے دین کی تکذیب کرتے ہیں (107/1-4)۔آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے دین اور معاشیات کا کتنا گہرا تعلق ہے۔

ح ظ ر

قرآن کریم میں ہے کہ جہاں تک خدا کے قانون طبعی کے ذریعہ دنیا کے مال ومتاع ملنے کا تعلق ہے یہ ہر شخص کو اس کی کوشش کے مطابق مل سکتا ہے۔اس میں کافر و مومن، کسی کی تمیز نہیں۔مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17/20) ''خدا نے اپنی عطا کردہ نعمتوں پر کوئی احاطہ بندی نہیں کر رکھی۔'' اسے تمام نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لیے کھلا رکھا ہے۔لہٰذا انہیں اسی طرح کھلا رکھنا چاہیے۔جو نظام خدا کے دیئے ہوئے رزق کے سرچشموں کو افراد کی ملکیتوں میں دے کر انہیں محظور کر دیتا ہے وہ خدا کے نظامِ رب العالمینی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔اس لیے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔اسی کو يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107/7) کہا گیا ہے۔یعنی جس رزق کو پانی کی طرح بہتا رہنا چاہیے تھا اسے بند لگا کر روک رکھنا۔

ح ف ف

سورۃ زمر میں ہے: وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (39/75) ''تو ملائکہ کو دیکھے گا کہ وہ عرش کے اردگرد گھیرا ڈالے ہیں۔'' عرش، کائنات کے کنٹرول کا مرکز ہے اور ملائکہ، عالم امر وخلق کی وہ قوتیں ہیں جو مشیت کے پروگرام کو

بروئے کار لاتی ہیں۔ یہ سب قوتیں خدا کے کائناتی کنٹرول کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں۔

ح ق ق

حَقٌّ کے معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے۔ یعنی کسی چیز کا ٹھوس شکل (Conceret Form) میں سامنے آجانا یا ثابت (Establish) ہو جانا۔

(۱) حَقٌّ کے اولین معنی ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بن کر سامنے آجانا۔

(۲) چونکہ کوئی شے ٹھوس واقعہ میں اسی صورت میں تبدیل ہو سکتی ہے جب اس کی نشوونما تعمیری (Constructive) ہو۔

(۳) کوئی چیز اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے کہ وہ قانونِ حفظ و بقا کے عین مطابق ہو۔ جو زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ جو اپنی جگہ پر بھی فٹ ہو اور بدلنے والے حالات سے بھی موافق رہے۔ چنانچہ حَقٌّ کے تیسرے معنی ہیں علم و عقل، عدل و انصاف اور واقعات و مصالح کے عین مطابق ہونا۔

(۴) حَقٌّ اس موجد کو کہتے ہیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اس لیے خدا کو اَلْحَقُّ کہا گیا ہے۔

ان معانی کی روشنی میں حَقٌّ اور بَاطِلٌ کی قرآنی اصطلاحات کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

خدا خود حق ہے (10/30)۔ اس کا رسول حق ہے (3/85)۔ اس کی طرف سے بھیجا ہوا قرآن کریم حق ہے (34/6)۔ اس کے وعدے (قوانین) حق ہیں (10/55)۔ اس کا دین حق ہے (9/33)۔ اور یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے (39/5)۔ چونکہ حق ظن و شکوک سے بلند ہوتا ہے اور وہ ایک ٹھوس تعمیری واقعہ کی شکل میں سامنے موجود ہوتا ہے، اس لیے ظہور نتائج کو بھی اَلْحَآقَّةُ کہا گیا ہے (69/1)۔

ح ک م

اَلْحِكْمَةُ کے معنی ہیں فیصلہ میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا۔ یعنی ہر ایک حقوق کی حدیں مقرر کر کے کسی کو ان سے تجاوز نہ کرنے دینا۔ اسی لیے حَكِيْمٌ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو ہر چیز کو صحیح تناسب و توازن کے ساتھ، ہر تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نہایت حسن و اتقان کے ساتھ بنائے یا معاملات کو اس طرح سرانجام دے۔ حِكْمَةٌ کو حکمت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ جہالت اور نادانی کی باتوں سے روکتی ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں حِكْمَةٌ 'رائے با قوت'[1] کو کہیں گے۔ یعنی فیصلہ دینے

---

[1] رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں ۔۔ قوتِ بے رائے جہل است و جنوں علامہ اقبال (پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)
کشاف کلیاتِ فارسی، صفحہ نمبر 916، مرتب احمد رضا: 042-37809200، شائع کردہ ادارہ اہل قلم، 3/10 ہما بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

کی صلاحیت اور پھر اس فیصلہ کو نافذ کرنے کی قدرت۔ اسی کو آج کل کی زبان میں حکومت کہتے ہیں۔

قرآن کریم کو حَکِیۡمٌ کہا گیا ہے (36/2) کیونکہ وہ ہر شے کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو ان حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ وہ تمام اختلافی امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے۔ خدا کو بھی حَکِیۡمٌ کہا گیا ہے (2/32) کیونکہ وہ کائنات کو ٹھیک ٹھیک راستہ پر چلاتا ہے۔ ہر شے کو صحیح صحیح اندازے اور تناسب کے مطابق پیدا کرتا ہے اور اپنے قانون کی لگام سے ہر شے کو مسخر کئے ہوئے ہے: یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ (2/113) وہ انسانوں کے اختلافی امور میں فیصلے کرتا ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ اس کی آیات مُحۡکَمٰتٌ اور مُتَشٰبِہٰتٌ ہیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جس کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے:

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝ (3/6)

عام الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اللہ وہ ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ اس میں ایک قسم تو ایسی آیتوں کی ہے جو ''محکم'' ہیں اور وہی کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری قسم ''متشابہات'' کی ہے۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو ''متشابہ'' ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی تاویل نکالیں۔ حالانکہ اس کی تاویل اللہ جانتا ہے اور وہ لوگ (جانتے ہیں) جو علم میں پختہ ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) حقائق کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و بصیرت والے ہیں۔

مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہوتے ہیں، ملتی جلتی ہوئی چیزیں جن میں باہمی مشابہت اور موافقت ہو۔ تشبیہ کو اسی لیے تشبیہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک چیز کو اس سے ملتی جلتی چیز کے ساتھ مثال دے کر سمجھایا جاتا ہے۔

ان معانی کے اعتبار سے مُحۡکَمٌ کے اولین معنی ہوں گے ایسی آیات جن کے الفاظ سے وہی مفہوم ہو جو ان الفاظ کے معنی ہیں۔ مثلاً نکاح کے ضمن میں ارشاد ہے: حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمۡ اُمَّهٰتُکُمۡ (4/23) تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں۔ اس میں اُمٌّ کے معنی ماں کے ہیں۔ یعنی وہ عورت جس کے بطن سے کوئی پیدا ہو۔ لیکن محکم و متشابہات کی جس آیت کو اوپر نقل کیا گیا ہے یعنی (3/6) اس میں هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ میں اُمٌّ کے معنی اس قسم کی ماں نہیں۔ اس میں اُمٌّ کا لفظ استعارۃً استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مفہوم ہے ''اصل و بنیاد''۔ یہ اس لفظ کی تاویل ہے۔ تاویل کے معنی ہیں آخری نتیجہ، جو کچھ مآل کار ہو۔ کسی شے کی

آخری حقیقت (Ultimate Reality)۔قرآن میں انسانی راہنمائی کے لیے قوانین وضوابط دیئے گئے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان احکام وقوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن کا مطلب ان الفاظ سے محکم طور پر متعین ہوجاتا ہو۔جیسا کہ حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ کی مثال میں بتایا گیا ہے۔اس قسم کی آیات محکمات ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق اس عالم سے ہے جو ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہے۔مثلاً اللہ کی ذات اور اس کی صفات۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور اس میں اعمال کے نتائج۔وہاں کی جنت اور جہنم۔یا انسانی زندگی کا منتہٰی اور مآل۔ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرد حقائق (Abstract Truths) کو جب بھی بیان کیا جائے گا تو تشبیہ واستعارہ اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائے گا۔یعنی ان کا بیان علامتی (Symbolically) ممکن ہوگا۔مثلاً اللہ کے متعلق کہا گیا ہے: ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ (7/54) وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔اور كَانَ عَرۡشُهٗ عَلَى الۡمَآءِ (11/7) اس کا عرش پانی پر ہے۔ظاہر ہے کہ ان آیات میں عرش سے مراد لکڑی (یا کسی اور چیز کا) بنا ہوا تخت مراد نہیں۔نہ ہی مَآءٌ سے مراد پانی ہے۔یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے۔یعنی ان حقائق کو تشبیہ اور مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔لہٰذا یہ آیات متشابہات ہیں۔ایسی آیات جن میں حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے عالمِ محسوسات سے باہر کے ہیں، ان کی حقیقت، کنہ، ماہیت یعنی ان کی تاویل (What they actually are) کا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔البتہ جس قسم کی مثالوں سے انہیں سمجھایا گیا ہے ان پر غور و فکر کرنے سے ہم ان کے متعلق کچھ ایسا اندازہ اپنے ذہن میں لگا سکتے ہیں جو اس حقیقت کا مفہوم سمجھا دے۔مثلاً لفظ عرش سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا مفہوم قوت واقتدار (Authority or Control) ہے۔یا كَانَ عَرۡشُهٗ عَلَى الۡمَآءِ میں مَآءٌ سے مراد زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے: وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ (21/30)۔ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا۔لیکن خدا اپنے کنٹرول کو کس طرح عمل میں لاتا ہے (Exercise کرتا) ہے یا اس نے خود حیات (Life) کو کس طرح پیدا کیا۔ان باتوں کی کنہ وحقیقت کو ہم نہیں پا سکتے۔ان حقائق کی اصل وحقیقت کے متعلق ہمیں علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔وَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا (17/85) ان کی اصل وحقیقت کا واقعی علم صرف خدا کو ہوسکتا ہے۔ البتہ جہاں تک ان کا تعلق ہماری ذات اور انسان کی تمدنی زندگی سے ہے، ہم عقل وفکر کے ذریعہ اس راہنمائی تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے مقصود ہے۔وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (3/6)۔

اس قسم کی آیات کے متعلق دو قسم کی ذہنیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔یعنی لوگوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور عملی نتائج سے دور ہٹا کر محض نظری تصورات میں الجھا کر ان کی قوتوں کو تخریبی راستوں میں ضائع کرتے چلے جانا۔یہ لوگ ان ماوراء العقل حقائق کی کنہ وحقیقت اور کیفیت و ماہیت دریافت کرنے کے

لیے نظری موشگافیاں اور تصوراتی نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے ہیں اور اسے بلند ترین سطح کا علم قرار دیتے ہیں۔ یہ زمین کے ہنگاموں ① کو پست معاملات قرار دے کر ہمیشہ آسمان کی باتوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ قرآن کریم اسے فتنہ قرار دیتا ہے جو انسان کو عملی زندگی سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسری ذہنیت کے لوگ وہ ہیں جنہیں قرآن کریم ''الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ'' اور ''اُولِي الْاَلْبَابِ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ جو عقل وفکر سے کام لے کر علم میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنی فکر کی عمارت کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حقائق اس خدا کی طرف سے بیان ہوئے ہیں جو ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ اس لیے ان کے حقائق (Truths) ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ لیکن ہم ان کی کنہ وحقیقت کو پا نہیں سکتے۔ البتہ ان سے جو انسانی راہنمائی مقصود ہے (ذکر) ہم عقل وفکر سے اس تک ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ ان حقائق کے متعلق ہمارے علم کی یہی حد ہے۔ یعنی ان حقائق کا علم خدا بھی رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف اس حد تک ان کا علم رکھتے ہیں جس حد تک ان سے مقصود انسانی راہنمائی (ذکر) ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ علم سے انسان صحیح نتیجہ تک اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے جب وہ اپنے علم سے وحی کی روشنی میں کام لے (مثلاً دیکھئے 46/26 یا 45/23)۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ''ایمان والوں'' میں دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایک وہ عوام جو وحی پر ویسے ہی ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے صاحبانِ علم وبصیرت جو عقل وفکر کی رو سے وحی کے حقائق پر غور وخوض کرتے ہیں۔ سورۃ مدثر میں اس دوسرے گروہ کو ''الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' کہہ کر پکارا گیا ہے اور ان کے برعکس عام لوگوں کو ''الْمُؤْمِنُوْنَ'' (74/31)۔

بہرحال مومنین کی جماعت کے خواص ہو یا عوام ان میں سے کسی کے لیے بھی اس قسم کا تمثیلی بیان وجہ اضطراب و شکوک نہیں ہوتا۔ لیکن وَ لِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا (74/31) جن لوگوں کے دل میں مرض ہوتا ہے، نیز وہ لوگ جو قرآن پر سرے سے ایمان نہیں رکھتے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے خدا کا حقیقی منشاء کیا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ (قرآن میں یہ حقائق تمثیلی انداز میں بیان ہوئے ہیں) ان بیانات سے جو چاہتا ہے صحیح راہنمائی حاصل کر لیتا ہے اور جو چاہتا ہے ان سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے: وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (74/31) یہ خدا کے لشکر ہیں جن کی کنہ وحقیقت کا علم صرف اسی کو ہے۔ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (74/31) لیکن ان کے تمثیلی بیان سے انسانوں کی راہنمائی مقصود ہے۔ لہٰذا جو ''الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ'' ہیں وہ ان کی کنہ وحقیقت کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ غور وفکر سے اس راہنمائی (ذکر) تک پہنچ جاتے ہیں جو ان سے مقصود ہے۔

یہ ہے آیات مُحْكَمٰتٌ وَمُتَشٰبِهٰتٌ کا پہلا مفہوم۔

---

① اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے   بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی   (علامہ اقبال)

مُتَشٰبِهٰتٌ میں ایسے حقائق بھی شامل ہیں جنہیں اس قسم کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کا مفہوم ہر شخص اپنی اپنی علمی اور عقلی سطح کے مطابق یا ہر زمانہ کا انسان اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ہر سطح کے انسانوں کے لیے راہنمائی کا ضابطہ ہے اور ہر زمانہ کے انسانوں کے لیے بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف انسان مختلف علمی اور عقلی سطح رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کریم کسی ایک سطح کے انسانوں کو سامنے رکھ کر ہی اپنے حقائق بیان کرتا تو نہ وہ عالمگیر ہوسکتا تھا نہ ابدی۔ وہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کے لیے یا ایک سطح کے انسانوں کے لیے ہی مفید ہوسکتا تھا۔ باقی انسانوں کے لیے بے کار ہوجاتا۔ اس قسم کی کتاب کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان حقائق کو ایسے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کرے جن میں کافی وسعت اور لچک ہوتا کہ ہر سطح کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کا اس قسم کا انتخاب بھی قرآن کریم کا وہ خاصہ ہے جو اعجاز کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ان الفاظ میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ یہ حقیقت کو اس کے صحیح مقام پر بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے اندر ایسی لچک رکھتے ہیں کہ اس سے ہر انسان اپنی اپنی سطح علم وعقل کے مطابق مستفید ہوسکتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کہ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (36/40) ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں تیزی سے تیر رہا ہے۔ اور سورج کے متعلق ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (36/38) سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جارہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک فلکیات کے متعلق (قدیم) بطلیموسی تصور رائج تھا، اجرامِ فلکی کی گردش سے متعلق صحیح تصور ذہن انسانی میں آنہیں سکتا تھا۔ جب بعد میں کوپرنیکس کا نظام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اجرام سماوی کس طرح اپنے اپنے دائرے میں سرگرمِ گردش ہیں۔ اسی طرح جب تک ہرشل کا نظریہ سامنے نہیں آیا تھا یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ سورج اپنے پورے نظام کے ساتھ کسی مستقر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب تک انسانی علم اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا قرآن کریم کی یہ آیات متشابہات کی فہرست میں شامل تھیں۔ جب یہ انکشاف ہوئے تو یہ آیات محکمات کے زمرے میں شامل ہوگئیں۔ اب بھی یہ آیات ایک خاص علمی سطح کے انسانوں کے لیے محکمات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سے نیچے کی سطح والوں کے لیے یہ متشابہات ہی میں داخل ہیں۔ جب تک یہ آیات متشابہات کے زمرے میں تھیں ان کی حقیقت (تاویل) کا علم خدا کو تھا۔ جب یہ محکمات کے ذیل میں آگئیں تو ان کی حقیقت ''الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ'' پر بھی منکشف ہوگئی۔ اسی بنا پر قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار سے واقف ہے (25/6)۔ اور اس سے کچھ آیات بعد ہے کہ اگر ان امور کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہو تو فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا (25/59) اس سے پوچھو جو اِن اسرار سے واقف ہے۔ جب تک انسانی علم ان حقائق کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا ان کا واقف صرف خدا ہوتا ہے جس نے وحی کے ذریعہ ان حقائق کو بیان کردیا ہے۔ جب انسانی علم ان کی بلندیوں تک پہنچ جائے گا تو ان حقائق کے ماہرین بھی (خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق) ان کے خبیر ہوجائیں گے۔

لہٰذا مُحْكَمٰتٌ وَمُتَشٰبِهٰتٌ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔

یہ ہیں قرآنی آیات کے مُّحۡکَمٰتٌ وَ مُتَشٰبِهٰتٌ ہونے کے مختلف مفہوم۔لیکن محکمات ہوں یا متشابہات تمام آیات اپنی اپنی جگہ پر یکسر مستحکم ہیں۔قرآن کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر محکم ہے۔اسی لیے سورۃ ہود میں ہے کِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ (11/1) یہ وہ کتاب ہے جس کی تمام آیات کو محکم بنایا گیا ہے۔یہ کتاب مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل ہے۔اس کے حقائق غیر متبدل اور اس کے اصول تغیر نا آشنا ہیں۔جن حقائق کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے ان کی بھی حقیقت غیر متبدل (محکم) ہے۔لہٰذا اس نقطہ نگاہ سے قرآن کریم کی تمام آیات محکمات ہیں۔

اس کے برعکس سورۃ زمر میں پوری کتاب کو متشابہات کہا گیا ہے۔اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (39/23)۔

قرآن کریم میں کتاب کے ساتھ حِکۡمَۃٌ کا لفظ بھی آیا ہے۔وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (2/151)۔ایک چیز ہوتی ہے قانون (Law) اور ایک ہوتی ہے اس قانون کی مصلحت یا غایت وعلت (The why of it)۔قانون کو کہتے ہیں کتاب اور اس کی مصلحت یا علت اور غایت کو کہتے ہیں حکمت، اِس لیے کہ یہ حِکۡمَۃٌ ہی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قانون کی غایت کیا ہے۔اس کا متعین راستہ کون سا ہے۔وہ کس روش پر انسانوں کو چلانا چاہتا ہے۔اگر قرآن کریم کا مقصود یہ ہوتا کہ اس کے قانون کو مستبدانہ انداز سے (ڈنڈے کے زور پر) اندھادھند منوایا جائے تو پھر خالی قانون (کتاب) کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ اس قانون کی اطاعت علیٰ وجہ البصیرت اور بطیب خاطر (دل کی پوری رضامندی کے ساتھ) ہو اس لیے ضروری تھا کہ ان قوانین کی حکمت (مقصد، غایت، مصلحت) بھی ساتھ ہی واضح کر دی جائے۔لہٰذا کتاب کے ساتھ حکمت بھی دی گئی۔یہ دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ سورۃ نساء میں ہے:وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (4/113) خدا نے تیری طرف کتاب اور حکمت کو نازل کیا۔ کہیں قرآن کو صرف الۡحِكۡمَةِ (17/39) کہا گیا ہے۔کہیں اسے الۡكِتٰبِ اور الۡحِكۡمَةِ (2/231) کہہ کر ضمیر دونوں کے لیے واحد کی استعمال کی گئی ہے۔تا کہ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس سے مراد ایک ہی چیز (قرآن کریم) ہے۔ سورۃ احزاب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے کہ الۡحِكۡمَةِ کی بھی تلاوت ہوتی ہے (33/35)۔اس لیے حکمت وحی غیر متلو نہیں۔ان حقائق سے واضح ہے کہ حکمت قرآن کریم کے اندر ہے،قرآن کریم سے باہر نہیں۔

حکمت کو وحی کے ذریعہ نازل کرنے میں ایک بہت بڑا مقصد تھا۔قرآن کریم نے احکام وقوانین اس لیے دیئے ہیں تا کہ ان کا نتیجہ مرتب ہو۔یعنی اس کے قوانین مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک نتیجہ پیدا کرنے (ایک مقصد حاصل کرنے) کا ذریعہ ہیں۔اگر اللہ کی طرف سے صرف قوانین مل جاتے اور یہ نہ بتایا جاتا کہ ان قوانین پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا نکلے گا تو ہوسکتا تھا کہ ہم ان قوانین پر اپنے طور پر عمل کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے کہ خدا کا منشا پورا ہو گیا ہے۔خدا نے یہ نہیں کیا۔اس نے قوانین دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانین پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔لہٰذا ہمیں ہر وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ ان

قوانین سے وہ نتیجہ برآمد ہورہا ہے یانہیں جو خدا نے متعین کیا ہے۔اگر ہورہا ہے تو پھران قوانین پرعمل بھی ٹھیک ہورہا ہے۔ لیکن اگر ان سے وہ نتیجہ نہیں نکلتا تو پھر ہمیں رک کر اپنا جائزہ لینا ہوگا کہ ہم سے کہاں غلطی ہورہی ہے جس کی وجہ سے ان قوانین سے ان کا متعین کردہ نتیجہ برآمد ہی نہیں ہورہا۔مثلاً قرآن کریم میں صلوٰۃ کے متعلق ہے کہ: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (29/45) اس میں اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (صلوٰۃ قائم کرو) حکم (کِتٰبٌ) ہے۔اور دوسرا حصہ (کہ صلوٰۃ سے فحشاء اور منکر کی روک تھام ہوجائے گی) اس کی حکمت ہے۔اگر صلوٰۃ سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا تو ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم سے کہاں غلطی ہورہی ہے۔ کیونکہ جب خدا نے کہا ہے کہ اقامت صلوٰۃ سے ایسا ہوگا (تو اگر اقامت صلوٰۃ قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ہورہا ہے) تو اس سے وہ نتیجہ لازمی طور پر نکلنا چاہیے۔اس لیے کہ یہ نتیجہ بھی خود خدا کا ہی بتایا ہوا ہے جو کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔دین (قرآنی نظام) میں ہر حکم اپنا متعین نتیجہ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔یہ مقصد تھا کِتٰبٌ کے ساتھ حکمت کے مُنَزَّلٌ مِنَ اللہ ہونے کا۔

حُکْمًا سے مراد وہ قوتِ فیصلہ (یا فہم) بھی ہے جو عام انسانوں کو حاصل ہوتی ہے، یعنی وحی کے بغیر۔سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤی اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا (28/14) جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور اس کے قویٰ میں اعتدال آ گیا تو ہم نے اسے حکم (فہم، قوتِ فیصلہ) اور علم عطا کیا۔سیاق وسباق سے ظاہر ہے کہ یہ بات حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملنے سے پہلے کی ہے۔اس لیے اس سے مراد وہ حِکْمَۃٌ نہیں جو وحی کے ذریعے ملتی ہے۔یہ وہ حکمت ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کو کب، کس طرح اور کہاں، زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق، منطبق کیا جائے اور اس کے اصولی حکم کو جزئیات پر چسپاں کرنے کے لیے کیا اندازِ تعبیر اختیار کیا جائے۔یا مختلف احکام میں سے کس کو مقدم اور کس کو مؤخر کیا جائے۔یہ ساری حکمتیں عقل، فہم، فراست سے تعلق رکھتی ہیں اور اس اَلْحِکْمَۃُ سے الگ ہیں جو قرآن کریم کے اندر ہیں اور جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن کریم میں ہے: یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (62/2) اس میں تلاوتِ آیات، تزکیہ، تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت، چاروں الگ الگ چیزیں ہیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ رسول ایک تو ان قوانین اور ان کی حکمت کی تعلیم دیتا ہے جو قرآن کریم کے اندر ہیں اور (اس نظام کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں) بہت سی حکمتیں اس کے علاوہ بتاتا ہے اور اس طرح احکام خداوندی کے مناسب انطباق یا تقدیم وتاخیر وغیرہ کے فیصلے کرتا ہے۔ اس تعلیم حکمت سے اُمت کو یہ سکھانا مطلوب ہوتا ہے کہ وہ بھی مختلف ادوار وحالات میں اسی طرح کی حکمتیں (سمجھ کی باتیں) کام میں لائے۔قرآن کریم کی بیان کردہ حکمت تو (اس کے قوانین کی طرح) غیر متبدل ہوگی لیکن یہ حکمت (عقل و فراست پر مبنی فیصلے) تغیر حالات سے بدلتی رہے گی۔

حکومت۔قرآن کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت

کرے، خواہ اِسے ضابطۂ قوانین، قوتِ فیصلہ اور نبوت تک بھی کیوں نہ دے دی گئی ہو (3/78)۔ حکومت (لوگوں میں فیصلہ کرنے اور اپنے فیصلے منوانے) کا حق صرف خدا کو حاصل ہے (12/40)۔ خدا کی یہ حکومت، اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوتی ہے (6/115)۔ لیکن قرآن کریم کے فیصلوں کو عملاً نافذ کرنے کے لیے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت لاینفک ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہیں گے جسے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا۔ اس نظام کے مرکز کی اطاعت، خود خدا کی اطاعت تھی۔ کیونکہ وہ مرکز خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا، اپنے فیصلوں کی نہیں (4/65؛ 5/47)۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ نظام علیٰ حالہٖ آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہتے ہیں (3/143)۔ الدین، اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنی مملکت کے اندر سامنے آسکتا ہے۔ یہ انفرادی چیز نہیں۔ ''خدا کی حکومت'' سے یہی مراد ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ جو ایسا نہیں کرتے، قرآن کریم انہیں کافر کہتا ہے (5/44)۔ اس قسم کی حکومت ہر زمانے میں قائم ہوسکتی ہے۔

حلال

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ سوائے ان چیزوں کے جنہیں قرآن کریم میں حرام قرار دے دیا گیا ہے کھانے پینے کی سب چیزیں حلال ہیں۔ ان پر ممانعت کی کوئی گرہ نہیں باندھی گئی۔ نہ ہی کسی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دے دے۔ (دیکھئے 5/87؛ 6/146؛ 6/119-20؛ 10/59؛ 16/116؛ 22/30) حتیٰ کہ رسول کو بھی اس کا اختیار نہیں دیا گیا (66/1)۔ سورۃ اعراف میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ: وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (7/157) وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو لوگوں کے لیے حرام قرار دے گا، تو اس سے مراد وحی کے ذریعے ایسا کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے (5/1؛ 6/146)۔

لیکن قرآن کریم نے حَلٰلًا کے ساتھ طَيِّبًا بھی کہا ہے (2/168)۔ یعنی جتنی حلال چیزیں ہیں ان میں سے جو تمہیں مرغوب ہوں وہ کھاؤ۔ ناخوشگوار چیزیں یا مضر چیزیں مت کھاؤ۔ (حلال) کھانے کی چیزیں دیدہ زیب بھی ہوں، خوش ذائقہ بھی اور صحت کے لیے مفید بھی۔ یعنی ہر لحاظ سے خوشگوار۔ اس میں ہر فرد کے اپنے اپنے ذوق اور پسند کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔ نیز اجتماعی مصالح اور مفاد کی گنجائش بھی۔

اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے طیبات، حلال ہیں اور خبائث حرام۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے وہ سب فی ذاتہٖ طیب ہیں۔ یعنی پاکیزہ، مفید، منفعت بخش۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر حلال چیز کو بالضرور کھایا جائے گا۔ اگر کوئی چیز کسی کو ناپسند ہو، یا مضرت رساں، تو اسے اجازت ہے کہ وہ شے نہ کھائے۔ لیکن اسے حرام نہ سمجھے۔ اسی طرح اجتماعی مصالح کے پیش نظر، اسلامی معاشرہ وقتی طور پر بعض چیزوں کے استعمال

کوممنوع قرار دے سکتا ہے۔ایسی پابندیاں عائد کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔لیکن کسی حلال چیز کوحرام سمجھ لینا یا اسے حرام قرار دے دینا قطعاً جائز نہیں۔اسی طرح کسی حرام شے کوحلال قرار دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

خدا کے نظامِ ربوبیت کے پیشِ نظر حلال وحرام کے معنی یہ بھی ہوں گے کہ عام اشیائے فطرت جنہیں اللہ نے نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے یعنی رزق کے سرچشمے، انہیں کھلا رہنے دو اور انہیں روک کر لوگوں کو اس کے استفادہ سے محروم نہ کرو۔ یہ بھی خدا کے حلال کو حرام کر دینا ہے۔ یہ قرآنی نظامِ معیشت کی اصل و بنیاد ہے۔مفت چیزوں (Free Goods) کو قیمتاً اشیاء(Economic Goods) میں تبدیل کرنا کبھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔

ح ل م

اَلْحَلِيْمُ خدا کی صفت ہے جس سے مراد یہ ہے نہ اسے نافرمانوں کی نافرمانیاں بھڑکاتی ہیں اور نہ اسے غصہ جلد بازی اور اوچھے پن پر اُکساتا ہے۔ بلکہ اس نے ہر چیز کے لیے ایک پیمانہ (قانون) مقرر کر رکھا ہے جس تک وہ چیز بہر حال پہنچ جاتی ہے (یعنی ہر عمل کا نتیجہ)۔لہٰذا حَلِيْمٌ کے معنی ہیں سمجھدار، ثقہ، بھاری بھرکم، پُروقار، ہمیشہ اصول اور قانون کے مطابق کام کرنے والا۔ جو یونہی جذبات سے بھڑک نہ اُٹھے۔حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (11/75) ''یقیناً ابراہیم بردبار، غمگسار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔'' اور حضرت اسماعیلؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے: فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (37/101) ''ہم نے ابراہیم کو ایک حلیم بیٹے کی خوشخبری دی۔

ہمارے ہاں حِلْم (حلیم الطبع) سے مراد انکسار، فروتنی، نرم مزاجی لی جاتی ہے۔ یہ ہمارے اپنے لغت کے معنی ہیں۔ محض فروتنی توضعف اور کمزوری کی پیدا کردہ بھی ہوتی ہے لیکن حِلْمٌ قوت اور توانائی کا مظہر ہوتا ہے جس سے انسان کو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ بڑے سے بڑے اشتعال انگیز حالات میں بھی ضابطہ اور قانون کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور کوئی بات بے سمجھی کی نہیں کرتا۔جس میں مقابلہ کی قوت نہ ہو اس کا جھکنا شکست اور ذلت ہے۔سرکشی کی قوت رکھتے ہوئے، قانون وضوابط کے سامنے جھکنا، شرفِ انسانیت ہے۔

ح م ا

قرآن کریم نے انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (15/26) سیاہ متغیر شدہ مٹی کے اوپر جو پپڑی سی جم جائے، تخلیق انسان کی ابتدا خدا نے اس سے کی۔اسی کو طِيْنٍ لَّازِبٍ (37/11) کہا گیا ہے۔اس سے مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اولین جرثومہ (Life Cell) کی نمود پانی اور مٹی ① کے

① اب تک (2016ء) 92 عناصر (Elements) مٹی سے دریافت ہو چکے ہیں اور یہ سب جسم انسانی میں پائے جاتے ہیں۔(منظور الحسن)

امتزاج سے ہوئی۔

حمد

حَمۡدٌ۔کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں تحسین وستائش (Appreciation) کے جو جذبات پیدا ہوں، ان کے اظہار کا نام حمد ہے۔جس سے مقصد اس شاہکار کے خالق کی عظمت و برتری کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں۔

(۱) جس حسن ورعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جارہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہیے۔(جیسے افعالِ محمودہ، مقامِ محمود، صفاتِ محمودہ وغیرہ) غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذبات تحسین وستائش پیدا نہیں ہوسکتے۔مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اس کی ان تصاویر کے ذریعے ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آ جائیں۔اسی لیے قرآن کریم نے ان نمود ونمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔یُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (3/187)''وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں۔''

(۲) کسی کی جس بات یا جس کام کی تعریف کی جارہی ہے وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہیے(تاکہ اس کی انفرادی خودی کے زندہ و بیدار ہونے کا اندازہ کیا جا سکے)۔اضطراری طور پر (خود بخود یونہی میکانکی انداز سے) کسی فعل کا سرزد ہوجانا ستائش کا حق پیدا نہیں کرتا۔حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اس کے لیے بھی حمد کا لفظ نہیں بولا جاتا۔مدح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے (مَدَحَ الْجَمَالَ)۔اگر کوئی مشین نہایت عمدہ چیزیں بنارہی ہو تو وہ مشین قابل حمد نہیں۔بلکہ قابل مدح ہوگی اور اس کا بنانے والا مستحق حمد۔یہی صورت رقص طاؤس کی ہے۔طاؤس مستحق مدح ہے اور اس کا خالق (خدا) سزوارِ حمد۔

(۳) حَمۡدٌ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کی حمد (ستائش) کی جارہی ہے اسے ستائش کرنے والے کا دل بھی پسند کرتا ہو۔کسی کے دباؤ سے اس کی تعریف کرنا حمد نہیں، مدح ہے۔نہ ہی حمد میں ملمع کاری، نمائش، منافقت، یا کسی کو بنانے کے لیے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہوسکتا ہے۔حمد میں جذبات تحسین بے ساختہ زبان پر آ جاتے ہیں۔

(۴) جس چیز کی حمد کی جارہی ہے اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔محض گمان کی بنا پر حمد نہیں کی جاسکتی۔مبہم تصورات، دھندلے نقوش اور شکوک وتذبذب پیدا کرنے والے خیالات ومعتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔حمد، فریبِ تخیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں اُبھرتی۔اس کا سرچشمہ یقینِ محکم اور ایمان مکمل ہوتا ہے۔(مدح ظنی چیزوں کی بھی کی جاسکتی ہے مگر حمد نہیں)۔

(۵) جن نفع بخش، کشش انگیز باتوں اور حسن وتناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کمال درجہ تک پہنچ چکے ہوں اور ان کی نفع بخشیاں محسوس ہوں۔ جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو آرٹ انسانیت کے لیے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد وستائش نہیں ہوتا۔

ان شرائط کے ساتھ جذباتِ تحسین وستائش کے اظہار کا نام حَمْدٌ ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو اس کے لیے حَمْدٌ نہیں بلکہ مَدْحٌ کا لفظ بولا جائے گا۔ (قرآن کریم میں خدائی شاہکاروں کے لیے ہر جگہ حَمْدٌ کا لفظ آیا ہے۔ مَدْحٌ کا لفظ ایک جگہ بھی نہیں آیا)۔

واضح رہے کہ ثناء کا لفظ مدح اور ذم دونوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔

لہٰذا جہاں قرآن کریم میں ہے کہ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (13/13) ''گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح[1] کرتی ہے۔'' یا وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (30/18) ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں حمد اسی کے لیے ہے۔'' یا وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (17/44) ''کوئی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام کائناتی قوتیں، اس قسم کے تعمیری اور منفعت بخش نتائج پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہیں جو خدا کی حمد وتحسین کے زندہ پیکر ہیں۔ حتیٰ کہ اس مقصد کے لیے جب تخریبی قوتوں کو راستہ سے ہٹایا جاتا ہے تو یہ کام بجائے خویش وجہ ستائش ہوتا ہے۔ چنانچہ ظالم قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں کہا: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (6/45) ''ظلم کرنے والی قوموں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ رب العالمین کے لے حمد ہے۔'' اسی لیے خدا کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ عَزِيْزٌ بھی ہے اور حَمِيْدٌ بھی (14/1)۔ یعنی اپنے غلبہ واقتدار سے تخریبی قوتوں کو راستے سے ہٹا کر تعمیری پروگرام کو اس طرح کامیاب بنانے والا کہ اس کے منفعت بخش نتائج خدا کی حمد وستائش کی منہ بولتی تصویر بن جائیں۔ دوسری جگہ ہے: لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (64/1) ہر طرح کا اقتدار وستائش اس کے لیے ہے۔ جلال وجمال کا سرچشمہ وہی ہے۔ مومنین کی صفات میں یہ بھی ہے کہ وہ حٰمِدُوْنَ (9/112) حمد کرنے والے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انسان کو علم الاسماء یعنی اشیائے کائنات کا علم (علم الفطرت) دیا گیا ہے (2/31)۔ کیونکہ جب ملائکہ (کائناتی قوتوں) نے کہا کہ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (2/30) ''ہم تیری حمد وستائش کی نمود کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں'' تو اس کے جواب میں یہی کہا گیا کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2/31) ''آدم کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا گیا ہے۔''

آدم کو تمام کائنات کی وجہِ ستائش خداوندی بنا سکتا ہے جب وہ اپنے علم کے ماحصل کو وحی کے تابع رکھے۔ اس لیے اسے کہہ دیا گیا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2/38) جو قوم خدا کی راہنمائی کے پیچھے چلے گی

---

[1] تسبیح کے معنی ہیں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں پوری قوت کے ساتھ سرگرم عمل رہنا۔

وہی خوف وحزن سے محفوظ رہے گی۔ یہ وہ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17/79) ہے۔(ایسی پوزیشن جوسراپا وجہ حمد وستائش ہو) جس پر نبی اکرم ﷺ فائز ہوئے۔ وہ خود اَحْمَدُ (61/6) (بہت زیادہ حمد وستائش کرنے والے) تھے۔ اس لیے (جیسا آپ کا دوسرا نام تھا ویسے ہی عملاً) مُحَمَّدٌ (48/29) ہو گئے۔ یعنی وہ جو مسلسل وپیہم وجہِ حمد وستائش ہو (جس کی یکے بعد دیگرے ستائش کی جائے) رسول اللہ ﷺ کا نام احمد بھی تھا اور محمد بھی۔ اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (61/6) اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (48/29)۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ 1/1) پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان چار لفظوں سے قرآن کریم نے کس طرح اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ کائنات کا ہر حسین گوشہ اور منفعت بخش پہلو خدا کے اس عالمگیر قانونِ ربوبیت کے وجہِ حمد وستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے جو ہر گوشے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج اوجِ کمال تک لے جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حمدیت محض ایک عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ جذبۂ تحسین ہے جس کا اظہار نظام کائنات پر غور و فکر سے بیساختہ ہو جاتا ہے۔ جو قوم نظام کائنات پر غور نہیں کرتی وہ اس کے خالق کے کلام کو کس طرح خراج تحسین (Appreciate) پیش کر سکتی ہے؟ نیز جو اس کے نظام ربوبیت کو عملاً متشکل نہیں کرتی وہ کیسے سمجھ سکتی ہے کہ اس کے نتائج کس درجہ مستحق حمد وستائش ہیں۔ ''خدا کی حمد کرنا'' ایک عملی پروگرام ہے۔ یعنی نظام خداوندی کو عملاً متشکل کر کے ایسے محیر العقول اور درخشندہ نتائج پیدا کرنا جنہیں دیکھ کر دنیا کی ہر قوم پکار اٹھے کہ جس خدا نے ایسے قوانین عطا کیے ہیں وہ واقعی مستحق حمد و ستائش ہے۔

ح م ل

سورۃ احزاب میں ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33/72) ''ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس (خیانت) سے ڈر گئے۔ لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے۔ یہ بڑا ہی ظالم اور نادان ہے۔'' یعنی خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا تو اس نے اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی۔ تمام اشیائے کائنات اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہے۔ لیکن یہی قانون جب انسان کو دیا تو یہ اس میں خیانت کرتا ہے، اس کی اطاعت نہیں کرتا۔ یہ بڑا نادان ہے اور اپنے آپ پر زیادتی کرتا ہے۔

سورۃ عنکبوت میں ہے: وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا (29/60) یہاں حملِ رزق کے معنی ذخیرہ اندوزی کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم نے یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ رزق کو سمیٹ کر رکھنے کا جذبہ انسان میں ہے حیوانات میں نہیں (یہ جو ہم چیونٹیوں، چوہوں وغیرہ کو ذخیرہ اندوزی کرتے دیکھتے ہیں تو تحقیقات نے بتایا ہے کہ یہ محض عادۃً

ایسا کرتے ہیں، کسی مقصد کے ماتحت نہیں)۔علاوہ ازیں ان کا جمع کردہ ذخیرہ ان کی قوم کے تمام افراد کے کام آتا ہے۔وہ گراں فروشی یا نفع اندوزی کے لیے ایسا نہیں کرتے۔

ح ن ث

اَلْحِنْثُ۔گناہ، معصیت، نافرمانی (خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرنا)، حق سے باطل کی طرف جانا۔

جب بچہ جوان ہوجائے یعنی اس میں گناہ کرنے کی قوت آجائے تو کہتے ہیں بَلَغَ الْغُلَامُ الْحِنْثَ یہ اس لیے کہ سنِ شعور کے بعد بچہ اپنے اچھے اور برے کاموں کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔یعنی اگر اس سے کسی حکم کی خلاف ورزی ہوجائے تو وہ مجرم گردانا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں قصۂ حضرت ایوبؑ میں ہے: وَلَا تَحْنَثْ (38/44) (تو اپنی بیماری کا علاج جڑی بوٹیوں سے کر اور جھاڑ پھونک کی تو ہم پرستیوں میں مبتلا ہوکر) حق سے باطل کی طرف مائل نہ ہو۔

ح ن ف

حَنِيْفٌ کا مطلب ہے ہر غیر خداوندی قانون وروش زندگی سے منہ موڑ کر خدا کے قوانین کی طرف آجانے والا۔غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (22/31) اور ان قوانین کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو شامل نہ کرنے والا۔اسی کا نام اسلام ہے۔یعنی پہلے ہر غیر خدائی طاقت سے منہ موڑا جائے (يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ) اور اس کے بعد اللہ کے قانون پر ایمان لایا جائے۔يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ (2/256)۔

یہی مطلب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ہے۔''یعنی کوئی صاحب اقتدار ہستی نہیں بجز اللہ کے۔'' لہٰذا ہر مومن حَنِيْفٌ ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ کی روش تھی جنہیں قرآن کریم نے حَنِيْفٌ کہہ کر پکارا ہے (2/135)۔ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف قوانین خداوندی کی محکومت اختیار کرنے والا۔

ح ن ک

قرآن کریم میں ہے کہ ابلیس نے یہ چیلنج دیا کہ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ (17/62) میں بالضرور ابن آدم کی ٹھوڑی میں رسی باندھوں گا اور اس طرح اسے جدھر جی چاہے لیے لیے پھروں گا۔اس میں نہ صرف یہی ہے کہ ابلیس اسے جدھر جی چاہے لیے لیے پھرتا ہے بلکہ اِحْتِنَاكٌ میں جو ذلت کا پہلو ہے وہ بھی نمایاں ہے۔انفرادی مفاد پرستیاں جس طرح انسان کو اپنی گرفت میں لے کر ذلیل وخوار کرتی ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔اسی طرح انسان اپنے جذبات کے پیچھے لگا پھرتا ہے اور ذلیل وخوار ہوتا ہے۔اگر اس کی بجائے وہ انہی جذبات کو وحی کی روشنی میں چلائے تو کونین کی سرفرازیاں اس کے حصہ

میں آ جائیں۔

جو کچھ انفرادی جذبات پرستیاں ایک فرد کے ساتھ کرتی ہیں، وہی کچھ طاقتور قومیں کمزور قوموں کے ساتھ کرتی ہیں۔ یعنی ان کے جبڑے میں رسی ڈال کر انہیں جدھر جی چاہے لیے لیے پھرتی ہیں۔ یہ بھی ابلیسی قوتیں ہیں۔

ح ن ن

قرآن کریم میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ اٰتَیۡنٰہُ ... حَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا (19/12-14) ہم نے اسے اپنے ہاں سے رقت قلب، سوز و گداز، ماں کی سی محبت رکھنے والا دل عطا کیا۔ اسی اعتبار سے ہمارے ہاں خدا کے اسماء میں سے ایک نام الحنان بھی شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اس میں کچھ عیسائیت کے خدا کے تصور (رقت و سوز و گداز) کی جھلک پائی جاتی ہے۔

ح و ر

جنت کی زندگی میں باہمی رفقاء (حُوۡرٌ عِیۡنٌ) خواہ وہ عام ہم نشین ہوں یا بیویاں۔ کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی عقل و خرد ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے کام میں نہیں لائی جائے گی۔ وہ عقل ادب خوردۂ دل ہوگی۔ یعنی پاکیزہ اور شفاف عقل نہ کہ حیلہ جو اور فریب کار۔

ح و ط

قرآن کریم میں وَاللّٰہُ مُحِیۡطٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ (2/19) اکثر مقامات پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو کچھ ہمارے جی میں آئے کرتے رہیں، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تو یہ خیال غلط ہے۔ ان کے اعمال کبھی بے نتیجہ نہیں رہ سکتے۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے اور ان کے نتائج تباہیوں اور بربادیوں کی شکل میں، انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ ضرور ہلاک ہو کر رہیں گے۔ اس طرح، مُحِیۡطٌ میں حفاظت اعمال اور ان کے نتائج کی وجہ سے ہلاکت کے دونوں پہلو آجاتے ہیں۔ اسی طرح جہنم کے متعلق ہے: وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیۡطَةٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ (29/54) ''یقیناً جہنم ان انکار کرنے والوں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔'' دوسری جگہ ہے وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِیۡنَ (82/16) ''وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں۔''

ح ی ف

قرآن کریم میں ہے: اَمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَرَسُوۡلُہٗ (24/50) ''کیا انہیں اس کا ڈر ہے کہ خدا اور اس

کا رسول فیصلہ کرنے میں فریق مخالف کی طرف جھک جائے گا اور ان سے انصاف نہیں برتے گا۔'' (کس قدر غلط ہے ان کا یہ اندیشہ)۔

ح ی ن

سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَكُمۡ فِي الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ (2/36) اس کے یہ معنی ہوں گے کہ تمہیں زمین پر ٹھہرنا ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ہے ایک وقت تک کے لیے جس کی مدت معین نہیں۔ یہ مدت مختلف افراد اور مختلف اقوام کے لیے مختلف ہوگی۔ جس قسم کے اعمال کسی قوم سے سرزد ہوں گے اس کے مطابق اس کی مدت حیات کا تعین ہو جائے گا۔ باقی رہا نوعِ انسان کا اس ارض پر قیام، سو اس کی مدت کے متعلق علمِ انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ح ی ی

علم الحیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ زندگی کی ایک علامت سکڑنا ہے۔ آپ کسی جاندار چیز (مثلاً کیڑے وغیرہ) کو چھیڑیئے، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا پہلا ردِعمل یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سکیڑ لے گا، سمٹ جائے گا۔ اگر وہ زندہ نہیں تو علیٰ حالہٖ رہے گا۔ اس کا یہ سمٹنا درحقیقت اس کے جذبہ تحفظ خویش (Preservation of Self) کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی سے عربوں نے اس مادہ سے سمٹنے اور سکڑنے کا مفہوم بھی لیا۔ یہیں سے حَيَاءٌ (شرم) ہے کیونکہ حیاء کا مظاہرہ بھی سمٹنے سے ہوتا ہے۔ سانپ کو بھی حَيَّةٌ اس کے سکڑنے اور سمٹنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ حیات اخروی دنیا کی زندگی کے تسلسل میں تو ہوگی لیکن جن طبیعی قوانین کے ماتحت اس دنیا میں زندگی کی نمود اور بقا ہوتی ہے، اُخروی حیات ان قوانین کے تابع نہیں ہوگی۔ وہاں اس کے لیے اور قوانین ہوں گے۔

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے قرآن کریم ان کی محض طبیعی زندگی (Physical Life) کو حیات نہیں قرار دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی زندگی وہ ہے جو شرفِ انسانیت کو لیے ہو۔ جس میں انسان قوانین خداوندی کی روشنی میں علم وعقل سے کام لے کر اپنی ذات کی نشوونما کرتا چلا جائے۔ اَلۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا سے مراد مفادِ عاجلہ، پیش پا افتادہ مفاد، فوری عیش وعشرت، محض قریبی فائدے۔ یعنی وہ زندگی جس میں مستقبل پر کوئی نگاہ نہ ہو۔ طبعی زندگی جس میں انسان حیوانی سطح (Animal Level) پر دن بسر کرتا ہے۔ نہ اس زندگی میں مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد تسلسل حیات پر یقین رکھتا ہے، اَلۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ہے۔

قرآن کریم میں الحیاۃ الدنیا اور حیاتِ آخرت کی اہم اصطلاحات کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان معانی کو پیش نظر رکھنا

چاہیے۔ نیز اس حقیقت کو بھی کہ جس طرح ہمارے ہاں (اردو میں اور اسی طرح دنیا کی دیگر زبانوں میں) زندگی سے مراد صرف زندہ رہنا (سانس لینا) اور موت سے مراد محض مرجانا (نفس کی آمد و شد کا بند ہوجانا) نہیں بلکہ ان الفاظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اسی طرح عربی زبان (اور قرآن کریم میں) بھی یہ الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر مقام پر (نفسِ مضمون کے اعتبار سے) دیکھنا چاہیے کہ وہاں کون سے معانی زیادہ موزوں ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں قوم مردہ ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے افراد قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ اور جب کہتے ہیں کہ اس قوم کا شمار زندہ قوموں ① میں ہوتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس کے افراد سانس لیتے ہیں۔ مردہ اقوام اور زندہ اقوام کا مفہوم واضح ہے۔ اسی طرح یہ الفاظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ.... (6/123) "اور کیا وہ جو مردہ ہو پھر اسے ہم زندہ کر دیں اور اسے ایسی روشنی عطا کر دیں جس سے وہ لوگوں میں چلے۔۔۔" ظاہر ہے کہ یہاں موت اور حیات سے مراد طبعی موت اور زندگی نہیں بلکہ گمراہی اور ہدایت ہے۔ موت اور حیات کے معانی کے اس فرق کو ہر مقام پر ملحوظ رکھنا چاہیے۔ حضرات انبیاء کرام اقوام مردہ کو ایسی زندگی عطا کرنے کے لیے آتے تھے جو انہیں دنیا بھر کی سرفرازیاں عطا کر دے (8/24)۔ یہ زندگی اب قرآن کریم کی رو سے مل سکتی ہے لیکن صرف اسے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو (36/70)۔ اور جو تباہیوں سے بچنا چاہے (2/2)۔

خ ب ث

سورۃ ابراہیم میں كَلِمَةً طَيِّبَةً کے مقابلہ میں كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ آیا ہے جسے شَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ سے تشبیہ دی گئی ہے (14/24-26)۔ اس کے معنی ہیں ایسا درخت جو پھل نہ دے۔ غلط نظریۂ حیات دیکھنے میں بالکل صحیح نظریہ کے مطابق نظر آتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ حالانکہ غلط نظریۂ حیات کی چمک دمک بھی بہت ہوتی ہے اور پھیلتا بھی بڑی کثرت سے ہے (5/100)۔ لیکن اسے ثبات و قرار کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہوتی ہیں (14/26)۔

قرآن کریم میں فحش کاری یا فحش کار لوگوں کے لیے بھی خبیث کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً سورہ نور میں ہے: اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ... (24/26)۔ یہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ خبیث باتیں خبیث لوگوں کے شایان شان ہیں۔ اور یہ بھی کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں۔ ثانی الذکر مفہوم کی تائید اسی سورۃ کی دوسری آیت سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً (24/3) زانی مرد صرف زانی عورت سے نکاح کرسکتا ہے۔

---

① نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں (علامہ اقبالؒ)

ختم

قرآن کریم میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (یا طَبَعَ اللّٰہُ) متعدد بار آیا ہے (2/7)۔ دلوں پر مہر لگ جانے سے مطلب یہ ہے کہ ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ سورۃ انعام میں اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ (6/46) کی وضاحت کردی ہے۔ یعنی علم حاصل کرنے کے دروازے ہی اس پر مسدود ہوجاتے ہیں۔ یہ حالت ان لوگوں کی ہوجاتی ہے جو اپنے دل کی مرضی سے (برضا ورغبت) غلط روش اختیار کرلیتے ہیں، کیونکہ وہ مستقبل کی خوشگواریوں پر مفاد عاجلہ کو ترجیح دیتے ہیں (16/106-108)۔ اسی طرح وہ لوگ ہیں جو صحیح بات کے سننے سے انکار کردیتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کا ذکر آئے تو منہ پھیر کر چل دیتے ہیں (17/45-46)۔ جن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تمہاری مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری باتیں نہایت غور سے سن رہے ہیں لیکن وہ اس وقت سوچ کچھ اور ہی رہے ہوتے ہیں۔ یہ صرف اپنے جذبات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں (47/16-17)۔ اور قرآن کریم میں غور وفکر نہیں کرتے (47/24)۔ ان لوگوں کے اپنے اعمال خود زنگ بن کر ان کے دلوں پر مہر لگادیتے ہیں (83/14)۔ ان مقامات سے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی اللہ مہر نہیں لگاتا، ان کے اپنے اعمال قوانین خداوندی کے مطابق مہر بن جاتے ہیں۔

سورۃ احزاب میں نبی اکرم ﷺ کو خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (33/40) کہا گیا ہے۔ اس رو سے اس کے معنی آخری نبی ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کو جاری سمجھنا قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف ہے۔ جب قرآن کریم آخری کتاب ہے تو جس نبی پر قرآن کریم نازل ہوا وہ آخری نبی ہے۔ لہٰذا نہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب اور نہ ہی نبی اکرم ﷺ کے بعد کوئی اور نبی۔ یہ تصور کہ نبی اکرم ﷺ کی مہر سے دوسرے لوگ نبی بن سکتے ہیں، نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ نبوت خدا کی طرف سے ایک وہبی خصوصیت تھی جو بلا کسب وہنر عطا ہوتی تھی۔ اسے نہ کوئی اپنی محنت سے حاصل کرسکتا تھا اور نہ ہی کوئی نبی اسے دوسرے کو عطا کرسکتا تھا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ یکسر باطل ہے۔

لیکن ''دعوائے نبوت'' کی ایک اور شکل بھی ہے جو بڑی دقیق فلہٰذا بڑی غور طلب ہے۔ ''نبوت'' سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرے۔ یعنی اس علم میں اس کی اپنی عقل وخرد کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ علم اسے خدا سے براہِ راست ملے۔ ہمارے ہاں (تصوف میں) یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ ''اولیاء اللہ'' یا صوفیائے کرام، خدا سے براہِ راست حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ ورنہ کشف والہام اور وحی میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اس لیے یہ عقیدہ بجائے خویش باب نبوت کو کھول دیتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے صحیح بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو علم براہِ راست دینا تھا وہ آخری نبی ﷺ کو دے دیا۔ یہ علم اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

کشف والہام، انسان کی اپنی نفسیاتی کیفیت کے مظاہرے ہوتے ہیں، خدا کی طرف سے کشفِ حقائق نہیں ہوتا۔

خ د ع

خَادِعٌ سے مراد وہ جذباتی شخص ہے جو معاملات کا فیصلہ سوچ سمجھ کر نہیں محض جذبات کی رُو سے کرتا ہے۔ ذرا جذبات ابھر آئے تو بڑے بڑے وعدے اور دعوے کر دیئے۔ ذرا ان میں کمی اور افسردگی آ گئی تو سمٹ اور سکڑ کر بیٹھ گئے۔ یا ایسا مفاد پرست جو اپنی مصلحت کی خاطر اپنے آپ کو ایسا بنا کر دکھائے جیسا (یا جتنا) وہ درحقیقت نہیں اور اس طرح معاشرہ کو دھوکے میں رکھے۔ معاشرہ کے استحکام کے لیے ایسے لوگوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا وجود معاشرے کے لیے سخت نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

خ ذ ل

سورۃ آل عمران میں ہے: اِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ (3/159) ''اگر وہ تمہیں بے مدد چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا۔'' جس قوم کا ساتھ خدا کا قانون چھوڑ دے (بمقابلہ یَنۡصُرُ (3/159) اور وہ اس طرح باقی قوموں سے پیچھے رہ جائے تو اس کی مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرح پیچھے رہ جانے والا، خواہ ایک فرد اپنی جماعت سے پیچھے رہ جائے اور خواہ ایک قوم دوسری قوم سے پیچھے رہ جائے، زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے (17/22)۔ اسلام کے معنی ہیں تمام رفقائے سفر کا کامل ہم آہنگی سے مل کر ساتھ ساتھ چلنا۔ اور اَثِمَ کے معنی ہیں اپنی ذاتی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جانا۔ لیکن اگر کوئی شخص مختلف قسم کی کششوں سے، جن میں اولاد کے مفاد کی کشش سب سے زیادہ ہوتی ہے، جماعت سے پیچھے رہ جائے تو یہ خَذُلٌ ہوگا۔ بہر حال اس کا نتیجہ وہی ہوگا۔ یعنی اپنے انفرادی مفاد اور ذاتی جذبات کی وجہ سے جماعتِ مومنین سے پیچھے رہ جانا۔ یا قرآن کریم کے نظام کو چھوڑ دینے سے اقوامِ عالم کی صف میں پیچھے رہ جانا۔ یہ دونوں خَذُلٌ ہوں گے۔

خ ر ب

سورہ بقرہ میں مساجد کے متعلق ہے کہ جو شخص ان میں ذکر اللہ کے لیے رکاوٹ کا موجب بنتا ہے، سَعٰی فِیۡ خَرَابِہَا (2/114) ''وہ ان کی ویرانی کی کوشش کرتا ہے۔'' لہٰذا مساجد کی ویرانی یہی نہیں کہ ان میں لوگوں کا اجتماع نہ ہو۔ ان کی ویرانی یہ ہے کہ ان میں قوانین خداوندی کا ذکر اذکار اور صفاتِ الٰہیہ کے متعلق بات چیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ (42/38) اکٹھا آیا ہے۔ یعنی اقامت صلوٰۃ اور باہمی مشورہ، لازم و ملزوم ہیں۔ دوسری جگہ ہے مشرکین مساجد کو آباد نہیں کر سکتے (9/17)۔ اس لیے کہ وہ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتے۔

خ ر ر

سورۃ فرقان میں مومنین کی بہت سی صفات گنائی گئی ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی کہ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (25/73)''جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر گرنہیں پڑتے'' (بلکہ ان پر غور وفکر کرتے ہیں)۔اس سے ظاہر ہے کہ رسمی طور پر تو ایک طرف رہا، جذباتی طور پر بلاغور وفکر تمسک بالقرآن بھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا عمل بالقرآن غور وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔وہ علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ تمسک بالکتاب سے مقصد کیا ہے۔ذرا سوچئے کہ جو خدا اپنی آیات کو بھی بہروں اور اندھوں کی طرح بلاسوچے سمجھے اور دیکھے بھالے ماننے اور ان پر قائم رہنے کی اجازت نہ دیتا ہو وہ غیر خداوندی باتوں کو بلاغور وفکر تسلیم کر لینے کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ اور مومن وہ ہے جو احکام الٰہیہ اور قوانینِ خداوندی کو علیٰ وجہ البصیرت مانتا ہو۔

خ ر ص

حقائق کی بنیاد یقین پر ہوتی ہے۔اس لیے دین کا سارا مدار یقین پر ہے۔کوئی ظنی اور قیاسی بات دین نہیں بن سکتی۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے (خود قرآن کریم کی داخلی اور تاریخ کی خارجی شہادت اس پر دلالت کرتی ہے) اس لیے یہ یقینی طور پر دین ہے اور حق و باطل کو پرکھنے کا حقیقی معیار۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ظن وتخمین کا اتباع کرنے والے تباہ ہوں گے۔لہٰذا دین میں ظنیات کا اتباع کرنے والے (قرآن کریم کے دعویٰ کی رو سے) کبھی کامیاب وکامران نہیں ہوسکتے۔خود ہماری اپنی حالت اس کی زندہ شہادت ہے۔

خ ر ط م

قرآن کریم میں ہے: سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (68/16)''ہم اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔'' مطلب ذلیل کرنے سے ہے کیونکہ چہرہ یا ناک کا داغی کر دینا انتہائی ذلت کی بات ہوتی تھی۔اس میں توہین و ذلت کا ایسا پہلو ہے جو چھپائے نہ چھپے۔

ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں ''فلاں شخص قوم کی ناک ہے''۔یہ باشرف ہونے سے کنایہ ہے۔یا کہتے ہیں ''ناک کٹ گئی''۔یعنی وہ بے عزت ہوگیا۔

خ ز ن

خَزَآئِنُ اللّٰهِ کائنات کی وہ قوتیں اور ذخائر ہیں جو ہنوز انسان کے علم میں نہ آئے ہوں۔

خ ز ی

قرآن کریم میں ضابطۂ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2/85) بتایا گیا ہے۔ یعنی اس دنیا کی زندگی میں ذلت آمیز رسوائیاں۔

دنیا میں عزت وشرف کی زندگی مومن کا شعار ہے۔ ذلت ورسوائی خدا کا عذاب ہے۔ لہٰذا جو قوم دنیا میں ذلیل ورسوا ہو وہ مومنین کی جماعت نہیں ہوسکتی۔ ایسی قوم زندگی کی خوشگواریوں سے دور (محروم) کردی جاتی ہے اور یہ انتہائی ذلت ہے۔

اگر کسی قوم کے متعلق یہ دیکھنا ہو کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کررہی ہے یا نہیں، تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دنیا میں سرفرازی وسربلندی، غلبہ وتسلط اور عزت وشرف کی حامل ہے یا اقوام عالم کے مقابلہ میں ذلیل وخوار ہے۔ اگر وہ ذلیل وخوار ہے تو وہ قوانین خداوندی کے مطابق نہیں چل رہی۔ اس ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

① جو قوم ان قوانین کے مطابق تو زندگی بسر کرتی ہے جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں (یعنی تسخیر فطرت کرتی ہے) لیکن اپنی تمدنی زندگی کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع رکھتی ہے، اسے مفاد عاجلہ حاصل ہوجاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ اقوام مغرب کا شمار انہی میں ہے۔

② جو قوم تسخیر فطرت بھی کرتی ہے اور اپنی تمدنی زندگی بھی قوانین خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی بھی عزت وشرف کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت بھی درخشندہ وتابناک۔ یہ جماعت مومنین کی خصوصیت ہے۔ لیکن

③ جو قوم نہ تسخیر فطرت کرتی ہے اور نہ اپنی تمدنی زندگی قرآن کریم کے مطابق رکھتی ہے، اس کی دنیا بھی خراب ہوتی ہے اور آخرت بھی تباہ۔ ہم اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ (2/85) ''دنیاوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹنا۔''

خ س ف

قرآن کریم میں (نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں آنے والے انقلاب کے سلسلہ میں ہے) خَسَفَ الۡقَمَرُ (75/8) جس کا مطلب یہ ہے کہ عرب جاہلیت (جن کا نشان قمر تھا) کا زور ٹوٹ جائے گا، وہ کمزور اور ماند پڑ جائیں گے۔ ان کی مخالفت اور سرکشی ختم ہوجائے گی۔ یہ مجازی معنی ہیں۔ لیکن اگر اس کے حقیقی معنی لیے جائیں تو ترجمہ ہوگا ''چاند کو گہن لگ گیا۔ ماند پڑ گیا۔''

خ ش ع

خٰشِعِیْنَ ان لوگوں کے لیے بھی آیا ہے جو قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔ قرآن کریم نے اس کے معنی کیے ہیں الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (2/46) یعنی وہ لوگ جو اس کا گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کا سامنا کرنا ہے۔ یعنی وہ اپنے اعمال کے بارے میں خدا کے قانون مکافات کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس لیے وہ ہر معاملہ میں اُسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے خَشُوْعٌ سے مقصود۔ قلب سلیم سے قوانین خداوندی کے سامنے جھک جانا، سرِ تسلیم خم کر دینا۔

خ ش ی

خشیت الٰہی سے عام طور پر مراد لی جاتی ہے خدا کا ڈر۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قوانین خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی کوششوں کی کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے (ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ :2/5)۔ ان کی محنتوں کا بیج ایک شجر طیب بن جاتا ہے جس کی جڑیں زمین میں مستحکم ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی۔ اور وہ ہر موسم میں مسلسل پھل دیتا رہتا ہے (14/24)۔ یہ نتیجہ ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس اگر قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کی جائے تو انسان کی کوششوں کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور اس کی محنتوں کے پودے خشک ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا احساس کہ اگر ہم قانون خداوندی کے مطابق نہ چلے تو ہماری کھیتی جھلس کر رہ جائے گی، خَشْیَۃُ اللّٰہِ (خدا کا ڈر) کہلاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی سے سرکشی کے نتائج و عواقب کا احساس۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں احتمال، توقع، اندیشہ، اور علم کا پہلو مضمر ہوتا ہے، اور ان قوانین کے غیر متبدل اور لازمی طور پر نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے ان کی عظمت اور قوت کا پہلو بھی۔

سورہ توبہ میں ہے: اَتَخْشَوْنَھُمْ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ (9/13) تم اس سے تو ڈرتے ہو کہ ان لوگوں کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا حالانکہ تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اگر قانونِ خداوندی کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ''نتائج کا ڈر۔'' یہ ہے خَشْیَتْ کا صحیح مفہوم۔

خ ص ص

قرآن کریم میں ہے: وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (2/105) ''اللہ اپنی رحمت کے لیے جسے چاہتا ہے مختص کر لیتا ہے۔'' یہاں رحمت کے معنی وحی خداوندی ہیں۔ مطلب یہ کہ اللہ عام انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب (الگ) کر کے اسے

وحی عطا کر دیتا ہے۔ وحی چونکہ وہبی عطیہ ہے جو اکتسابی طور پر نہیں مل سکتی، اس لیے وحی کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے نہیں ملتی۔ یہ مشیت کے پروگرام کے مطابق اُسے ملتی ہے (بلکہ یوں کہیے کہ اسے ملتی تھی۔ کیونکہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے) جسے خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق دینا چاہے۔

خ ض ر

''آبِ حیات والے خواجہ خضر''، جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پانیوں کے پیغمبر ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ لیکن یہ محض ''شاعری'' ہے۔ قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

خ ض ع

قرآن کریم میں امہات المومنینؓ (نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات) سے کہا گیا ہے: فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ (33/32) ''اپنی گفتگو میں نرمی اور لوچ نہ پیدا کرو'' تمکنت اور وقار سے باتیں کرو۔ ①

خ ط أ

سورۃ الاحزاب میں ہے: لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ فِیۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِہٖ وَلٰکِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ (33/5) ''تم پر اس بارے میں گناہ نہیں جو تم سے خطا ہو جائے۔ گناہ وہ ہے جو تمہارے دل کے ارادہ سے ہو۔'' اس سے ظاہر ہے کہ خطاء اس غلطی کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جائے اور اس میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو۔ اسی قسم کی بلاعمد خطائیں (سہو) تھیں جن کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ خدا انہیں ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھے گا۔ وَ الَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ (26/82) ''وہ ذات جس سے مجھے توقع ہے کہ وہ ظہورِ نتائج کے وقت میری خطاؤں کے اثرات سے مجھے محفوظ رکھے گا۔''

خ ف ض

قرآن کریم میں ہے: وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (15/88) ''تو جماعت مومنین کے لیے اپنا بازو جھکا دے۔'' اسے نرم کر دے۔ ان سب کو اپنے بازو کے نیچے لے لے۔ اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لے۔ خَفَضَ الطَّائِرُ جَنَاحَہٗ اس وقت بھی کہتے ہیں جب پرندہ اپنی پرواز کو روکنے کے لیے بازو سمیٹ لے۔ ان معانی کی رو سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تو اپنی تیز رفتاری میں کمی کر دے تاکہ دیگر افراد کارواں جو اتنے تیز رَو نہیں ہیں،

---

① جو حکم اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کی بیویوں کو دیا ہے اُسی حکم کی پیروی مسلمان خواتین کو بھی کرنا فرض ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے تمام احکامات مرد و عورت پر فرض ہیں۔ (منظور الحسن)

تمہارے ساتھ چل سکیں۔ایک قائد کو اپنے پروگرام کی ترتیب میں اپنے رفقاء کی استطاعت اور استعداد کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔

خ ف ف

سورۃ القارعہ میں ثَقُلَتْ بمقابلہ خَفَّتْ آیا ہے۔فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (101/6-9) ''سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوشگوار اور پسندیدہ زندگی بسر کرے گا۔اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ تباہی کے عمیق گڑھے میں ہوگا۔''اس آیت میں ارتقاء کے ایک عظیم اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ طالب علموں کے لیے امتحان میں کامیابی کے لیے ''فی صد نمبروں'' کا قاعدہ مقرر ہوتا ہے (مثلاً ساٹھ فیصد)۔جو طالب علم سو میں سے ساٹھ نمبر حاصل کر لیتا ہے اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔اس کی چالیس فیصد غلطیوں سے درگزر کر لیا جاتا ہے اور اسے اگلی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے۔یعنی اس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے اور غلطیوں کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے۔اس کے برعکس جو طالب علم چالیس فیصد نمبر حاصل کرتا ہے اسے فیل کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ترقی کے لیے مقرر ہے۔کائنات میں قانونِ ارتقاء کا اصول بھی یہی ہے۔جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی تھوڑی بہت کمزوریاں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں۔جس میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اس کی تھوڑی بہت صلاحیت اس کے کسی کام نہیں آتی۔وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔یہی اصول انسانی ارتقاء کا بھی ہے۔جس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھک جائے گا اسے زندگی کی اگلی منزل میں ترقی مل جائے گی۔جس کا پلڑا کمزور رہے گا، وہ ترقی نہیں پا سکے گا۔''ترقی پانے والوں'' کو اہل جنت کہا گیا ہے اور آگے نہ بڑھنے والوں کو اہل جہنم۔اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11/115)''یقیناً حسنات (اچھے اعمال) سیأت (غلط اعمال) کو دور کر دیتے ہیں۔''اگر حسنات (تقویت بخش) اعمالِ حیات کا پلڑا بھاری ہو تو کمزوریوں کے مضرت رساں اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔اس مقصد کے لیے انسانی اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے لایا جاتا ہے(99/7-8)۔

خ ل د

قرآن کریم میں ہے کہ وہ شخص جو مال کو جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ (104/3) وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال زمانہ دراز تک اسے تباہیوں سے محفوظ رکھے گا یا حیات دوام عطا کر دے گا۔یہ اس کا خیال خام ہے۔بقا اس کے لیے نہیں جو مال جمع کر کے دوسروں کو اس کے فائدے سے محروم رکھتا ہے۔بقا اس کے لیے ہے جو نوع انسانی کے لیے نفع رساں ہو۔وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13/17)۔

خ ل ع

اَلْخُلْعُ۔ وہ طلاق جو عورت اپنے خاوند سے حاصل کرے۔ (یہ فقہی اصطلاح ہے قرآنی نہیں۔)

خ ل ف

جب حضرت موسیٰؑ طور پر گئے تو انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ (7/142) تم (میری غیبیت میں) قوم میں میرے جانشین بنو۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ان کی جانشینی کرنا۔ اس میں حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی کا تصور خاص طور سے ذہن نشین کرنے کے قابل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کسی کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں ہوسکتا ہے۔ خواہ وہ زندہ ہو لیکن اس جگہ موجود نہ ہو اور خواہ مر چکا ہو۔ چنانچہ سورۃ یونس میں ہے: ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (10/14) ''ہم نے تمہیں اُن کے بعد ملک میں ان کا جانشین بنایا۔'' سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم نے قوانین خداوندی سے روگردانی کی تو يَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (11/57) ''میرا رب تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا۔'' تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جانشین ایک اور قوم ہوجائے گی۔ قوم عاد کے متعلق ہے: جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (7/69) ''تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا۔'' اور ثمود کے متعلق ہے کہ انہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا (7/74)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات میں آدم (انسان) کے متعلق ہے: اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (2/30) اس کے معنی عام طور پر کیے جاتے ہیں خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ۔ یعنی زمین پر خدا کا نائب یا قائم مقام۔ یہ معنی بوجوہ غلط ہیں۔ سب سے پہلے تو اس لیے کہ قرآن کریم میں آدم کو کہیں بھی خَلِيْفَةُ اللّٰهِ (اللہ کا خلیفہ) نہیں کہا گیا۔ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ کہا گیا ہے۔ خَلِيْفَةٌ کے معنی ہیں کسی کے بعد یا کسی کی عدم موجودگی میں اس کی جگہ لینے والا۔ (انگریزی میں اسے Successor کہتے ہیں)۔ خدا ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اس لیے خدا کے بعد یا خدا کی عدم موجودگی میں اس کی جانشینی کا تصور ہی باطل ہے۔ جو خود موجود ہو اس کا جانشین (Successor) کیسا؟

انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کے لیے نہیں آیا۔ خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے آیا ہے۔ آدم (انسان) کو جو خلیفۃ فی الارض کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیا میں اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین (Successor) ہے۔ چونکہ جانشینی میں غلبہ وتسلط اور اختیار واقتدار شامل ہوتا ہے اس لیے اِسْتِخْلَافٌ فِي الْاَرْضِ سے مراد ہے ملک کی حکومت۔ کسی دوسری حاکم قوم کی جانشینی۔ یہ نظریہ بھی کہ انسان خدا کی نیابت کرتا ہے، قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں۔ نیابت کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنے اختیارات تفویض کردینا، (Powers Delegate) کر

دینا۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ دنیا میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل نہیں۔ نہ کسی بادشاہ کو، نہ مذہبی پیشوا کو، حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں۔ خدا نے اپنے مطلق اختیارات سے قوانین مرتب کیے ہیں۔ خدا کے بندے ان قوانین کو پہلے اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں اور پھر باقی دنیا پر۔ انسان کا فریضہ، قوانین خداوندی کی تنفیذ ہے۔ قوانین سازی کے اختیارات اسے تفویض نہیں کیے گئے۔ خدا کا رسول بھی، خدا کا دین (قانون) دنیا تک پہنچاتا اور اسے نافذ کرتا ہے، دین بناتا نہیں۔ اس لیے ان معنوں میں انسان خدا کا نائب نہیں۔ البتہ اس سے اگر مفہوم ''خدا کے قوانین کو نافذ کرنے والا'' لیا جائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس کے لیے ''نائب'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے تفویض اختیارات کا باطل مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے (24/55)۔ لہٰذا جس ایمان اور جن اعمال کا نتیجہ اِس دنیا میں غلبہ و اقتدار اور حکومت و شوکت نہیں قرآن کریم کی رو سے نہ وہ ایمان ایمان ہے نہ وہ اعمال اعمالِ صالحہ۔ ایمان و اعمالِ صالحہ کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان کا نتیجہ صرف آخرت (مرنے کے بعد) برآمد ہوگا، اس دنیا سے ان کا کچھ واسطہ نہیں یا ان سے مقصود ایک فرد کی اپنی ''روحانی ترقی'' ہے جسے معاشرہ کی اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں، قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

قرآن کریم کی رو سے کسی قوم میں باہمی اختلاف خدا کا عذاب ہے (3/104) اور اختلافات کا مٹ جانا اللہ کی رحمت (11/118-19)۔ قرآن کریم لوگوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لیے آیا ہے (16/64)۔ اور اسی لیے یہ بھی خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ جنتی زندگی کے مستحق وہ ہیں جن میں اختلافات نہ ہوں (3/105-6)۔ باہم اختلافات اور دین میں تفرقہ شرک ہے (30/31-32)۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ہر متنازع فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کیا جائے (42/10)۔ لیکن یہ فریضہ امت کا اجتماعی نظام (حکومت قرآنی) سرانجام دے گا (4/65)۔

خ ل ق

خَلَقَ کے معنی ہوں گے کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اس کے حشو و زوائد کو دور کرنا اور پھر اسے اندازے اور پیمانے کے مطابق بنانا، اس طرح کہ اس کا توازن و تناسب بالکل درست رہے اور وہ صاف اور ہموار ہو جائے۔ خَلَقَ کے معنی ہوں گے مختلف عناصر کو نئی نئی ترکیبیں دینا اور اس طرح ان سے اور چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ جیسے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ (16/4) یا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (55/14)۔

خلاق اور خالق اللہ تعالیٰ کی دو عظیم صفات ہیں (36/81 و 39/25)۔ لہٰذا جس فرد یا قوم میں صفات خداوندی کی نمود ہوگی اس کا مظاہرہ اس کی قوت تخلیق سے ہوگا۔ اولاد پیدا کرنا تخلیق (Creation) نہیں، تولید (Procreation) ہے۔ یہ وہ

حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوانات بھی انسان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ لہٰذا تولید، حیوانی سطح زندگی کا عمل ہے، انسانی سطح پر تخلیق شروع ہوتی ہے جس میں حیوان شریک نہیں ہو سکتے۔ جس قوم میں قوتِ تخلیق نہیں اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود نہیں۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے کہ:

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست
نزد ما جز کافر و زندیق نیست

یہ بھی یاد رہے کہ تخلیق محض (Duplication) نہیں۔ یعنی ایک جیسی چیز کا بار بار بنائے چلے جانا تخلیق نہیں۔ تخلیق نت نئے اضافے چاہتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے: يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35/1) ''وہ اپنی مشیت کے مطابق خلق میں اضافے کرتا رہتا ہے۔'' اس لیے اس کے بندوں کی بھی یہ شان ہونی چاہیے کہ وہ اپنے تخلیقی کارناموں میں نئے نئے اضافے کرتے رہیں۔ اس کو ایجاد کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (68/4) ''اور یقیناً تو خلق عظیم کا حامل ہے۔'' خلق کے معانی میں اعتدال، توازن و تناسب پایا جاتا ہے۔ یہ چیز شرف انسانیت کی دلیل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی میں یہ شرف اپنی بلند ترین سطح پر تھا۔ ہمارے ہاں جس چیز کو ''اخلاقیات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ہمارے دور ملوکیت کی تمدنی زندگی کا آئینہ ہیں۔ قرآن کریم نے جو صفات مؤمن کی بیان کی ہیں وہی صحیح اخلاق ہیں۔ اور ان صفات کی بلند ترین مظہر نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے جو نوع انسانی کے لیے حسین ترین نمونہ ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت کا یہ نمونہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔

خ م س

مال غنیمت کا خُمُسٌ (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کے لیے ہے (8/41)۔ یعنی مرکز نظام خداوندی کے لیے۔ امیر ملت اس مال کو امت کی اجتماعی ضروریات پر صرف کرے گا، اسی کو فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

خ ن ز ر

خنزیر (سؤر) کے متعلق یہ عجیب چیز ہے کہ اسے دنیا میں ہر جگہ قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یورپ کی جو قومیں اس کا گوشت کھاتی ہیں وہ بھی اس کے نام کو بطور گالی استعمال کرتی ہیں۔ خود بائبل میں اس کا ذکر اسی انداز سے آیا ہے۔

خ و ض

سورۃ مدثر میں مجرمین کی فہرست جرائم میں یہ بھی ہے کہ: كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ (74/45)۔ یہ اس ٹائپ کے لیڈروں کا ذکر ہے جو فلاح عامہ کے لیے عملاً کچھ نہیں کرتے لیکن بیانات دھڑا دھڑ دیتے، ریزولیشن پاس کرتے، اسکیمیں بناتے اور ہمیشہ منصوبہ بندی (Planning) میں وقت گزار دیتے ہیں۔ یعنی باتیں ہی باتیں اور کام کچھ نہیں۔ نیز ایسے علماء اور مفکرین جو نظری مسائل کی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں میں لگے رہتے ہیں اور عملی نتائج مرتب کرنے والے امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ قوموں کی تباہی کا موجب بنتے ہیں (70/41-42)۔

خ و ن

جس شخص کو امانت دار سمجھا جائے وہ اپنی امانت اور عہد کا پاس نہ کرے اس کا نام خِیَانَةٌ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خِیَانَةٌ دراصل اعتماد اور بھروسہ کو ضائع کر دینے کا نام ہے۔

اَمَانَةٌ تو یہ ہے کہ انسان کسی کی طرف سے مطمئن (امن میں) ہو جائے اور اپنے اعتماد کو نہیں کھوئے۔ لیکن خِیَانَةٌ میں یہ اعتماد اور بھروسہ باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قوانین خداوندی کے متعلق کہا ہے کہ وہ ایک ایسی مضبوط کڑی ہے کہ لَاانْفِصَامَ لَهَا (2/256) جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ ان پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کبھی راستہ میں دغا نہیں دیتے۔ یہ درمیان میں پہنچ کر ٹوٹ نہیں جاتے۔

سب سے بڑا جرم خود اپنے آپ سے خیانت کرنا ہے۔ یعنی جن امور کو تم صحیح اور سچا مانتے ہو ان کے خلاف عمل کرنا (خواہ اس کا علم کسی دوسرے کو ہو یا نہ ہو)۔ یہ انسانی خودی کی کمزوری کی دلیل، بلکہ دوغلے پن (Dual Personality) کی علامت ہے۔ یعنی اُن باتوں کو ماننے والا کوئی اور ہوتا ہے اور ان کے خلاف کام کرنے والا کوئی اور۔ قرآن کریم اس سے روکتا ہے۔

خ ی ب

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ (91/9-10) جس نے انسانی ذات (نفس۔Self) کی نشوونما کی، اس کی زندگی کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ جس نے اسے دبائے رکھا اور اُبھرنے نہ دیا اس کی کشتِ حیات ویران ہوگئی۔ اس کا شعلۂ زندگی افسردہ ہوگیا۔ ایسے چقماق کی مانند ہوگیا جس سے چنگاری نہ نکلے۔

خ ی ر

زندگی کی تمام خوشگواریاں اور اختیارات واقتدارات کی وسعتیں قوانین خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس لیے وحی کے لیے بھی خَیۡرٌ کی جامع اصطلاح آئی ہے (2/105)۔ لہٰذا مومنین کی زندگی یہ ہے کہ انہیں وحی کے اتباع سے ساری دنیا کی مفید اور حسین چیزیں میسر ہوں اور ان کے اختیارات کی وسعتیں حدودفراموش ہوں۔ یہ ہے خیر جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی لیے سورۂ نحل میں ہے کہ جب مومنین سے ان کے مخالفین سوال کرتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ تو سہی کہ تمہارے رب نے تمہارے لیے کیا نازل کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں ایک جامع لفظ کہہ دیتے ہیں: قَالُوۡا خَیۡرًا (16/30) یعنی تمام دنیا کی خوشگواریاں اور خوشحالیاں اور اختیارات کی وسعتیں۔

ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کی خوشگواریاں ہوں خیر ہے اور جس کا نتیجہ اس کے برعکس ہو وہ شر ہے۔ خوشگواریوں میں انسانی ذات (Personality) کی نشوونما (Development) سب سے مقدم ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ خوشگوار کہتے ہی اسے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو۔ جس سے اس کی نشوونما رک جائے وہ شر ہے۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اسے وہ اعمال صالحہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جن سے انسانی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوں۔

خ ی ط

قرآن کریم میں روزوں کے احکام کے سلسلہ میں اَلۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ آیا ہے (2/187) یعنی سفید دھاگہ اور سیاہ دھاگہ۔ اس سے مراد ہے صبح کی پھٹنے والے روشنی اور رات کی تاریکی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ لفظی معنی نہیں لیے جاتے بلکہ مفہوم کے اعتبار سے مطلب لیا جاتا ہے۔

داؤد علیہ السلام

کہتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ بڑے خوش آواز تھے [1]۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری اور بابلی مزامیر (سازوں) کو ترقی دے کر نئے نئے آلاتِ موسیقی ایجاد کیے۔

د ب ب

سورۂ ہود میں ہے: وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا (11/6) ''اس زمین میں کوئی دَآبَّۃٌ ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو'' دَآبَّۃٌ سے مراد خواہ تمام حیوانات (انسان سمیت) ہوں یا صرف انسان، ان سب کے رزق

---

① اسی بنا پر خوش آواز کو لحنِ داؤدی کہتے ہیں۔ (منظور الحسن)

کی ذمہ داری اللہ پر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو پھر دنیا میں لوگ بھوک سے کیوں مرتے ہیں؟ ایک ایک قحط میں مرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور عام حالات میں بھی کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اگر ان کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو وہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور نہایت غور طلب۔

ایسے مقامات میں اللہ کی ذمہ داری اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یعنی یہ نظام ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتا ہے جن کی نسبت (قرآن میں) اللہ کی طرف کی گئی ہے اور اسی طرح وہ حقوق و واجبات بھی اس کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں جنہیں خدا کے حقوق کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں خدا کی اطاعت اس نظام کی رو سے کی جاتی ہے جو خدا کے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ اور عَلَى اللّٰہِ رِزْقُهَا کے معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ ان تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری اس نظام پر عائد ہوجاتی ہے۔ لہٰذا نظام خداوندی میں تمام افراد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اس نظام کے ذمہ ہوتا ہے۔ رزق کے سرچشمے اصلاً اس نظام کی تحویل میں بطور امانت رہتے ہیں اور وہ نظام خدا کے دیئے ہوئے رزق کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ کوئی متنفس اس سے محروم نہیں رہنے پاتا۔ اس طرح خدا کی ذمہ داریاں خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب وہ نظام قائم نہ ہو تو مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں پر قابض ہوجاتی ہیں اور کمزور انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ جسے چاہتے ہیں رزق دیتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ آسمانی انقلاب، رزق کے سرچشموں کو ان کے ہاتھ سے چھین کر، انسانیت کی پرورش کے لیے نظام خداوندی کی تحویل میں دے دیتا ہے۔

سورۃ شوریٰ میں ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ○ (42/29) ''اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سماوات، زمین اور فضائی کروں کو پیدا کیا اور (جو) ان کے اندر اس نے ذی حیات (دابۃ) پھیلا دیئے ہیں۔ اور وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق انہیں جمع کرنے پر قادر ہے۔'' اس آیت سے آسمانی کروں میں ذی حیات آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ نیز، اب غالباً وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب زمین کی آبادی، آسمانی کروں کی آبادی کے ساتھ مل جائے (دونوں جمع ہوجائیں)۔ قرآن نے انسان کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ ارض و سماوات میں جو کچھ ہے وہ اس کے لیے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اس کی یہ کوشش کہ آسمانی کروں تک جا پہنچے، قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ ان کروں میں سے جن میں آبادی ہوگی وہ اس طرح زمین کی آبادی کے ساتھ مل جائے گی۔ دیکھا آپ نے کہ انفس و آفاق کی نشانیاں کس طرح قرآنی حقائق کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے چلی جارہی ہیں؟ (41/53)۔

دث ر

قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کو یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ (74/1) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی کہ اے وہ جس کے ذمے انسانیت کے سنوارنے کا فریضہ ہے یا اے وہ جو نوعِ انسانی کے معاملات کو حسن تدبیر سے سلجھانے کے لیے آیا ہے اور دَثَرَ الشَّجَرُ کے اعتبار سے معنی ہوں گے، اے وہ جس کی آمد سے ایک نئی دنیا وجود میں آنے والی ہے۔ یا جس کی آمد سے چمن عالم پر بہار آنے والی ہے۔ اس تخاطب کے بعد آپؐ سے کہا گیا قُمْ فَاَنْذِرْ (74/2) ''اٹھ اور دنیا کو غلط روش کے عواقب سے آگاہ کر دے۔'' اس کے بعد اس دعوت انقلاب کے مختلف اجزا کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ الْمُدَّثِّرُ میں انقلاب آفرینی اور نوع انسان کی خیر سگالی کا پہلو نمایاں ہے۔ یہی ایک آسمانی داعی انقلاب کی خصوصیت اور ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کے معنی باطل کے ہر تصور اور نظریہ پر چھا جانے والا (غالب آ جانے والا) بھی ہو سکتے ہیں۔ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (9/33) ''تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے۔'' اسی مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔

جو انقلاب نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کا طریق (Revolutionary) تھا۔ یعنی انقلاب کا دفعتہً رونما ہو جانا۔ اس کے بعد اب قرآنی تصوراتِ حیات کا غلبہ بتدریج ہو رہا ہے۔ اسے (Evolutionary) ارتقائی طریق کہتے ہیں۔ زمانہ ایک چیز کو لیتا ہے۔ اس کا تجربہ کرتا ہے اور اپنے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صحیح نظریہ وہی ہے جسے قرآن نے پیش کیا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے عملاً کر کے دکھا دیا تھا۔ لہٰذا اب قرآنی تصورات کا باطل کے تصورات پر غلبہ تدریجاً ہو رہا ہے۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت اس نظام کو لے کر اٹھے یا کوئی مملکت اسے اپنے ہاں نافذ کر کے اس کے انسانیت ساز تعمیری نتائج دنیا کے سامنے لے آئے تو یہ نظام پھر اچک کر، دوسرے نظامہائے حیات پر غالب آ سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سنت رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں تَدثُّر کا یہ عملِ خیر کس قوم کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے؟ وہی قوم اس دور میں انسانیت کی سب سے بڑی محسن ہوگی، اسی کے ہاتھوں شجر ہستی کے پھول کھلیں گے اور چمن کائنات پر پھر بہار آئے گی۔

الْمُدَّثِّرُ کے معنی ہیں انسانی کمالات اور شرفِ نبوت سے آراستہ و پیراستہ ہونے والا۔ نیز الْمُدَّثِّرُ کے معنی کنایۃً ایسے شخص کے ہیں جس کے پاس کوئی پروگرام نہ ہو اور وہ فارغ بیٹھا ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قُمْ فَاَنْذِرْ کہہ کر حضور ﷺ کو عظیم الشان انقلابی پروگرام عطا کر دیا۔

دخ ر

انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے مظاہر فطرت (اشیائے کائنات) کو معبود قرار دے کر، انسان کو ان کے سامنے جھکنا

سکھایا ہے۔ قرآن کریم نے یہ اعلان کر کے کہ تمام اشیائے کائنات ان قوانین خداوندی کے سامنے جھکی [1] ہوئی ہیں جن کا علم انسان کو دے دیا گیا ہے، دنیائے انسانیت میں کتنا عظیم انقلاب برپا کر دیا؟

دخ ن

قرآن کریم میں ہے کہ ارض کو دو مراحل میں پیدا کیا۔ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ (41/11) پھر وہ دیگر اجرام فلکی کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ بالکل دھوئیں (گیس) کی حالت میں تھے۔ سائنس کے انکشافات اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں جسے قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے بیان کیا تھا۔ اجرام سماوی کے اولین ہیولیٰ (Nebulae) کو ایسا ہی بتایا جاتا ہے۔

درأ

سورۃ قصص میں ہے: وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ (28/54)۔ حسنات کے ذریعہ سیأت کا ازالہ کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر متنوع اسالیب سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تخریب کی روک تھام دوسری قسم کی تخریب سے نہیں ہوتی۔ اس کی مدافعت اس سے قوی تر اور مؤثر تر تعمیر سے ہوتی ہے۔ آپ کمزور ہیں اس لیے ہر قسم کے تخریبی جراثیم آپ پر غالب آجاتے ہیں اور آپ بیمار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنی قوتِ مدافعت بڑھائیں۔ اس طرح آپ کی تخریب رک جائے گی اور تعمیر کا سلسلہ آگے چلے گا۔ زندگی کے ہر گوشے میں، تخریب کی مدافعت کا یہی صحیح طریق ہے۔ اسی کو ''نیکیوں کا پلڑا جھکنا'' کہتے ہیں۔

درج

قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں کے متعلق ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (2/228)۔ عورتوں کے لیے، از روئے معروف، ان ذمہ داریوں کے مطابق حقوق ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ بلحاظ حقوق و فرائض ان میں کسی کو کسی پر افضلیت نہیں۔ دونوں مساوی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (2/228)۔ مردوں کو ایک بات میں ان پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ ایک بات کیا ہے؟ اس کا ذکر خود اسی آیت میں موجود ہے۔ طلاق کے بعد عورت کے لیے عدت کی میعاد مقرر ہے جس میں وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی لیکن مرد کے لیے عدت کی کوئی قید نہیں۔ نیز اگر طلاق مرد کی طرف سے ہو اور

---

[1] نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے (علامہ اقبال)

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوجائے تو وہ عدت کے دوران میں بھی مطلقہ بیوی کو پھر سے اپنی زوجیت میں لاسکتا ہے۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (2/228) یہ ہے وہ بات جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں رعایت یا دَرَجَةٌ (ایک فضیلت) حاصل ہے۔ یہ نہیں کہ مرد (Men) عورتوں (Women) کے مقابلہ میں افضل (Superior) ہیں۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور فرمائیے۔ عورتوں اور مردوں کے تعلقات کے سلسلہ میں ہر جگہ ''عَلَيْهِنَّ'' نمایاں طور پر دکھائی دے گا۔ یعنی مردوں کے حقوق ہی حقوق ہوں گے اور عورت کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں۔ عورت کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ یعنی عورت کسی بات کو مرد سے بطور استحقاق (As of Right) طلب نہیں کر سکے گی۔ یہ انقلاب آفریں آواز آپ کو قرآن کریم کی عدالت سے بلند ہوتی سنائی دے گی کہ عورت کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح مرد کے اور اس باب میں دونوں برابر ہیں۔ جس قسم کے مردوں کے حقوق عورتوں پر (عَلَيْهِنَّ) اسی قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لَهُنَّ)۔ انسان کی عمرانی اور معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب ہے جو اِن چار لفظوں کی رو سے پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور کس قدر جامع ہیں یہ چار لفظ۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ۔ اس کے بعد بِالْمَعْرُوْفِ کہہ کر اس کی بھی صراحت کر دی کہ یہ بات کسی فرد یا معاشرہ کی مرضی پر نہیں چھوڑ دی گئی۔ اس کی (Provision) قانونِ خداوندی میں کر دی گئی ہے۔ اسی قانون (قرآن کریم) نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ایک بات کیا ہے جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک فوقیت (دَرَجَةٌ) حاصل ہے۔

حقوق اور ذمہ داریوں کی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ فطرت کی طرف سے جو فرائض مرد اور عورت پر عائد ہوتے ہیں وہ بھی یکساں ہیں۔ تقسیم عمل کے لحاظ سے فطرت نے مرد اور عورت کی تخلیق میں فرق رکھا ہے۔ اس لیے جو فرائض عورت کے ذمے عائد کیے گئے ہیں انہیں عورت کو سرانجام دینا ہوگا اور جو مرد کے ذمے ہیں انہیں مرد کو۔ عورت کا مختص فریضہ جسے مرد اَدا نہیں کر سکتا، اولاد کی پیدائش اور تربیت ہے۔ اور چونکہ اس میں عورت کا بہت سا وقت صرف ہوجاتا ہے اس لیے کسب معاش کا فریضہ مردوں کے ذمہ عائد کیا گیا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4/34) کے یہی معنی ہیں۔

درس

سورۃ آل عمران میں ہے: بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3/79) کتاب کو اس طرح گاہنا کہ اس کے معانی نکھر اور ابھر کر (الگ ہوکر) سامنے آجائیں۔ اس پر مسلسل غور وفکر کرنا تاکہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں وہ نکھر کر سامنے آجائیں یا جو حقائق انسانی تخیلات کے پردوں میں چھپ گئے ہیں وہ بے نقاب ہوجائیں۔

درک

سیڑھی کے ڈنڈوں کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے دَرَجٰتٌ کہتے ہیں اور نیچے اترنے کے لحاظ کو دَرَكَاتٌ۔ یہی وجہ ہے کہ

قرآن کریم نے جنت کے مراتب و منازل کو دَرَجٰتٌ کہا ہے۔اس کے برخلاف جہنم کے منازل کو دَرَکَاتٌ۔فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (4/145) جہنم کی سب سے نچلی تہہ۔غور کیجئے! سیڑھی وہی ہوتی ہے اور اس کے ڈنڈے بھی وہی۔ جو شخص اوپر چڑھنا چاہتا ہے سیڑھی اسے بلندی تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جو نیچے اترنا چاہتا ہے، وہی سیڑھی اسے پستی کی طرف لے جانے کا موجب ہوجاتی ہے۔ زندگی ایک ہی ہے۔ جو اسے جس انداز سے بسر کرنا چاہے یہ اسے اسی انداز کی منزل تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

د س ر

حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں دھات کا استعمال ہونے لگ گیا تھا اور کشتیاں محض درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر لینے سے نہیں بنا لیتے تھے بلکہ تختوں اور میخوں سے بنائی جاتی تھیں۔لیکن کشتی حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں یہ بھی ہے کہ اسے خدا کی زیرِ نگرانی، اس کی وحی کے مطابق بنایا گیا تھا (11/37)۔ممکن ہے اُس زمانے میں اس قسم کی صنعتی نادرہ کاری[1] کا علم بھی (پہلے پہل) وحی کے ذریعے دیا جاتا ہو اور پھر اس کا استعمال عام ہوجاتا ہو۔

تاریخ انسانیت سے پردے اُٹھ جانے سے نہ معلوم کیا کیا حقائق سامنے آئیں گے، اور کتنی ایسی چیزیں جن کے متعلق آج یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کی ابتدا عقلِ انسانی نے کی تھی، وحی کی رہین منت متحقق ہوں گی؟

د س س (د س و)

سورۃ شمس میں نفس انسانی کے متعلق ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا (91/10) ''جس نے اس کی نشوونما کر لی وہ کامیاب و کامران ہوگیا۔'' اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (91/11) ''جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد و ناکام رہا۔'' کھیتی (اَفْلَحَ) کی نسبت سے بیج کی مثال کو سامنے لائیے۔اس کی برومندی کے لیے اسے مٹی میں ملانا پڑتا ہے۔اگر پانی، مٹی، ہوا، حرارت، روشنی کا تناسب صحیح صحیح ہو تو بیج کی صلاحیتیں نشوونما پالیتی ہیں۔وہ شگوفہ بن کر پھوٹتا ہے، کونپل بن کر ابھرتا ہے اور تناور درخت کی شکل میں فضا میں جھومتا ہے۔لیکن اگر اسی بیج پر مٹی زیادہ مقدار میں پڑ جائے تو اس کی تمام صلاحیتیں فنا ہوجاتی ہیں۔انسانی ذات میں بڑھنے، پھولنے اور پھلنے کی صلاحیتیں مضمر کر دی گئی ہیں۔لیکن ان صلاحیتوں کی نشوونما (موجودہ سٹیج پر) مادی دنیا کے اندر ہوتی ہے۔اگر مادی قوتوں سے مناسب کام لیا جائے تو انسانی ذات کی مضمر

---

[1] اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت نوحؑ کے زمانے میں کشتیاں (لکڑی کے تختوں اور کیلوں سے) بنانے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا لیکن جس قسم کی کشتی (جہاز نما کشتی) اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب کے لیے بنوانا چاہتا تھا اُس طرز اور انداز کی کشتی صرف اللہ تعالیٰ کی نگرانی ہی میں (وحی کی رُو سے) بن سکتی تھی۔(منظور الحسن)

صلاحیتیں برومند ہوجاتی ہیں۔ اگر یہ مفاد پرستیوں کے بوجھ کے نیچے دب جائے تو اس کی صلاحیتیں سلب ہوجاتی ہیں۔

بخیل آدمی اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور سخی اپنے آپ کو نمایاں اور کھلا ہوا رکھتا ہے۔ یہ معنی اس اعتبار سے (ایک گونہ) صحیح ہیں کہ قرآن کریم نے خود نفسِ انسانی کی نشوونما کا راز اَعۡطٰی (دوسروں کو دینے) میں بتایا ہے اور بخل کو اس کی تباہی کا موجب قرار دیا ہے۔ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَاتَّقٰی ○ ... فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ○ وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰی ○ ... فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ○ (92/6-10) اسی کو ربوبیت کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں کی پرورش سے اپنی ذات کی نشوونما کرنا۔ اور یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہیٰ ہے۔

د ع ع

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107/1) ''کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے؟'' کون ہے جو یہ معلوم کرنا نہ چاہے گا کہ دین کی تکذیب کون کرتا ہے؟ اس کا جواب اگلی دو آیات میں یہ دیا گیا ہے کہ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ○ (107/2-3) ''یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔'' آپ نے غور کیا کہ دین اور معاشیات میں کتنا گہرا تعلق ہے؟ بلکہ صلوٰۃ اور معاش میں بھی؟ اس لیے کہ اگلی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ ان مصلین کے لیے تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی تو پابندی کرتے ہیں لیکن رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں ہر ایک ضرورت مند تک پہنچنا چاہیے، بند لگا کر روک لیتے ہیں۔

د ع و

سورہ بقرہ میں ہے: فَادۡعُ لَنَا رَبَّکَ (2/61) جس کے معنی ہیں ہمارے لیے اپنے پروردگار کو پکار۔ اَلدَّعۡوٰی: پکار، مطالبہ، تقاضا (10/10)۔ اب ہمارے سامنے دعا کا وہ گوشہ آتا ہے جو مذہب اور فلسفہ کی دنیا میں سب سے مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے طرح طرح کے شکوک اور خدشات لاحق ہوجاتے ہیں۔ یہ گوشہ ہے ''خدا سے دعا مانگنے'' کا۔ ان شکوک و خدشات کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کسی مقدمہ میں زید مدعی ہے اور بکر مدعا علیہ۔ زید خدا سے دعا کرتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہوجائے۔ اس سے حسب ذیل سوالات سامنے آتے ہیں۔

(الف) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے ہاں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بھی پہلے سے طے شدہ ہوگی کہ اس مقدمہ میں زید کو شکست ہوگی یا فتح۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ زید کو شکست ہوگی تو کیا زید کے دعا کرنے سے خدا اپنے پہلے فیصلے کو بدل دے

گا اور زید مقدمہ ہارنے کی بجائے جیت جائے گا؟ اگر ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا اپنے فیصلوں کو انسانوں کی مرضی کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ یعنی خدا، انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔

(ب) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کے دعا کرنے سے خدا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دے گا؟ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر دیا اور سچے کو اس کے حق سے محروم کر دیا۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

(ج) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ اگر زید خدا سے دعا نہ کرے تو کیا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا یا نہیں؟ اگر دعا کے بغیر فیصلہ اس کے حق میں نہیں ہوسکتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا از خود سچے کے حق میں فیصلہ نہیں دیتا۔ سچے کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لیے خدا سے منت خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

(د) یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ناجائز نہ سہی، جائز ہی سہی۔ کوشش تو ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر زید صرف دعا کرے لیکن کوشش نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائے گا؟ اگر وہ صرف دعا سے مقدمہ جیت جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے عمل (کوشش کرنے) پر جو اس قدر زور دیا ہے تو وہ سب بے کار ہوگا۔

اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کا فائدہ کیا ہوا؟

(ہ) اگر زید اپنی جگہ خدا سے دعا کرے اور بکر اپنی جگہ، تو پھر مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ خدا کس کی دعا قبول کرے گا اور کس کی ردّ کرے گا؟

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے شکوک و خدشات ہیں جو دعا کے اس مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے حل کرنے کے لیے مذہب اور فلسفہ صدیوں سے (ناکام) کوششوں میں مصروف ہیں۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دعا کا یہ تصور غلط ہے اور اس دور کا پیدا کردہ ہے جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کائنات میں قانون اسباب (Law of Causality) کے تصور سے ناآشنا تھا۔ اس نے بتایا کہ

(۱) کائنات میں ہر شے خدا کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے اور خدا اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (33/62) ''تو قانونِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔''

(۲) انسانی دنیا میں بھی خدا ہی کا قانون کارفرما ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق جس قدر کوشش کرے گا اسی قدر وہ کامیاب ہوگا۔ وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ○ وَاَنَّ سَعۡيَهٗ سَوۡفَ يُرٰى ○ (53/39-40) ''انسان کے لیے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرے اور اس کی کوشش کا نتیجہ بلا تاخیر سامنے آجائے گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو شخص خدا کے قانون کے مطابق کوشش نہیں کرتا اور محض دعا مانگنے سے سمجھتا

ہے کہ مقصود حاصل ہو جائے گا، اس کا نہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح ہے اور نہ ہی اسے کبھی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے: لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ انسان کی جو دعوت تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے، جو حق پر مبنی قرار پا سکتی ہے وہ وہی دعوت ہے جو خدا کے لیے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) ہو۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اور جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں سے اپنی طلب وابستہ کرتے ہیں یعنی چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر اپنی تو ہم پرستیوں کے زور پر کامیاب ہو جائیں تو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کی یہ خود ساختہ قوتیں ان کی کوئی مانگ پوری نہیں کر سکیں گی۔ ایسے لوگوں کی مثال كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ہے، یعنی جیسے کوئی شخص (دریا کے کنارے) اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر بیٹھا رہے (اور دعا کرتا رہے کہ پانی اس کے منہ میں آجائے تو) اس طرح پانی اس کے منہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (13/14) جو لوگ خدا کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا ۔۔(13/15)۔ کائنات کی ہر شے طوعاً و کرھاً خدا کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سو جب ساری کائنات کا سلسلہ خدا کے قانون کے مطابق چل رہا ہے، تو انسان اس سے مستثنیٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟

لہٰذا قرآن کریم کی رو سے ''خدا سے دعا'' کے معنی ہیں خدا کے قانون سے مدد چاہنا یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں میں صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمن میں ہے: وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ تمہارا نشوونما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ اس کے بعد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (40/60) یقیناً جو لوگ میری محکومیت اختیار کرنے سے سرکشی برتتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوتے ہیں۔ آیت کے دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''خدا کو پکارنے'' سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی و کاوش کا ثمر بار ہونا۔ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (32/15)۔ ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کیے جاتے ہیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشوونما دینے والے (کے پروگرام کو) درخور حمد و ستائش بنانے کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں اور وہ ان احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (32/16) وہ ان احکام کی تعمیل میں اس طرح سرگرم عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پروا نہیں کرتے۔ راتوں کو بھی جاگتے ہیں اور اس طرح اپنے رب کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لیے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل سے کیسے عمدہ نتائج مرتب ہوں گے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر

تباہیاں آئیں گی، جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے وہ اسے (نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے) کھلا رکھتے ہیں۔ سورۃ المومن میں ہے: فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ... (40/65) خدا کو پکارو تو اس طرح کہ فرماں پذیری کے ہر گوشے کو خالصۃً اُسی کے لیے وقف اور مختص کر دو۔ سورۃ شوریٰ میں ہے: وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ... (42/26) ''وہ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتے ہیں۔'' یہاں سے بھی واضح ہے کہ ''پکار اور اس کے جواب'' سے مفہوم کیا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (7/55) ''تم اپنے نشوونما دینے والے کو دل کے پورے جھکاؤ اور سکون سے پکارو۔'' اس طرح کہ یہ پکار تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ یاد رکھو! جو لوگ اس کے قانون سے سرکشی برتتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہ انہیں کبھی پسند نہیں کرتا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ''خدا کو پکارنے'' سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس سے اگلی آیت نے اسی مفہوم کی تشریح کر دی ہے جہاں کہا ہے: وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (7/56) یعنی تم معاشرہ میں ہمواری پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ اور خدا کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لیے پکارو۔ یاد رکھو! جو لوگ حسن کارانہ انداز سے معاشرہ کا توازن قائم رکھتے ہیں، خدا کی رحمت ان سے بہت قریب ہوتی ہے۔''

یہاں ''خدا کی رحمت'' کو قریب کہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ''اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں (کہیں دور نہیں ہوں ان سے بہت) قریب ہوں۔ (ان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب۔ 50/16) میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ اس کے بعد ہے: فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (2/186) ''پس انہیں چاہیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں تا کہ یہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ پالیں۔''

اس سے واضح ہے کہ خدا کو پکارنے (دعا) سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے اور دعا کا جواب دینے سے مفہوم اُس کی اطاعت پذیری کے نتائج مرتب ہونا۔

سورۃ نمل میں پہلے کائناتی نظام کے مختلف گوشوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہاں کس طرح ہر بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد، اس جماعت مومنین کو مخاطب کیا گیا ہے جو اپنے نظام کے ابتدائی مراحل میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں سے گزر رہی تھی اور قدم قدم پر پکار رہی تھی کہ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (2/214) خدا کی نصرت کب آئے گی؟ ان سے کہا کہ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (27/62) (خدا کے علاوہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) قلب مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے اور تمہاری پریشانیوں اور مشکلات کو دور کر کے تمہیں استخلاف

فی الارض عطا کرسکتا ہے (24/55)۔ اس لیے تم گھبراؤ نہیں۔ خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ وہ تمہاری بے کسی اور بے چارگی کو غلبہ وتسلط سے تبدیل کردے گا۔ اگر تم اس راستے پر چلتے رہے تو ہماری کائناتی قوتیں، ان مخالفین کی ضرر رسانیوں سے تمہاری حفاظت طلب کرتی رہیں گی (40/7)۔

جماعت مومنین تو ایک طرف، خود حضرات انبیاءؑ کرام سے بھی یہی کہا گیا۔ مثلاً سورہ یونس میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کا مقابلہ کرنے کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے: قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا (10/89) تم دونوں کی ''دعا قبول ہوگئی ہے۔'' بس اب تم اپنے پروگرام پر پوری پوری استقامت سے کاربند رہو۔ ظاہر ہے کہ اگر دعا قبول ہوجانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دے دیا گیا ہے (یا وہ تمہیں مل جائے گا) تو اس کے بعد اس کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تمہاری دعا قبول ہوگئی ہے۔ لہٰذا اب تم نہایت استقامت سے اس پروگرام پر کاربند رہو۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا وہ فقط اتنا ہی تھا کہ تمہاری یہ آرزوئیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں لہٰذا تم ان کے حصول میں نہایت مستقل مزاجی سے کوشش کرو۔ تم ضرور کامیاب ہوجاؤ گے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے خدا سے دعا کرنے کے معنی اس کے احکام وقوانین کی اطاعت کرنا ہے۔ اسی ''دعا'' کا حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (72/20) ان سے کہہ دو کہ صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کو ساتھ شریک نہیں کرتا۔

''دعا'' کے اس قرآنی مفہوم کے بعد ان شکوک وخدشات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

جن باتوں کو ہم اپنی اصطلاح میں ''دعا'' کہتے ہیں، قرآن کریم میں وہ بھی ہیں۔ مثلاً رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (3/146) ''اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری کوتاہیوں، اور معاملات میں حد سے بڑھ جانے کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت کر۔ ہمارے قدموں کو استقامت عطا فرما اور ہمیں قوم کفار پر کامیابی عطا کردے۔'' یعنی وہ دعائیں جن میں انسان اپنی کسی آرزو کے برآنے کی درخواست کرتا ہے۔ یہ دعائیں درحقیقت انسان کی آرزو کی شدت کا مظاہرہ ہوتی ہیں۔ اس شدت آرزو سے انسان کی اپنی ذات میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس سے اس کی خفیہ قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں اور مضمر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ ان کی وجہ سے اس کا عزم راسخ اور ہمت بلند ہوجاتی ہے اور وہ موانعات کا مقابلہ کرنے اور شدائد پر غلبہ پالینے کے قابل ہوجاتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ انسان وہی کچھ چاہے جو قانون خداوندی کے مطابق ہو۔ اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے آرزو میں شدت پیدا کرے۔ اس سے اس کے اندر ایسی انقلابی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جس کے نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ہر آرزو، قانون خداوندی کے مطابق ہونی چاہیے، ورنہ تم وہ کچھ

طلب کرنے لگ جاؤ گے جو تمہارے لیے درحقیقت مضر ہوگا۔ 17/11)۔اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنے اندر و یسے ہی شدت آرزو پیدا کر لے تو اس سے بھی اس کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ پھر اس میں اور خدا سے دعا کرنے میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح بھی انسان کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں لیکن مقصد صرف قوتوں کی بیداری نہیں۔سب سے پہلی چیز خود مقصد کا تعین ہے۔یعنی وہ مقصد ہے کیا جس کے حصول کے لیے آرزو کی جا رہی ہے اور وہ ہے کیسا؟ پھر اس کے حصول کے لیے طریقے کیا کیا اختیار کیے جائیں گے اور اس تمام سعی و کاوش کے ماحصل کو کس مصرف میں لایا جائے گا۔ایک مردمومن (قرآنی انسان) ان تمام امور کا فیصلہ خدا کے احکام کی روشنی میں کرتا ہے اس لیے وہ، پہلے قدم سے آخری قدم تک، خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔اس کی طلب و آرزو کی شدت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوتی ہے۔اس لیے وہ اس کے لیے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے۔خدا کی طرف سے سب کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔حتیٰ کہ دعا کے نتیجہ میں انسان کی خفیہ قوتوں کی بیداری بھی اس کے قانون ہی کے مطابق ہوتی ہے۔علاوہ بریں، ایک اور بھی نقطہ ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔خدا نے انسانی ذات میں ایسی صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ مناسب نشوونما سے اپنے اندر (علیٰ حد بشریت) ان صفات کو اجاگر کرتی جائے جنہیں (لامحدود طور پر) صفات خداوندی یا الاسماءالحسنیٰ کہا جاتا ہے۔اس نقطہ نگاہ سے خدا کی ذات (یعنی ان صفات حسنیٰ کی حامل ذات) انسانی ذات کی نشوونما کے لیے معیار (Standard) بن جاتی ہے۔انسان کا اپنی شدت آرزو میں خدا کو پکارنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات خداوندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے جن سے مقصد پیش نظر میں کامیابی ہو جائے۔یہ ہے فرق ''خدا سے دعا مانگنے'' اور اپنے طور پر شدت آرزو پیدا کرنے میں۔

اب رہیں حضرات انبیاءؑ کرام کی وہ ذاتی دعائیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔سو نبوت کا معاملہ عام انسانی معاملات سے بالکل الگ ہے۔اس کے متعلق ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ہم ان کے لائے ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں اور اسی کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے۔باقی رہا ان کی دعاؤں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جس طرح خدا ان کی دعا کے جواب میں ان سے ہم کلام ہوتا تھا، اسی طرح دیگر (غیر از انبیاء) انسانوں سے بھی ہمکلام ہو سکتا ہے۔تو یہ چیز وحی اور نبوت کے قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے۔خدا، حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ کسی انسان سے ہمکلام نہیں ہوتا اور نبی اکرم ﷺ کے بعد ایسا سمجھنا ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے۔

نہ ہی یہ عقیدہ صحیح ہے کہ خدا ہماری دعا کو نہیں سنتا اس لیے ''خدا کے مقرب'' سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے

لیے خدا سے دعا کرے۔ قرآن کی رو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل [1] نہیں ہوسکتی۔ ایسا سمجھنا شرک ہے۔ ''خدا تک پہنچنے'' یا اس تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر انسان اس کے قوانین کے اتباع سے ''اس تک پہنچ سکتا ہے'' اور اپنی آواز اس تک پہنچا سکتا ہے۔ اور اس کے قوانین کا اتباع، قرآنی معاشرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جو دعائیں مومنین کے لیے بتائیں ہیں وہ عام طور پر اجتماعی ہیں۔ مثلاً 1/5-7 و 2/201 و 2/286 و 3/7 و 3/146 و 3/192۔

سورۃ بقرہ کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے۔ یعنی وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ (2/186) ''جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو (ان سے کہہ دو کہ) میں قریب ہوں۔'' یا نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (50/16) ''میں انسان سے اس کی رگ جان سے بھی قریب ہوں۔'' تو ان میں ضمناً خدا کے موجود فی الکائنات (Immanence) اور خارج از کائنات (Transcendence) کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ وہ ہر انسان سے اس کی رگ جان سے بھی قریب ہے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس طرح موجود نہیں جس طرح کوئی چیز کسی خاص مقام میں مقید ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارے حواس کسی ایسی شے کا تصور نہیں کر سکتے جو فضا (Space) کے اندر مقید نہ ہو اس لیے ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا، اس کائنات میں، بغیر جگہ (Space) گھیرے کس طرح موجود ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (6/104) انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ لیکن وہ انسانی نگاہوں کا ادراک و احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے قانون کا ہم ادراک بھی کر سکتے ہیں اور نتائج سے اس کا مشاہدہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے ہمارا تعلق خدا کے قانون سے بتایا ہے۔ خود خدا کی ذات سے نہیں۔ دعا (پکارنے) کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے۔ ہم اس کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کا جواب دیتا ہے۔

باقی رہا خدا کا علم، سو جس چیز کو ہم ''ماضی، حال، مستقبل'' کہتے ہیں، علم خداوندی کی رو سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل سب بیک وقت (Eternal now کی شکل میں) موجود ہوتے ہیں۔ یعنی اسے ہونے والے واقعات کا اس طرح علم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے اس وقت ہو رہے ہوں۔ لیکن اس چیز کا ہمارے اس اختیار و ارادے پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو ہمیں خدا نے عطا کیا ہے۔ نہ ہی اس بات پر کوئی اثر پڑتا ہے کہ ہمارے لیے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سب کچھ خدا کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے (اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے) لیکن وہ

---

[1] ایک دفعہ حضرت عمرؓ کسی مقام سے گزر رہے تھے کہ معاً سجدہ بجالائے۔ ساتھیوں نے عرض کیا کہ یہ مقامِ سجدہ کیا ہے؟ فرمانے لگے کہ اس جگہ میں مویشیوں کو چرایا کرتا تھا اور میرا باپ بڑا سخت گیر تھا۔ معمولی سی کوتاہی پر مار مار کر بھرکس نکال دیتا تھا اور آج جب میں اِس مقام پر آیا ہوں تو مجھے وہ سارے احوال و کوائف یاد آ گئے اور میں اس لیے اس مقام پر سجدہ شکر بجالایا ہوں کہ میرے اور خدا کے درمیان آج کوئی قوت حائل نہیں۔

ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے قانون کے مطابق کام کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں۔ کسی میں اس کی طاقت نہیں کہ خدا کے قانون کے خلاف کرے اور اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب کرے۔ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا، خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے۔ اور اس کا خوشگوار نتیجہ مل جانا، دعا کا قبول ہو جانا۔

د ل ک

قرآن کریم میں ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (17/78) اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا "صلوٰۃ قائم کرو دلوک شمس سے غسق لیل تک۔ اور فجر کا قرآن۔" یہاں اگر دُلُوْكٌ کے معنی عام حرکت کے لیے جائیں تو اس میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا سارا وقت آجاتا ہے۔ اور قُرْاٰنَ الْفَجْرِ طلوعِ آفتاب سے پہلے، اور غَسَقِ الَّیْلِ غروبِ آفتاب کے بعد۔ یعنی اس طرح اس آیت میں سونے کا وقت نکال کر باقی دن رات کا سارا وقت آجاتا ہے۔ مفہوم ظاہر ہے کہ صلوٰۃ کے لیے یہ سارا وقت تمہارے لیے کھلا رکھا ہے۔ اور اگر دُلُوْكٌ کو زوال آفتاب سے غروب تک مقید کر دیا جائے تو پھر (اوپر کے مفہوم کی رو سے) طلوعِ آفتاب سے لے کر اس کے نصف النہار تک پہنچنے کا وقت خارج ہو جائے گا۔ دوسری جگہ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ (11/114) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی دن کے دونوں کناروں اور رات کے (ابتدائی) حصوں میں۔ دن کے دونوں کنارے فجر اور مغرب ہیں اور رات کے (ابتدائی) حصے غَسَقِ الَّیْلِ۔ سورۃ نور میں صَلٰوۃِ الْفَجْرِ اور صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ (24/58) کا خصوصیت سے نام لیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن کریم (رسول اللہ ﷺ) کے زمانے میں دونوں اوقات میں اجتماعات صلوٰۃ ہوتے تھے۔ یہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اور غَسَقِ الَّیْلِ کے اوقات تھے۔ باقی وقت دُلُوْكِ الشَّمْسِ سے غَسَقِ الَّیْلِ تک کا ہے۔ اسے صبح سے شام کہہ لیجئے یا سورج ڈھلنے سے شام تک کا وقت۔ دُلُوْكٌ کے عام مفہوم کے اعتبار سے پہلے معانی (صبح سے شام تک کا وقت) لغوی اعتبار سے زیادہ موزوں ہوں گے۔

(غَسَقٌ۔ ابتداء شب کی تاریکی کو کہتے ہیں۔)

صلوٰۃ سے مراد صرف وقتی اجتماعات نماز ہی نہیں۔ اس سے مراد قرآنی نظام یا قرآن کریم کے مطابق متعین کردہ فرائض زندگی بھی ہے۔ اقامت صلوٰۃ کے معنی فرائض زندگی کی سرانجام دہی یا قرآنی نظام کے قیام کے لیے جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آغاز کار سے پہلے (ہر روز، صبح دم) یہ دیکھو کہ زیر نظر پروگرام کے لیے قرآن کریم کی طرف سے کیا راہ نمائی ملتی ہے (یہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ہوگا) اور پھر صبح سے شام تک اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف کار رہو۔ یہ اقامت الصلوٰۃ

دلوک شمس سے غسق لیل تک ہوگا۔

د م غ

خدا کے تعمیری پروگرام کا تخریبی پروگراموں پر غالب آنا، قانون کائنات ہے۔ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے غلبہ اور تسلط کی رفتار (ہمارے پیمانوں کے مطابق) بہت سست ہے۔ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا (بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا) ہوتا ہے (32/5 و 70/4)۔ لیکن اگر انسان خدا کے قانون کا رفیق بن جائے، تو پھر اس کے نتائج خود انسان کے حساب و شمار کے مطابق مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

د ن و

قرآن کریم میں اَلْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا بمقابلہ آخِرَۃٌ اکثر مقامات پر آیا ہے اور یہی وہ تقابل ہے جو زیادہ غور طلب ہے۔ اس لیے کہ اس تقابل میں اَلْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا کو آخرت کے مقابلہ میں کم قیمت قرار دیا گیا ہے۔

عام مذاہب عالم میں جہاں روح اور مادہ کی ثنویت (Duality) کا عقیدہ رائج ہے، دنیا اور اس کی متاع کو بڑا ذلیل اور حقیر قرار دیا گیا ہے۔ ہندو دھرم کی رو سے دنیا ہے ہی مایا یعنی فریب اور اس فریب سے چھوٹ جانے کا نام نجات یا مکتی ہے۔ بدھ مت میں دنیا کے متعلق ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔۔ اس لیے اصلِ حیات ترکِ آرزو کا نام ہے۔ یہی عقیدہ عیسائیت میں ہے جہاں نیکوکاروں کی بادشاہت آسمان میں ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں ترک دنیا سب سے بڑی ولایت ہے۔ یہی عقیدہ تصوف کی اصل ہے اور اس سے متاثر ہو کر خود ہمارے (مسلمانوں کے) ہاں بھی دنیا کو بڑا حقیر اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ''دنیا دار'' اور ''گنہگار'' قریب قریب مرادف المعنی الفاظ ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس، دین اور دنیا ایک دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ مومن کو (آخرت کے علاوہ) فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً (7/156) کی دعا سکھاتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ (16/30)۔ حسن عمل کا نتیجہ (آخرت کے علاوہ) اس دنیا کی خوشگواریاں ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (7/152) ''دنیا میں ذلت و خواری'' کو خدا کے غضب اور اس کی لعنت قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے یہ تصور باطل ہے کہ دنیا قابل نفرت ہے اور اس کی آسائشیں اور آرائشیں گناہ کی آلودگیاں!

لیکن قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں متاع دنیا کو قلیل اور اس کی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم ان لوگوں کی سخت مخالفت کرتا ہے جو اپنی نگاہوں کو مفاد عاجلہ (فوری حاصل ہو جانے والے مفاد) پر مرکوز رکھتے ہیں

اور مستقبل کی خوشگواریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی مفاد عاجلہ کو وہ مَتَاعُ الدُّنْیَا قریبی مفاد یا پیش پا افتادہ مفاد کہہ کر پکارتا ہے اور ان لوگوں کو سخت مطعون کرتا ہے جو ان پیش پا افتادہ مفادات کی خاطر مستقبل کی خوشگواریوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ لہٰذا جو چیز قرآن کریم کی رو سے مذموم ہے وہ یہ ہے کہ انسان قریبی مفاد (Immediate Gain) کی خاطر مستقبل (Future) کی تابناکی کو نظر انداز کر دے۔ یعنی وہ زندگی اسی طبعی زندگی ہی کو سمجھ لے۔ اور یہ بھی مفہوم ہے کہ انسان دنیا کو ترک کر کے صرف ''عاقبت سنوارنے'' کے خیال میں لگ جائے۔ اسے رہبانیت کہتے ہیں جسے قرآن کریم جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2/201) اس دنیا میں بھی خوشگواریاں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ حال بھی درخشندہ اور مستقبل بھی تابناک۔ قریبی مفاد بھی اور مستقبل کے مفاد بھی۔

اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جس کا حال درخشندہ نہیں وہ سمجھ لے کہ اس کا مستقبل بھی تاریک ہی ہے۔ وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا (17/72) ''جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا۔''

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ وہ انسان کو اقدار (Values) متعین کر کے دیتا ہے۔ وہ ہر شے کے متعلق بتاتا ہے کہ انسانیت کی میزان میں اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ عقل اور ایمان کی رو سے صحیح مسلک زندگی یہ ہے کہ انسان بلند تر قدر و قیمت کی شے کے لیے کم قدر و قیمت کی شے کو قربان کر دے۔ وہ بتاتا ہے کہ دنیاوی سامانِ زندگی اور اس کی خوشنمائیاں اپنی قدر رکھتی ہیں۔ انہیں ضرور حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی زندگی (یعنی انسان کی طبعی زندگی۔ Physical Life) کے کسی تقاضے میں اور انسانی زندگی (انسانی ذات) کے کسی تقاضے میں تصادم واقع ہو جائے (ان میں (Tie) پڑ جائے) تو اس وقت انسانی ذات کے بلند تقاضہ کی خاطر طبعی زندگی کے کم تر درجہ کے تقاضہ کو قربان کر دینا چاہیے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں قرآن کریم نے (طبعی زندگی اور انسانی ذات کا مقابلہ کرتے ہوئے) دنیاوی زندگی اور اس کے ساز و سامان کو کم قیمت بتایا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیاوی زندگی قابل نفرت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب طبعی زندگی اور انسانی زندگی (جسے مرنے کے بعد قائم رہنا ہے) کا مقابلہ ہو تو پھر طبعی زندگی کی قیمت، انسانی زندگی کے مقابلہ میں کم تر سمجھنی چاہیے۔ یہ ہے قرآن کریم کی صحیح تعلیم ''دنیا اور آخرت'' کے متعلق۔

دھر

قرآن کریم میں ان لوگوں کا قول نقل کیا گیا ہے جو زندگی کو اِس طبعی زندگی تک محدود سمجھتے ہیں کہ وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ (45/24) یہ صرف مرورِ زمانہ (Time) ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ وقت گزرنے سے انسان کے قویٰ مضمحل

ہوجاتے ہیں اوراس طرح وہ زوال پذیر (Deteriorate) ہوتا ہوا مرجاتا ہے اور زندگی کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔اس کے بعد کوئی اور زندگی نہیں۔ یہ وہی تصور ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں (Materialistic Concept of Life) مادی نظریۂ حیات کہتے ہیں۔قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ(45/24) ان کا یہ عقیدہ علم پر مبنی نہیں۔ یہ محض ظن وقیاس سے کام لیتے ہیں۔قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔اب ہمارے دور میں دھر (Time) کے متعلق جو جدید فلسفیانہ (اور سائنٹفک) تصورات قائم ہوئے ہیں ان کی رو سے زمان (Time) کی حقیت ہی کچھ اور ہوگئی ہے۔اور ابھی تو اس نہایت مشکل اور نازک موضوع پر تحقیق وتفتیش اور بحث ونظر کی ابتداء ہوئی ہے۔آگے چل کر دیکھئے اس کے متعلق کیا کیا تصورات قائم ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ عقیدہ کہ زندگی محض طبعی زندگی (Physical Life) ہے اور مرورِ زمانہ سے اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اب عہد کہن کا فرسودہ خیال سمجھا جاتا ہے۔اب تحقیقات کا رخ اسی طرف کو ہے کہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے۔

مرورِ زمانہ سے انسان کا جسم مضمحل ہوجاتا ہے۔اس کی ذات (Personality) پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔وہ زمانے کے اثرات سے غیر متاثر رہتی ہے۔قرآن کریم کی رو سے انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔جسم کے علاوہ اس کی ذات بھی ہے۔اگر اس کی نشوونما قرآن کریم کے طریق کے مطابق ہوجائے تو موت[1] سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔وہ زندگی کے مراحل طے کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتی ہے، اسی لیے دھر (زمانہ) کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے الدھر اس زمانے کو بھی کہا ہے جب انسان ہنوز وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (76/1) لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ خود زمانہ (دہر) کو خدا مان لیا جائے۔ بہرحال جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، زمانہ یا دہر (Time) کے متعلق بحث بڑی فلسفیانہ ہے جو ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے۔قرآن کریم میں یہ لفظ (دھر) انہی دو مقامات میں آیا ہے جن کا ذکر اوپر کردیا گیا ہے۔ان مقامات میں اس لفظ کا مفہوم بالکل صاف اور سیدھا ہے جس کے سمجھنے کے لیے کسی فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

د ھ ن

سورۃ قلم میں ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ(68/9) یہ چاہتے ہیں کہ اگر تو تھوڑا سا اپنے مقام سے ہٹ جائے تو وہ

---

[1] علامہ اقبال نے ضربِ کلیم میں کہا ہے

ا فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے — موت

ب ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی نہ مرسکے — حیاتِ ابدی

بھی اپنے مقام سے ہٹ کر تجھ سے ''مفاہمت'' (Compromise) کر لیں۔ لیکن جو شخص حق پر ہو وہ اگر اپنے مقام سے ذرا سا بھی ہٹ جائے تو وہ باطل پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس، باطل اگر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ باطل کا باطل ہی رہتا ہے۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ تین اور تین چھ ہوتے ہیں اور بکر کہتا ہے کہ نہیں، تین اور تین چار ہوتے ہیں۔ اب ان میں ''مفاہمت'' کرانے والا کہتا ہے کہ کچھ تم گھٹو اور کچھ تم بڑھو اور دونوں یہ مان لو کہ تین اور تین پانچ ہوتے ہیں۔ بکر کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ وہ جیسا پہلے غلطی پر تھا ویسا ہی اب رہے گا۔ لیکن اس سے زید فوراً اپنے مقامِ حق سے باطل پر آ جائے گا۔ یہ وجہ ہے کہ حق کسی کی خاطر اپنے مقام سے ہٹ نہیں سکتا۔ وہ اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے۔ دین کے محکم اصول اپنے اندر کسی قسم کی کمی بیشی کی گنجائش ہی نہیں رکھتے۔ سورۃ واقعہ میں پہلے قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کس قدر عظیم کتاب ہے۔ اس کے بعد ہے: اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (56/81) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیا تم ایسی کتاب میں خیانت کرتے ہو۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کی صحیح تعلیم میں کمی بیشی کرتے ہو۔ اور دوسرے یہ کہ تم اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو ان کے صحیح مقام سے پھسلاتے ہو؟ مفہوم درحقیقت دونوں سے ایک ہی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم میں کمی بیشی کرتی ہے اور اس طرح لوگوں کو حق کے مقام سے ہٹا دیتی ہے۔ اور یہ سب اس لیے کہ اس سے ان کی روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (56/82)۔ اس تکذیب کو تم اپنے لیے ذریعہ معاش بناتے ہو؟

دنیا کی مصیبتوں کا بیشتر حصہ عقلِ فریب کار کی چالاکیوں ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔

دول

قرآن کریم نے مال کی گردش کے متعلق کہا ہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (59/7) تاکہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی نہ گھومتا پھرتا رہے۔ معاشیات (Economics) کا کتنا بڑا اصول ہے جسے قرآن کریم نے چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ معاشرہ کا فساد اسی سے ہوتا ہے کہ دولت ایک خاص (اوپر کے) طبقہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) رہنی چاہیے، نہ دولت کو ایک خاص دائرے (Circle) کے اندر گردش کرنا چاہیے۔ علاوہ بریں، قرآن کریم میں یہ اصول بالخصوص مالِ فے کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے روپیہ کو بھی اوپر کے طبقہ (یعنی اربابِ حل وعقد) کے اندر صرف نہیں ہوتے رہنا چاہیے۔ اسے رفاہِ عامہ کے لیے گردش کرنا چاہیے۔

د و ن

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (3/27) ''مومن مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔'' یعنی ایسا کبھی نہ کریں کہ مومنوں کو بھی دوست رکھیں اوران کے ساتھ کفار کو بھی۔

کتنے معبود ہیں جو انسانوں نے خدا سے ورے ہی اپنی ''پرستش'' کے لیے تجویز کر رکھے ہیں۔ یہ معبود مٹی اور پتھر کے بت نہیں۔ انسانی جذبات کے بت، ارباب اقتدار کے بت، مذہبی پیشواؤں کے بت، غرض یہ کہ ہر آن ایک نیا بت۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

نزول قرآن کے بعد خدا تک پہنچنے سے قاصر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اس کی کتاب کا اتباع ہے اور وہ کتاب ہر ایک کے سامنے ہے۔

د ی ن

دِیْنٌ۔ یہ لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ازانجملہ غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم ونسق، فیصلہ، ٹھوس نتیجہ، جزا وسزا، بدلہ ہیں۔ دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ تمام معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سورہ بقرہ میں عالمگیر نشوونما دینے والے کے قوانین واحکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کو الدِّیْنَ کہا گیا ہے (2/131-32)۔ اسی کو دوسری جگہ الْاِسْلَامُ کہا گیا ہے (3/18)۔

غلبہ واقتدار اور قانون واختیار کے مفہوم کے اعتبار سے قرآن کریم نے یوم الدین کے معنی خود واضح کر دیئے ہیں جہاں کہا ہے کہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ''تجھے کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے۔'' جواب میں کہا کہ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (82/18-19) جس دور میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے لیے کچھ اقتدار و اختیار نہیں رکھے گا اور تمام معاملات قانون خداوندی کے مطابق فیصل ہوں گے۔ اسی کے متعلق سورۃ فاتحہ میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1/3) کہا ہے۔ یعنی جس دور میں انسانی زندگی آئین خداوندی کے مطابق بسر ہوگی۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی غلبہ واقتدار نہیں ہوگا۔ غلبہ واقتدار صرف قانون خداوندی کا ہوگا۔ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو آئین خداوندی کے تابع حاصل ہوتی ہے!

خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون

وحی کے ذریعے (بوساطت انبیاء کرامؑ) ملتا ہے۔ یہ قانون اپنی مکمل اور آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔اس کا نام اَلدِّیۡن ہے۔اس کے مطابق عمل کرنے کو''اَلۡاِسۡلَامُ'' کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں نظام معاشرہ، ضابطہ زندگی، قانون حکومت، آئین مملکت، عدل وغیرہ کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں لیکن قرآن کریم نے ان سب کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے اور وہ ہے دین۔یہی ہمارے معاشرے کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین ہے۔اس آئین کی رو سے انسانوں کی آزادی اور پابندی کی حدود مقرر کرنے کا پورا اقتدار خدا کو حاصل ہوتا ہے کسی اور کو نہیں ہوتا۔اس لیے''الدین'' میں اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) خدا کا ہوتا ہے۔اس کا یہ اقتدار اعلیٰ اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے بروئے کار آتا ہے۔اس لیے اسلامی مملکت میں عملاً اقتدار اعلیٰ کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔اسلامی مملکت، قرآنی اصولوں کو دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ (Agency) ہوتی ہے۔اور چونکہ انسانی اعمال کے غلط اور صحیح ہونے کا معیار بھی یہی کتاب ہے اس لیے جزا اور سزا (اعمال کے نتائج) بھی اس کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔اس جہت سے دین کا یہ مفہوم (جزا و سزا) بھی عملاً سامنے آجاتا ہے۔اسے نظام عدل کہا جائے گا جس کا دائرہ صرف عدالتی عدل تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔اسلامی مملکت کا آئین (Constitution) قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کا دوسرا نام ہے۔اس مملکت کا تمام کاروبار انہی اصولوں کی حدود کے اندر سرانجام پاتا ہے اور مقصود اس سے نظام عدل و توازن کا قائم رکھنا ہے۔اس کا نام''الدین'' ہے۔

لہٰذا الدین سے مراد ہے خدا کا عطا کردہ نظام زندگی جو ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتا ہے اور جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔جس دور میں انسان اپنے آپ کو اس نظام کے تابع لے آئیں گے وہ تمام دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف قوانین خداوندی کے محکوم ہوں گے۔اس لیے کہ''مالک یوم الدین'' خدا کے سوا کوئی اور نہیں۔ہر وہ فیصلہ جو قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا، دینی فیصلہ کہلائے گا اور عدل کے محکم اصول پر مبنی ہوگا۔ سورۃ فاتحہ میں دیکھئے خدا کی صفت ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیّت کے ساتھ ہی اس کے نظام عدل و قانون (مالک یوم الدین) کا ذکر آ گیا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کو سامان زیست اور اسباب نشوونما تو بلا مزد و معاوضہ عطا کر دیئے ہیں لیکن انسانی مدارج کا تعین، ان کے اعمال کی رو سے ہوگا۔اس کا نام آئین وقوانین کے مطابق عدل کی زندگی ہے اور یہ چیز حیوانیت سے آگے بڑھ کر خاصۂ انسانیت ہے۔

عرف عام میں دَیۡنٌ اس قرضے کو کہتے ہیں جو مدت معینہ کے لیے سود پر دیا جائے۔لیکن قرآن کریم نے چونکہ ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے اس لیے اس میں مسلمانوں کی باہمی لین دین میں دَیۡنٌ کا لفظ قرضۂ بلاسود ہی کے لیے ہے (2/282)۔

اسلام کے لیے قرآن کریم نے دین کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ضابطۂ حیات کے ہیں۔اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ

الْإِسْلَامُ (3/18)۔ وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (5/3)۔ یہی الدِّیْنُ ہے جسے دے کر نبی اکرم ﷺ کو بھیجا گیا تھا۔ هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9/33) نیز (48/28) ''خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس دین (نظام حیات) کو دیگر تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ چیز کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔'' مَذْهَبٌ کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اس لیے اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہیے۔ دِیْنٌ ہی کہنا چاہیے۔ مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو اور دِیْنٌ اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے ملا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مذہب میں مختلف فرقے ہوتے ہیں لیکن دین میں فرقہ سازی کو شرک قرار دیا گیا ہے (30/32)۔ جو دین خدا کی طرف سے ملا تھا وہ سب کے لیے ایک ہی تھا۔ اس میں مختلف فرقوں کا کیا سوال؟ فرقے مختلف انسانوں کے بنائے ہوئے راستے (مذہب) پر چلنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اقوام سابقہ کے پاس خدا کا دین (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) آتا رہا لیکن انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کو ضائع کر کے ان کی جگہ انسانوں کے تراشیدہ راستوں کو اختیار کر لیا۔ اس طرح ان سے دین گم ہو گیا اور اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اس کی اصلی شکل میں قرآن کریم میں عطا کر کے اسے محفوظ کر دیا۔ یہی دین تھا جو اس مملکت کا آئین (Constitution) تھا جسے نبی اکرم ﷺ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس کے بعد ہم نے خدا کی کتاب کو پس پشت [1] ڈال دیا اور انسانوں کی دی ہوئی تعلیم کے پیچھے چل پڑے۔ اس طرح ہم نے بھی دین کی جگہ مذہب اختیار کر لیا۔ اس نہج سے ہم بھی اقوام سابقہ کی سطح پر آ گئے لیکن ہم میں اور ان میں ایک فرق ہے۔ ان کے پاس دین اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اس لیے وہ اپنے مذہب کو خدا کے عطا کردہ دین سے بدل نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود ہے اس لیے ہم جس وقت بھی چاہیں اپنے مروجہ مذاہب کو دین خداوندی سے بدل سکتے ہیں۔ (اسی طرح دیگر اقوام عالم بھی چاہیں تو اپنے اپنے مذہب کو چھوڑ کر، قرآن کریم میں دیئے ہوئے دین کو اختیار کر سکتی ہیں)۔ جب تک ہم ایسا نہیں کرتے، زندگی کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

ذ ب ب

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا ہے: مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ (4/143) اور اس کی تشریح یہ کہہ کر دی ہے: لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (4/143) نہ یکسو ہو کر اِدھر کے اور نہ ہی یکسو ہو کر اُدھر کے۔ انہی کے متعلق ہے: مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (22/11) جو کنارے پر کھڑے ہو کر (Sitting on the Fence) قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ اِدھر فائدہ دیکھا تو اِدھر جھک گئے، اُدھر دیکھا تو اُدھر جھک گئے۔ برعکس منافق کے جو موقع پرست (Opportunist) ہوتا ہے۔

---

[1] دیکھئے الفرقان: 25/30

ذبح

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ قوم فرعون یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ کُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَ کُمْ (2/49 ودیگر مقامات) ''تمہارے ابناء کو ذبح کر دیتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔'' عام طور پر اس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جولڑکے پیدا ہوں انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ سوال یہ ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ سے مراد سچ مچ ذبح کر دینا ہے یا اس کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ سورۃ اعراف میں یُذَبِّحُوْنَ کی جگہ یُقَتِّلُوْنَ آیا ہے (7/141)۔ یعنی وہ تمہارے ابناء کو قتل کر ڈالتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے ذِبْحٌ اور قَتْلٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قَتْلٌ کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی صرف مار ڈالنا نہیں بلکہ اس کے معنی ذلیل وخوار کرنا، کسی کو کمزور اور غیر مؤثر کر دینا، ایسا بنا دینا کہ اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو، کسی کو حقیر کر دینا، بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی کو علم وتربیت سے محروم رکھنا بھی ہیں۔ قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ذِبْحٌ یا قَتْلٌ سے مراد سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں ذلیل وحقیر کرنا اور کمزور وغیر مؤثر بنا دینا ہیں۔ سچ مچ قتل کر دینے کے خلاف حسب ذیل قرائن ہیں۔

(۱) یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی قوم کی تعداد بہت بڑی تھی۔ اگر کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کے تمام لڑکے مار دیئے جائیں اور صرف لڑکیاں زندہ رکھی جائیں تو کچھ وقت کے بعد وہ قوم ختم ہو جائے گی۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی (حضرت ہارونؑ) بھی زندہ موجود تھے اور حضرت موسیٰؑ بھی پیدا ہوتے ہی مار نہیں ڈالے گئے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار نہیں دیا کرتے تھے۔

(۳) سورۃ یونس میں ہے کہ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ (10/83) ''موسیٰ پر اس کی قوم کی ذریت ایمان لائی۔'' ذریت نئی پود (یا نوجوانوں) کو کہتے ہیں۔ اگر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا کرتے تو یہ ذریت موجود ہی نہ ہوتی۔

(۴) جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس آئے ہیں تو اس نے کہا کہ ہم نے تیری پرورش کی اور تجھ پر اس قدر احسانات کیے اور تو ان احسانات کا یہ بدلہ دے رہا ہے۔ تو اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ وَتِلْکَ نِعْمَۃٌ تَمُنُّھَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (26/26) ''یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام (محکوم) بنا رکھا ہے۔'' آپ دیکھئے حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے خلاف جو الزام عائد کیا ہے وہ بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا ہے۔ اگر وہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا مجرم بھی ہوتا تو آپ سب سے پہلے اس کا ذکر کرتے۔ کیونکہ یہ جرم قوم کو غلام (محکوم) بنانے سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ لیکن آپ سارے قرآن کریم میں دیکھ جایئے، حضرت موسیٰؑ کے کسی جگہ بھی فرعون اور اس کی قوم کو

اس جرم سے مطعون نہیں کیا۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کی قوم بنی اسرائیل کے بچوں کو سچ مچ ذبح نہیں کیا کرتے تھے۔ یعنی انہیں مار نہیں ڈالا کرتے تھے۔ کہا جائے گا کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے (خدا کے حکم سے) حضرت موسیٰؑ کو صندوق میں ڈال کر دریا میں کیوں بہا دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ تدبیر کی تھی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خود قرآن کریم میں اس کی تصریح موجود ہے کہ فرعون نے یہ حکم (کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے) [1] اُس وقت دیا تھا جب حضرت موسیٰؑ اپنی دعوتِ انقلاب لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی انقلابی دعوت کا عالمگیر اثر دیکھ کر فرعون کے امیروں اور وزیروں نے فرعون سے کہا کہ ان کے خلاف کوئی سخت اقدام کیوں نہیں کیا جاتا؟ انہیں اس طرح کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ یہ جو جی میں آئے کرتے جائیں؟ اس کے جواب میں فرعون نے کہا کہ نہیں! میرے سامنے ایک تجویز ہے۔ اور وہ یہ کہ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ (7/127) ''عنقریب ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اس وقت عمل میں لائی گئی تھی جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت پھیلی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم موجود نہیں تھا۔ سورۃ المومن میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس دعوت لے کر گئے تو اس نے کہا کہ اقۡتُلُوۡۤا اَبۡنَآءَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ وَاسۡتَحۡیُوۡا نِسَآءَهُمۡ (40/25) ''جو لوگ موسیٰ پر ایمان لائیں ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو۔'' اس سے نہ صرف یہی واضح ہے کہ یہ حکم دعوت حضرت موسیٰ کے زمانہ میں دیا گیا تھا، بلکہ یہ بھی کہ یہ حکم تمام بنی اسرائیل کے لیے نہیں تھا۔ صرف ان کے متعلق تھا جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے۔ [2]

ان شواہد سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم نافذ نہیں تھا۔ لہٰذا جب یہ حکم ہی نہ تھا تو یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو اس لیے دریا میں بہا دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس تدبیر سے زندہ رکھنا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کو دریا میں کیوں بہا دیا گیا تھا۔ اس کا جواب خود قرآن کریم نے دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل مصر میں حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں داخل ہوئے تھے اور حضرت یوسفؑ کو جو وقار مصر میں حاصل تھا اس پر قرآن کریم شاہد ہے۔ مملکت کے خزانے کی چابیاں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ اس قوم کا وقار حضرت یوسفؑ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک باقی رہا

---

[1] جب تک ان الفاظ کا صحیح مفہوم آگے جا کر واضح نہیں ہو جاتا تاہم یہی الفاظ لکھتے جائیں گے۔ یعنی بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم وغیرہ۔

[2] یہ بات آگے چل کر بتائی جائے گی کہ جو لوگ حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے ان کے خلاف تو فرعون نے کچھ نہیں کیا۔ ان کے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیا؟ ان بچوں کا کیا قصور تھا؟

ہوگا۔لیکن اس کے بعد حاکم قوم نے بنی اسرائیل کومحکوم قوم کا درجہ دے دیا ہوگا۔اگرچہ آج بھی دنیا میں محکوم قوموں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اُس زمانے میں تومحکوم قوم کی حیثیت غلاموں کی سی ہوتی تھی۔نہ ان کے بچوں کے لیے تعلیم وتربیت کے کوئی مواقع ہوتے تھے، نہ بڑوں کے لیے حکومت کے کاروبار میں عمل دخل کی کوئی صورت۔مشیت کے پروگرام کے مطابق حضرت موسیٰؑ کوفرعون کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ ان کی تعلیم وتربیت بھی اعلیٰ درجہ کی ہوتی اور انہیں رموزِ مملکت اورغوامض سیاست سمجھنے کے بھی مواقع حاصل ہوتے۔اس مقصد کے لیے تجویز یہ کیا گیا کہ ان کی پرورش خود فرعون کے محلات میں اوران کا ابتدائی زمانہ فرعون کے متبنیٰ کی حیثیت سے گزرے۔یہ تھا وہ مقصد جس کے لیے انہیں دریا میں بہا کر فرعون کے محلات تک پہنچایا گیا۔چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ یہ اس لیے کیا گیا تھا لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِیْ (20/39)''تا کہ تیری تربیت ہماری نگرانی میں ہو۔''یعنی اس سے مقصد حسن تربیت تھا (جس پر بنی اسرائیل کے بچوں کے دروازے بند تھے)۔اور یہ اس پروگرام کی ایک کڑی تھی جس کے مطابق حضرت موسیٰؑ کواس مہم کے لیے تیار کیا جارہا تھا۔چنانچہ اس سے ذرا آگے ہے: ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (20/41)''اس طرح آہستہ آہستہ تم، اے موسیٰ، ہمارے پیمانے پر پورے اتر آئے۔''

سورۃ القصص میں البتہ یہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ کی ماں سے کہا گیا کہ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِی الْيَمِّ (28/7)''تو اس بچہ کو دودھ پلاتی رہ۔اور جب تجھے اس کے متعلق خوف ہوتو اسے دریا میں ڈال دینا۔''اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ خوف اس بات کا تھا کہ فرعون کے لوگ بچے کوقتل کردیں گے۔لیکن جب قرآنی شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ قتل ابناء کا حکم حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے زمانے کا ہے تو اس سے یہ اندازہ صحیح نہیں ہوسکتا۔اس خوف کا باعث کچھ اور سمجھنا ہوگا۔اس سے آگے فرعون کی بیوی کے متعلق کہا ہے کہ جب فرعون کے لوگوں نے صندوق پکڑ لیا تو اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ لَا تَقْتُلُوْهُ (28/9)''اسے قتل نہ کرو۔''اسے ہم متبنیٰ بنالیتے ہیں۔اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے مین بنی اسرائیل کے بچوں کوقتل کیا جاتا تھا۔لیکن یہ قیاس اس لیے صحیح نہیں کہ اس بچے کے متعلق (جسے دریا کی لہروں سے اٹھایا گیا تھا) یہ کس طرح معلوم ہوگیا کہ وہ بنی اسرائیل کی قوم کا بچہ ہے۔قوم فرعون میں سے کسی کا بچہ نہیں۔لہٰذا یہاں لَا تَقْتُلُوْهُ کے معنی قتل کرنا نہیں ہوں گے بلکہ حقیر سمجھ کر پھینک دینے کے ہوں گے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ فیصلہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت عام ہورہی تھی اور فرعون اوراس کی قوم کواس سے خطرہ لاحق ہورہا تھا۔چنانچہ فرعون کے ارباب حل وعقد نے اس سے کہا تھا کہ اس فتنے کوکب تک اس طرح کھلا رہنے دیا جائے گا۔اس کا کچھ علاج کرنا چاہیے (7/127)۔تو اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کے متعلق میں نے ایک تجویز سوچ لی ہے، ہم اس پر عمل پیرا ہوں گے۔اور وہ تجویز یہی (قتل ابناء کی) تھی۔چنانچہ قرآن کریم نے اس تجویز کو کَیْدُ (20/25) سے تعبیر کیا

ہے،جس کے معنی ہیں ایک گہری چال۔ یہ چال کیا تھی؟ فرعون کے متعلق سورۃ قصص میں ہے کہ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (28/4)''وہ اپنی رعایا میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا۔''اس کے بعد ہے يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ (28/4) یعنی ان کے ابناء کو ذبح کرتا تھا اور نساء کو زندہ رکھتا تھا۔اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے تا کہ اُس قوم میں پھوٹ پڑی رہے اور وہ باہمی آویزشوں میں الجھی رہے۔ یہ وہ چال ہے جو ہر سیاستدان حکمران قوم،قومِ محکوم کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس پارٹی بازی میں وہ کرتا یہ تھا کہ قوم کا وہ طبقہ جس میں اسے جوہر مردانگی نظر آتے،جن کے متعلق وہ یہ سمجھتا کہ ان کا اُبھرنا خطرناک ہے انہیں دباتا،انہیں ہر طرح حقیر و ذلیل رکھتا۔اور جس طبقہ کو دیکھتا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورتوں جیسے ہیں،انہیں ابھار کر معزز و مقرب بنالیتا اور ان کے ہاتھوں انہی کی قوم کا گلا گھونٹتا رہتا۔ یہ کچھ بھی ہر ماہر سیاست حاکم قوم کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ محکوم قوم کے ان افراد کو ذلیل وخوار رکھتی ہے جن میں انہیں جوہر مردانگی نظر آتے ہیں اور ان لوگوں کو جن سے کسی خطرہ کا امکان نہ ہو،آگے بڑھاتی رہتی ہے۔قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو قوم کے اَبْنَآءَ کہا ہے اور ثانی الذکر کو نِسَآءً۔اور قَتْلِ اَبْنَاء سے مراد ہے انہیں ذلیل وحقیر رکھنا۔اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَآءً سے مفہوم ہے اس دوسرے طبقہ کو ابھار کر آگے بڑھانا۔اس طرح وہ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو کمزور کیے جارہا تھا۔

قرآن کریم کے شواہد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ قتل یا ذبح ابناء سے یہی مراد ہے۔لیکن بہرحال یہ ایک اندازہ ہے جس پر مزید غور کیا جاسکتا ہے۔اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ فرعون کے اس حکم کا مطلب کیا تھا کہ جو لوگ موسیٰ پر ایمان لائے ہیں ان کے ابناء کو قتل کر دیا جائے (40/25)۔یعنی اس کی تدبیر یہ تھی کہ اس جماعت میں اس طرح سے پھوٹ ڈالی جائے کہ ان کی پارٹیاں بنادی جائیں اور اس طرح ان میں جتنے لوگ ایسے ہیں جن سے خطرہ ہوسکتا ہے انہیں ایسا غیر مؤثر بنادیا جائے کہ کوئی ان کی بات ہی نہ سنے۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایمان تو لائیں یہ لوگ،اور حکم یہ دیا جائے کہ ان کے پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ حالانکہ دوسری طرف جب دربارِ فرعون کے ساحرین ایمان لائے ہیں تو اس نے ان ہی کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے،نہ یہ کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔

بہرحال قرآنی شواہد سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ ذَبْحِ اَبْنَاءَ اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَآءً کے الفاظ استعارةً استعمال ہوئے ہیں۔ سچ مچ ذبح کر دینے کے معنوں میں استعمال نہیں ہوئے۔لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے جس کے دلائل اوپر دیئے گئے ہیں۔ اگر ان دلائل کو قوی نہ سمجھا جائے تو ذَبْحِ اَبْنَاءَ کو حقیقی معنوں میں لیا جائے گا۔یعنی فرعون، بنی اسرائیل کے لڑکوں کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتا تھا۔اس وقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جس قدر پردے اٹھے ہیں ان میں بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو۔اس وقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو مار

ڈالنے کا حکم دے رکھا تھا (کتاب خروج)۔ لیکن تاریخی نقطہ نگاہ سے موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔

سورۃ صافات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے تذکار جلیلہ میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو (اپنے خیال کے مطابق) ہماری راہ میں قربان کرنے اور حضرت اسمٰعیلؑ اپنے آپ کو اس طرح قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گئے تو ہم نے انہیں آواز دے کر اس سے روک دیا اور وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (37/107) ''اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے بدلے میں بچا لیا۔'' جیسا کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اس ذبح عظیم سے مراد یہ ہے انہیں شام کے سرسبز وشاداب علاقہ کی سرداری کی بجائے عرب کی بے برگ وگیاہ سرزمین میں خانۂ کعبہ کی تولیت کے لیے متعین کر دیا۔ یہ وہ قربانی تھی جو ساری عمر کے لیے تھی۔ نہ صرف اپنی ساری عمر کے لیے بلکہ اپنی آنے والی نسل کی بھی قربانی۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (37/108) اس لیے یہ ذبح عظیم تھی۔ یعنی بہت بڑی قربانی۔

ذ خ ر

سورۃ آل عمران میں ہے: مَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (3/48) اس کے معنی ذخیرہ کرنے کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ (خدا کے ایک سچے داعی انقلاب ہونے کی وجہ سے) یہودیوں کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding) سے نالاں تھے۔ اس میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ذ ر ر

انقلاب آفرین پیغام پر، ابھرنے والی نسلیں جلدی ایمان لاتی ہیں۔ پرانے لوگ اپنے قدیم معتقدات اور عادات و خصائل میں پختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ نیز بڑھاپے کی وجہ سے ان میں اپنے اندر نئی تبدیلی پیدا کرنے یا نئے ماحول سے مطابقت کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔ یہ قوم کا نوجوان طبقہ ہوتا ہے جو ظلم واستبداد کے علی الرغم، کسی قسم کا خوف نہ رکھتے ہوئے دعوت انقلاب پر لبیک کہتا اور حالات کی تلاطم انگیزیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

ذ ک ر

قرآن کریم کو الذِّكْرُ کہا گیا ہے (16/44)۔ کیونکہ اس میں اقوام وملل کے عروج وزوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یادداشتیں بھی۔ اشیائے فطرت پر غور وفکر کرنے والوں کو لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (16/13) کہا گیا ہے۔ نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان قوانین خداوندی کو سامنے لانے کی جدوجہد جنہیں اُنہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے (20/34 و 20/42)۔ اس لیے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور اس طرح قوانین خداوندی کو عملاً

غالب کرنے کو بھی ذِکْرٌ کہا گیا ہے (8/45)۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ زندگی کے کسی گوشہ میں حتیٰ کہ میدان جنگ میں بھی قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔ خود قوانین خداوندی ذِکْرِ اللّٰہِ (39/23) ہیں۔

سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (2/152) اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کروں گا اور تمہیں عظمت وسطوت عطا کروں گا۔ تم ان قوانین کا اتباع کرو تو ان کے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آجائیں گے۔ (یہاں علاوہ دیگر امور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا اس کا جواب دیتا ہے۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسی قسم کا ردّعمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ذِکْرُ اللّٰہِ کے معنی قوانین خداوندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ گنتے رہنا)۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف وعظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ وتسلط ہے۔

صاحب ضرب کلیمی کا فرعون کے مقابلہ کے لیے جانا، ذکر اور تسبیح ہے۔ میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے۔ اشیائے کائنات پر غور وفکر کرنا ذکر ہے۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت وموعظت حاصل کرنا ذکر ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ایک ایک قدم پر قانون خداوندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے۔ اسی کو آج کل کی اصطلاح میں نشر واشاعت کرنا کہتے ہیں۔ یہی وہ ''ذکر اللہ'' ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے (13/28)۔ ہم نے اطمینان کے ساتھ ''سچے'' کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ جھوٹا اطمینان انسان کو ہر طریق سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر جھوٹا اطمینان حاصل نہ ہوتا تو لوگ باطل مذاہب پر جمے کس طرح رہیں؟ سچا اطمینان علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے۔ یعنی جب کسی بات پر علم وبصیرت کی رو سے غور کرنے کے بعد، یا اس کے عملی نتائج سامنے آجانے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ وہ بات حق وصداقت پر مبنی ہے، تو اس سے سچا اطمینان حاصل ہوجاتا ہے جو دل اور دماغ دونوں کے لیے وجہٗ سکون ہوتا ہے۔ جھوٹا اطمینان اپنے آپ کو فریب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ سچا اطمینان جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہوا تھا جب انہیں اپنے سے تین گنا فوج پر عظیم فتح حاصل ہوئی تھی (3/125)۔ یہ حجروں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا۔

ذ ل ل

قرآن کریم میں تُذِلُّ، تُعِزُّ کے مقابلہ میں آیا ہے (3/25)۔ یعنی عزت کے معنی ہیں حکومت اور مملکت کا مِل جانا۔ غلبہ واقتدار کا حاصل ہوجانا اور ذلت کے معنی حکومت ومملکت کا چھن جانا۔ غلبہ واقتدار کا کھوجانا۔

قرآن کریم نے ذلت ومسکنت، محکومی اور کمزوری کی زندگی کو خدا کا غضب قرار دیا ہے (2/61)۔ یہ ذلت اسی دنیا کی

ذلت ہے جو ہر ایک کو نظر آسکتی ہے (7/152)۔ اس کے برعکس کہا ہے کہ مومنین کی زندگی غلبہ واقتدار اور قوت وسطوت کی زندگی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (63/8) ''غلبہ واقتدار اللہ اور اس کے رسول اور جماعت مومنین کے لیے ہے۔'' مومنین کی زندگی اَعْلَوْنَ (3/138) سب پر غالب رہنے کی زندگی ہے۔ حکومت اور سلطنت کی زندگی ہے (24/55)۔ لہٰذا جس زندگی میں غلبہ واقتدار اور شوکت وحشمت نہیں وہ مومنین کی زندگی نہیں۔ اس دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2/61) ''ان پر ذلت ومسکنت کی مار ماری گئی۔ یعنی وہ عذاب خداوندی کے مستوجب بن گئے۔'' اس دنیا کو اغیار کے حوالے کر کے، بے کسی و بے بسی، محتاجی اور محرومی کی ذلیل زندگی بسر کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے انسان کو ''روحانی ترقی'' حاصل ہوتی ہے، وہ فریب ہے جو مستبد قوتیں کمزوروں اور محکوموں کو دیتی ہیں۔ قرآن کریم اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا کہ اس دنیا میں عزت واقتدار، سرفرازی وسربلندی، شوکت وحشمت، دولت وقوت، حکومت وسطوت کی زندگی، ایمان واعمال صالحہ کا نتیجہ ہے۔ اور ذلت وخواری، محکومی ومحتاجی کی زندگی خدا کا عذاب۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جو یہاں خدا کے عذاب میں مبتلا ہے وہ عاقبت میں خدا کا مقرب نہیں ہوسکتا۔ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20/124) ''جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہوجائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن بھی اندھا اُٹھائیں گے۔'' یہ ایک ایسا معیار ہے جس سے ہم ہر وقت اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں۔

ذ ن ب

سورۃ فتح میں جہاں نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہا ہے: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (48/2) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ فتح عظیم اس لیے دی جا رہی ہے کہ ان تمام اتہامات سے تمہاری حفاظت ہوجائے جو تمہارے مخالفین تم پر لگاتے رہے ہیں یا آئندہ لگانا چاہیں۔ مخالفین کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں، دیوانے ہیں، کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے، یونہی لوگوں کو سبز باغ دکھلا کر ورغلاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ فتح مبین، جس سے مخالفین کی قوتیں ٹوٹ گئی ہیں، ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو انجام کار کون سچا ثابت ہوا۔

بعض لوگ اپنے آپ کو از رہ کسر نفسی، مُذْنِب (عاصی پُر معاصی وغیرہ) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ذنب یا گناہ، حکومت خداوندی کے جرم کو کہتے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو ''مجرم'' کہنا پسند نہیں کرتے تو مذنب یا عاصی وغیرہ کیوں کہلوائیں؟ اگر ہم سے واقعی کوئی جرم صادر ہوگیا ہے تو اس پر ہمیں ندامت ہونی چاہیے، نہ کہ اسے اپنے لیے نشانِ امتیاز یا پہچانے جانے کی علامت قرار دے دیا جائے۔

مذہب

قرآن کریم میں مَذھَبؐ کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ اسلام کے لیے دِیْنؐ کا لفظ آیا ہے۔ درحقیقت مذہب کے معنی مکتب فکر (School of Thought) کے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں صرف دِیْنؐ تھا۔ بعد میں جب مختلف آئمہ فکر وفقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ہوئے تو دین کی جگہ مَذھَبؐ (طریقہ) نے لے لی۔ اس سے دِیْنؐ (یعنی وہ ضابطۂ حیات جو خدا کی طرف سے ملا تھا) گم ہوگیا اور مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مذاہب آگے چل پڑے۔ جب تک اشخاص کی طرف منسوب کردہ مذاہب نہیں مٹتے دِیْنؐ قائم نہیں ہوسکتا۔ ''مٹنے'' کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کو صرف یہ حیثیت دی جائے کہ یہ ان حضرات کا دین کے متعلق فہم تھا۔ یا وہ جزئیات تھیں جنہیں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کیا تھا۔ ان کی حیثیت ابدی نہیں ہے۔ ابدی صرف خدا کا دین ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ لہٰذا، اسلاف کے مختلف مذاہب کے نام سے جو کچھ ہمارے پاس چلا آرہا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ جس بات کو قرآن کریم صحیح کہے وہ صحیح سمجھی جائے۔ جسے وہ غلط قرار دے اُسے غلط ٹھہرایا جائے۔ باقی رہیں فقہی جزئیات، تو ان کی حیثیت دائمی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر دور کی فقہ قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب ہوگی۔

مغرب میں چونکہ عیسائیت ایک (Religion) کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے وہاں مذہب اسلام کا ترجمہ (Religionof Islam) ہوگیا اور اس سے دین کا تصور بالکل مٹ گیا، اور اسلام بھی دیگر مذاہب عالم میں سے ایک مذہب سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ اسلام دِیْنؐ (ضابطۂ حیات) کا نام تھا۔ مذہب (Religion) نہیں تھا۔

لفظ (Religion) کے بنیادی معنوں کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ہے۔ لیکن اس پر عمومی اجماع ہے کہ اس کے اصلی معنی ''دیوتاؤں کی تعظیم'' کے ہیں۔ اس کے بعد کسی مافوق الفطرت ہستی کی پرستش کے قواعد وضوابط کے مجموعہ کا نام ریلیجن رکھا گیا اور ان معنوں میں یہ لفظ بالعموم رائج ہے (دیکھئے Century Dictioinary) ظاہر ہے کہ اسلام اس معنی میں ریلیجن نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات یا زندگی کا قانون ہے۔ لہٰذا اسلام کو ریلیجن یا مذہب نہیں کہنا چاہیے۔ یہ دِیْنؐ ہے۔

''مذہب'' درحقیقت اُس زمانے کی یادگار ہے جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا۔ وہ اس وقت یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کائنات میں فطرت کے جو حوادث رونما ہوتے ہیں وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ ان کی علت (Cause) کو نہیں سمجھتا تھا اس لیے ان سے ڈرتا اور لرزتا تھا اور خوشامد سے انہیں راضی کرنے کے لیے ان کے سامنے جھکتا اور گڑگڑاتا تھا۔ ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لیے وسیلے تلاش کرتا تھا۔ سفارش کرنے والے ڈھونڈتا تھا۔ انسان کی اپنی توہم پرستیوں نے دیوی، دیوتاؤں کی تخلیق کی اور اسی سے ان کی بھگتی یا پرستش کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان میں جو لوگ ذرا زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے عوام کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کے نمائندے یا

مقرب بنا کر اپنی پرستش شروع کرادی۔اس طرح مذہبی پیشوائیت اور روحانی اقتدار کے ادارے وجود میں آ گئے۔حکمران طبقہ نے ان ''خدائی نمائندگان'' سے گٹھ جوڑ پیدا کیا تو انہوں نے انہیں ''ایشور کا اوتار''، ''ظل اللہ علی الارض'' اور خدائی اختیارات کا حامل قرار دے کر عوام کو ان کے حضور جھکنا سکھایا۔ان تمام تصورات کے مجموعہ کا نام ''مذہب'' (Religion) ہے جو انسانوں میں اب تک متوارث چلا آ رہا ہے۔

مذہب کے اس باطل تصور کو مٹانے کے لیے، خدا کی طرف سے بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ دین ملتا رہا۔اس نے انسان کو کائنات میں اس کے صحیح مقام سے روشناس کرایا۔اس نے کہا کہ کائنات کا سلسلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کی رو سے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں نوع انسان کی نشوونما اور بہبود و ترفع کے لیے استعمال کرے۔اس نے (دین نے) اپنی دعاوی کو دلائل و براہین کی رو سے پیش کیا اور علم و بصیرت کی رو سے ماننے کی دعوت دی۔خدا کا یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور ''مذہب'' کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔دنیا میں چونکہ علم و بصیرت عام ہو رہا ہے اس لیے آہستہ آہستہ مذہب کا دور دورہ بھی ختم ہو رہا ہے۔اس طرح دین کے قیام کے لیے راستہ صاف ہو رہا ہے۔آپ نے دیکھا نہیں کہ دنیا کس طرح ملوکیت، سرمایہ داری، مذہبی پیشوائیت سے بیزار ہوتی چلی جا رہی ہے؟ یہی قرائن بتا رہے ہیں کہ اب وہ دور آ رہا ہے جب خدا کا دین، اپنی تابانیوں کے ساتھ عالمتاب ہوگا۔اب انسان سن شعور کو پہنچ رہا ہے۔اب اسے نہ بچپن کی توہم پرستیاں ڈرا سکتی ہیں نہ کاغذ کے پھول بہلا سکتے ہیں۔اب اس کا اطمینان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

ذھل

قرآن کریم میں انقلاب کے متعلق کہا ہے کہ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا (22/2) ''جب تم اسے دیکھو گے اس وقت ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو چھوڑ دے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی۔'' یہ چیز اس انقلابی ساعت کی ہولناکی کے لیے کہی گئی ہے۔لیکن اگر اس سے مراد خود انقلابی دور ہو تو اس سے ہمارا زمانہ سامنے آ جاتا ہے جس میں مائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں اور کوئی لڑکی (شادی کے باوجود) حاملہ ہونا نہیں چاہتی۔اور ان فطری نسوانی فرائض کو چھوڑ کر انہیں کچھ افسوس نہیں ہوتا بلکہ اس سے خوش ہوتی ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے دوسرے مشاغل میں حارج نہ ہوں۔یا ویسے ہی پریشانی اور اضطراب کا وہ عالم جس میں ہم سب گرفتار رہتے ہیں اور اس طرح اپنی ضروری ذمہ داریوں تک سے غافل ہو جاتے ہیں۔

ذوالقرنین

ایران کا وہ خدا ترس بادشاہ جس نے یہودیوں کو بابل کی اسیری سے رہائی دلا کر یروشلم میں دوبارہ آباد کرایا تھا۔ قرآن کریم نے (سورہ کہف میں) اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔(18/83-101)

ذود

سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک پیاؤ (گھاٹ) پر دوسرے لوگوں کے جانور (بعد میں آ کر) پانی پیتے چلے جاتے ہیں۔لیکن دو لڑکیاں ہیں جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ہیں (تَذُوْدٰنِ : 28/23) کہ وہ کہیں آگے بڑھ کر پانی تک نہ پہنچ جائیں۔

حضرت موسیٰؑ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف آنے سے کیوں روک رہی ہیں۔ انہوں نے ان سے پوچھا تو لڑکیوں نے کہا کہ لَا نَسۡقِيۡ حَتّٰى يُصۡدِرَ الرِّعَآءُ(28/23) ہم اپنے جانوروں کو اس وقت تک پانی نہیں پلاسکتیں جب تک یہ (طاقتور چرواہے) اپنے اپنے جانوروں کو اچھی طرح پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں۔اس کے ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بتائی کہ وَاَبُوۡنَا شَيۡخٌ كَبِيۡرٌ(28/24) (ہم لڑکیاں ہونے کی وجہ سے کمزور ہیں) اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔اس لیے ہم کب جرأت کرسکتی ہیں کہ ہمارے جانور پہلے پانی پی لیں۔

غور کیجئے! قرآن کریم نے ایک کہانی کے دو ٹکڑوں میں نوع انسانی کی پوری کی پوری داستان کس حسن وخوبی سے بیان کر کے رکھ دی ہے۔دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہو رہا ہے کہ طاقتور کا جانور پہلے پانی پیتا ہے اور اس سے اگر کچھ بچ جائے تو غریب کے جانور کی باری آتی ہے۔اس میں استثناء ہے تو انہی کی جو آسمانی انقلاب کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے جانوروں کو ان کی باری پر پانی پلانے کا انتظام کریں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے فَسَقٰى لَهُمَا (28/23) (بلا مزد و معاوضہ) ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔پیغمبر یہی کچھ کرنے کے لیے آتے تھے اور ان کا لایا ہوا نظام دنیا میں یہی کچھ کرے گا۔یعنی رزق کے جن سرچشموں پر ارباب اقتدار اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہوں انہیں نوع انسانی کے مفاد عامہ کے لیے آزاد کرا دینا تا کہ ہر فرزند آدم کی ضروریات یکساں طور پر پوری ہوتی رہیں۔

اگرچہ حضرت موسیٰؑ اِس وقت ابھی منصب نبوت پر سرفراز نہیں ہوئے تھے لیکن طبیعت کا رجحان [1] ایسے ہی کاموں کی طرف تھا۔

---

[1] پیغمبرانِ کرامؑ کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ابتدا ہی سے دوسروں کی بھلائی چاہتے ہیں۔(منظور الحسن صاحب کتاب)

رأف

رءوف اور رحیم سلبی (Negative) اور ایجابی (Positive) دونوں پہلوؤں کو محیط ہوجاتے ہیں۔ ان اسباب وعناصر کا دفع کرنا جو کسی کی نشوونما کے راستہ میں حائل ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس ساز وسامان کا بہم پہنچانا جس سے ان کی نشوونما ہوتی جائے۔

خدا کی رأفت ورحمت کس طرح ملتی ہے۔ اس کے متعلق سورہ بقرہ میں کہہ دیا کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (2/143) اللہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ کسی کے ایمان کو یونہی بلاحفاظت چھوڑ دے اور وہ بلانتیجہ رہ جائے۔ وہ تو رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ہے۔ یعنی وہ کرتا یہ ہے کہ انسان کے ایمان کے نتیجہ خیز ہونے کی راہ میں جس قدر موانع آئیں انہیں راستے سے ہٹائے اور ایمان کے مثبت نتائج پیدا کرتا جائے۔ لہٰذا اس کی رأفت اور رحمت، ایمان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی انسانیت کی صحیح نشوونما کا ذریعہ ہے۔ ایمان کے معنی ہیں قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین اور اعتماد رکھنا اور اس کی اطاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالینا۔

سورۃ نور میں زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا ہے: وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (24/2) ''قانونِ خداوندی کے نفاذ میں نرمی سے کام مت لو'' ایسا نہ ہو کہ اس خیال سے کہ یہ سزا انہیں تکلیف پہنچائے گی تم مجرمین کو جرم کی سزا ہی نہ دو یا اس میں نرمی برتو۔ اس لیے کہ اگر ظالمین اور مجرمین کو سزا نہ دی جائے تو مظلوموں کی دادرسی کیسے ہو۔ عیسائیت نے خدا ترسی کا یہی غلط مفہوم اپنے سامنے رکھا جس کی وجہ سے ظالموں کی رسیاں دراز ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ مذہب کو کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر محبوس ہونا پڑا اور سیاست بے مہار ہوگئی۔ قرآن کریم نے اسی لیے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ یہ ان کا خود تراشیدہ مسلک تھا اور جذبات رافت ورحمت کی غلط تعبیر کا پیدا کردہ (57/27)۔ اسلام عدل قائم کرنا سکھاتا ہے جس کے لیے زیادتی کرنے والوں کی قوتوں کو توڑنا پڑتا ہے۔

ر ب ب

قرآن کریم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1/1) سے ہوتی ہے۔ یعنی کائنات کا ہر حسین گوشہ خدا کی صفت ربوبیت کا پیکرِ حمد وستائش ہے۔ کائنات میں ہر شے اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک عظیم الشان پروگرام کارفرما ہے جس میں ایک ادنیٰ سا بیج اپنی نشوونما کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا نقطۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی کو خدا کا نظام ربوبیت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی لیے قابل حمد وستائش ہے کہ وہ ہر شے کو ربوبیت عطا کرتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جس طرح خدا کا یہ نظام ربوبیت خارجی کائنات میں ازخود کارفرما ہے اسی طرح انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی داخلی اور معاشرتی دنیا میں اس

نظام ربوبیت کو نافذ کریں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ رزق کے تمام سرچشمے تمام افراد کی پرورش کے لیے عام ہوجائیں اور ہر فرد اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کو دوسرے افراد کی نشوونما کے لیے وقف کردے۔ اس طرح تمام نوع انسانی کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں گی۔ جو لوگ اس نظام کو قائم کردیں گے وہ رَبّٰنِیُّوْنَ کہلائیں گے (3/78)۔ اور اس نظام کا قیام قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ہوگا۔ یہی قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ یعنی دنیا میں نظام ربوبیت کا قیام۔ اسی کے لیے وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ ذریعہ ہوتی ہے افراد انسانیہ کی ربوبیت کا۔ چونکہ ربوبیت میں انسان کی طبعی (جسمانی) زندگی کی پرورش بھی شامل ہوتی ہے اور اس کی ذات کی نشوونما بھی، اس لیے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور ایسے وسائل و ذرائع ہر ایک کے لیے یکساں طور پر مہیا کرے جن سے ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ جب انسانی ذات کی اس طرح نشوونما ہوجائے تو موت سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔ خدا کی ربوبیت کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہتا ہے۔

''ربوبیت عالمینی'' بس یہ ہے اسلامی معاشرہ کا مقصود و منتہٰی۔ یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت بلا لحاظ نسل و رنگ اور بلا امتیاز خون و وطن۔ جب تک خدا کی یہ صفت افراد اور ان کے مجموعی معاشرہ میں منعکس نہیں ہوتی، ان کی زندگی اسلامی نہیں کہلاسکتی۔ یہ قرآن کریم کی پہلی آیت اور اس کی تعلیم کا نقطۂ آغاز ہے۔ جس کے اندر یہ صفت خداوندی منعکس ہوتی ہے وہ پوری پوری محنت سے کماتا ہے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دیتا ہے۔ اسی لیے اس معاشرہ میں نہ جائدادیں کھڑی کرنے کا تصور پیدا ہوسکتا ہے، نہ دولت اکٹھی کرنے کا خیال، نہ رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ دوسروں کی محنت کو غصب کرلینے کا خیال۔ قرآن کریم کا مقصود اسی قسم کے معاشرہ کی تشکیل اور قیام ہے اور یہی معاشرہ ہے جو دنیا کو محسوس طریق پر دکھا سکتا ہے کہ خدا کا تجویز کردہ نظام کس قدر درخور حمد و ستائش ہے۔ یہ عملی تفسیر ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی۔

ر ب ص

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِہِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَۃِ اَشْھُرٍ ... (2/226) ''جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیں ان کے لیے چار ماہ کی مدت تک انتظار ہے۔'' یعنی وہ عورتوں کو اس حالت میں غیر معین عرصہ تک نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں چار ماہ کے اندر قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہیں نکاح میں رکھنا ہے یا آزاد کردینا ہے۔

ربو

سورۃ آل عمران میں ہے:لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (3/129)سود مت کھاؤ۔تم سمجھتے ہو کہ اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔حالانکہ درحقیقت اس سے قومی سرمایہ میں کمی ہوتی ہے۔قرآن کریم نے جو معاشی نظام تجویز کیا ہے اس میں سود کی کہیں گنجائش نہیں۔جب اس میں دولت کا جمع کرنا ہی منع ہے تو پھر سود تو کجا،اس میں قرضہ کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔اس میں فالتو سرمایہ(Surplus Money)کسی فرد کے پاس رہتا ہی نہیں،سارے معاشرے میں بٹ جاتا ہے۔قرآن کریم میں قرضہ وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں جب ہنوز قرآن کریم کا معاشی نظامِ ربوبیت متشکل نہ ہوا ہو۔

قرآن کریم نے اَلرِّبٰو کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا ہے کہ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا(2/275)''خدا نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور ربوٰ کو حرام۔''سوال یہ ہے کہ ربوٰ کسے کہتے ہیں؟اس مقام پر قرآن کریم ربوٰ کو بیع کے مقابلہ میں لایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ربوٰ،بیع کی ضد ہے۔

جو کچھ ہم کسی دوسرے سے لیتے ہیں،اس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔مثلاً عطیہ،اجرت،سود(عام معنوں میں)،منافع(تجارت میں)،جوئے کی جیت۔اب دیکھئے کہ ان میں فرق کیا ہوتا ہے۔

(۱) عطیہ:اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔دینے والا اسے کچھ واپس لینے کے خیال کے بغیر،تحفۃً دیتا ہے۔لہٰذا اسے لین دین کی مد میں نہیں لایا جاسکتا۔اس لیے یہ شکل ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے۔

(۲) اُجرت:یہ محنت(Labour)کا معاوضہ ہوتا ہے۔اس میں سرمایہ(Capital)کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) سود:اس میں دوسرے کو سرمایہ(Capital)دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے کچھ زائد وصول کیا جاتا ہے۔اس میں محنت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

(۴) منافع(تجارت میں):اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار:اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے،نہ محنت کی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى(53/39)''انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے وہ محنت کرے۔'' یعنی وہ صرف محنت کا معاوضہ جائز قرار دیتا ہے۔سرمایہ(Capital)استعمال کرنے کا معاوضہ جائز نہیں قرار دیتا۔چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں تھا اس لیے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربوٰ میں فرق کیا ہے؟ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دیتا ہے۔اسے دس روپے زائد ملتے ہیں۔دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔اس میں بھی اسے دس روپے

اصل سے زائد پر ملتے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں اصل پر زائد ہیں، تو ان میں فرق کیا ہے؟ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (2/275) وہ بیع اور ربوٰ کو ایک ہی بات سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ دونوں ایک نوعیت کی چیز نہیں ہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آ جاتا ہے اور دکاندار کو اس کی محنت کا معاوضہ سرمایہ سے الگ ملتا ہے، یہ حلال ہے۔ لیکن ربوٰ میں صرف سرمایہ لگتا ہے، محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے، جو حرام ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ٹھہرا کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام ہے

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربوٰ ہے۔ (اس بات کا تعین قرآنی معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا)۔ لہٰذا ہر وہ کاروبار جس میں انسان صرف سرمایہ لگا کر اپنے اصل سے زائد وصول کرے، قرآن کریم کی رو سے الربوٰ میں داخل ہوگا۔ خواہ وہ زمین کی بٹائی ہو یا کاروبار میں (Sleeping Partner) کا منافع میں حصہ۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے (Un-earned Income) کہتے ہیں۔ یعنی وہ آمدنی جو محنت سے کمائی نہ جائے۔ اور جب نہ سرمایہ لگایا جائے نہ محنت کی جائے تو وہ آمدنی جوئے کی ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (Risk) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع یا نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور ربوٰ میں (Risk) نہیں ہوتا۔ لیکن یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (Risk) ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیے کیونکہ اس میں ہر داؤ میں (Risk) ہوتا ہے۔ بیع اور ربوٰ میں اصل فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ بیع میں رأس المال + محنت کا معاوضہ (اجرت) واپس ملتے ہیں اور ربوٰ میں رأس المال + رأس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ اجرت حلال ہے۔ رأس المال کا معاوضہ حرام ہے، خواہ وہ سود کے نام سے پکارا جائے یا تجارت کے ''منافع'' کے نام سے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام میں رأس المال پر اضافہ کسی شکل میں بھی جائز نہیں ہوگا۔ اگر تجارت اُس زمانہ میں ہوگی جب ہنوز افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ نے اپنے اوپر نہیں لی (یعنی عبوری دور میں) تو رأس المال کے علاوہ اتنے منافع کی اجازت ہوگی جو دکاندار کی دن بھر کی محنت کے معاوضہ کے برابر ہو۔ اور جب دکاندار کی ضروریات زندگی بھی معاشرہ پوری کرے گا تو تجارت میں اشیاء کی فراہمی بلا منافع ہوگی۔ معلوم نہیں انسان کو قرآن کریم کے نظام معاش تک پہنچنے میں ابھی کتنا وقت لگے۔ لیکن جتنا بھی وقت لگے، انسان اپنے خود ساختہ جہنم سے اسی وقت نکل سکے گا جب اس نے قرآنی نظام اختیار کیا۔ موجودہ نظام معیشت جس میں سرمایہ کے استعمال کے معاوضہ کو حلال و طیب سمجھا جاتا ہے، قرآنی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ ہے (2/279)۔

رتق

قرآن کریم میں ارض وسماوات کے متعلق ہے کہ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21/30) شروع میں اس تمام مادی کائنات کا ہیولیٰ ملا جلا تھا۔ پھر اس میں سے مختلف کُرّے الگ الگ ہو گئے (79/30)۔غور کیجئے کہ یہ اعلان چھٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے جب کسی انسان کے ذہن میں اس کا تصور تک بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ مختلف اجرام شروع میں ایک ہی ہیولیٰ تھے اور بعد میں یہ الگ الگ ہوئے۔آج سائنس کی تحقیقات نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے لیکن اُس وقت اس حقیقت کو خالق کائنات کے سوا اور کون بیان کر سکتا تھا؟

رتل

قرآن کریم کے متعلق ہے: وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (25/32) ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب، تناسب اور نظم کے ساتھ نازل کیا ہے۔اس کے اجزاء کو نہایت خوبصورتی سے باہمدگر جوڑا ہے۔اس کی ساری تعلیم، ایک خاص نظم کے ساتھ، اس کے مرکزی فکر کے گرد گھومتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (73/4) تم بھی اسے اسی طرح حسن نظم و تناسب کے ساتھ عمل میں لاتے چلے جاؤ۔

رجز

سورۃ المدثر میں جب نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ ''اب تو دعوت انقلاب کو لے کر اٹھ۔'' تو اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74/5)۔ اس کمزوری کو جھٹک کر الگ کر دے جو اٹھنے میں لڑکھڑاہٹ کا موجب بن جائے۔تم اور تمہارے رفقاء اپنے اندر اتنی قوت پیدا کرلو کہ تم اس بارِگراں کو لے کر مردانہ وار اٹھ کھڑے ہو۔اس سورۃ میں تخاطب تو نبی اکرم ﷺ سے ہے لیکن یہ تعلیم تمام جماعت کے لیے ہے۔ایسا عظیم انقلاب اسی جماعت کے ہاتھوں برپا ہوسکتا ہے جس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئے۔

رجس

سورۃ احزاب میں اہل بیت نبویؐ کے متعلق ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (33/33) خدا چاہتا ہے کہ تم سے رِجْسٌ دور کردے۔یعنی اضطرابات اور التباسات یا وہ موانع جو تمہاری صحیح نشوونما کے راستہ میں حائل ہوں۔سورۃ انعام میں ایمان والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا سینہ اسلام کے لیے کھل جاتا ہے۔اس کے برعکس، غلط راستے پر چلنے والوں کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ان کی سانس پھول جاتی ہے۔اس کے بعد ہے: كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى

الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (6/126)۔اس سے ظاہر ہے کہ رجس کے اندر دل کی تنگی، تعصب، تنگ نگہی ضد، ہٹ دھرمی، عقل وفکر سے کام نہ لینا، نیز شکوک، اضطراب وغیرہ سب کا مفہوم آجاتا ہے۔اسی بنا پر منافقین کو رجس مجسم کہا گیا ہے (9/95)۔یعنی شکوک واضطراب اور صحیح نظام کے راستے میں خلل اور رکاوٹ۔برعکس ایمان والوں کے (9/124-25)۔

ر ج ع

قرآن کریم میں ہے: صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ (2/18)۔ایسے مقامات پر یَرۡجِعُوۡنَ کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی تو سامنے دو قسم کے لوگ تھے۔ایک اہل کتاب، جو کسی وقت میں حق پر تھے لیکن بعد میں حق کے راستے سے ہٹ گئے۔ان سے یہی کہا گیا کہ تم پھر حق کی طرف پلٹ کر آجاؤ۔وہ اس سے انکار کرتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جن کی طرف حق پہلے پہل آیا تھا۔وہ جب حق کی طرف نہیں آتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے، اس کی طرف آتے ہی نہیں۔اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔اس کے لیے بھی قرآن کریم نے لَا یَرۡجِعُوۡنَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ان مقامات میں صحیح ترجمہ ''رجوع کرنا'' ہوگا۔ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ غلط روش کو چھوڑ کر حق کی طرف نہیں پلٹتے۔

اس مقام پر اس غلط تصور کا ازالہ کرنا ضروری ہے جو رجعت الی اللہ کے غیر قرآنی مفہوم سے عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ہمارے ہاں کسی کی موت کی خبر سن کر کہا جاتا ہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2/156)۔اور اس کے معنی کیے جاتے ہیں ''ہم اللہ کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔'' اس سے ذہن دو صورتوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ایک تو یہ کہ ہم پیدا ہونے سے پہلے خدا کے پاس تھے اور مرنے کے بعد (حشر کے دن) ایک میدان میں جمع ہوں گے جہاں اللہ تعالیٰ بھی ہوں گے اور اس طرح ہم لوٹ کر اُس کی طرف چلے جائیں گے۔یہ تصور اس لیے غیر قرآنی ہے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا کسی ایک مقام میں محدود ہے اور تمام انسانوں کو اس مقام کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔خدا کے لیے کسی خاص مقام کا تعین باطل تصور ہے۔وہ ہر مقام پر ہے۔هُوَ مَعَكُمۡ اَیۡنَ مَا كُنۡتُمۡ (57/5) مرنے کے بعد اگلی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی، اعمال کے جزا وسزا کا رنگ کیا ہوگا۔یہ وہ باتیں ہیں جن کی ماہیت اس زندگی میں سمجھ میں نہیں آسکتی۔قرآن کریم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔لیکن ایک بات بالکل واضح ہے۔اور وہ یہ کہ مُردوں کا کسی ایسے مقام کی طرف جانا جہاں خاص طور پر خدا موجود ہوگا قرآنی تصور کے مطابق نہیں۔قرآن کریم تو یہ بھی کہتا ہے کہ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (89/22) تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئیں گے۔وَجِایۡٓءَ یَوۡمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ (89/23) اُس دن جہنم لائی جائے گی۔خدا کے متعلق کسی خاص مقام یا سمت کا تصور جہاں ہم مرنے کے بعد

جائیں گے، قرآن کریم کی رو سے درست نہیں۔

دوسری یہ صورت جس کی طرف ذہن (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ سے) منتقل ہوتا ہے تصوف کی پیدا کردہ ہے۔ ویدانت (ہندوؤں کے ''تصوف'') کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح (آتما) درحقیقت روحِ کائنات، یعنی خدا (پرماتما) کا ایک جزو ہے۔ یہ جزو اپنے کُل سے جدا ہو کر مادوں کی دلدلوں میں پھنس چکا ہے اور یہاں سے نکلنے کے لیے تناسخ کے چکر کاٹ رہا ہے۔ آخرالامر یہ جزو پھر اپنے کُل میں جا ملے گا جس طرح، (اپنشد کے الفاظ میں) ''شام کو پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔'' ویدانت کا یہی تصور ہمارے تصوف میں آیا جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ ''انسانی روح'' خدا کا ایک جزو ہے اور یہ جزو اپنے کُل سے ملنے کے لیے مضطرب و بے قرار ہے۔

''اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ'' سے (ان کے نزدیک) مراد ہے جزو کا اپنے کُل کی طرف لوٹ جانا اور اُس سے جا کر مل جانا۔ اسی لیے یہ لوگ موت کو وصال کہتے ہیں (فلاں صاحب کا وصال ہو گیا۔ یا فلاں بزرگ واصل بالحق ہو گئے) وصال کے معنی مل جانے کے ہیں۔

یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے، اس لیے کہ انسان اور خدا کا تعلق جزو اور کُل کا نہیں۔ کسی کُل سے اگر کوئی جزو الگ ہو جائے تو کُل ناتمام رہ جاتا ہے اور یہ چیز ذاتِ خداوندی میں نقص کا باعث ہے۔ لہٰذا اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کا یہ مفہوم بھی غلط ہے۔

سورۃ یٰس میں ہے: فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ (36/83)۔ اللہ کی ذات (انسان کے خود پیدا کردہ غلط تصورات سے) بہت دور اور بلند ہے۔ ہر شے کی باگ ڈور اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس لیے ہر شے اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق گردش کرتی ہے۔ اس کا ہر قدم اسی قانون کی طرف اٹھتا ہے۔ اس سے وہ ادھر اُدھر ہٹ نہیں سکتی۔ اور چونکہ ''اشیاء'' میں خود انسان بھی شامل ہیں اس لیے یہ بھی اِس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کا ہر عمل بھی قانونِ مکافات کی زنجیروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس لیے اس کا ہر قدم بھی اسی کی سمت اٹھ رہا ہے۔ (وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ)۔

اب یہاں سے ہم خارجی کائنات کے قانونِ طبیعی سے آگے بڑھ کر انسانی دنیا کے قانونِ مکافات کی طرف آ گئے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات میں اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (یا اسی قسم کے دیگر الفاظ) آئے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے: اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۞ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ۔ جب انسان اپنے متعلق یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں (ہر ایک سے مستغنی ہے) تو پھر سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لاکھ اپنے آپ کو مستغنی سمجھے اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی (96/5-8) وہ خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا۔ اسے بہرحال اسی قانون کی طرف آنا ہے۔ اس حقیقت کو وَ تَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ بَیۡنَہُمۡ (21/93) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہے: کُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ ۔ اور اس کے بعد ہے: فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا کُفۡرَانَ لِسَعۡیِہٖ ۚ وَ اِنَّا لَہٗ کٰتِبُوۡنَ (21/94) پس جو شخص صلاحیت بخش

پروگرام پر کاربند رہتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو اس کی کوششیں بے نتیجہ نہیں رہتیں۔ ہم ان سب کو لکھتے رہتے ہیں۔ اس سے کُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے اعمال کے نتائج ہمارے ہاں قانونِ مکافات عمل کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ تمام اعمال اس محور کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ہر ایک کا قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے۔ کوئی اِس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ یہ لوگ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کر کے بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری گرفت سے دور جا رہے ہیں حالانکہ وہ ہمارے قانونِ مکافات کی طرف از خود کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ کُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ جہاں مکافاتِ عمل کا مفہوم واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔

اعمال کے نتائج کے متعلق بھی ہمارے ذہن میں یہ تصور ہے کہ یہ نتائج صرف دوسری زندگی میں جا کر مرتب ہوں گے۔ یہ تصور بھی صحیح نہیں۔ اعمال کے نتائج، عمل سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض نتائج کا ظہور اسی دنیا میں ہو جاتا ہے اور بعض کا ظہور اِس کے بعد کی زندگی میں ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (29/9) اور جس کے معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ ''تمہیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پس میں تمہیں تمہارے اعمال کی خبر دوں گا۔'' تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب انسان مرنے کے بعد خدا کی طرف جائے گا تو اعمال کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے تمام اعمال ہمارے قانونِ مکافات کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتے۔ اسی کی رو سے ان کے نتائج تمہارے سامنے آ جاتے ہیں۔ چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ (40/78) ہم ان مخالفین کو جس سزا کی وعید دے رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ظہور میں آ جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا تیری وفات کے بعد ہو۔ لیکن زود ہو یا بدیر۔ ان کے اعمال کے نتائج بہر حال ہمارے ہی قانون کے مطابق مرتب ہوں گے۔ یہ اس کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے۔ (فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ)۔

لیکن جن اعمال کے نتائج انسان کی اِس زندگی میں سامنے نہیں آتے وہ اس کے بعد کی زندگی میں سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ آیا ہے کہ تم مرنے کے بعد بھی اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ''خدا کی طرف لوٹو گے۔'' یعنی تم یہ نہ سمجھو کہ اب تو ہم مر گئے اس لیے اب ہم پر کسی کی گرفت نہیں۔ تم مرنے کے بعد بھی خدا کے قانون مکافات کی طرف جاؤ گے۔ اس سے تمہارے لیے کہیں مفر نہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کا مفہوم۔

ان تصریحات کی روشنی میں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کا صحیح مفہوم سمجھئے۔ قرآن کریم میں جہاں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ آیا ہے اس سے پہلی آیات میں یہ ذکر ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں جان تک بھی دے دینی پڑتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد جماعت مومنین سے کہا گیا

ہے کہ تمہارے سامنے بھی زندگی کے مختلف پہلو آئیں گے۔ دشمنوں کی طرف سے ایذا رسانی کا خوف، بھوک، اموال و ثمرات اور نفوس کا اتلاف۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ اس کے بعد ہے: وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ○ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ○ (2/156)۔ تو خوشگوار نتائج کی بشارت دے دے ان لوگوں کو جن کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں جب بھی اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو وہ دل کے پورے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہماری ساری زندگی خدا (کے نظام) کے لیے وقف ہے۔ اور ہم ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اُسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یا یہ کہ جب ہماری ساری زندگی اُس کے نظام کے لیے وقف ہے کہ تو یہ مشکلات و مصائب ہمیں اس کے راستے سے ہٹا نہیں سکتیں۔ ان کے علی الرغم ہمارا ہر قدم اُسی کی طرف اٹھتا ہے۔ ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے (اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)۔ اور ہماری اس جدوجہد کے نتائج بھی اسی کے قانون کے مطابق مرتب ہوں گے جس پر ہمیں پورا پورا بھروسہ ہے۔ جتنے موانعات آنا چاہتے ہیں آئیں، جتنی رکاوٹیں کوئی ڈالنا چاہتا ہے ڈال لے، ہم ان سے گھبرا کر اپنا رخ کسی دوسری سمت کو کبھی نہیں موڑیں گے۔ ہمارا ہر قدم، بہرحال و بہرطور اسی منزل کی طرف اٹھے گا جو ہمارے خدا نے ہمارے لیے متعین کی ہے اور جو ہماری زندگی کا منتہی و مقصود ہے (اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)۔ اس کے بعد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (2/155/57) ''یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے تبریک و تہنیت کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا قدم صحیح راستے پر اٹھ رہا ہے۔'' ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' خود ''اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' کی تشریح کر رہا ہے۔

قرآن کریم کے ان مقامات سے واضح ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کے یہ معنی نہیں کہ خدا کسی خاص مقام میں ہے اور ہم لوٹ کر اُس مقام کی طرف اس کے پاس جائیں گے۔ نہ ہی یہ کہ ہماری ''روح'' اُس کُل کا ایک جزو ہے اور یہ جزو آخرالامر اپنے کُل سے جا ملے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی، نظامِ خداوندی کے لیے وقف ہے (اِنَّا لِلّٰهِ) اور دنیا بھر کی مشکلات و مصائب کے باوجود ہمارا ہر قدم اُسی نظام کی طرف اٹھتا ہے۔ اُسی سے ہم توانائیاں حاصل کرتے ہیں اور اس کی رو سے ہمارے اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی کی ہر حرکت اِسی محور کے گرد گھومتی ہے وہی ہمارے دائرۂ حیات کا مرکز ہے۔ ہماری تمام تگ و تاز کا رُخ اِسی قبلہ کی طرف ہے (اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) نیز یہ کہ ہمارا ہر عمل اُس کے قانونِ مکافات کی طرف کشاں کشاں چلا جاتا ہے۔ وہ اس سے کہیں اِدھر اُدھر ہٹ نہیں سکتا۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ اس زندگی میں سامنے آ جائے یا مرنے کے بعد دوسری زندگی میں۔ اس لیے کہ اس کا قانونِ مکافات اِسی دنیا تک محدود نہیں۔

رج م

زمانہ قدیم میں مندروں اور معبدوں میں کاہن ہوتے تھے جو لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ (اب بھی مندروں کے پجاری اور خانقاہوں کے پیشوا یہی کچھ کرتے ہیں)۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ہم یہ باتیں ''آسمان'' سے سن کر آتے ہیں۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ یہ سب رَجۡمًا باتیں کرتے ہیں۔ یعنی محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ ان میں سے کبھی کبھار کوئی بات ٹھیک بھی نکل آتی ہے (جیسے دس قیاسی باتوں میں سے ایک آدھ ٹھیک نکل آیا کرتی ہے) ورنہ انہیں علم وحقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نزولِ قرآن کے بعد علم وبصیرت کا زمانہ آ گیا، اس لیے اس قسم کی توہم پرستیوں کے لیے اب کوئی گنجائش نہ رہی۔ اب ان خرافات کو ''آسمان سے آتشیں کوڑے'' پڑتے ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے لَعۡنَتٌ گالی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔ یعنی غلط روش کی بنا پر زندگی کی ان خوشگواریوں سے محرومی جو قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ جسے اس طرح خوشگواریوں سے محروم کر دیا گیا ہو وہ مَلۡعُوۡنٌ کہلائے گا۔ یہی معنی رَجِیۡمٌ کے ہیں۔ یعنی دور پھینکا ہوا۔ یعنی جو ان خوشگواریوں سے محروم ہو۔ اس کے متعلق ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ اس سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ اس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے۔ اس سے دور دور رہا جائے۔ ہر وہ قوت یا جذبہ جو ہمیں قوانینِ خداوندی کے خلاف سرکشی پر آمادہ کرے یا جہالت اور بے بصری کی طرف مائل کرے، اس قابل ہے کہ اس سے دور دور رہا جائے۔ اسی کو ملعون یا رجیم کہا جائے گا۔

رح ق

قرآن کریم نے اہل جنت کے سلسلہ میں رَّحِیۡقٍ مَّخۡتُوۡمٍ (83/25) کہا ہے۔ یعنی خالص مشروب، اور پھر اس طرح محفوظ کیا ہوا کہ بعد میں بھی اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا امکان نہ رہے۔ زندگی کی پاکیزہ سرور آور خوشگواریاں۔

رح م

خدا کی ربوبیت کے معنی صرف انسانی جسم کی نشوونما نہیں بلکہ اس کے شرفِ انسانیت (انسانی ذات۔Self) کی نشوونما (Development) بھی ہے جو اُس ضابطہ حیات کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعہ ملتا ہے، اس لیے وحی کو بھی رحمت کہا گیا ہے (2/105 و 43/32)۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کی راہنمائی سب سے بڑا ذریعہ نشوونما ہے جو یکسر وہبی طور پر ملتا ہے، اس لیے رحمتِ خصوصی ہے۔

چونکہ خدا رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہے (یعنی تمام کائنات کو نشوونما دینے والا اور نوعِ انسانی کی صلاحیتوں کی تکمیل کرنے والا) اس لیے اس نے سامانِ نشوونما کا وہبی طور پر عطا کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ (6/54)

''تمہارے رب نے سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔'' اس طرح وہ کائنات کی ہر شے کو اپنے دامنِ ربوبیت و پردۂ رحمت میں لیے ہوئے ہے (40/7)۔ اسی لیے سورۃ فاتحہ میں رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے ساتھ ہی الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ بھی آیا ہے (1/1-2)۔ زبان کے قاعدے کے لحاظ سے رحیم کے معنی ہوں گے عمومی طور پر مسلسل سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ اور رحمٰن وہ جو کسی ہنگامی ضرورت کے وقت شدت اور غلبہ کے ساتھ سامانِ رحمت بہم پہنچائے۔ اول الذکر طریق کو نشوونما کا عام ارتقائی ذریعہ اور ثانی الذکر کو انقلابی ذریعہ کہا جاسکتا ہے۔ یا دورِ حاضر کے علم الحیات (Biology) کی اصطلاح میں اول الذکر متزائد ارتقاء (Progressive Evolution) ہوگی اور آخر الذکر فجائی ارتقا (Emergent Evolution) یہ فرق تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔ سورۃ الرحمن میں ہے: يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝ (55/29) ارض وسماوات میں جو کچھ ہے (اپنی نشوونما کے لیے) خدا (کے ذرائع ربوبیت) کا محتاج ہے۔ پھر ان چیزوں کا یہ عالم نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتی ہیں اس لیے انہیں ایک ہی قسم کا سامانِ نشوونما ملتا رہتا ہے۔ یہ چیزیں ہر آن تغیر پذیر رہتی ہیں۔ ان کی حالت میں ہر وقت تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے ان کی نشوونما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ رحم مادر کے اندر جنین کی نشوونما کا تقاضا کچھ اور، بچے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور، بڑے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ جب تک کوئی شے ایک حالت میں رہتی ہے، خدا کی صفت رحیمیت کے مطابق اس کی نشوونما ایک انداز سے ہوتی جاتی ہے۔ لیکن جونہی اس کی حالت بدلتی ہے اس کی صفتِ رحمانیت کے مطابق اس کی نشوونما کے انداز وطریق میں بھی ہنگامی تبدیلی آجاتی ہے۔ یوں عمومی ارتقاء اور ہنگامی ارتقاء کے قوانین خداوندی کے مطابق ہر شے اپنے نقطۂ آغاز سے منزل تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہے رب، رحمٰن اور رحیم سے مراد۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ (اپنے پہلے ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں) گنہگار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ عمل سے زائل نہیں ہوسکتا، اس لیے ان کے نزدیک نجات صرف خدا کے رحم (Mercy) سے ملتی ہے۔ رحم کا یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے فلاح وفوز (کامیابی وکامرانی) اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے جسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اس قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53/39) انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ جدوجہد کرے۔ البتہ اس سعی وعمل کے لیے انسان کو مختلف صلاحیتیں خارجی کائنات میں سامانِ نشوونما اور عقل کی راہنمائی کے لیے وحی کی روشنی، خدا کی طرف سے بلامزد ومعاوضہ ملتی ہے اس لیے یہ سب رَحْمٌ میں داخل ہے۔ یعنی یہ تمام نشوونما خدا کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ اب جو شخص ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر خدا کے قانون کے مطابق اپنی ذات کی نشوونما کرلے گا (جو ایک صحیح معاشرہ کے اندر دوسروں کی ربوبیت ہوتی ہے) وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوجائے گا۔ جو ایسا نہ کرے گا، وہ ان سے محروم رہ جائے گا۔ اسے خدا کا قانون مکافات کہتے

ہیں۔لہٰذا انسان اپنی منزلِ مقصود تک خدا کی رحمت (Grace) سے نہیں بلکہ اپنے اعمال کے نتائج کی رو سے، خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق پہنچتا ہے۔

ردد

سورۃ نحل میں ایک آیت ہے جو قرآنی نظامِ ربوبیت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی مختلف استعداد ہوتی ہے [اس کا مقصد 43/32 میں بیان کیا گیا ہے یعنی اس سے معاشرہ کے چھوٹے بڑے، ہر قسم کے کام چلتے رہتے ہیں] لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اس کے ماحصل (رزق) کو اپنے ہی لیے مخصوص کر لیں۔یعنی وہ یہ سمجھ لیں کہ چونکہ یہ ہماری ہنرمندیوں سے حاصل ہوا ہے اس لیے ہم ہی اس کے مالک ہیں، یہ غلط ہے۔فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16/71)''جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اپنے رزق کو اپنے زیردستوں کی طرف نہیں لوٹاتے (اس ڈر سے کہ) اس طرح یہ سب اس میں برابر کے شریک ہو جائیں گے؟''بِرَآدِّيْ کا لفظ غور طلب ہے۔یہ نہیں کہا کہ انہیں بطور خیرات دے دیں۔کہا یہ ہے کہ یہ فالتو رزق، درحقیقت ان کے لیے ہے جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اور جنہیں اس کی ضرورت ہے۔اس لیے جس کے لیے یہ ہے اُسی کی طرف اسے لوٹا دینا چاہیے۔اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تم اس سے انکار کرتے ہو کہ کمانے کی استعداد اور رزق کے اسباب و ذرائع خدا کی نعمتیں ہیں جو اس کی طرف سے مفت ملی ہیں۔اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (169/71)''کیا یہ لوگ جو اپنی زائد از ضرورت دولت کو ان کی طرف نہیں لوٹاتے جنہیں اس کی ضرورت ہے، خدا کی نعمت سے انکار کرتے ہیں؟''یہ ہے قرآن کریم کا سوشل آرڈر۔عمرانی اور معاشی نظام۔

رذل

اَرْذَلِ الْعُمُرِ (16/70) عمر کا ردی حصہ۔بڑھاپے کا وہ حصہ جس میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا (16/70) انسان ان چیزوں کو بھی بھول جاتا ہے جن کا اسے پہلے علم ہوتا ہے۔حافظہ جاتا رہتا ہے۔

رزق

قرآن کریم نے تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رِزْقِ اللّٰهِ (2/60) کہا ہے۔سورۃ حجر میں مَعَايِشَ اور رِزْقٌ ہم معنی استعمال ہوئے ہیں (15/20)۔لیکن چونکہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں بلکہ زندگی موت کے بعد بھی مسلسل آگے چلتی ہے اس لیے اس کے نزدیک سامان نشوونما کی ضرورت صرف طبعی جسم کی پرورش ہی کے لیے نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے بھی ہے۔اس لیے قرآن کریم نے مرنے کے بعد انسانی ذات کی نشوونما کے اسباب

وذرائع کوبھی رِزْقٌ سے تعبیر کیا ہے (22/58)۔اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جنت زندگی کے ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے۔وہاں بھی انسانی ذات کی نشوونما کا سلسلہ جاری رہے گا۔

لہٰذا رِزْقٌ سے مراد ہیں وہ تمام اسباب وذرائع جن سے انسانی جسم اوراس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں سامانِ زیست (ضروریاتِ زندگی) کی تقسیم قانونِ وحی کے تابع ہو (جسے نظام ربوبیت کہتے ہیں) تو انسانی جسم کی نشوونمااوراس کی ذات کی نمود وبالیدگی بلامشقت ہوتی چلی جاتی ہے۔

ر س خ

قرآن کریم میں الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (3/6) آیا ہے۔اس کے معنی ہوں گے وہ لوگ جوعلم میں پختگی حاصل کرلیں اور علم کی تہہ میں اتر جائیں۔رَاسِخٌ فِی الْعِلْمِ وہ ہے جوعلم میں اس حدتک تحقیق کر چکا ہوکہ اس میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔قرآن کریم اپنی دعوت علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اوراسے غوروفکراورعلم وتحقیق کی رو سے ماننے کی تلقین کرتا ہے۔لہٰذا رَاسِخٌ فِی الْعِلْمِ وہ شخص ہے جو اپنی تحقیق کی رو سے یقینی نتائج تک پہنچ جائے اور اس طرح اس کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت محکم ہوجائے۔

ر س ل

> وہ حضرات جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اوراس وحی کووہ انسانوں تک پہنچاتے ہیں خدا کے رسول کہلاتے ہیں۔قرآن کریم نے انہیں اَنْبِیَاءُ بھی کہا ہے اور رُسُلٌ بھی۔ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی ذات کے دو منصب ہیں۔نبوت خدا کی طرف سے وحی کا ملنا ہے اور رسالت اس وحی کا آگے پہنچانا۔نہ نبوت بغیر رسالت کے ہوسکتی ہے اور نہ رسالت بغیر نبوت کے۔ یہ جوکہا جاتا ہے کہ رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی بلاشریعت، یہ خیال غیر قرآنی ہے۔قرآن کریم نے رسول اور نبی میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ ہر نبی صاحب کتاب تھا (2/213) اور ہر رسول بھی (57/25)۔

وحی کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر ختم ہوگیا۔اس کے بعد وہ نظام آگے چلا جوقرآنی قوانین کی رو سے قائم ہوا تھا۔اس نظام میں خلیفۃ الرسولؐ وہ فرائض سرانجام دیتا تھا جنہیں اپنی زندگی میں رسول سرانجام دیتا تھا۔یعنی منظم اور اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا۔اس طرح ''اطاعت خدااوررسول'' کا یہ سلسلہ قائم رہا۔لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔اب اگر پھراسی قسم کا نظام قائم ہوجائے جس میں قرآنی قوانین عملاً نافذ ہوں تو پھر اُسی اطاعت کا

سلسلہ جاری ہوسکتا ہے جسے ''خدااوررسولؐ'' کی عملی اطاعت کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اللہ اور رسول کا ذکر آیا ہے لیکن اس کے بعد ضمیر یا صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ''اللہ اور رسول'' کی اطاعتیں دو الگ الگ اطاعتیں نہیں ہوتیں۔ اس سے مراد ہوتی ہے قوانین خداوندی کی اطاعت جو اس نظام کی وساطت سے کی جاتی ہے جسے رسول متشکل کرتا ہے اور جو رسول کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کے ذریعے آگے چلتا ہے۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا ہے اور وہ دین کا مکمل ضابطہ ہے، اس لیے نبوت کے ختم ہوجانے سے انسانی راہ نمائی کے سلسلہ میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سوال صرف اس نظام کے قائم کرنے کا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا۔ وہ آج بھی قائم ہوسکتا ہے۔

رشد

رُشد ایک جامع لفظ ہے جس میں ہدایت، حکمت وبصیرت سے لے کر منزل مقصود تک پہنچنے کے لے عملی تدابیر اور راستے کے خطرات اور نقصانات سے بچنے کے سامان سب آجاتے ہیں۔ اسی لیے انبیائے کرامؑ (انقلاب خداوندی کی طرف دعوت دینے والوں) کو رُشْدٌ عطا ہوتا تھا (21/51)۔ اور جماعت مومنین رَاشِدُوْنَ کی جماعت ہوتی ہے (49/7)۔ یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی اطاعت سے ملتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کی تصریح کردی ہے کہ خدا کے سوا نہ کوئی وَلِیٌّ ہے اور نہ کوئی مُرْشِدٌ (18/17)۔ لیکن ہم ہیں کہ انسانوں کو اپنا پیرومرشد بناتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہے ہیں۔

رصد

خدا کے مِرْصَادٌ (گھات) میں ہونے (89/14) کے یہ معنے ہیں کہ اس کا قانونِ مکافات ہر ایک پر نگاہ رکھتا ہے اور جب ظہورِ نتائج کا وقت آتا ہے تو اسے فوراً دبوچ لیتا ہے۔ کوئی شخص اُس قانون کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ انسان کا ہر عمل، قانونِ خداوندی کے معین کردہ راستے سے گزر کر اپنی منزل ومنتہٰی تک پہنچتا ہے، جسے اس کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی عمل بلانتیجہ رہ نہیں سکتا۔

رصص

قرآن کریم میں ہے کہ مومن خدا کی راہ میں اس طرح صف بستہ لڑتے ہیں كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (61/4) گویا وہ ایک ایسی محکم دیوار ہیں جسے سیسہ پلا دیا گیا ہو۔ یہ بات اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے جب قلوب ایک دوسرے سے

پیوست ہوں اور قلوب کی پیوستگی، مقصدِ زندگی اور ضابطۂ حیات کے ایک ہونے سے ہوتی ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ جس جماعت (امت مسلمہ) کی کیفیت یہ ہونی چاہیے تھی وہ آج کس طرح فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو حامل قرآن سمجھ رہی ہے!

رضی

قرآن کریم میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ(9/100)۔ اس کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے "اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔" چونکہ راضی ہوجانا اور ناراض ہوجانا انسانی جذبات ہیں اس لیے اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوجاتا ہے کہ یہی جذبات خدا میں بھی ہیں۔ وہ بھی کسی بات سے خوش ہوجاتا ہے اور کسی بات سے ناراض ہوجاتا ہے۔ خدا خوشی اور ناراضگی کے ان انسانی جذبات سے مُبرّا ہے۔ اس لیے رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو اس نے دیوی دیوتا یا خدا کا تصور ایسا ہی پیدا کیا جیسا وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھتا تھا، اس لیے کہ اس کے نزدیک بادشاہ سے بڑھ کر قوت اور اقتدار کا مالک کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن نے خدا کو بھی (بادشاہ کی طرح) ایک تخت پر بٹھایا۔ پھر یہ سمجھا کہ بادشاہ کے امراء و وزراء کی طرح خدا کے بھی مقربین ہیں جنہیں اس کے کاروبار میں دخل ہے۔ نیز اس کے حاجب و دربان بھی ہیں۔ بندے اس کے رعایا ہیں جنہیں اس کے سامنے دم مارنے کی جا نہیں۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اس کے حضور پیش کرنی ہو تو اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرنا ضروری ہوگا۔ نیز اس درخواست کو بادشاہ کے مقربین میں سے کسی کی وساطت سے وہاں تک پہنچانا ہوگا تاکہ وہ سفارش کرے۔ ان درخواستوں کے فیصلے (یا بادشاہ کے دیگر احکام) کسی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار بادشاہ کے مزاج پر ہوتا ہے۔ اگر وہ خوش ہو گیا تو گاؤں بخش دیا۔ اگر ناراض ہو گیا تو گدھوں سے ہل چلوا دیئے۔ بادشاہ کی خوشی اور ناراضگی بھی کسی اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ لہٰذا بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کسی طرح خدا کو راضی رکھیں۔ اسے خوش کرلیں۔ ایشور کی بھگتی، ڈنڈوت، پوجا پاٹ، اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا، دیوتاؤں کے استھانوں پر قربانیاں دینا سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح ایشور پرماتما کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے بھگتوں سے راضی رہے۔

"اللہ کے راضی ہونے" سے مراد یہ ہے کہ خدا کے پسندیدہ راستہ (قرآن کریم) کے مطابق چلا جائے۔ اور انسانوں کے خدا سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا تجویز کردہ راستہ، ان کے دلوں میں محبوب و مرغوب بن جائے۔ قرآن کریم کے دیگر مقامات سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں منافقین کے متعلق ہے کہ

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ (9/8) ''وہ اپنے منہ سے تم کو راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں۔''
لہٰذا رَضِیَ کے معنی برضا و رغبت موافقت کرنے اور دلی طور پر ہم آہنگی کے ہوں گے۔

سورۃ توبہ میں ہے کہ اللہ نے مومنین سے جَنّٰتٍ اور مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ہے: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (9/73) اللہ کی ''رضوان'' ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ ایک عظیم کامرانی (Achievement) ہے۔

یہ آیۃ جلیلہ ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا کیا ہے؟

انسان نام ہے اس کی طبعی زندگی (Physical Life) اور انسانی ذات (Self) کا۔ زندگی کی کامیابی سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی بھی خوشگوار رہے اور اس کی ذات کی بھی نشوونما ہو جائے۔ انسان کی نشوونما سے مراد یہ ہے کہ اس میں جس قدر مضمر صلاحیتیں ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔ خدا کی ذات ایک مکمل ترین ذات ہے جس میں اس کی تمام صفات بطریق احسن جلوہ فرما ہیں۔ وہی صفات انسان کی ذات میں بھی ہیں لیکن علیٰ قدرِ بشریت۔ یعنی چھوٹے پیمانے پر۔ انسانی ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ان صفات کی نمود ہوتی جائے۔ اب ظاہر ہے کہ انسانی ذات کو جس قدر زیادہ نشوونما حاصل ہوگی یہ اتنی ہی زیادہ صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی جائے گی۔

ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا یہ ہے کہ انسانی ذات کی اس طرح نشوونما ہوتی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے زندگی کی خوشگواریاں بھی ملتی چلی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ زندگی کی یہ خوشگواریاں بڑی خوش آئند اور مبارک ہیں اور ان کا حاصل ہو جانا بھی بڑی چیز ہے۔ لیکن حقیقی کامرانی و کامیابی یہ ہے کہ اس سے انسانی ذات، صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ ان اعمال کا بدلہ (یا نتیجہ) ایک تو اس طرح مرتب ہوتا ہے کہ انسان کی خارجی دنیا حسین و خوشگوار ہو جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی داخلی دنیا میں بھی ایک عظیم انقلاب آ جاتا ہے۔ یہ انقلاب (یعنی انسانی ذات کا نشوونما پا جانا) بہت بڑی کامرانی ہے۔ یہی چیز ہے جسے باندازِ دگر یوں کہا گیا ہے کہ لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْھَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ (50/35) ''جنت میں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس (اس سے بھی) بڑھ کر (کچھ اور) ہے۔'' یعنی انسان کی خواہش اس کے علم و جذبات کی موجودہ سطح کے مطابق ہی ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب جنت کی زندگی میں یہ سطح ہی بلند ہو جائے گی تو وہاں جو کچھ ملے گا وہ ان کی موجودہ خواہشوں اور آرزوؤں سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس کی ذات کی نشوونما بایں نمط ہوگی کہ اس کے شعور کی موجودہ سطح اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔

انسانی ذات کی یہ نشوونما صرف اس معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے جو قرآن کریم متشکل کرتا ہے۔ خانقاہوں کی تجرد گاہوں میں نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ رضوان من اللہ یا مرضات اللہ، قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے خوشگوار نتائج کا نام ہے۔

رعد

کائنات کی ہر قوت اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لیے سرگرداں رہتی ہے اور ان کی نقل و حرکت کا مجموعی نتیجہ کائنات میں تعمیری اضافے ہوتا ہے۔ ہم جب ان قوتوں کو الگ الگ دیکھتے ہیں تو ہمیں بعض قوتیں محض ڈر اور خوف کا موجب نظر آتی ہیں (جیسے بجلی کی کڑک) لیکن بہ ہیت مجموعی ان سب کا نتیجہ تعمیری ہے۔ اور یہی چیز خدا کی حمد و ستائش کی مظہر ہے۔

رع ی

اگر کسی قول یا عمل سے اہانتِ رسول یا تنقیصِ توحید کا شائبہ تک بھی پیدا ہوتا ہو تو اس سے بچنا چاہیے اور محض نیک نیتی کو اس کے جواز کے لئے آڑ نہیں بنانا چاہیے۔ مسلمان کی ہر بات اور ہر عمل کو صاف، واضح اور بین ہونا چاہیے۔ ان امور میں (بالخصوص) شاعری جس قسم کا لائسنس لے لیتی ہے اس کی کبھی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

رف ث

حج کے ضمن میں ہے فَلَا رَفَثَ (2/197)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حج کے اجتماع میں کوئی فحش خیال یا ایسی بات یا حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیے جس میں جنسی میلان پایا جاتا ہو۔ روزوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے: اُحِلَّ لَکُمۡ لَیۡلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمۡ (2/187)۔ ''تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رفث حلال کیا گیا ہے۔'' یہاں قرآن کریم نے اِلٰی نِسَآئِکُمۡ کا ٹکڑا بڑھا کر واضح کر دیا ہے کہ اس سے کنایہ ''جماع'' ہے۔

رف ع

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا گیا ہے کہ بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ (4/158) تو اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ اللہ نے ان کے مدارج بلند کر دیئے اور اس طرح اپنا مقرب بنا لیا۔ ورنہ اگر رَفَعَ کے معنے جسمانی طور پر اوپر اٹھا لینے کے لئے جائیں تو اِلَيۡهِ (خدا کی طرف) کے لفظ سے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کسی ایک مقام پر ہے۔ اس لئے کہ جب بھی کسی جسمانی شے کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ فلاں کی طرف گئی ہے تو جس کی طرف وہ چیز جائے گی اس کا کوئی مقام متعین کرنا ضروری ہوگا۔ خدا کو کسی ایک مقام میں محدود سمجھنا قرآن کریم کے خلاف ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے: وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ (94/4) ہم نے تیری عظمت کو تیرے لیے بہت بلند کر دیا۔

رف ق

قرآن کریم میں ہے: حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا (4/69)۔ ''یہ اچھے ساتھی ہیں ایسے رفقائے سفر جن کی رفاقت سے انسانی

خامیاں پوری ہوکر اس کی ذات کا اور معاشرہ کا توازن قائم رہے۔ اور یہ سب کچھ بطیب خاطر ہو۔

جہنم کی زندگی ایسی ہے جس کے سہارے انسان، زندگی کے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتا۔ جنت کی زندگی ایسی ہے جو انسان کے اوپر اٹھنے اور بلندیوں کی طرف جانے کا بہترین سہارا بنتی ہے۔ ایسا سہارا جس سے کبھی توازن نہیں بگڑتا۔ انسان اُسی سہارے سے اوپر اٹھ سکتا ہے جو اُس کے توازن کو قائم رکھے۔ توازن بگڑ جانے سے انسان لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ سہارے تو جہنمی معاشرہ میں بھی ہوتے ہیں لیکن وہ بڑے ناہموار ہوتے ہیں اس لیے انسان ان کے ذریعے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ ان سے اس کی ذات کی نشوونما نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف جنتی معاشرے کے سہارے ہیں جن سے افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور وہ اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اوپر اٹھتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

رک ب

سورۃ انشقاق میں ہے: لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (84/19)۔ ''تم ایک حالت سے دوسری حالت پر چڑھتے ہوئے درجہ بدرجہ اوپر کو اٹھتے جاؤ گے''۔ انسانی زندگی کا موجودہ مقام اس کا منتہیٰ نہیں۔ اسے ابھی بہت آگے بڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اس لیے موت سے سلسلہ حیات ختم نہیں ہوجاتا۔ خاک کے ذرے حیاتیاتی طور پر (Biologically) ارتقائی منازل طے کرتے پیکر انسانی تک پہنچے ہیں۔ لیکن اس پیکر میں انسانی ذات طبعی ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ ارتقاء (Evolution) کی اگلی منزل شروع ہوتی ہے۔ یعنی انسانی جسم کے بجائے انسانی ذات (Human Personality) کا ارتقاء۔ یہ ارتقاء اسی زندگی میں شروع ہوکر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی اس کے راستے میں طبعی موت (Physical Death) کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہوتا ہے کہ خود انسانیت (Humanity) تہ بہ تہ اوپر کو اٹھتی چلی آرہی ہے۔ تاریخ انہی تہوں کا ریکارڈ ہے۔

رک ض

سورۃ انبیاء کی آیت (لَا تَرۡكُضُوۡا (21/13)) ایک عظیم حقیقت کی ترجمان ہے۔ جو قومیں اپنے معاشی نظام کو قوانین خداوندی کے تابع رکھنے کی بجائے اپنی تدابیر کے تابع رکھتی ہیں وہ معاشرے میں فساد پیدا کردیتی ہیں۔ اس سے دولت کی تقسیم سخت ناہموار ہوجاتی ہے جس کا آخر الامر نتیجہ تباہی ہوتا۔ لیکن وہ دولت کے نشے میں بدمست اس کا احساس نہیں کرتیں کہ وہ کس تباہی کی طرف کشاں کشاں چلی جارہی ہیں۔ تا آنکہ جب وہ تباہی محسوس طور پر ان لوگوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے تو وہ اس سے بچنے کے لئے تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت خدا کا قانون مکافات عمل

انہیں آوز دیتا ہے کہ لَا تَرْكُضُوْا مت بھاگنے کی کوشش کرو۔تم اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ ۔چلو واپس اپنے عظیم الشان محلوں میں اور آسائش کے مقامات میں جنہیں تم نے غریبوں کے خون کی رنگینی سے مزین بنا رکھا تھا۔وہیں واپس چلو،لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21/31) تاکہ تم سے وہاں جا کر پوچھا جائے کہ یہ دولت کہاں سے آئی تھی اور ان عیش سامانیوں پر تمہارا کیا حق تھا؟ قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری کے انجام کا نقشہ کس قدر بیّن انداز میں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے؟

ر ک ع

رکوع وسجود درحقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کا نام ہے۔سجدہ میں رکوع کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔یعنی کامل اطاعت۔سورۃ بقرہ میں یہودیوں سے کہا گیا ہے:وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (2/43)۔یعنی جو جماعت مومنین،قوانین خدواندی کے سامنے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے،تم بھی ان میں شامل ہو کر اسی طرح ان قوانین کی اطاعت کرو۔

چونکہ انسان کے جسم کی حرکات اس کے دل کے جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔(مثال کے طور پر جب ہم ''نہیں'' کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا سر خودبخود دائیں بائیں ہل جاتا ہے اور جب ''ہاں'' کہتے ہیں تو اس کی حرکت خودبخود اوپر نیچے ہو جاتی ہے)۔اس لئے قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی محسوس ترجمانی اجتماعات صلٰوۃ میں رُكُوعٌ اور سَجْدَةٌ کی شکل میں ہوتی ہے۔تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا .... سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48/29)''تو انہیں رکوع وسجود کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔۔۔اطاعت کے اثر سے ان کی قلبی کیفیات ان کے چہروں پر (ظاہر) ہیں۔'' ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں رکوع اور سجدہ تو کرے لیکن اپنی زندگی غیر خدائی قوانین کے تابع بسر کرے،تو اس کے یہ رکوع وسجود منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ہوں گے۔یعنی وہ چند منٹ کے لئے (اور وہ بھی بظاہر) خدا کے سامنے جھکتا ہے لیکن اپنی پوری زندگی میں عملاً غیر اللہ کے سامنے جھکتا رہتا ہے۔اس لئے اس کے یہ رکوع اور سجود خدا کی اطاعت کی علامات نہیں ہیں۔سچا رکوع اور سجدہ یہ ہے کہ انسان کا دل قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائے،اور دل کے جھکنے کے ساتھ اس کا سر بھی تعظیماً جھک جائے۔اجتماعات صلٰوۃ کی محسوس حرکات سے یہی مقصود ہے۔

روح

اَلرُّوْحُ کے معنے (عام انسانی روح کے علاوہ) رحمت،خدا کی طرف سے وحی اور خود قرآن کریم۔مثلاً قرآن کریم میں ہے:يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (16/2)۔یہاں اَلرُّوْحُ سے مراد وحی ہے۔اور سورۃ

شوریٰ میں ہے وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (42/52)۔ یہاں روحًا سے مراد خود قرآن کریم ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں کہا گیا ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (17/85)۔ ''تجھ سے اَلرُّوْحُ کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ اَلرُّوْحُ میرے رب کے امر سے ہے۔'' تو وہاں روح سے مراد انسانی روح (Soul) نہیں بلکہ وحی ہے۔اس کی وضاحت اِس سے اگلی آیت نے کر دی ہے جہاں اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ کہا گیا ہے (17/86)۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وحی کی ماہیت سمجھنا چاہتے ہیں۔ان سے کہہ دو کہ اس کا تعلق عالم امر سے ہے دنیائے محسوسات سے نہیں۔اس لئے تم اس کی ماہیت کو نہیں سمجھ سکتے۔اس پر ایمان لانا ہوگا البتہ اس کی تعلیم کو سمجھ سکتے ہو۔ ''ماہیت'' کے معنی یہ ہیں کہ وحی کیسے ہوتی ہے۔خدا اور نبی کا تعلق کیا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

رُوْحُ کے لفظ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ الوہیاتی توانائی ہے جو نبی کے قلب پر انکشاف حقائق کرتی ہے۔اور ملائکہ وہ کائناتی قوتیں ہیں جو قانون خداوندی کو مشہود بناتی ہیں۔اسی لئے قرآن کریم میں مَلٰٓئِكَةُ اور رُوْحُ کا الگ الگ بھی ذکر آیا ہے (97/4:78/38:70/4)۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ابتدائی کڑیاں تو وہی ہیں جو عام حیوانات کی تخلیق سے متعلق ہیں۔لیکن اس کے بعد انسان کو دوسرے حیوانات سے یہ کہہ کر ممتاز کر دیا گیا ہے کہ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (32/9)۔اس میں خدا نے اپنی ''روح'' پھونکی۔اور اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ (32/9)۔انسان کو سمع و بصر یعنی ذرائع علم اور قلب عطا کیا۔ظاہر ہے کہ اس میں ''روح خدواندی'' سے مراد وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (Personality) یا نفس (Self) کہتے ہیں اور جس سے انسانی خصوصیات وابستہ ہیں۔ یہ (انسانی خودی) ہر انسان کو یکساں طور پر ملی ہے۔اس کے بعد دیکھنا یہ ہوگا کہ انسان اسے کس حد تک نشوونما دیتا ہے۔اس کی کتنی (Development) کرتا ہے۔ روحانیت سے یہی مراد ہے اور یہ نشوونما قرآنی معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ''توانائی'' یعنی ''روح'' کو ''روحنا'' (ہماری روح) کیوں کہا ہے؟ کیا یہ چیز ''ذاتِ خداوندی'' کا جزو ہے؟ اس سوال کا سمجھ لینا ضروری ہے۔کائناتِ میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے۔ یہ توانائی مادی اسباب وعلل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہیے کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے ''مادی توانائی'' کہتے ہیں۔انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار اور ارادے کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسم انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے کہ طبعی توانائی اس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس ''توانائی'' کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے ''روحنا کہہ کر پکارا ہے۔یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس

سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں۔ خدا کی طرف سے براہِ راست ملی ہے۔ یہ ''انسانی ذات'' ہے۔ اسی کو ''الوہیاتی توانائی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''الوہیاتی'' ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں ''الہ (خدا) کی طرف منسوب۔ لہٰذا ''الوہیاتی توانائی'' سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہ راست خدا کی طرف منسوب ہے۔ واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی ''غیر از خدا'' کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ ''انسانی توانائی'' کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ ''مادی توانائی'' سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی، خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ ''ذات'' کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔ اسے ذات خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا، ہندوؤں کے فلسفہ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ''توانائی'' ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے، نہ اس کا منتہیٰ اس کی ذات سے جا کر مل جانا ہے۔ یہ توانائی، غیر نشوونما یافتہ شکل (Un-Developed Form) میں ملتی ہے۔ اور اسے نشوونما دینا، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی کے لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اس کی ذات کے طبیعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

مادی تصورِ حیات (Materialistic Concept of Life) اور قرآنی تصورِ حیات میں فرق ہی یہ ہے کہ اول الذکر کی رو سے انسان عبارت ہے صرف اس کے طبعی جسم سے۔ اس جسم کی مشینری، طبعی قوانین کے تابع سرگرمِ عمل رہتی ہے اور جب انہی قوانین کے مطابق وہ چلنے سے رک جاتی ہے تو اسے موت کہتے ہیں جس سے اُس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآنی تصور حیات کی رو سے انسان عبارت ہے اس کے طبعی جسم اور اس کی ذات سے۔ اس کی ذات، طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی اس لئے جب طبعی قوانین کے مطابق انسانی جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رک جاتی ہے تو اس سے اس کی ذات کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول متعین ہیں۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے، جو عقل انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جسم اور ذات کی نشوونما کے قوانین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا استعمال کرے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی عمارت اسی بنیا پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی ذات جوں جوں نشوونما پاتی جاتی ہے اس میں صفاتِ خداوندی (حدودِ بشریت کے اندر) منعکس ہوتی جاتی ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی جگہ بھی ''انسانی روح'' کا ذکر نہیں کیا، ''روح خداوندی'' ہی کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ ''

روحِ خداوندی'' (الوہیاتی توانائی) انسان کو عطا کردی جاتی ہے تو اسے ،قرآن کریم کی اصطلاح میں، نفس کہا جاتا ہے۔ (91/7-9)

اسی کو انسانی ذات (Human Personality) یا خودی (Self) یا اَنا① کہتے ہیں۔ یعنی I amness (مَیں)۔

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جب ہم نے یہ کہا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم اور اس کی نشوونما کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم کی پرورش بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشوونما، انسانی جسم کی وساطت سے ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے جسم کا توانا ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح انڈے کے اندر جیتا جاگتا چوزہ بننے کے لیے انڈے کے خول کا صحیح وسلامت رہنا ضروری ہے۔ البتہ جب کبھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے (مستقل اقدار) میں تصادم ہو، ان میں (Tie) گرہ پڑ جائے ،تو اس وقت ،جسم کے تقاضے کو ذات کے تقاضے پر قربان کردینا، شرطِ انسانیت (ایمان کا تقاضا) ہوجاتا ہے جس طرح، جب انڈے کے اندر چوزے کا ''دم گھٹنے لگے'' تو وہ انڈے کے خول کو چونچیں مار مار کر توڑ دیتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہی یہی ہے۔ یعنی جب طبعی تقاضوں میں اور مستقل اقدار میں گرہ (Tie) پڑے تو مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے طبعی تقاضوں کو قربان کردینا۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔

رود

قرآن کریم میں جہاں ''خدا کے ارادوں'' کا ذکر آیا ہے، انہیں انسانی ارادوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے۔ انسانی ارادے بندھتے بھی ہیں، ٹوٹتے بھی ہیں، صحیح بھی ہوتے ہیں، غلط بھی، قابلِ عمل بھی ہوتے ہیں اور محض ''شاعرانہ'' بھی۔ لیکن خدا کے ارادے درحقیقت اس کے وہ فیصلے ہیں جو عالمِ امر سے، اس کے قوانین مشیت کے مطابق سرزد ہوتے ہیں اور جن کے مطابق کائنات سرگرمِ عمل ہے۔

روم

الروم۔ سلطنت رومۃ الکبریٰ (Roman Empire)۔ سورۃ روم (30/2) میں ہے کہ رومی مغلوب ہوگئے۔ یہ اس شکست کا ذکر ہے جو ایران کے بادشاہ، خسرو پرویز، کے ہاتھوں رومیوں کو پہنچی تھی۔ جس میں رومیوں کا صوبے پر صوبہ فتح ہوتا چلا گیا تھا اور جس کا سلسلہ سنہ 615ء تک جاری رہا تھا۔ قرآن کریم نے عین اس وقت جب رومی انتہائی کمزوری میں تھے، کہا کہ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ پھر ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ سنہ 624ء میں ہرقل نے نہ صرف اپنے

---

① اسے I amness کہتے ہیں۔

مفتوحہ علاقے واپس لے لئے بلکہ ایران کے اندر داخل ہوکران کے بڑے آتش کدہ کو تباہ کردیا۔ یہ اس سال (سنہ 2ھ میں) ہوا جب مسلمانوں کو مخالفین عرب پر، بدر کے میدان میں پہلی فتح حاصل ہوئی تھی۔ عربوں کا قریب ترین حریف ایران تھا۔ ایران کا اتنی قوت حاصل کرلینا کہ رومن ایمپائر بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر سکے، عربوں کے لئے بڑی پریشانی کا موجب تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں، انہی عربوں کو قرآنی نظام کی بدولت اتنی قوت حاصل ہوگئی کہ ان کے سامنے نہ ایرانی سلطنت ٹھہر سکی، نہ رومن ایمپائر۔ یہ سب ''نکتہء ایمان کی تفسیر''[1] تھا۔

رھ ب

بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا: اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ (2/41) تم صرف مجھ سے ڈرنا۔ خدا سے ڈرنے کے معنی یہی ہیں کہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈر کر ان کی نگہداشت کی جائے اور ان سے سرکشی اختیار کرنے سے احتیاط کی جائے۔

باقی رہا رہبانیت کا مسلک۔ یعنی ترک دنیا کا مسلک۔ سو قرآن کریم کہتا ہے کہ اسے عیسائیوں نے خود ہی وضع کرلیا تھا۔ ہم نے اسے ان کے لئے تجویز نہیں کیا تھا (57/27)۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا (57/27)۔ پھر وہ (اپنے اس خودساختہ مسلک) کو بھی پوری طرح نباہ نہ سکے۔ یہ ہے قرآن کریم کا فیصلہ مسلک خانقاہیت سے متعلق جو تصوف کی بنیاد ہے اور جسے (بدقسمتی سے) ہمارے ہاں ''مغز دین'' قرار دیا جاتا ہے۔ جب مسلمانوں کے ہاتھ سے قرآن کریم کا دامن چھوٹا تو وہ تمام غیر قرآنی عناصر جنہیں قرآن کریم مٹانے کے لئے آیا تھا، ایک ایک کرکے اسلام کا جزو بنتے گئے۔ روما کی ملوکیت، ایران کی نسل پرستی، یہودیوں کی پیشوائیت اور روایت پرستی اور عیسائیوں اور مجوسیوں کا مسلک خانقاہیت، سب اسلام کے اجزا بن گئے۔ اور اب اسلام انہی کے مجموعہ کا نام قرار پا چکا ہے۔ یاللعجب!

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ دین، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور قرآن کریم کا ایک ایک لفظ، بغیر کسی آمیزش کے، ہمارے پاس موجود ہے۔ لہٰذا ہم دین خالص کو ان آمیزشوں سے باآسانی الگ کرسکتے ہیں، بشرطیکہ ایسا کرنے کی نیت ہو۔

رھ ط

سورۃ نمل میں قوم ثمود کے سلسلہ میں آیا ہے: وَ كَانَ فِي الۡمَدِیۡنَةِ تِسۡعَةُ رَهۡطٍ یُّفۡسِدُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ (27/48) ''اور

---

[1] ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں (علامہ اقبالؒ)

شہر میں نو افراد تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے''۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان اکابرین قوم کی طرف اشارہ ہے جن کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار تھی۔ ہرقوم، ملک، حکومت یا مملکت میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو ملک میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں باقی ملک انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتا ہے۔

رھن

قرآن کریم میں ہے: كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (52/21)۔ ہرشخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہے، یعنی اس کی زندگی کا فیصلہ اس کے اعمال کے نتائج پر ہے۔ سورۃ بقرہ میں قرضہ کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اور وہاں کاتب نہ ملے تو فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ (2/283) مستعار دی ہوئی چیزوں کے عوض کچھ چیزیں بطور ضمانت اپنے قبضے میں رکھ لینی چاہئیں۔ اس سے ہمارے ہاں کے ''رہن بالقبضہ'' کا جواز نکالنا (جو سود ہی کی دوسری شکل ہے) بڑی زیادتی ہے۔

''رھن بالقبضہ'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ (مثلاً) ایک کسان نے کسی سے کچھ روپیہ بطور قرض لیا اور قرض دینے والے نے اس کی کچھ زمین بطور رہن لے لی۔ اس کے بعد زمین پر قرض دینے والے کا قبضہ ہوگا اور جب تک قرض ادا نہیں ہو جائے گا وہ اس کی پیداوار کھاتا جائے گا۔ (اور اس پیداوار کو قرض میں محسوب نہیں کرے گا) اگر یہ ربوٰ نہیں تو اور کیا ہے؟

رھو

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو ان سے کہا گیا کہ وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (44/24)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تو سمندر کو پرسکون حالت میں چھوڑ دے۔ یعنی جب حضرت موسیٰ وہاں پہنچے ہیں تو سمندر سکون کی حالت میں تھا۔ اس میں جوش وخروش نہیں تھا۔ وہ اترا ہوا تھا اور اس طرح اس نے خشک راستہ چھوڑ دیا تھا۔

جس جگہ پہلے سمندر ہو وہ پست (نشیب) ہوگی اور جب وہاں سے سمندر ہٹ جائے گا تو وہ، دوسری زمین کے مقابلہ میں (جو ہنوز زیرآب ہے) بلند ہو جائے گی۔

روض

قرآن کریم میں ہے: فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (30/15)۔ ''وہ سرسبز مقام میں محفل موسیقی سے لطف اندوز ہوں گے۔

ری ب

سورۃ الطور میں رَيْبَ الْمَنُوْنِ (52/30) کے معنے ہیں حوادثِ روزگار یا زمانہ کی اضطراب انگیزیاں جن کا مقابلہ حقائق تو کر سکتے ہیں، شاعرانہ جذبات پرستی نہیں کر سکتی۔

قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں کہہ دیا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ(2/2)۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے جس میں کوئی بات ایسی نہیں جو شک وشبہ والی ہو اور اس کی وجہ سے انسان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب اور کشمکش باقی رہے۔ اس میں کامل سکون واطمینان دینے والی تعلیم ہے۔ اضطراب اور بے چینی کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ یہ یکسر علم وبصیرت پر مبنی اور دلائل وبراہین پر قائم ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح اطمینان علم وبراہین ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اندھی عقیدت مندیوں اور توہم پرستیوں سے نہیں۔

ری ش

قرآن کریم میں لباس کے متعلق ہے کہ وہ تمہارا ستر بھی ڈھانپتا ہے اور رِيْشًا (26/7) باعث زینت بھی ہے۔ قرآن کریم اشیائے کائنات کے صرف افادی پہلو (Utilitarian Aspects) ہی کی اہمیت پیش نہیں کرتا، ان کے جمالیاتی گوشوں (Aesthetic Aspects) کو بھی برابر کی اہمیت دیتا ہے۔ حسن فطرت کی تمام رعنائیاں اور دل ربائیاں، خالق فطرت کے اسی انداز تخلیق کی مظہر ہیں۔ یعنی ہر شے میں افادی اور جمالیاتی پہلو۔ مومن کی زندگی بھی ان دونوں گوشوں کی مظہر ہونی چاہیے۔

ری ع

قرآن کریم میں ہے اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ(26/128)''کیا تم ہر بلند مقام پر (اپنی عظمت کی یادگار کے طور پر) کوئی نہ کوئی نشان بنا لیتے ہو؟ اور وہ بھی بلا ضرورت''۔ اس سے مراد بلند عمارتیں ہیں جنہیں بطور یادگار (Memorials) بنایا جاتا ہے اور جن کا مصرف کچھ نہیں ہوتا۔ یادگار وہی بہتر ہوسکتی ہے جو آنے والوں کے لیے نفع بخش ہو۔

ری ن

قرآن کریم میں ہے: رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (83/15)۔ ''اُن کے اعمال اُن کے دل پر زنگ بن کر چھا گئے''۔ غور کیجیے! دلوں پر مہریں کہیں باہر سے نہیں لگتیں۔ انسان کے اپنے اعمال ہی زنگ اور مہریں بن جاتے ہیں۔ اسی کو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2/7) کہا گیا۔

ز ج ج

اَلزُّجَاجُ۔ کانچ اور شیشے اور ان سے بنی ہوئی چیزوں کو کہتے ہیں۔ واحد زُجَاجَةٍ ہے۔ قرآن کریم میں چراغ کے متعلق ہے فِيْ زُجَاجَةٍ(24/35)۔ اس سے مراد ہے شیشے کی چمنی یا فانوس۔ جب پیالہ بھرا ہوا ہو تو اسے اسے كَاْسٌ کہتے ہیں اور جب خالی ہو تو زُجَاجَةٌ کہلاتا ہے۔

زجر

مَجۡنُوۡنٌ وَّ ازۡدُجِرَ (54/9)۔ انہوں نے اسے مجنون قرار دیا اور ڈانٹ کر نکال دیا۔ مفاد پرست گروہ اپنی قوت اور اقتدار کے نشہ میں ہر داعی الی الحق کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے ہیں۔

زرع

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ (56/64)۔ ''کیا کھیتی کو تم اگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں!'' تم صرف حرث کرتے ہو (56/63)۔ یعنی تم صرف کھیتی بوتے ہو۔ اُگاتے ہم ہیں۔ لہٰذا تم ساری کی ساری فصل کے مالک کیسے بن سکتے ہو! تم اپنی محنت کا حصہ لے لو اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔ یعنی اُن لوگوں کو دے دو جنہیں اس کی ضرورت ہے (56/73)۔

زقم[1]

قرآن کریم نے کہا کہ اِنَّہَا شَجَرَۃٌ تَخۡرُجُ فِیۡۤ اَصۡلِ الۡجَحِیۡمِ (37/64)۔ وہ ایک ایسا درخت ہے جو جہنم (جحیم) کی جڑوں میں اگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد کوئی سچ مچ کا درخت نہیں، کیونکہ جہنم کی جڑ میں کونسا درخت اُگ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اس قسم کا رزق ہے جس سے انسانیت جل کر راکھ ہو جائے۔ اس کے خوشے بڑے بڑے سرکش و مستبد لوگوں (شیاطین) کے سروں جیسے ہوں گے۔ یعنی ظلم و استبداد سے حاصل کردہ رزق۔ اسی کو الشَّجَرَۃَ الۡمَلۡعُوۡنَۃَ بھی کہا گیا ہے (17/60) اور طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ بھی (44/44)۔ یعنی ایسا رزق جس سے انسان کی قوتیں مضمحل اور صلاحیتیں افسردہ ہو جائیں اور وہ زندگی کی صحیح خوشگواریوں سے محروم رہ جائے۔ یہ ان لوگوں کا رزق ہے جو اپنے آپ کو (بزعم خویش) بڑا اصاحبِ عزت وتکریم سمجھتے ہیں (44/49) یعنی مُتۡرَفِیۡنَ کا طبقہ (56/45) جو دوسروں کی کمائی پر عیش وعشرت اور حکومت کرنے کے خوگر ہوں۔ اس رزق سے پیٹ تو ضرور بھر جاتا ہے (37/66) لیکن انسانیت نشوونما نہیں پا سکتی (37/68)۔

زکو

اَلزَّکوٰۃُ کے معنی ہیں نشوونما، بالیدگی، پھولنا، پھلنا۔ اس کے معنی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں۔ قرآن کریم میں (ایک ہی آیت میں) اَزۡکٰی اور اَطۡهَرُ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں۔ ذٰلِکُمۡ اَزۡکٰی لَکُمۡ وَ اَطۡهَرُ (2/232) اس میں اَطۡهَرُ تو پاکیزگی

---

[1] دیکھئے سورت الصافات، آیت نمبر 62

کے لیے ہے اور آزؔ کی نشوونما کے لیے۔ پاکیزگی (طہارت) ایک سلبی صفت (Negative Virtue) ہے۔ یعنی نقائص اور خرابیوں سے دور رہنا۔ لیکن زکوٰۃ ایجابی صفت (Positive Virtue) ہے۔ یعنی بڑھنا، پھولنا، پھلنا، نشوونما اور بالیدگی حاصل کرنا۔

قرآن کریم میں اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہی دوستون ہیں۔ اس سے مراد ہے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے، اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ہے ''ایتائے زکوٰۃ''۔ ایتاء کے معنی ہیں دینا۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما (Growth) یا (Development) کا سامان بہم پہنچانا۔ اس ''نشوونما'' میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما، دونوں شامل ہیں۔ سورۃ حج میں ہے کہ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (22/41)۔ ''یہ (جماعت مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔'' یعنی اسلامی مملکت کا فریضہ ''ایتائے زکوٰۃ'' ہوگا۔ یعنی دوسروں کو نشوونما دینا، اپنے افراد معاشرہ اور دیگر نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔

اب سوال یہ ہے کہ مملکت اسلامی (یا نظامِ خداوندی) اپنے اس عظیم فریضہ (نوعِ انسان کو سامان نشوونما بہم پہنچانے کے فریضہ) کو سرانجام کس طرح سے دے گی؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے (اولاً) ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ رزق کی تقسیم لوگوں کی ضرورت کے مطابق کر سکے۔ اور (دوسرے یہ کہ) افراد معاشرہ جو کچھ کمائیں وہ اسے اس طرح کھلا رکھیں کہ مملکت اس میں سے جس قدر ضرورت سمجھے، ''ایتائے زکوٰۃ'' (دوسروں کی نشوونما) کے لئے لے لے۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب۔ اس میں سوال ضرورت پوری کرنے کا ہے۔ حتیٰ کہ اس ضمن میں یہ بھی کہہ دیا کہ جو کچھ افراد کی ضروریات پورا ہونے کے بعد بچ جائے، عندالضرورت وہ سب کا سب مملکت کی تحویل میں لیا جا سکتا ہے، (دیکھئے 2/219)۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھئے تو مملکت اسلامی کی تمام آمدنی ''ایتائے زکوٰۃ'' کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

لیکن اس قسم کا اسلامی نظام، بتدریج قائم ہوگا۔ جس عرصہ میں یہ ہنوز زیر تشکیل ہوگا، اس میں جماعت کے افراد سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لئے جائیں گے یا ہنگامی ٹیکس عائد کئے جائیں گے۔ ان کے لئے قرآن کریم نے ''صدقات'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ''صدقات'' اور ''زکوٰۃ'' کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم نے ''صدقات'' کے خرچ کی جو مدات بتائی ہیں (9/20) انہیں بھی زکوٰۃ کے مصرف کی مدات سمجھا جاتا

ہے۔لیکن قرآن کریم نے ان اصطلاحات کو الگ الگ مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلامی نظام مملکت کے شعبے ہیں، انفرادی چیزیں نہیں ہیں۔ انفرادی طور پر انسان جو کچھ ضرورت مندوں کو دے گا وہ خیرات ہوگی۔ اسلامی نظام میں خیرات لینے یا دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ قرار پاجاتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ جو کچھ حکومت لیتی ہے وہ مملکت کا ٹیکس ہوتا، اور زکوٰۃ خدا کا ٹیکس ہے۔''قیصر اور خدا'' کی یہ تقسیم، عیسائیت کی ثنویت (Dualism) کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلام میں، جو مملکت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے، اسے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا ہی کو دیا جاتا ہے۔

سورۃ النجم میں ہے: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (53/33)۔ اس کے معنی ہیں کہ تم خود ہی اپنے متعلق فیصلہ نہ کرو کہ تمہارا تزکیہ نفس (ذات کی نشوونما) ہو رہا ہے۔ اس کے لئے معیار، خدا کا مقرر کردہ قانون ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى (92/18)۔ تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو (نوع انسان کی پرورش کے لئے) دیتا ہے۔ یعنی مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (92/5)۔'' جو دیتا ہے اور تقویٰ شعار بنتا ہے۔۔۔۔ اس کے لئے راستے آسان ہوجاتے ہیں (92/7)۔

زلم

اَزْلَامٌ سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانہ جاہلیت میں فال نکالتے تھے۔ تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر تھیلے میں ڈال دیئے جاتے۔ ان میں سے ایک پر اِفْعَلْ (کر) دوسرے پر لَا تَفْعَلْ (نہ کر) لکھ دیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے۔ جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لیے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فال نکالو۔ چنانچہ وہ اپنے قاعدے کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتادیتے۔ اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے۔ بعض لوگ خود بھی اپنے پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے۔ اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی اور (جوئے کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا (5/3)۔ قرآن کریم نے ان سب باتوں سے منع کردیا۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کرلیتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے وہ مقام انسانیت سے گرجاتا ہے۔ یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم۔ لیکن اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے ہاں فال لینا، قرعے ڈالنا، ''استخارے کرنا'' (یعنی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تسبیح کے دانوں کے سپرد کردینا) عام روش زندگی ہوگیا ہے۔ گری ہوئی قومیں اپنی قوت بازو ہی کو ترک نہیں کرتیں، عقل و فکر کو بھی

ساتھ ہی چھوڑ دیتی ہیں اور اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں۔ ایک مردِ مومن اچھی طرح جانتا ہے کہ خاکِ زندہ ہوں میں تابع ستارہ نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اتفاقات اور حوادث کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اتفاقات اور حوادث کو اپنے پروگرام کے تابع ① لاتا ہے۔

ز م ل

ایک اونٹ پر بالعموم دو سواریاں بیٹھتی ہیں۔ ایسے سفر میں سب سے اہم اور پہلا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک اونٹ پر ایسی دو سواریاں بٹھائی جائیں جو ہم وزن بھی ہوں اور ہم خیال بھی تاکہ ان دونوں میں طبعی اور ذہنی، دونوں انداز سے ہم آہنگی ہو۔ اگر ان کا وزن برابر نہ ہو تو سفر میں اونٹ کو اور خود سواریوں کو بھی تکلیف ہوگی۔ اور اگر وہ ہم خیال نہ ہوں تو یہ سفر، سَقَر (دوزخ) بن جائے گا۔ سب سے اچھا سالارِ کارواں وہ ہوتا ہے جو زَمِیْلٌ چننے میں ماہر ہو۔

رسول اللہ ﷺ کو جب وحی کے ذریعہ قرآنی نظام کا نقشہ سمجھا دیا گیا تو اس کے بعد ان کا سب سے اہم فریضہ یہ قرار پایا کہ وہ رفقائے کار کی تلاش کریں اور ان کے انتخاب میں زمیلانہ انداز اختیار کریں۔ اس لئے کہ ایسے عظیم پروگرام کی کامیابی کا راز رفقائے سفر کے صحیح انتخاب میں تھا۔ یہ تھا وہ فریضہ جس کی طرف آپ کی توجہ یَاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73/1) کہہ کر دلائی گئی۔ اس کے بعد جس قسم کی تزمیل رسول اللہ ﷺ نے کی، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

اس اعتبار سے مُزَّمِّلُ وہ ہوگا جو بارِ رسالت کو نہایت حسن و خوبی سے اٹھائے۔ یَاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کے معنی ہیں اے امر عظیم کے اٹھا لینے والے۔ اَلْمُزَّمِّلُ کے معنی ہیں وہ شخص جس نے اپنے آپ کو خدا کا ہم رنگ کر لیا ہو۔ یہ رفاقت کی انتہائی شکل ہے۔ اس کے معنی مُزَّمِّلُ بِالْقُرْآن ہیں۔ یعنی قرآن کا بار اٹھانے والا، حامل قرآن۔

نبی اکرم کو جو یَاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر پکارا گیا ہے تو اس میں حضور ﷺ کے عظیم القدر فرائض رسالت کی طرف اشارہ ہے جن کا مقصد جماعتِ مومنین کو ساتھ لے کر دنیا میں انقلاب عظیم برپا کرنا تھا۔

ز ن ی

قرآن کریم میں ہے: لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی (17/32)۔ ''زنا کے قریب تک بھی نہ جاؤ۔'' یعنی یہی نہیں کہ زنا نہ کرو بلکہ

---

① I عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں — تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے — (اقبال)

II دَر دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ — ۔ایضاً۔

III ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا — وہ خود فراخیٔ اَفلاک میں ہے خوار و زبوں — ۔ایضاً۔

IV ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے — کہ خاکِ زندہ ہے تُو، تابع ستارہ نہیں — ۔ایضاً۔

V تیرگی اپنے مقدر کی مٹانے کے لیے — چھین کر چاند ستاروں سے اُجالا لے لو — نامعلوم

مبادیات زنا تک کے بھی پاس نہ جاؤ۔ سورۃ فرقان میں ہے: وَلَا یَزْنُوْنَ (25/68)۔ ''زنا نہیں کرتے''۔ اَلزَّانِيْ؛ زنا کرنے والا مرد۔ اَلزَّانِیَةُ (24/2) زنا کرنے والی عورت۔ ان میں سے ہر ایک کی سزا سو کوڑے ہیں۔ (24/2)۔ البتہ اگر یہ جرم ایسی شادی شدہ عورت سے سرزد ہو جو پہلے لونڈی رہ چکی ہو (زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق) تو اس کی سزا اس سے نصف ہے (25/4)۔ اس لئے کہ لونڈیوں کی پرورش اور تربیت جس پست ماحول میں ہوتی تھی اس سے ان میں اس بلندی کردار کی توقع رکھنا جو بلند، شریف اور پاکیزہ ماحول میں پیدا ہوتا ہے، زیادتی تھی۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ قرآنِ کریم انسان کی اضطراری کمزوریوں پر کس قدر نگاہ رکھتا ہے۔

سنگساری (رجم) کی سزا قرآن کریم میں نہیں۔

زھد

زُھْدٌ یا زَاھِدٌ کا لفظ جن معنوں میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ یہ تصوف کی اصطلاح ہے جس میں دنیا سے بے رغبتی کو بڑی فضلیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ (خود تصوف ہی اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے) قرآن کریم کی رو سے مومن کا فریضہ دنیا کی تسخیر ہے اور اس کی خوشگواریوں سے متمتع ہونا اس کا حق۔ قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ''ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔'' (7/32)۔ مومن صرف اِن چیزوں سے اجتناب کرتا ہے جن سے خدا نے روکا ہے۔ ان کے علاوہ، وہ دنیا کی ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا اور انہیں اپنے کام میں لاتا ہے۔

زوج

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق مختلف مقامات میں آیا ہے کہ لَھُمْ فِیْھَآ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَةٌ (4/57) تو اس کے معنی نیک بیویاں ہی نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں پاکیزہ خیالات رکھنے والے ہم مشرب ساتھی۔ جنتی معاشرہ میں قلب ونگاہ کی پاکیزگی اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ چونکہ اس معاشرہ میں مرد بھی ہوں گے اور عورتیں بھی، اس لئے اَزْوَاجٌ میں میاں بیوی بھی شامل ہوں گے۔ واضح رہے کہ جو جنتی معاشرہ دنیا میں قائم ہوگا اس میں میاں بیوی کے تعلقات میں افزائش نسل کا مقصد بھی شامل ہوگا۔ لیکن جنتِ آخرت میں میاں بیوی کی مواصلت یا افزائش نسل کا تصور قرآن کریم سے نہیں ملتا۔ لہٰذا وہاں کی (مردوں اور عورتوں کی) زوجیت، باہمی رفاقت (Companionship) کی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت آخرت کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے وہاں کی نعمتوں کا تمثیلی بیان ہے۔ اسے یہاں کے اندازِ زیست پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔

زَوْجٌ (جمع اَزْوَاجٌ)۔ رفیق، ایک دوسرے کے ساتھی ۔زَوْجٌ (جمع اَزْوَاجٌ) کے معنی شوہر یا بیوی دونوں کے ہیں۔ شوہر بیوی کا زَوْجٌ ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی زَوْجٌ۔ ان میں سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کا نام ہے ازدواجی زندگی۔ قرآن کریم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن کریم کی رو سے ازدواجی زندگی کس قسم کی زندگی ہوتی ہے تو اس کے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ تَزَوَّجَهُ النَّوْمُ کے معنی ہیں نیند آنکھوں میں گھل مل گئی۔ لہٰذا میاں بیوی کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آنکھوں میں نیند گھل جائے۔ اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں (بیویاں) بھی ہوں گی لیکن وہ بھی قلب ونگاہ کی پاکیزگی کو لئے ہوئے ہوں گی اور سفر زندگی میں ایک رفیق کی طرح ساتھ چلنے والیاں۔ قرآن کریم نے ان رفقائے حیات کی خصوصیات کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔

ہم اپنے ادراک کی موجودہ سطح پر اس کی کیفیات کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اِس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کے ساتھیوں کی کیسی کیفیت ہوگی۔ لیکن اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ہم رنگ اور ہم آہنگ ساتھی کا مل جانا، جنت ہے۔

زور

سورۃ حج میں ہے: اِجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (22/30)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں جھوٹی اور بناوٹی بات سے بچو۔ لیکن اصل کے اعتبار سے اس کے معنی ہیں سیدھے راستے سے ہٹی ہوئی حرکت۔ انسان کا ہر وہ قدم جو صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا پڑے، زُوْرٌ میں آجائے گا۔ اسلام، حرکت کا نام ہے۔ یہ ایک تحریک ہے۔ لیکن یہ حرکت بلاتعین منزل نہیں کہ جس طرف جی چاہا قدم اٹھا دیا۔ یہ حرکت ہے ایک متعین منزل کی طرف۔ اس لئے اس میں زُوْرٌ کا کوئی کام نہیں۔ اس کی تشریح اگلی آیت نے کردی جہاں فرمایا حُنَفَآءَ لِلّٰهِ (22/31)۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر اُس نصب العین کی طرف چلنا جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (22/31)۔ اس میں کسی اور خیال، جذبہ اور میلان کی آمیزش نہ کرنا۔ اسی کو سورۃ فرقان میں ظُلْمًا وَّزُوْرًا (25/4) کہا ہے۔[1]

زی ت

قرآن کریم میں ہے: وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ○ (95/103)۔ اس میں اَلزَّيْتُوْنِ زیتا نام پہاڑی ہے جو فلسطین میں واقع ہے۔ وہاں حضرت عیسیٰؑ معبوث ہوئے تھے۔ اور اَلتِّيْنِ حضرت نوحؑ کی

1 سورۃ الفرقان آیت نمبر 4 میں ہے: (ترجمہ) اور کافر کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) خود ساختہ باتیں ہیں جو اس (نبی) نے بنالی ہیں اور دوسرے لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔ یقیناً یہ لوگ ظلم اور جھوٹ پر اُتر آئے ہیں

بعثت کا مقام ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور حضرت موسیٰؑ اور محمدؐ عربی کی دعوت، یہ سب آسمانی دعوتیں اس حقیقت کبریٰ کی شاہد ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ۔۔۔۔ الخ (95/4-6)۔

زی غ

قرآن کریم میں ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (61/5)۔ جب وہ صحیح راستے سے ہٹ گئے تو خدا کے قانونِ مکافات نے ان کے دلوں کو اُسی طرف جھکا دیا۔

یہ آیت قرآنی تعلیم کی ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دے دے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔ اس نے جنہیں گمراہ کرنا ہوتا ہے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم اور خدا کے قانونِ مکافات عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کرتا ہے کہ اِسے سیدھے راستے پر چلنا چاہیے یا کجروی اختیار کرنی چاہیے۔ جس قسم کا وہ فیصلہ کرتا ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کجروی اختیار کرتا ہے تو اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں غلط طریق پر چل کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے: يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (51/8) ''حق سے اس کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہتا ہے۔'' خدا کا قانون یہ نہیں کہ ایک شخص حق سے پھرنا چاہتا ہے لیکن خدا اِسے زبردستی حق پر قائم رکھتا ہے۔ یا ایک شخص حق پر قائم رہنا چاہتا ہے اور خدا اُسے حق سے پھرا دیتا ہے۔ حق سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہے۔ دل انہی کے ٹیڑھے ہوتے ہیں جو خود ٹیڑھے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ یہاں ابتداء کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کا قانون اس کے پیچھے چلتا ہے۔ جیسا انسان کا فیصلہ، ویسا خدا کا قانون۔ جیسا انسان خود، ویسا خدا کا قانون۔ آنکھیں بند کر لو، اندھیرا ہو جائے گا۔ کھول لو، نظر آنے لگ جائے گا۔

سورۃ النجم میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (53/17) ''نہ تو آپ کی نگاہ حقیقت سے کسی اور طرف کو ہٹی اور نہ ہی حد سے تجاوز کر گئی۔'' مَا طَغٰى نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں رسول کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کا علم بھی محدود ہوتا ہے۔ جو حد خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

صحیح روش یہ ہے کہ ہمارے قلبی اور ذہنی میلانات و عواطف کا تقاضا کچھ بھی کیوں نہ ہو ہمیں قرآن یم کے مرکز [1] سے اِدھر اُدھر کبھی نہیں ہٹنا چاہیے۔ حق وہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے۔ نہ کہ وہ جو ہمارے جذبات و میلانات چاہتے ہیں۔ جو شخص

[1] علامہ اقبال کے الفاظ میں:

پرد در وُسعتِ گردوں یگانہ -:- نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ (ارمغانِ حجاز)

پہلے سے کچھ خیالات یا عقائد ذہن میں رکھ کر قرآن کریم کی طرف اس مقصد سے جائے کہ قرآن کریم سے ان عقائد کی تائید حاصل کرے (خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں) اسے قرآن کریم سے کبھی صحیح راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ ①

قرآن کریم سے صحیح راہ نمائی حاصل کرنے کے لیے ادراک ② کا بے رنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔

ز ی ن

ابلیس نے کہا تھا کہ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ (15/39)۔ میں (انسان کو) اس کی طبعی زندگی (حیاتِ ارضی) اس قدر خوشنما بنا کر دکھاؤں گا کہ یہ اسی کو نصب العین حیات بنا کر بیٹھ جائے گا۔ یعنی اس کا تصورِ حیات بالکل مادہ پرستانہ (Materialistic) ہو جائے گا۔

قرآن کریم، صرف زندگی کا افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی سامنے نہیں رکھتا بلکہ جمالیاتی پہلو (Aesthetic Aspect) بھی پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس لئے وہ انسان کو نہ صرف اجازت دیتا ہے کہ وہ زیبائش و آرائش کی چیزوں سے اپنے اور کائنات کے حسن میں اضافہ کرے بلکہ اس کا حکم دیتا ہے کہ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (7/31) ہماری اطاعت گزاریوں میں حسن و زینت کو اختیار کرو۔ جو لوگ زندگی کے جمالیاتی پہلو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق بڑی سختی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (7/32)۔ ان سے کہو کہ زیبائش و آرائش کی جن چیزوں کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے وہ کون ہے جو انہیں حرام قرار دے سکتا ہے؟ اس نے زیبائش و آرائش کی چیزوں کو کسی خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا (18/7) جو کچھ زمین میں ہے سب اس کے لئے وجہ زینت ہے۔ اس لئے زمین میں جو کچھ بھی زینت و آرائش کا سامان ہے، سب انسان کے حسن و زیبائش کے لئے ہے۔ کسی چیز کی ممانعت نہیں۔ البتہ اس اہم حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہی چیزیں زندگی کا نصب العین نہیں بن جانی چاہئیں (18/46)۔ انہیں اصل نصب العین کے حصول میں مددگار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ یا یوں سمجھئے کہ دنیوی متاعِ حیات اور زیب و زینت کی اشیاء سے متمتع ہونے کی ممانعت نہیں لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ ان چیزوں میں اور قرآن کی متعین کردہ حدود اور اقدار میں ٹکراؤ ہو، اُس وقت اِن چیزوں کو، ان اقدار کے تحفظ کی خاطر قربان کر دینا ہوگا۔ یہی دین کا مغز اور قرآنی تعلیم کا ماحصل ہے۔

قرآن کریم میں (پردے کے احکام کے سلسلہ میں) کہا گیا ہے کہ مرد اور عورتیں جب باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو

---

① بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے -:- ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے (علامہ اقبال)

② قرآن کریم کی سورت واقعہ میں ہے: لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56/79) اس کے معنی یہ نہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ جو پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ خیال ہوں دوسرے لوگ قرآنی حقائق پر مطلع نہیں ہو سکتے۔ یعنی یہاں قرآن کریم کو مَس کرنے کے معنی چھونا نہیں، اس کے حقائق سے باخبر ہونا ہے۔

کھو یا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں -:- سمجھے گا نہ تو، جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک (بالِ جبریل)

بیباک نہ ہونے دیں (24/30)۔ اور عورتیں لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا (24/31) اپنی زینت کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں، ہاں جو ان میں سے خود بخود ظاہر ہو جائیں (تو اس کا مضائقہ نہیں)۔ یہاں زینت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عورتیں اپنا بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ مثلاً زیورات وغیرہ۔ اس کی تائید اگلے الفاظ سے ہوجاتی ہے، جہاں کہا گیا ہے کہ وَ لَا یَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِہِنَّ لِیُعۡلَمَ مَا یُخۡفِیۡنَ مِنۡ زِیۡنَتِہِنَّ (24/31)۔ وہ اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت میں سے چھپائے ہوئے ہیں وہ ظاہر ہو جائے۔ پاؤں کو زور سے زمین پر مارنے سے، چھپے ہوئے زیور (جھانجھن یا چھاگل وغیرہ) کی آواز نمایاں ہوجاتی ہے۔ باقی رہی جسم کے اوپر کے حصہ کی اشیائے زینت، سو اس کے لیے کہہ دیا کہ وہ اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں (24/31) یا جلباب اوڑھ لیا کریں (33/59)۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اشیائے زینت کی نمائش نہ کرتی پھریں۔ البتہ افرادِ خاندان کے سامنے ان کی نمائش کرلیں تو اس میں حرج کی بات نہیں (24/31)۔ اس فہرست پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن کریم اس باب میں بھی کہاں تک احتیاط برتتا ہے۔

جنسی جذبہ (بھوک اور پیاس کی قسم کا جذبہ) نہیں جو از خود بیدار ہو جائے۔ یہ جذبہ بیدار کرنے سے بیدار ہوتا ہے۔ قرآن کریم ان اسباب و ذرائع کی نگرانی کرتا ہے جو اس جذبہ کی بیداری کے محرک بن سکتے ہیں۔ عورت کی طرف سے غیروں کے سامنے نمودِ حسن یا اظہارِ زینت، سب سے بڑا محرک ہے۔ قرآن کریم اس پر پابندی عائد کرتا ہے۔

س أ ل

قرآن کریم میں ہے: اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡہَرۡ (93/10)۔ ضرورت مند، صاحبِ احتیاج کو (ذلیل و حقیر سمجھ کر) مت ڈانٹو۔ سورۃ الرحمن میں ہے: یَسۡـَٔلُہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (55/29)۔ کائنات میں ہر شے اپنی ضروریات کے لئے خدا کے سامنے جھولی پھیلائے ہوئے ہے۔ ہر شے اپنی نشو و نما کے لئے اس کے نظامِ ربوبیت کی محتاج ہے۔ سورۃ سجدہ میں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ (41/10) ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ یہ انسانی رزق کا سرچشمہ ہے اس لئے اس سے ہر شخص کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ یہی اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ نہ یہ کہ مختلف لوگ اس پر حد بندی کر کے اسے اپنی اپنی ملکیت تصور کرلیں۔ خدا نے ان تمام چیزوں کو، جن کی انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضرورت ہے، خود مہیا کر دیا ہے۔ وَ اٰتٰىکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡہُ (14/34)۔ یہ اس کا نظامِ ربوبیت ہے۔ لہٰذا اس کی ربوبیت عامہ کو افراد کی ملکیت سمجھ لینا بہت بڑا جرم۔

''سوال'' کے بنیادی معنی ضرورت اور احتیاج کے ہیں۔ جب ہم کسی سے کچھ دریافت کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہمیں ان باتوں کو معلوم کرنے کی احتیاج ہوتی ہے جن کی بابت ہم دریافت کرتے (پوچھتے) ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ کس جگہ اس کا ترجمہ دریافت کرنا ٹھیک ہوگا اور کس جگہ طلب کرنا۔

س أ م

لَا یَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَیْرِ (41/49)۔ انسان مال اور دولت کی طلب سے اکتا تا ہی نہیں۔ اس کی یہ طلب، اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ جذبۂ منافست کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ کی بنا پر۔ اور اس طلب کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102/2)۔ تا آنکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔

سبأ

سَبَاٌ یمن کی ایک قدیم سلطنت کے دارالخلافہ کا نام تھا جس پر عہد حضرتِ سلیمانؑ میں ایک ملکہ حکمران تھی۔ قرآن کریم میں اس قوم، اس کے ملک اور ملکہ سبا کا ذکر آیا ہے۔ (دیکھئے 27/22 و 34/15)۔ اس میں اس ملک کی سرسبزی اور زرخیزی کا خاص طور پر ذکر ہے اور پھر سیلاب کی وجہ سے اس کی عبرت انگیز تباہی کا۔ انہوں نے ایک بہت بڑا بند تعمیر کر کے پانی کو روکا تھا جس سے ان کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ یہ سیلاب اسی بند کے ٹوٹنے سے آیا تھا۔ 1955ء میں ایک امریکن ماہر حفریات (Archaeologist) نے ان آثار قدیمہ کا ذکر کیا تھا جو اس نے جنوبی عرب، بالخصوص یمن کے علاقہ میں دریافت کیے تھے۔ اس کی کتاب کا نام (Qataban and Sheba) ہے اور مصنف کا نام (Wendell Phillips)۔ ان تفاصیل سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ بالخصوص ان کے تعمیر کردہ بند اور اس کے بعد اس تباہی پر جس سے اس قوم کی صرف داستانیں دنیا میں باقی رہ گئیں (34/19)۔

س ب ب

سورۃ کہف میں ہے: وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا (18/84) اس کے معنی سامان و ذرائع ہی کے ہیں۔ گالی دینے کے معنوں میں یہ مادہ (6/109) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ کفار کے معبودانِ باطل کو گالی مت دو، ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے، جہالت کی بنا پر خدا کو گالی دے دیں۔ اس قسم کے مظاہرے، مذہبی مناظروں [1] کے میدانوں میں اکثر ہوتے

---

① مناظرے کی حقیقت کیا ہے اور یہ کیا ہوتا ہے، آیئے آپ کو اس کی ایک جھلک دکھائیں۔
پاکستان بننے سے پہلے غیر منقسم ہندوستان میں مناظروں کا عام چلن تھا۔ ایک دفعہ مسلمان مولویوں اور عیسائی پادریوں کے درمیان مناظرہ تھا۔ اس مناظرے میں عیسائی پادریوں نے مسلمان مولویوں کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا کہ آپ کا خدا کیسا ہے کہ وہ نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کو کربلا کے میدان میں جبکہ حضرت امام حسین شہید ہونے کے قریب تھے نہ بچا سکے۔ مسلمان مولویوں میں سے ایک نے جواب دیا کہ جب حضرت امام حسینؑ شہید ہونے والے تھے تو ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوئے اور فرمایا اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرا نواسہ (امام حسینؑ) جام شہادت سے شرف یاب ہونے والا ہے تو اِسے بچا لے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ رو رہے تھے اور انہوں نے روتے ہوئے فرمایا: اے محمدؐ! میں تمہارے نواسے کو کس طرح بچاؤں جبکہ دشمنوں نے میرے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو صلیب پر لٹکا دیا اور میں اسے نہ بچا سکا۔ اس جواب پر مسلمانوں نے جلسہ گاہ میں نعرہ تکبیر بلند کیا اور اپنے مولویوں پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے اور جشن منائے۔ تو قارئین کرام یہ ہوتا ہے مناظرہ جس کی بنیاد سچائی اور حقائق پر نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ وقت کے مطابق جس بات سے جیت جانے کا اِمکان زیادہ ہو وہی من گھڑت (خودساختہ) بات کہہ دی جاتی ہے۔

رہتے ہیں۔

س ب ت

یہودیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اپنے سبت کی پابندیوں کو توڑا (2/65 و 4/154)۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ یہ اس دن مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے (7/163)۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی (4/47)۔ اور یہ وبال اس لیے آیا کہ وہ سب ایک مسلک پر چلنے کی بجائے باہمی اختلاف کرنے لگ گئے تھے (16/124)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب زندگی ایک نظام کے ماتحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عائد کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندیوں پر قائم رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہفتے میں ایک دن کا کاروباری ناغہ بڑی معمولی سی پابندی ہے۔ لیکن اس سے سیرت و کردار کا امتحان ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اتنی سی طمع (Temptation) کا مقابلہ نہ کرسکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں وہ بھلا زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اتریں گے؟ کیریکٹر نام ہی ضبط خویش (Self Discipline) اور ترغیبات کے مقابلہ کا ہے۔ واقعۂ سبت کے بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود یہی ہے۔

س ب ح

التسبیح خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں۔ ازاں بعد اس کا استعمال وسعت اختیار کر گیا اور اسے قولی یا عملی یا اعتقادی عبادات کے لیے بولنے لگ گئے۔ حتیٰ کہ اب سُبحۃ ان دانوں کو کہتے ہیں جو تسبیح میں پرو لیے جاتے ہیں حالانکہ یہ چیز عربوں میں غیر معروف ہے۔ (تسبیح عیسائی راہبوں کے ہاں ہوتی تھی جنہوں نے اسے غالباً بدھ مت والوں سے لیا تھا)۔

قرآن کریم میں اجرام سماوی کے متعلق ہے: كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (36/40) ''وہ تمام اپنے اپنے دوائر (Orbits) میں تیزی کے ساتھ تیر رہے ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ارشاد ہے: اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (73/7) تیرے لیے دن میں بڑا لمبا پروگرام ہوتا ہے۔ تجھے بڑی جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ پرندوں کے متعلق ہے: كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (24/41) ان میں سے ہر ایک فضا کی پہنائیوں میں اپنے اپنے راستے سے بھی واقف ہے۔ (حالانکہ وہاں کوئی نشانِ راہ نہیں لگا ہوتا) یا اپنے اپنے مقاصد کے پیچھے جانے سے واقف ہے، اور اپنی اپنی جدوجہد کے دوائر اور حصولِ معاش کے طور طریق سے بھی۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57/1) کے معنی ہیں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل میں جو قانونِ خداوندی کی رو سے ان کے لیے متعین کیا گیا ہے پوری شدت اور تیزی سے مصروف عمل ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ خارجی کائنات کی چیزیں اس

پروگرام کی تکمیل کے لیے ازخود (Instinctively) سرگرمِ عمل رہتی ہیں (اسی کو قصۂ آدم میں فرشتوں کی تسبیح کہا گیا ہے 2/31۔ یا مثلاً رعد کی تسبیح ۔ 13/13)۔لیکن انسان کو اس کے لیے اپنے اختیار و ارادہ سے سرگرم عمل رہنا ہے۔ اس لیے جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (33/42) تم صبح شام (ہمیشہ) اس پروگرام کی تکمیل کے لیے مصروفِ سعی وعمل رہو۔ یہ پروگرام کیا ہے؟ اس کے متعلق فرمایا: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (56/96) اپنے نشوونما دینے والے کی صفتِ ربوبیت عظمیٰ کو، جس پر ساری کائنات کی عمارت استوار ہے، انسانی معاشرہ میں عملاً متشکل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل رہنا۔ اس کے راستے میں جو قوتیں مزاحم ہوں ان کے خلاف جدوجہد کو بھی ''ذکر و تسبیح'' کہا گیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف جانے لگے ہیں تو انہوں نے اپنی اس مہم کے لیے بھی کہا تھا: كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ○ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (20/33-34)۔ (ترجمہ) اور اسے (میرے بھائی کو) میرے نبوت اور تبلیغ کے کام میں شریک کرتا کہ ہم تیری کثرت سے تسبیح (تبلیغ) کریں اور لوگوں میں تیرا کثرت سے ذکر کریں۔

قرآن کریم جو نظامِ زندگی جماعت مومنین کے لیے تجویز کرتا ہے اس میں صلوٰۃ کے اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس جماعت کے جذبہ اطاعت خداوندی کے عملی مظاہرے ہوتے ہیں اور اس کا اظہار رکوع و سجود کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ رکوع و سجود میں ایک عبد مومن اپنے خدا سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اُس کے قوانین کی اطاعت اور اُس کے بتائے ہوئے فرائض کی سرانجام دہی کے لیے جدوجہد میں صرف کرے گا۔ یہ اقرار جن الفاظ میں کیا جاتا ہے عام اصطلاح میں انہیں بھی خدا کی تسبیح کہا جاتا ہے۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اس قسم کے اقرار کرتا رہے اور عملاً ایسا کر کے نہ دکھائے، تو یہ زبانی قول و اقرار ایک بےنتیجہ رسم سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔صلوٰۃ میں حرکات و سکنات اور الفاظ، انسان کے جذبہ عمل کے بےتابانہ اظہار کی شکلیں ہیں۔ اگر عمل نہ رہے اور انسان ان شکلوں ہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھ لے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ تسبیح کے دانوں پر خدا کا نام گننا، قرآنی تعلیم کا مقصود نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے تسبیح سے مفہوم قوانین خداوندی کی اطاعت میں پوری پوری جدوجہد اور سرگرمیٔ عمل ہے۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ کے معنی ہوں گے صفاتِ خداوندی کو نہایت تیزی، شدت اور مضبوطی کے ساتھ اپنانا اور عام کرنا۔ سورۃ صافات میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے کہ انہیں بڑی مچھلی نے لقمہ بنالیا۔ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ○ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ (37/143-44) اگر یہ لفظ (مُسَبِّحِيْنَ) سَبْحٌ سے ہوتا تو اس کے معنی تیراک ہوتے۔ لیکن سَبَّحَ کے اعتبار سے اس کے معنی ہوں گے پوری قوت اور شدت سے جدوجہد کرنے والا۔ اس میں مچھلی کے منہ سے نکلنے کے لیے پوری جدوجہد کرنے کے بعد ساحل تک پہنچ جانے میں تیرنے کا مفہوم خودبخود آجاتا ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (37/159) کے معنی ہیں خدا ان تمام غلط تصورات سے بہت دور ہے جو یہ لوگ اس کے متعلق

اپنے ذہن میں قائم کرتے ہیں۔

س ب ع

ہماری زبان میں بیسیوں، پچاسوں، سینکڑوں کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا۔ یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں سو بار سمجھا چکے ہیں۔ اس سے مراد ٹھیک سو کی تعداد نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے: اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً (9/80) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر تو ان کے لیے ستر بار مغفرت مانگے تو ہم مغفرت نہیں دیں گے اور اگر ستر سے زیادہ مرتبہ مغفرت مانگے تو مغفرت دے دی جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو ان کے لیے چاہے کتنی مرتبہ بھی مغفرت مانگے انہیں مغفرت نہیں ملے گی۔

س ب ق

سورہ بقرہ میں ہے: فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ (2/148) خوشگواریاں پیدا کرنے والے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو۔ نفسیاتی طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کے لیے عمل اور جدوجہد کا جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مقابلہ (Competition) اور مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ) ہی وہ مہمیز ہے جس سے انسان دیوانہ وار مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ قرآن کریم بھی انسان کے اس جذبہ کی رعایت کرتا ہے اور اس کی پرورش چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس کا رخ بدل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ذاتی مفاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، نوعِ انسانی کے لیے خوشگواریاں پیدا کرنے والے امور میں سبقت کرو۔ اس سے تمہارے جذبۂ مسابقت کی بھی تسکین ہو جائے گی اور معاشرہ میں وہ فساد بھی برپا نہیں ہوگا جو اپنے اپنے مفاد کی خاطر دوسروں سے آگے بڑھنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

سورۃ انبیاء میں ہے: اِنَّ الَّذِيۡنَ سَبَقَتۡ لَهُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰٓى (21/101) اس کے معنی کیے جاتے ہیں جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی آ چکی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے کہ فلاں آدمی اچھے کام کرے اور فلاں برے کام۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون پہلے سے بنا رکھا ہے کہ فلاں کام کا نتیجہ اچھا ہوگا اور فلاں کا نتیجہ برا۔ اور اس کے بعد انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ جس قسم کا کام جی چاہے کرے۔ وہ جس قسم کا کام کرے گا اس کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا۔ سورۃ انبیاء کی مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صحیح روش پر چلیں ان کے لیے خوشگواریاں ہیں۔ اور یہ چیز (کہ اُس روش کا نتیجہ یہ ہوگا) پہلے سے متعین ہو چکی ہے۔ ہم نے محض ان کی خاطر یہ اصول نہیں اختیار کیا۔

س ب ل

قرآن کریم میں فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (2/190) کی اصطلاح متعدد بار آئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (4/76) آیا ہے۔ ''مومنین کی جماعت فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جنگ کرتی ہے اور کفار فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ جنگ کرتے ہیں'' (4/76)۔ اس سے فی سبیل اللہ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ طاغوت وہ مستبد قوتیں ہیں جو دوسروں کو اپنے احکام کے تابع چلائیں اور دنیا میں باطل کا نظام قائم کریں۔ لہٰذا سبیل اللہ کے معنی ہوئے قوانین خداوندی کی اطاعت کے لیے، نظامِ خداوندی کے قیام کی خاطر، اس راستہ پر چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لیے جو خدا نے مقرر کیا ہے، ذاتی مفاد پرستیوں کی بجائے نوع انسانی کی فلاح و بہبود (رب العالمین) کے لیے، انسانی بھلائی کے کاموں کے لیے، مخالفت کی قوتوں کا مقابلہ کرنا۔ مومنین اسی مقصد کے لیے جیتے اور اسی کے لیے اپنی جان دیتے ہیں۔ اسی سے انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی حق کے اثبات اور نوع انسانی کی بہبود کی خاطر اپنا مال کھلا رکھنا کہ جتنا ضروری ہو اس میں سے لے لیا جائے۔

قرآن کریم نے اسلامی معاشرہ کے فرائض میں یہ بھی شامل کیا ہے کہ وہ ''اِبْنِ السَّبِیْلِ'' کی مدد کرے۔ حتیٰ کہ صدقات کا ایک مصرف یہ بھی بتایا ہے (9/60)۔ اس میں ہر اس شخص کے لیے جو اسلامی مملکت میں سفر کرے سفر کی سہولتیں بھی آجاتی ہیں اور جو لوگ سفر میں کسی وجہ سے نادار ہوجائیں انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچانا بھی۔ دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں ''ابن السبیل'' وہ لوگ ہوں گے جو اسلامی مملکت میں عارضی طور پر آئیں جائیں اور رہیں سہیں (Non-Citizens)۔

سورۃ آل عمران میں اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ کہتے تھے کہ لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (3/74) یعنی ہم ان غیر اہلِ کتاب عربوں کے خلاف جو جی میں آئے کرلیں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو قبائلی عصبیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس کے مطابق جو جرم اپنے قبیلہ کے اندر کیا جائے وہ جرم ہوتا ہے لیکن جو جرم قبیلہ سے باہر کیا جائے وہ جرم نہیں کہلاتا۔ قبائلی زندگی تو ایک طرف، خود اہل روما کے ہاں قانون موجود تھا کہ اپنی قوم کے فرد کی چوری جرم ہے اور غیر قوم والوں کے ہاں چوری[1] جرم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گروہ سازی کہیں بھی ہو (خواہ وہ مذہبی فرقہ بندی ہو یا سیاسی قومیت کی گروہ بندی) اس سے یہی ذہنیت پیدا ہوتی ہے کہ ہمدردیاں اور نفع رسانیاں صرف اپنے فرقہ اور اپنی پارٹی کے افراد تک محدود رہنی چاہئیں۔ اس سے باہر جتنے افراد انسانیہ ہیں ان سے نفرت کی جائے۔ آج بھی یہی ہورہا ہے اور آج سے چار ہزار سال پہلے بھی یہی ہوتا تھا۔ عصر حاضر کی نیشنلزم اسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ اور اسی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔

---

[1] غالباً کسی یورپی مفکر نے کہا ہے کہ جو کچھ ہم اپنے ملک اور قوم کے لیے کرتے ہیں، اگر ہم اپنی ذات کے لیے کریں تو چور اور ڈاکو کہلائیں۔ (منظور الحسن مرتب و مؤلف)

قرآن کریم نے اس ذہنیت کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ جرم بہرنوع جرم ہے خواہ اپنوں کے خلاف کیا جائے یا دوسروں کے خلاف۔ اس میں انسان اور انسان، اور قوم اور قوم میں کوئی فرق نہیں۔ اسی لیے اس کے نزدیک اچھا کام وہی ہے جو فی سبیل اللہ کیا جائے۔ یعنی اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند ہو کر، نوع انسانی کی بہبود کی خاطر۔

قرآن کریم میں جنتی زندگی کے سلسلہ میں ہے: عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيۡلًا (76/18) ''اس میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہتے ہیں۔''

جاری چشمہ، ہر وقت بہتا رہنے والا چشمہ۔ یعنی خود زندگی کی جوئے رواں جو مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے۔ حیاتِ جاوداں جو ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ جو حرکتِ مسلسل سے عبارت ہے اور جس میں کہیں انقطاع اور حد بندی نہیں، کوئی روک اور رکاوٹ نہیں۔ اپنے زورِ دروں سے انسانی ذات کا مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جانا۔ ''سَبِيۡلِ اللّٰهِ'' بھی یہی راہ ہے۔ وہ راستہ جس میں انسان ''مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ'' (13/17) پر عمل پیرا ہوتا اور خدائی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہی وہ راہ تھی جس کی طرف رسول اللہ ﷺ علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے تھے (12/108)۔ یہ قرآن کریم کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے انسانی صلاحیتیں بھرپور طور پر نشو و نما حاصل کر سکتی ہیں۔

سورۃ عنکبوت میں ہے: وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (29/69)۔ اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ ''جو لوگ ہمارے لیے جدوجہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنے راستے دکھا دیتے ہیں۔'' یوں تو خدا کی طرف جانے والا ایک ہی راستہ ہے جسے اس نے ''الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ'' (1/5) کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن انسان کے سامنے نت نئے دن، زندگی کے نئے نئے مسائل آتے رہتے ہیں جن کا حل اسے تلاش کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے لیے اصول دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے ہر پیش آنے والے معاملہ کا حل دریافت کرنا، جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے خارجی کائنات کے احوال و کوائف، اقوام عالم کی تمدنی زندگی، اپنے زمانے کے مقتضیات اور قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر گہرے غور و خوض اور فکر و تدبر کی ضرورت ہوگی۔ اس طریق کار سے معاملات پیش نظر کے متعلق قرآنی راہنمائی کے لیے جدوجہد کرنا، (اصطلاح میں) اجتہاد کہلاتا ہے۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اجتہاد کریں گے ہم ان کے سامنے زندگی کی صحیح راہیں کشادہ کرتے چلے جائیں گے۔ انہی راہوں کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ''سبل السلام'' یعنی امن و سلامتی کی راہیں قرار دیا ہے اور ان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ اس طرح کاروانِ انسانیت، تاریکیوں سے روشنی میں آجاتا ہے۔ اور آخر میں ہے: وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (5/16) اور یوں انہیں ''صراطِ مستقیم'' کی طرف راہنمائی مل جاتی ہے۔ یعنی یہ تمام راستے اُسی صراطِ

مستقیم میں جا کر مل جاتے ہیں۔ یہ تمام جزئیات وتفاصیل جنہیں جماعت مومنین اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرتی ہے، قرآنی اصل کی شاخیں ہوتی ہیں اس لیے یہ تمام پگڈنڈیاں اُسی شاہراہِ مقصود میں جا کر مل جاتی ہیں۔

س ت ت

قرآن کریم میں ہے: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ (7/54) ''زمین اور آسمانی کروں کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔'' اس میں ان ارتقائی ادوار کی طرف اشارہ ہے جن سے گزر کر ہماری زمین دیگر اجرام اپنی موجودہ ہیئت تک پہنچے ہیں۔

س ت ر

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ جب تو قرآن کریم پڑھتا ہے تو تجھ میں اور ان لوگوں میں جو حیات مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (17/45) حائل ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا پردہ حائل ہو جاتا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے قلب و دماغ پر ایسا پردہ چھا جاتا ہے جو آنکھوں سے تو دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اُسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ان کی نفسیاتی کیفیت کو حِجَابٌ مَسْتُوْرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خدا کا ایک نام اَلسَّتَّارُ بھی مشہور ہے۔ لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔

س ج د

اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات وسکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دورِ حاضر کی علمی اصطلاح میں متوازیت یا (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم (Body) کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ مثلاً جب آپ لیٹے لیٹے کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس خیال کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ جب آپ آرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ یا جب آپ کسی بات پر ہاں کہتے ہیں تو ساتھ ہی سر ہلا دیتے ہیں (بلکہ یوں کہیے کہ آپ کا سر خود بخود غیر شعوری طور پر ہل جاتا ہے) جب آپ کسی کا احترام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ اُٹھ جاتا ہے اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے۔ قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (عربی) میں بات کرتا ہے اس لیے اس کے ہاں بھی اظہارِ مطالب کا یہی انداز ہے۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ، اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے: وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ○ (16/49) ''اور جو جاندار کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ، سب

خدا کے سامنے سربسجود ہیں اور وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے۔'' یہاں یَسۡجُدُ کا مفہوم لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ نے واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ احکام خداوندی سے سرکشی اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی جہاں کہا ہے وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (16/50) ''انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کرتے ہیں۔'' اس لیے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س۔ ج۔ د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرماں پذیری کے) معنوں میں۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی (بیشتر) محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہیے کہ اس کا علم (Sense-Perceptions) ''حواس'' کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہارِ خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اس کا اُس زمانے کا مذہب، محسوسات کے دائرے میں گھرا ہوا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ''خدا'' کے لیے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا تھا۔ بلکہ (Form) ہی کو مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو بالغ تصور کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ اسے عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور و بلوغت میں لانا چاہتا ہے۔ وہ علم بالحواس (Perceptual Knowledge) کے ساتھ تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) پر بھی زور دیتا ہے۔ اور دین کے معاملہ میں بھی شکل (Form) کی بجائے معنویت (مقصود و مفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن وہ شکل (Form) کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ضرور باقی رکھتا ہے۔ یہ اس لیے کہ (جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے) انسان کو تصورات (Ideas) کی تعبیر کے لیے (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے، نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لیے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اسی طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے)۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود بعض مقامات میں اسے باقی بھی رکھا ہے۔ صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کی مظہر ہیں۔ مثلاً (سورہ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے وہاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں کھڑا ہو جائے فَاِذَا سَجَدُوۡا (4/102) ''پھر جب وہ سجدہ کر چکیں'' تو وہ پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ''سجدہ'' سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے، اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں نبی اکرم ﷺ اور جماعت مومنین میں رائج تھی۔ قرآن کریم میں صلوٰۃ اور حج ہی وہ ''تقاریب''

ہیں جن میں محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (صلوٰۃ اور حج) اجتماعی عمل ہیں اور اجتماعی عمل کے لیے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ اجتماعی عمل میں اگر ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے حرکات وسکنات کرے تو اس سے جس قدر انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے اس پرخلوص جذبہ کا بے ساختہ مظہر نہیں اور محض شکل (Form) ہی شکل (Form) ہے، تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لیے قرآن کریم نے واضح طور پر کہہ دیا کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (2/177) ''نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اور کشاد کی راہ اس کی ہے جو خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے اور مال و دولت کو اس کی محبت کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مساکین، ابن السبیل اور محتاجوں اور محکوموں کو دیتا ہے۔۔۔'' یعنی صلوٰۃ درحقیقت انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کی محسوس مظہر ہے۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے تو خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، قرآن کریم کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ○ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ○ (107/4-7) ''ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور نماز ظاہرہ ارکان کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے ادا کرتے ہیں (اور سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ ادا ہوگیا۔ عملاً ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک تک پہنچنا چاہیے، (بند لگا کر) روک رکھتے ہیں۔'' اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سجدہ سے کیا مفہوم ہے۔

سورۃ کہف میں ہے کہ لوگوں نے ان نوجوانوں کے غار کے مقام پر مسجد بنادی (18/21)۔ یعنی وہ مجاہدین تھے۔ لیکن بعد میں لوگوں کی نگاہوں سے یہ تصور تو اوجھل ہوگیا اور (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) ان کی یادگار میں ایک خانقاہ یا مقبرہ تعمیر کر دیا جو سجدہ گاہ انام بن گیا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہودیوں کے ہیکل کو مسجد کہہ کر پکارا گیا ہے (17/7)۔ سورۃ التوبہ میں نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک کی اس مسجد کا بھی ذکر ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی (9/10) اور اس کا بھی جس کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ پیدا کرنا تھا اور جسے قرآن کریم نے کفر سے تعبیر کیا ہے اور خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں

کے لیے پناہ گاہ کہہ کر پکارا ہے(9/107)۔قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے(30/31)اور واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ مشرکین کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ''اللہ کی مسجدوں'' کو آباد کریں۔اس نے اعلان کر دیا کہ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (72/18)''مسجدیں صرف اللہ کے لیے ہیں،سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔''فرقہ بندی شرک اس لیے ہے کہ اس میں خالص خدا کی اطاعت نہیں ہوتی۔خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے امت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

کعبے کو جو مسجد الحرام (48/27) کہا گیا ہے تو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ہے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے۔وہ اُس اُمت کا مرکز محسوس ہے جس کی خصوصیت مُّسْلِمَةً لَّكَ (2/128) بتائی گئی ہے۔یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد مدینہ کو حکومت خداوندی کا مرکز قرار پانا تھا،اس لیے قرآن کریم میں (شب ہجرت کے تذکرہ کے سلسلہ میں) مدینہ کو مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) کہہ کر پکارا گیا ہے۔سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (17/1)''وہ ذات نقائص سے بہت دور ہے جو اپنے بندے کو ایک رات مسجد الحرام (مکہ) سے اس مسجد کی طرف لے گیا جو (مکہ سے) بہت دور تھی۔جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا تھا تاکہ ہم اسے اپنی آیات (نشانیاں) دکھائیں۔''اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے۔سورۃ طٰہٰ میں جہاں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ (20/22)''تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔'' یہ آیات،آویزش حضرت موسیٰؑ اور فرعون میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی تھی۔یہی وہ آیاتِ خداوندی تھیں جن کا مظہر،ہجرت کے بعد،مدینہ کو بننا تھا۔یعنی جماعت مومنین کا باطل کی قوتوں پر غلبہ اور کامرانی۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لیے مخصوص نہیں۔اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' اور عام دنیاوی امور میں فرق ہی نہیں کیا جاسکتا۔عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لیے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لیے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جاسکے۔

سورۃ اعراف میں ہے: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (7/31) اس آیت میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔عیسائیت (اور اسی قسم کے دیگر مذاہب) میں رہبانیت کو اطاعت و عبادت کا منتہیٰ قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترک دنیا،ترک لذت،ترک زیبائش و آرائش۔قرآن کریم نے اس غلط تصور کا بطلان کیا اور کہا کہ دنیاوی زیبائش و

آرائش، خدا کے راستے میں حائل نہیں ہوتی اس لیے اسے ترک کرنا اطاعت نہیں۔ ان چیزوں سے ضرور متمتع ہونا چاہیے۔ صرف ان حدود کا خیال رکھنا چاہیے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں۔ اس آیت کے اگلے حصے اور اس سے ملحقہ آیت نے اس مفہوم کی وضاحت کر دی ہے۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے: وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (7/31) ''تم کھاؤ پیو لیکن حد سے تجاوز نہ کرو۔ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' اس سے اگلی آیت میں ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7/32) ''ان سے کہو کہ اللہ کی زینت کی چیزوں کو جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور رزق طیب کو کس نے حرام قرار دیا ہے؟'' دو آیتیں پہلے ہے: قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ... (7/29) ''ان سے کہہ دو کہ اللہ نے تمہیں اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے اور تم اطاعت گزاری میں اپنی تمام توجہات کو توازن کے ساتھ (اس کی طرف) مرکوز رکھو اور اطاعت کو خالص اسی کے لیے مختص کرتے ہوئے اسے پکارو۔'' ان مقامات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں صحیح مقصود کیا ہے۔

سورہ الفتح میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ کے متعلق ہے: تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (48/29) ''تو انہیں رکوع کرتے ہوئے، سجدے کرتے ہوئے دیکھے گا۔'' یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لیے جائیں تو مطلب اجتماع صلوٰۃ کے ذریعے رکوع اور سجود ہوں گے۔ اور اگر مجازی معنی لیے جائیں تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سر تسلیم خم کیے ہوں گے۔ اس کے بعد ہے: سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48/29) اس کے عام معنی ہیں ''ان کی نشانیاں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات سے ظاہر ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی کامل اطاعت سے ان کے قلب میں جو ایک اطمینان و سکون کی کیفیت پید ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کا اثر، اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (55/41) مجرم اپنی علامات سے پہچانے جائیں گے۔ اس میں اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ اطاعت خداوندی سے قلبی سکون کی کیفیت مینائے رُخ سے چھلک کر باہر آ جاتی ہے۔

س ج ن

سِجِّيْنٌ۔ یہ لفظ سورۃ تطفیف میں آیا ہے۔ مَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ (83/8)۔ بعض نے اس کے معنی قید خانہ کیے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (83/9) کہہ کر خود ہی اس کی تفسیر کر دی ہے۔ یعنی نامۂ اعمال لکھی ہوئی چیز۔

س ج و

قرآن کریم میں ہے: وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی (93/2) رات کی تاریکی اور اس میں فضا کا سکوت، اور نمودِ صبح سے پہلے اس کی شدید ظلمت، اس حقیقت پر شاہد ہے کہ (نمودِ خداوندی کے) اس پروگرام کو کامیابی تک پہنچنے میں وقت لگے گا اور وہ اپنے مدارج طے کرتا ہوا مقصود تک پہنچے گا۔ لہٰذا اس وقت جو تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود معاشرہ کی تاریکیاں چھٹ نہیں رہیں تو اس سے اس نتیجہ پر نہ پہنچ جاؤ کہ قوانین خداوندی نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی (93/3) ''نہ تو تیرے نشوونما دینے والے نے تجھے چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی (یونہی، خوامخواہ) مشقت میں ڈال دیا ہے۔'' وَالضُّحٰی کے ساتھ آنے سے یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ دن اور رات کے تغیرات اس پر شاہد ہیں کہ ان مخالفین کی یہ حالت ہمیشہ ایسی ہی نہیں رہے گی، اس میں انقلاب آئے گا۔

س ح ت

اَلسُّحۡتُ۔ ہر حرام چیز جس کا تذکرہ معیوب ہو، حرام اور گندہ پیشہ جو باعث عار ہو، ہر ناپسندیدہ اور حرام کی کمائی۔ اس لیے کہ وہ برکت وسعادت کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے۔ یہود کے متعلق ہے: اَكّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ (5/42) ان کا ذریعہ معاش بہت بُرا ہے۔ عام یہودی سود خوار اور بددیانت تھے اور ان کے مذہبی راہنما دین فروشی کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر قابلِ نفرت ذریعۂ معاش اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور ایک یہودیوں پر ہی کیا موقوف ہے۔ سرمایہ پرستی اور پیشوائیت جہاں بھی ہو وہاں یہی حالت ہوتی ہے۔

س ح ر

مخالفین رسول اللہ ﷺ کو رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا (17/47) کہتے تھے۔ یعنی جسے دھوکا لگ گیا ہو، فریب خوردہ انسان۔ یا جس پر کسی نے جادو کر دیا ہو، یا جس کی عقل ماری گئی ہو۔ نیز اس کے معنی ساحر کے بھی کیے گئے ہیں جیسے (17/101) میں۔ سورۃ مومنون میں ہے: قُلۡ فَاَنّٰی تُسۡحَرُوۡنَ (23/89) ان سے پوچھو کہ تمہیں کہاں (یا کس وجہ سے) دھوکا لگتا ہے؟ وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تمہارا رخ حقیقت کی طرف سے مڑ کر دوسری طرف پھر جاتا ہے؟ دھوکے کے علاوہ اس کے معنی جھوٹ کے بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّكُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ (11/7) اگر تو ان سے کہے کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو جو لوگ اس کے منکر ہیں وہ کہہ دیں گے کہ یہ بالکل جھوٹی بات ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کی عمرانی زندگی میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جسے عہد ساحر (Magic Age) کہا جاتا ہے۔ مغربی محققین نے اس دور سے متعلق بڑی کثیر معلومات فراہم کی ہیں۔ سحر (یا Magic) کے معنی یہ تھے کہ انسان مختلف طریقوں (جھاڑ، پھونک، تعویذ گنڈا، اوراد و وظائف) سے کائنات کی مؤثر قوتوں کو مجبور کرے کہ وہ اس کی منشاء کے مطابق کام کریں۔ اسی کو جادو کہتے ہیں۔ یعنی انسان کا پہلا دور پرستش کا تھا جس میں وہ کائناتی قوتوں سے عاجزی سے گڑگڑا کر مدد مانگتا تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ دوسرا دور آیا جس میں اس نے ان قوتوں کو مجبور کرنے کا طریق اختیار کیا۔ ان ساحرین کا (پروہتوں کی طرح) معاشرہ میں بہت اونچا مقام تھا۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو انسان کا ''دور پرستش'' سے ''عہد ساحر'' کی طرف آنا، فکر معقول (Rational Thought) کی طرف آنے کی پہلی اور دھندلی سی کوشش تھی۔ ''فکر معقول'' سے مراد یہ ہے کہ ہر حادثہ کا سبب معلوم کیا جائے۔ قانون علّت ومعلول (Cause and Effect) کے مطابق حوادث و واقعات کی وجہ معلوم کی جائے۔ ''دور پرستش'' میں انسان سمجھتا تھا کہ (مثلاً) بخار اس لیے آتا ہے کہ کوئی دیوتا ناراض ہوجاتا ہے۔ اسے رفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس دیوتا کی بھگتی سے اسے خوش کردیا جائے۔ اس میں علت اور معلول کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ اس سے ''عہد سحر'' کی طرف آیا۔ یعنی اس نے یہ سوچا کہ (مثلاً) اگر فلاں منتر کو اتنی بار، اس طریق سے دہرالیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فلاں ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس کے ذہن میں عمل اور اس کے نتیجہ میں خاص ربط ہونے کی ذراسی کرن نمودار ہوئی۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین نے یہ بتایا کہ کائنات میں سب کچھ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ ہر کام کا ایک متعین نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے ایک خاص قانون کے مطابق۔ اگر انسان ان قوانین کا علم حاصل کرلے تو جب جی چاہے اس قسم کا نتیجہ پیدا کرسکتا ہے۔ یہ وہ تصور ہے جس پر سائنس کی ساری عمارت استوار ہے اور جس محور کے گرد انسان کی زندگی اور اس کا مستقبل گردش کرتا ہے۔ سحر اس لیے باطل ہے کہ اس میں نتیجہ کسی خاص قانون کے مطابق مرتب ہونے کا تصور نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص طریق پر کچھ پڑھنے اور کرنے کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ انسان کو فکر معقول قرآن کریم نے دیا۔

قرآن کریم میں داستانِ حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں ساحرین قومِ فرعون اور ان کی سحر کاریوں کا ذکر تفصیل سے آتا ہے۔ انہیں سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ ہوا تھا۔ اگر ان مقامات میں سِحْرٌ سے مراد جادو ہے تو ان تمام واقعات (رسیوں کا چلنا وغیرہ) کو انہی معانی میں سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر اس کے معنی ''باطل پرستی'' ہے تو پھر ان آیات کے مجازی معانی لیے جائیں گے۔

سِحْرٌ (جادو) کا مفہوم لینے سے ایک اہم چیز سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان جادوگروں نے سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (7/116) لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا۔ یعنی وہ رسیاں سچ مچ چلنے نہیں لگ گئی تھیں۔ انہوں نے (ہاتھوں کے کرتب یا نفسیاتی قوت سے) ایسا کیا کہ لوگوں کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں۔ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا

تَسْعٰی (20/66) ''موسیٰؑ کو ایسا خیال ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔'' یعنی سحر سے صرف دیکھنے والے کی قوت متخیّلہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ وہ چیزیں فی الواقعہ ایسی نہیں بن جاتیں۔ ساحر دیکھنے والی کی قوتِ متخیّلہ کو متاثر کر دیتا ہے اور بس۔ ہمارے زمانے میں نفسیات (Psychology) کی تحقیقات نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ یہ سب انسان کی قوتِ متخیّلہ کی کرشمہ سازیاں ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے آج سے کتنا عرصہ پہلے اس حقیقت کو واشگاف کیا تھا۔

یہودیوں کا سارا مذہب سحر و ساحری کا مرقع اور ان کے معبد اِس قسم کی کرشمہ سازیوں کی آماجگاہیں تھے۔ وہ ان باتوں کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ''اسمِ اعظم اور نقوشِ سلیمانی'' ان کی خاص چیزیں تھیں۔ قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی اور واضح الفاظ میں بتایا کہ خدا کے نبی ان توہم پرستیوں اور فریب سازیوں سے بہت دور ہوتے ہیں (2/102)۔

قرآن کریم نے تو یہ کہا، لیکن قرآن کریم کی حامل قوم (مسلمانوں) نے گنڈے، تعویذ، ورد، وظائف، غرضیکہ ان تمام توہم پرستیوں کو ایک ایک کر کے اپنے ہاں جمع کر لیا اور اسے ''روحانیت'' قرار دے کر باطل کو حق کا لباس پہنا دیا۔ یاللعجب!

کفار نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہتے تھے کہ وہ رجل مسحور ہے (17/47)۔ یعنی اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے (25/9)۔ نبی کی ذات اس قدر نشو و نما یافتہ اور مستحکم ہوتی ہے اور اس کی قوت ایمانی اس قدر مضبوط کہ اس کے مقابلہ میں ساحرین کی نفسیاتی قوت ایک ثانیہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی، چہ جائیکہ وہ نبی کو متاثر کر دے اور وہ ان کے فریب سحر میں آ جائے۔ یہ ناممکن ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے قصے میں اتنا ہی کہا ہے کہ انہوں نے خیال کیا کہ گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں۔ لیکن یہ چیز اور ہے اور کسی کا جادو کے اثر سے مسحو ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جانا اور بات۔ نبی پر اس قسم کا اثر کبھی نہیں ہو سکتا۔ (قصۂ حضرت موسیٰؑ میں اگر سحر کے معنی باطل پرستی کے لیے جائیں تو پھر بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے)۔

س خ ر

قرآن کریم میں ہے: لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (43/32)۔ سورۃ زخرف کی یہ آیت ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مختلف افراد میں کسب و ہنر کی استعداد میں جو فرق ہے وہ اس لیے ہے کہ معاشرہ کے مختلف کام مختلف افراد کر سکیں۔ اگر تمام افراد کی استعداد ایک جیسی ہو تو کوئی شخص کسی دوسرے کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق کام ہی نہ کرے۔ یا تمام افراد ایک ہی قسم کا کام کرنے لگ جائیں۔ اس طرح معاشرہ کا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن اختلاف استعداد کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ استعداد والے لوگوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کم استعداد والے

لوگوں کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنا کر انہیں اپنی اغراض کے حصول کا آلہ کار بنالیں۔ اختلافِ استعداد صرف تقسیم کار کے لیے ہے ورنہ قرآن کریم کی رو سے ہر ابن آدم واجب التکریم ہے۔

قرآن کریم میں ہے: سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45/13) اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر چیز کو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق چلنے کے لیے پیدا کر رکھا ہے اور وہ اسی کے مطابق چل رہی ہیں۔ یہ اس لیے ہے تا کہ انسان اس قانون کا علم حاصل کر کے (جسے قانونِ فطرت کہتے ہیں) ان اشیائے کائنات سے اپنے فائدے کے کام لے سکے۔ لہٰذا جو قوم، قوانین فطرت کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر کے اشیائے فطرت کو اپنے کام میں لائے گی وہی ان کی تخلیق و تسخیر کے منشا کو پورا کرے گی۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس اعلان سے انسانی دنیا میں کس قدر انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ انسان کائنات کی قوتوں سے ڈرتا تھا، انہیں اپنا معبود بناتا تھا، ان کے حضور گڑگڑاتا تھا، اپنے آپ کو ان کے سب کے سامنے کمزور و ناتواں سمجھتا تھا۔ قرآن کریم نے بتایا کہ یہ تصور یکسر باطل ہے۔ یہ قوتیں اس کی معبود نہیں، اس کی خادم ہیں۔ ''ملائکہ'' آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس سے انسان کا مقام کائنات کی ہر چیز سے بلند ہو گیا اور اس کے سامنے اشیائے فطرت کی تسخیر کے دروازے کھل گئے۔ دنیا میں جو قوم بھی قوانین فطرت کا علم حاصل کرے گی یہ قوتیں اس کے تابع فرمان ہو جائیں گی۔ اس میں مومن اور کافر کا بھی کچھ فرق نہیں۔ البتہ مومن ان قوتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق انسانیت کی نشوونما کے لیے صرف کرے گا اور کافر انہیں اپنی مفاد پرستیوں کے کام میں لائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ

① مقام آدم (آدمی کا مقام) یہ ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے اپنی مرضی کے مطابق ان کا استعمال کرے۔

② مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے منشائے خداوندی کے مطابق ان کا استعمال کرے۔

③ جو ان قوتوں کو مسخر ہی نہ کرے، اسے مقام مومن تو ایک طرف مقام آدم بھی نصیب نہیں۔

آج کا مسلمان خود سمجھ لے کہ قرآن کریم کی رو سے اس کا مقام کیا ہے؟

س خ ط

سَخَطٌ اس شدید غصے کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو۔ جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنی غصے یا ناراضگی کے نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان انسانی جذبات سے بہت بلند ہے۔ اس کے معنی سورۃ محمد کی اس آیت سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (47/28) ان کی ہلاکت اور تباہی اس لیے ہے کہ یہ لوگ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو احکامِ خداوندی کے مطابق نہیں ہیں۔ جو

باتیں ان احکام کے مطابق ہیں یہ انہیں ناپسند کرتے ہیں۔ (كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ) یعنی كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ (47/26)۔ وحی خداوندی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بلانتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی وہ خوشگوار نتائج مرتب نہیں کرتے جن کی یہ توقع لگائے رہتے ہیں۔ لہٰذا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ کے معنی ہوئے وہ امور جو قوانین خداوندی کے مطابق نہیں اور جن کا نتیجہ حبطِ اعمال ہے۔ اس میں غصے اور ناراضگی کا کوئی سوال نہیں۔

س د د

قرآن کریم میں قَوْلًا سَدِيْدًا (4/9، 33/70) آیا ہے، نہایت متوازن، سیدھی، صاف بات۔ جس بات سے کوئی خلا باقی نہ رہے۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کبھی مبہم، پُر پیچ وخم، ذو معنی، ٹیڑھی میڑھی بات نہ کرو۔ ہمیشہ سیدھی، صاف، واضح، محکم، متوازن اور ٹھیک ٹھیک معنی بتا دینے والی بات کرو۔ ایسی بات جس کا تعلق براہِ راست صحیح مقصد سے ہو۔ لا یعنی اور بے فائدہ نہ ہو۔ ڈپلومیسی کی باتیں قرآن کریم کی سیدھی اور واضح تعلیم کے خلاف ہیں۔

س د ر

سورۃ النجم میں مقام نبوت کی کیفیات کو مثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ وحی کی کیفیت صرف مثالاً اور تشبیہاً ہی بیان کی جاسکتی ہیں، کیونکہ کوئی غیر نبی، وحی کی کیفیت اور ماہیت کو جان اور پہچان نہیں سکتا۔ وہ صرف اس کے پیغام کو سمجھ سکتا ہے)۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں انسانی عقل وفکر کے لیے سوائے انتہائی حیرت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ عقل انسانی اُس مقام کی ماہیت کو قطعاً نہیں سمجھ سکتی۔ اسے وہاں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم نے سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (53/14) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی وہ مقام جہاں تحیر اپنی انتہا تک پہنچ جائے۔ اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (53/16) جب سدرہ پر چھار ہا تھا جو کچھ چھار ہا تھا۔ یعنی یہ تمہارے (غیر از نبی انسانوں کے) لیے ممکن نہیں کہ تم جان سکو کہ وہ کیا کیفیت تھی۔ تمہاری نگاہ کے لیے وہ تحیر کی فراوانی تھی جس نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (53/17) نبی کی آنکھ کسی قسم کا دھوکا نہیں کھاتی۔ وہ حقائق کو بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر دیکھتی ہے۔ لیکن صرف انہی حقائق کو جو اسے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ ان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ بڑھ سکتی ہی نہیں، کیونکہ اسے یہ چیزیں اس کے ذاتی کسب و ہنر سے نہیں ملتیں کہ وہ جس قدر زیادہ محنت کرتا جائے آگے بڑھتا جائے۔ اس پر حقائق منکشف کیے جاتے ہیں، جس قدر منکشف کیے جانے مقصود ہوں۔ انسانوں کے مقابلہ میں تو علم نبوت (وحی) لا انتہا ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کی ایک حد ہوتی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔

لہٰذا سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی وحی کا سرچشمہ ہے جہاں عقل انسانی کے لیے تحیر ہی تحیر ہوتا ہے لیکن چشم نبوت اسے صاف طور پر دیکھتی ہے۔

س د ی

قرآن کریم میں ہے: اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (75/36)۔ اس مادے کے بنیادی معنوں پر غور کیجئے۔ کپڑا بننے کے لیے تانے اور بانے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تنہا تانا سوگز لمبا بھی کیوں نہ ہو وہ بیکار رہتا ہے۔ جب تک اس میں بانا نہ بُنا جائے وہ کپڑا نہیں بن سکتا۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے! انسان نے جو نظام بھی بنایا وہ تنہا تانا تھا یا تنہا بانا۔ وہ کبھی ''روحانیت'' حاصل کرنے کے لیے خانقاہوں، تجردگاہوں اور سمادھیوں کی طرف چلا گیا اور کبھی خالص دنیادار بن کر حکومت وسلطنت کی طرف آ گیا۔ اس نے روح اور مادہ، آتما اور پراکرتی، دین اور دنیا، مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہوسکیں۔ یا وہ تانا رہیں اور یا بانا، وہ ثَوْبٌ (کپڑا) کبھی نہ بن سکیں۔ قرآن کریم نے آکر کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان کی زندگی تانا ہی تانا ہے۔ اس میں بانے کی بھی ضرورت ہے۔ تانے اور بانے کے امتزاج سے ثَوْبٌ بنے گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سمجھے کہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ وہ یونہی شتر بے مہار نہیں کہ اس پر کسی کی گرفت ہی نہ ہو۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی کڑی گرفت ہے۔ وہ اس کے احاطے سے باہر نہیں جا سکتا۔

لہٰذا صحیح زندگی دین اور دنیا کے تانے اور بانے سے خدا کے مقرر کردہ ڈیزائن کے مطابق کپڑا بننے میں ہے۔ یہی ثواب کا کام ہے۔ تنہا عقل انسانی کبھی کامیابی تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہ صرف تانا ہی تانا رہتی ہے۔ جب اس سے وحیِ الٰہی کی روشنی میں کام لیا جائے تو پھر اس سے صحیح تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

خدا نے انسان کو اس طرح شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا۔ اس کی راہ نمائی کے لیے اپنی طرف سے وحی کا ضابطہ بھیجا ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ اس ضابطہ کے مطابق چلے۔ اگر یہ اس کے مطابق نہیں چلے گا تو اس کی کوششیں بے کار چلی جائیں گی۔ کائنات میں انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوق کی یہ حالت ہے کہ ان کے لیے جو قوانین خدا نے بنائے ہیں، وہ ان پر چلنے کے لیے مجبور ہیں۔ اسی کو ان اشیاء کی فطرت (یا جبلت) کہتے ہیں۔ خدا نے انسان کے لیے بھی قوانین بنائے ہیں لیکن اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو ان کے خلاف چلا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان قوانین کے خلاف جا کر اپنے اعمال کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرے۔ وہ ان قوانین کی پرواہ کرے یا نہ کرے، اس کے اعمال کے نتائج بہرحال ان قوانین کے مطابق مرتب ہوں گے۔ وہ اس باب میں آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔

س ر ب

سراب وہ چمکتی ہوئی ریت ہے جو صحرا میں بہتے پانی کی طرح دکھائی دیتی ہے اور جوں جوں پیاسا اس کی طرف بڑھتا ہے وہ آگے آگے سرکتی چلی جاتی ہے۔ پیاسا چلتے چلتے تھک جاتا ہے لیکن اسے پانی کا گھونٹ تک نہیں ملتا۔ قرآن کریم نے غلط روشِ زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو سراب سے تشبیہ دی ہے (24/39)۔ وہ دور سے بہتے ہوئے پانی کی طرح دکھائی دیتے ہیں (بڑے دل فریب اور خوشنما نظر آتے ہیں) لیکن جب پیاسا ان کے پاس آتا ہے تو وہ اس کی تسکین کا سامان بننے کی بجائے الٹا ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔

س ر ع

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آتا ہے: اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (2/202) ''اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔'' خدا کے قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل اسی وقت اپنا اثر پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن اس کے اس اثر اور نتیجہ کا ظہور ایک خاص وقت پر جا کر ہوتا ہے۔ جیسے بیج میں نشو ونما تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے لیکن وہ درخت ایک وقت کے بعد جا کر بنتا ہے اور اس میں پھل بھی ایک وقت کے بعد جا کر لگتا ہے۔ عمل کا فوراً اثر مرتب کرنے لگنا، قانونِ مکافات کے سَرِيْعُ الْحِسَابِ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس سے انسان کی ذات اُسی وقت متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں قطعاً دیر نہیں لگتی۔

س ط ر

قرآن کریم میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ تاریخی شواہد پر غور کرو اور سوچو کہ جس قسم کے کام تم کرتے ہو، جن قوموں نے اس قسم کے کام کیے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟ تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (6/25) یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ ان سے کہا یہ جا رہا تھا کہ یہ خدا کا قانون ہے جو تم پر بھی اسی طرح صادق آئے گا جس طرح اقوام سابقہ پر صادق آیا تھا۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ قرآن کریم نے قانون مکافات کے عمل کے ضمن میں جو کچھ اپنے اولین مخاطبین کے متعلق کہا ہے، جب ان سے اُس کا ذکر کرو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بات یہودیوں کے متعلق ہے، یہ عیسائیوں کے متعلق ہے، یہ مشرکین مکہ کے متعلق ہے، یہ منافقین مدینہ کے متعلق۔ یعنی ان کے نزدیک سارے کا سارا قرآن انہی لوگوں سے متعلق تھا جو اس وقت اس کے مخاطب تھے۔ اب ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم سے اگر اس کا کوئی حصہ متعلق ہے تو صرف وہ جس میں جنت کا وعدہ کیا گیا ہے (یعنی وہ جنت جو ان کے خیال میں محض مسلمان کہلانے سے مل جائے گی)۔

س ع د

ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز سعد ہے اور فلاں نحس، فلاں دن سعد ہے اور فلاں نحس۔ یہ محض توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لیے قرآن کریم آیا تھا۔ کوئی چیز یا کوئی دن نہ سعد ہے نہ نحس۔ جس کام کا نتیجہ (قانون خداوندی کے مطابق) اچھا ہے، وہ عمل سعد ہے اور جس دن اس کام کا اچھا نتیجہ سامنے آئے وہ دن مسعود ہے۔ اسی طرح جس کام کا نتیجہ (قانونِ مکافات کی رو سے) مضر ہو وہ عمل منحوس ہے، اور جس دن وہ نتیجہ سامنے آئے وہ دن نحس۔ دنوں (ہفتہ، اتوار، سوموار وغیرہ) کی اپنی حقیقت ہی کچھ نہیں۔ یہ تو ہم نے اپنی سہولت کی خاطر، وقت (Time) کے گز پر گرہیں لگا رکھی ہیں تاکہ حساب میں آسانی رہے۔ نہ ہی ستاروں میں کوئی سعد یا نحس ہے۔ ستارے قوانین خداوندی کے مطابق گردش کرتے ہیں۔ ان کی گردش کا انسان کی ''قسمت'' سے کیا تعلق؟ اقبال کے الفاظ میں ؎

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

س ع ر

سورۃ نساء میں ہے: اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ‌ؕ وَسَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا (4/10) ''جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔'' موت کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا، یہ وہاں کی بات ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ شدتِ حرص سے ان کی نیت ہی نہیں بھرتی اور وہ مفت کے مال کے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتے ہیں۔

س ع ی

قرآن کریم میں ایک آیت ہے: وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53/39) ''انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے وہ سعی و کاوش کرے۔'' یہ آیت ایک عظیم اصول کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ قرآنی معاشیات (Quranic Economics) کی دنیا ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان کو صرف محنت (Labour) کا معاوضہ لینا چاہیے۔ سرمایہ (Capital) کا معاوضہ یا یونہی بغیر محنت کچھ لے لینا جائز نہیں۔ اس اصول پر قرآنی معاشیات کا جو نظام تعمیر ہوتا ہے اس کا اندازہ اہل بصیرت لگا سکتے ہیں۔

معاشرت اور تمدن کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ معاشرہ میں فرد کا مقام اس کی محنت کے اعتبار سے متعین کرنا چاہیے، نہ کہ خاندانی یا اسی قسم کی دیگر اضافی نسبتوں سے۔

انسان سفید لوح (Clean Slate) لے کر پیدا ہوتا ہے اور جس قدر وہ سعی وعمل کرے اسی قدر وہ زندگی کی خوشگواریوں کا اہل بن جاتا ہے۔ نیز اس اصول نے معیشت کی دنیا میں یہ کہہ دیا کہ ہر انسانی بچے کو سعی وعمل کا یکساں میدان ملنا چاہیے۔ اس باب میں نہ کسی کو رعایات ملنی چاہئے اور نہ ہی کسی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنی چاہئیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ اصول کس قدر عظیم انقلاب کا منشور ہے؟

س غ ب

قرآن کریم نے کہا ہے: اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ (90/14) ''ایسے وقت میں انسانوں کی خوراک کا انتظام کرنا جب بھوک اور مشقت عام ہورہی ہو۔'' قرآن کریم نے اس پروگرام (نظام) کو پہاڑی پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے (90/11-14)۔ فی الحقیقت یہ چیز کہ انسان محنت اور مشقت سے کمائے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے فقط اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی ماندہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے عام کردے، بالخصوص ایسے زمانے میں جب چاروں طرف بھوک ہی بھوک نظر آ رہی ہو، مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ہے۔ اسی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ اسی کو نظامِ ربوبیت کا قیام کہتے ہیں۔ سورۃ البلد کی یہ آیات (90/11-16) نظام ربوبیت کے سلسلہ میں عظیم حقائق کی مظہر ہیں۔ ان کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

س ف ح

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کے سلسلہ میں پہلے ان عورتوں کی فہرست دی ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ اس تعلق کی شکل مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (4/24) ہو۔ مُسٰفِحِيْنَ کے معنی ہوں گے مادۂ منویہ کو بہا دینے کے لیے۔ اس سے قرآن کریم ایک عجیب حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ پہلے آپ یہ دیکھئے کہ نکاح اور زنا کے جنسی تعلق میں فرق کیا ہے۔ شہوانی لذت تو دونوں میں ہوتی ہے لیکن اول الذکر صورت میں یہ لذت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مقصود افزائش نسل ہوتا ہے۔ لیکن زنا میں لذت مقصود بالذات ہوتی ہے اور زنا کار (مرد اور عورت دونوں) کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ استقرار حمل نہ ہو۔ یہ معنی ہیں ''مادۂ منویہ کو بہا دینے کی خاطر۔'' لہٰذا جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں انسان نکاح کی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کرے، انہیں (Avoid) کرے۔ اور مقصود محض جذبہ شہوانی کی تسکین ہو، قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں قرار پا سکتی۔

اسی سورۃ کی اگلی آیت میں قرآن کریم نے مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (4/25) کہا ہے۔ مطلب اس سے چھپی آشنائی ہے۔ (اگرچہ یہ لفظ اس زمانے کی لونڈیوں کے سلسلہ میں آیا ہے لیکن اطلاق اس کا عام ہے)۔

س ف ہ

حرکت واضطراب، نیز ناپختگی عقل کی بنا پر قرآن کریم نے ان لوگوں کو سُفَھَاءُ کہا ہے جن کے دل نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جو ہمیشہ منافقانہ انداز سے دورُخی چالیں چلتے ہیں (2/10-14)۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ ان جیسا بے عقل ہی کوئی نہیں کیونکہ یہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج کا شعور واحساس نہیں رکھتے (2/12)۔

قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ، انسانی ذات پر یقین اور اس کے بلند ترین قدر ہونے پر ایمان ہے۔ اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے یا اسے سنجیدگی (Seriously) سے نہ لیا جائے تو پھر خدا پر ایمان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

س ک ر

اگر انسان صلوٰۃ کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھتا ہو تو اس صلوٰۃ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ صلوٰۃ کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ تم جو کچھ زبان سے کہہ رہے ہو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہو۔ لہٰذا قرآن کریم کو بلا سمجھے پڑھنا (خواہ وہ صلوٰۃ میں ہو یا ویسے ہی) کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ قرآن کریم پڑھا اس لیے جاتا ہے کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لیے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ بلا مطلب سمجھے، بعض الفاظ کو دہرانے سے یہ سمجھنا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے، عہد سحر (Magic Age) کی توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لیے قرآن کریم آیا تھا۔

س ک ن

مَسْكَنَةٌ کو خدا کا غضب قرار دیا گیا ہے (2/61)۔ اس لیے کہ یہ اس جمود و تعطّل کا نام ہے جس سے قوم، زندگی اور حرکت سے محروم ہو جاتی ہے۔ سورۃ توبہ میں فقراء اور مساکین کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (9/60)۔ مسکین وہ ہے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ یا کسی حادثہ کی وجہ سے وہ زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کے قابل نہ رہے۔ قرآنی نظام میں کوئی مسکین اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہ سکتا۔ وہ ان چیزوں کو (بطور خیرات نہیں بلکہ) اپنے حق کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ سورۃ البلد میں يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ (90/15-16) آیا ہے۔ یعنی وہ جو لوگوں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پائے۔ اور جو ذرا کمزور ہو جانے پر معاشرہ کے ہاتھوں مٹی میں مل جائے۔ غلط معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ جو ذرا نیچے گرا، معاشرہ کا ریلا اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ قرآنی معاشرہ گرتوں کو اٹھانے کے لیے قائم ہوتا ہے۔

مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

س ل خ

سورۃ اعراف میں ایک شخص کی حالت کو مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اٰتَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانۡسَلَخَ مِنۡہَا (7/175)۔ ہم نے اسے اپنے قوانین دیئے اور وہ انہیں الگ چھوڑ کر اس طرح صاف نکل گیا جیسے سانپ کینچلی میں سے نکل جاتا ہے۔ یہ درحقیقت مسلمانوں ہی کی مثال ہے جنہیں اللہ نے قرآن کریم جیسا ضابطۂ حیات دیا لیکن انہوں نے اسے اس طرح چھوڑ دیا کہ اس کا کوئی نشان تک بھی ان کی مِلّی زندگی میں باقی نہ رہا۔ یہ اس میں سے صاف نکل گئے۔ انہوں نے اسے کینچلی کی طرح اتار کر پھینک دیا۔ لیکن للہ الحمد کہ وہ (قرآن) اپنی اسی حالت میں صحیح وسلامت موجود ہے۔ اس لیے اُسے جب جی چاہے پھر سے اسی طرح اوڑھا جا سکتا ہے۔

س ل ط

سورۃ رحمٰن میں ایک آیت ہے جو ایک عظیم الشان حقیقت پر دلالت کرتی ہے۔ یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا - اے گروہ جن وانس! اگر تم اس کی طاقت رکھتے ہو کہ ''اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ'' سے آگے نکل جاؤ تو جاؤ، ان سے آگے نکل جاؤ۔ (جن وانس کے معنی ہیں وحشی اور مہذب آبادیاں)۔ یہاں انسان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں یہ طاقت ہے کہ اس مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکو تو جاؤ، اس سے آگے نکل جاؤ۔ اس سے آگے ہے: لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ (55/33) تم سُلْطَانٌ کے بغیر ان سے آگے نہیں نکل سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکتا ہے بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہو جائے جسے سُلْطَانٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سُلْطَانٌ اس قوت کا نام جو قوانین خداوندی کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کہا گیا ہے: وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا (17/80) ''اور مجھے اپنے ہاں سے مدد دینے والی قوت عطا فرمادے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ قوانین خداوندی کے اتباع سے جہاں اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں وہاں اس سے انسان کی ذات میں ایسی قوت اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے یہ مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل کر زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ قوت کسی اور طریق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ صرف قرآن کریم کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خانقاہیت والی ''روحانی ترقی'' نہیں سمجھ لینی چاہیے جو انسان کو ارض وسما سے آگے لے جانا تو ایک طرف، اسے خود اس دنیا میں سربزیری [1] اور زیردستی

1۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

غریبی میں ہوں محسود امیری　　کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اُس فقر و درویشی سے جس نے　　مسلماں کو سکھا دی سربزیری

سکھاتی ہے۔ اس سُلْطَانٌ سے وہ قوت اور غلبہ مقصود ہے جو اس دنیا میں تمام طاغوتی قوتوں کا سر کچل دیتا ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون عملاً غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات میں اس قسم کا استحکام پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اسی کا نام اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے آگے نکل جانا ہے۔ طبعی قوتوں (Physical Forces) سے انسان خواہ چاند تک بھی کیوں نہ جا پہنچے یا اس سے بھی آگے کیوں نہ نکل جائے وہ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے اندر ہی رہے گا۔ ان حدود سے باہر، انسانی ذات ہی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس میں وہ سُلْطَانٌ پیدا ہو جائے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

س ل ل

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہے کہ اسے سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (23/14) سے پیدا کیا۔ یعنی وہ شے جو مٹی (جمادات۔ Inorganic Matter) سے بطور خلاصہ نکالی گئی ہو۔ اگر انسانی جسم کا تجزیہ کیا جائے تو وہ انہیں جامد عناصر (مثل لوہا، چونا، فاسفورس وغیرہ) کا مرکب نظر آئے گا۔

س ل م

سَلْمٌ: چونکہ یہی وہ مادہ ہے جس سے اِسْلَامٌ کا لفظ آیا ہے اس لیے اس کے بنیادی معانی کو غور سے سمجھ لینا چاہیے کیونکہ انہی معانی سے اِسْلَامٌ کے مختلف گوشے واضح ہو جائیں گے۔

① سَلِمَ کے بنیادی معنی ہی وہ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک اور صاف ہو گیا۔ اس کی ہر ایک کمی پوری ہو گئی۔ لہٰذا سَلِمَ کے بنیادی معنی ہیں اس طرح مکمل ہو جانا کہ پھر کوئی نقص اور کمی باقی نہ رہے۔ یعنی انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما اور تکمیل۔

② اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی ہیں، ہر قسم کے آفات، خطرات اور حوادث سے محفوظ رہنا۔ قرآن کریم میں خدا کا نام اَلسَّلَامُ (59/23) بھی آیا ہے۔ جس کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے "تمام عیوب و نقائص سے پاک"۔ سَلَامٌ اسے کہتے ہیں جس سے دوسری چیزیں سلامتی حاصل کریں اور سَالِمٌ وہ ہوتا ہے جو دوسرے سے سلامتی حاصل کرے۔ یعنی وہ جس پر کوئی آفت آ سکتی ہو اور وہ اس کا متوقع بھی ہو لیکن اس سے محفوظ رہنا چاہے۔ لہٰذا خدا کا نام سَلَامٌ اس لیے ہے کہ اس نے تمام مخلوق کو اختلال و انتشار سے محفوظ رکھا ہے اور اس کا نظامِ حیات حفاظت و صیانت سے چل رہا ہے۔ لہٰذا سَلَامٌ کے معنی ہیں آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنا۔

③ وہ ذرائع جن سے کوئی شخص نہایت اعتماد اور حفاظت سے بلندیوں تک پہنچ جائے۔

④ اَلسِلْمُ کے معنی ہیں صلح اور صفائی کے ساتھ رہنے والا۔ خود بھی امن وسلامتی سے رہنا اور دنیا میں بھی امن و سلامتی قائم رکھنا۔

⑤ اَلسِلْمُ وَالسَّلَامُ کے معنی ہیں اطاعت، انقیاد، سپردگی، جھک جانا۔ لہٰذا اس مادہ کے پانچویں بنیادی معنی ہوئے قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرنا۔

⑥ قَالُوْا سَلٰمًا کے معنی ہیں وہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں اور کوئی لغو بات نہیں کرتے۔ لہٰذا اس مادہ کے چھٹے معنی ہوئے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا اور لغویت اور بیہودگیوں سے بچنا۔

⑦ اِسْتَلَمَ الزَّرْعُ کے معنی ہیں کھیتی کی بالیں نکل آئیں۔ لہٰذا اس کے معنی ہیں کوشش کا نتیجہ خیز ہونا۔

⑧ اس مادہ کے آٹھویں معنی ہوئے حسن وخوشنمائی۔

ان معانی سے ظاہر ہے اَلْاِسْلَامُ اس نظامِ حیات کا نام ہے جس سے ① انسان کی تمام کمیاں پوری ہو جائیں اور اس کی صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پالیں۔ ② جس میں وہ زندگی کی تمام تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رہے اور ③ اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بلندیوں کی طرف بڑھتا چلا جائے۔ ④ وہ خود اپنی ذات میں بھی امن وسلامتی اور صلح وآشتی سے رہے اور ساری دنیا میں امن وسلامتی قائم کرنے کا موجب ہو۔ وہ سفر زندگی میں دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ پوری ہم آہنگی سے چلے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرے جس سے کوئی دوسرا مشتعل ہو اور اس طرح معاشرہ کا نظام خراب کر دے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ⑤ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے اور ان کے سامنے اپنا سر ہی نہیں بلکہ دل بھی جھکا دے۔ اور یہ کچھ ⑥ پورے پورے اعتدال اور توازن سے کرے۔ افراط وتفریط سے کام نہ لے۔ ⑦ اس طرح اس کی کوششیں ثمر بار ہو جائیں گی اور اس کا کوئی عمل رائیگاں نہیں جائے گا اور ⑧ اس کی اپنی ذات میں بھی حسن (توازن) پیدا ہو جائے گا اور پورے معاشرے میں بھی۔

اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مسلم کبھی مجرم نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے قرآن کریم میں ہے کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (68/35) ''کیا ہم مسلمین کو مجرمین جیسا بنا دیں گے؟'' لہٰذا مسلم وہی ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔

الاسلام، وہ ضابطہ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی ضابطہ حیات خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ سورۃ آل عمران میں ہے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ کیا یہ لوگ اللہ کے (متعین فرمودہ) ضابطہ حیات کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالانکہ تمام اشیائے کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (3/82) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قانون کے

سامنے طوعاً وکرہاً سربسجود ہیں اور وہ ہر ہر قدم پر اس قانون کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ (3/84) جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کرے گا اس سے وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ وَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (3/84) اور اس کا جی چاہے تو تجربہ کر کے دیکھ لے کہ وہ آخر کار ضرور نقصان اٹھائے گا۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو انبیائے سابقہ کو ملتا رہا اور جو آخرالامر قرآن کریم میں آ کر مکمل ہوا۔ اسی کو خدا نے تمام نوع انسان کے لیے منتخب کیا ہے (5/3)۔ لہٰذا اب اس آسمان کے نیچے خدا کا تجویز کردہ ضابطہ حیات جسے اس نے اسلام کہہ کر پکارا ہے، قرآن کریم سے باہر کہیں نہیں۔ اسی دین کے ماننے والوں کو مسلمین کہتے ہیں۔ مسلم وہ ہے جو قرآن کریم کو خدا کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطہ حیات [1] سمجھے۔

س ل و

السَّلۡوٰی (2/57) سفید رنگ کا ایک پرندہ (بٹیر سے مشابہ) جو سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل کو کھانے کو ملتا تھا۔ اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو وجہ تسلی ہو۔

سلیمان علیہ السلام

انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ خاص شوکت و حشمت کے مالک تھے۔ آپ حضرت داؤدؑ کے بیٹے (38/30) اور وارث (جانشین) تھے (27/16)۔ آپ کو علم اور قوتِ فیصلہ کی فراوانی عطا ہوئی تھی (27/15)۔ اس لیے انہیں سطوتِ داؤدی کی وراثت محض ان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں مل گئی تھی، اگرچہ بنی اسرائیل میں بادشاہت وراثت میں مل جاتی تھی۔ شہروں کی مہذب آبادیاں اور وحشی قبائل (جن وانس) آپ کے لشکروں میں جمع رہتے تھے اور گھوڑوں کے رسالے ان پر مستزاد تھے (27/17)۔ حضرت سلیمانؑ کا بحری بیڑہ بھی بڑا مشہور تھا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں (21/81)۔ یعنی وہ ان سے بادبانی کشتیوں کو چلاتے تھے۔ پہاڑی قبائل کے سرکش افراد مختلف کاموں پر مامور تھے (21/82)۔ وہ آپ کے لیے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے، مجسمے تراشتے اور تصویریں بناتے تھے (34/12-13)۔ اس زمانے میں یمن کے مشرقی علاقہ پر قوم سبا کی حکومت تھی جو ستارہ پرست تھی۔ ایک ملکہ ان پر حکمران تھی۔ آپ نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور وہ بالآخر مطیع و فرمانبردار ہو گئی (27/20-44)۔ یہی لشکر وادی نمل میں سے گزرا تھا (27/18-19)۔ ہدہد اسی لشکر میں ایک افسر تھا (27/20-21)۔ آپ اس شوکت و عظمت کے مالک تھے لیکن آپ کا جانشین کمزور ثابت ہوا (34/14)۔

یہودیوں نے سحر و کہانت کے بہت سے لغو افسانے تراش کر آپ کی طرف منسوب کر رکھے تھے۔ خود تورات میں بھی

[1] اور اس پر عمل کر کے مومن کے مقام پر فائز ہو۔ (منظور الحسن)

اس قسم کی خرافات ملتی ہیں۔قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی ہے(2/102)۔

س م ر

''کہانیاں کہنے والے''، جس طرح قوموں کو گمراہ اور برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر، قصوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو قعر مذلت میں گرتے چلے گئے۔رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہمارے ہاں دین نام ہی چند قصوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لیے نامانوس شے قرار پا چکے ہیں۔

س م ع

قرآن کریم نے حصول علم کے لیے سمع، بصر اور قلب کا ذکر کیا ہے۔سماعت و بصارت ان حواس (Senses) کی ترجمان ہیں جن کے ذریعے محسوس اشیاء کے متعلق معلومات ذہن انسانی تک پہنچتی ہیں۔یعنی یہ علم محسوسات (Perceptual Knowledge) کے ذرائع ہیں۔ان ذرائع سے جو معلومات (Sense Data) قلب (Mind) تک پہنچتا ہے وہ اس سے تصورات (Concept) متعین کرتا ہے۔اس طرح سمع، بصر و قلب سے (Conceptual Knowledge) حاصل ہوتا ہے۔قرآن کریم علم محسوسات اور علم تصورات پر بڑا زور دیتا ہے اور جو لوگ سمع و بصر و قلب سے کام نہیں لیتے انہیں جہنمی قرار دیتا ہے(7/179)۔لیکن وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب انسان پر جذبات غالب آجائیں تو پھر اس کے ذرائع علم اسے صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچاتے (47/16-17)۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ (مثلاً) غصہ میں انسان کس طرح اندھا اور بہرا ہوجاتا ہے۔یہی حال دوسرے جذبات کا ہے۔لالچ میں انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس پر ہر ہوش مند ہنستا ہے۔اور تعصب میں انسان دوسرے کے نقطہ نگاہ کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔جس طرح نشے کی حالت میں حواس صحیح کام نہیں دے سکتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہونے کی حالت میں عقل بے کار ہوجاتی ہے۔اسے قرآن کریم خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (2/7) سے تعبیر کرتا ہے۔آنکھوں پر پردے پڑ جانا، کانوں میں ڈاٹ لگ جانا اور دلوں پر مہریں لگ جانا۔علم اسی وقت صحیح نتائج تک پہنچا سکتا ہے جب اس سے وحی کی روشنی میں کام لیا جائے۔کیونکہ وحی کے ذریعہ وہ اصولِ زندگی ملتے ہیں جن میں انسانی جذبات کی آمیزش نہیں ہوتی۔انسان اپنے عقل و فہم سے جو اصول حیات بھی وضع کرے گا وہ اس کے جذبات کی آمیزش سے خالی نہیں رہ سکتے۔

س م و

آدم کو علم اشیاء کی ایسی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی شکل اور اس کے خواص سے معلوم کر کے اس کو پہچاننے

کے لیے نام رکھتا ہے۔

قرآن کریم میں اَرْضٌ وَ سَمَآءٌ بے شمار مقامات میں آتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ ہماری اس زمین کو بھی، جس پر ہم رہتے ہیں اَرْضٌ کہتے ہیں۔لیکن چونکہ ہر بلندی کو (پستی کی نسبت) سَمَآءٌ اور ہر پستی کو (اس کی بلندی کی نسبت سے) اَرْضٌ کہتے ہیں اس لیے اَرْضٌ وَ سَمَآءٌ کے معنی کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہوں گے۔اور جب اَرْضٌ کو سَمَآءٌ کے مقابل میں لایا جائے گا تو سَمَآءٌ سے مفہوم کائناتی زندگی اور اس کا نظام بھی ہوگا اور اَرْضٌ سے مراد انسان کی معاشرتی، معاشی اور تمدنی زندگی۔ نیز سَمَآءٌ یا سَمٰوٰتٌ سے مراد محض اجرامِ فلکی ہی نہیں ہوں گے بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی تمام توانائیاں مثل ایتھر اور ایٹم وغیرہ بھی ہوں گے۔یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اَرْضٌ وَ سَمَآءٌ کے الفاظ آئے ہیں سیاق و سباق پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ اُس جگہ سَمَآءٌ میں بلندی کا پہلو ہے اور اَرْضٌ میں پستی کا۔خواہ وہ محسوس اشیاء میں ہو، خواہ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے اور خواہ کائناتی قوانین کے مقابلہ میں انسان کی معاشرتی زندگی ہو جسے اس نے اپنی مفاد پرستیوں کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے۔

آدم کو جو علم الاسماء دیا گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں اشیائے کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی استعداد رکھ دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملائکہ (کائنات میں کام کرنے والی قوتیں) اس کے سامنے سربسجود ہیں۔جب انسان اس قانون سے واقف ہو جاتا ہے جو کائنات میں کارفرما ہے تو جو جو قوتیں اس قانون کے مطابق کام کر رہی ہیں وہ سب اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔لہٰذا جس قدر کوئی قوم اشیائے فطرت کے متعلق معلومات بہم پہنچا کر انہیں اپنے تابع فرمان کرلے گی اسی قدر وہ مسجود ملائکہ بنتی جائے گی۔اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ان قوتوں کا استعمال کس طرح کیا جائے۔سو اس کے متعلق فرما دیا کہ فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2/38)۔جو قوم وحی خداوندی کا اتباع کرے گی اسے کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔اور جو قوم انہیں اپنی مرضی کے مطابق (اپنی مفاد پرستیوں کے لیے) صرف کرے گی وہ خود بھی ہلاکتوں میں پڑے گی اور دوسروں کے لیے بھی باعث مصیبت بن جائے گی، اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ (2/39)۔اگر تسخیر فطرت کرنے والی قوم کو ''آدم'' (محض آدمی) کہا جائے تو اشیائے فطرت کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے والی قوم کو ''مومن'' کہا جائے گا اور جو قوم نہ تسخیر فطرت کرے اور نہ ہی اتباعِ قوانین خداوندی تو اسے۔۔۔؟ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے لیکن بہرحال کہنا ہی پڑتا ہے کہ اسے دورِ حاضر کے مسلمان کہا جائے گا۔ یاللعجب!

''آدم'' کے علم الاسماء کے ضمن میں ایک مغربی ڈاکٹر نے اپنے نقطہ نگاہ سے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔وہ کہتا ہے:

''آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا ۔اس لیے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام رکھے جاتے ہیں، ان سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں۔''①

اس سے بھی مراد کائنات کے علوم طبعی کی تحصیل ہے جو ''آدمیت'' کی علامت ہے۔ ''غلط نام'' رکھنے کے ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ جنہیں تم (خدا کے علاوہ) اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز این نیست کہ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُکُمۡ (12/40) ''یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں۔'' مَّآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ (12/40) ''اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔'' یہ جو ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے آستانے اور درگاہیں سجدہ گاہِ انام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دیئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے۔ اگر ان میں ایسے نام نہ رکھے جائیں تو وہ مٹی اور پتھر کی عمارتوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کا صحیح مقام وہی ہے جو اسے خدا کا قانون عطا کرے۔ کائناتی دنیا میں اس کا قانونِ کائنات، اور انسانی دنیا میں ضابطۂ وحی (قرآن عظیم)، باقی سب بتانِ آزری② ہیں۔

س ھ و

قرآن کریم میں ہے: هُمۡ فِیۡ غَمۡرَةٍ سَاهُوۡنَ (51/11) ''وہ اپنے اشغال میں منہمک، حقیقت سے بے خبر ہیں۔'' دوسری جگہ ہے: الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ (107/5) وہ اپنی صلوٰۃ (فرائض منصبی) کی طرف سے یکسر غافل ہیں۔ یا ان کی تکمیل میں بہت سست اور ڈھیلے ڈھالے رہتے ہیں (9/54)۔ یا وہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور صرف اس کے محسوس و مرئی حصہ (تعدیلِ ارکان قیام، رکوع، سجود وغیرہ) ہی کو اصل صلوٰۃ سمجھتے ہیں (107/6)۔ کیونکہ یہ بڑی آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والوں میں عزت بھی ہو جاتی ہے۔

س و أ

صحیح روش زندگی کا نتیجہ انسان کی ذات اور معاشرہ میں حسن کی افزائش ہے۔ یعنی اس سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ دونوں میں صحیح صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے اور زندگی کی ساری خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ اس کے خلاف زندگی بسر کرنے سے توازن بگڑ جاتا ہے اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی متضاد

---

① Dr. M. L. Tyler in "Homoeo Drug Pictures" (Preface).

② سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آزری (علامہ اقبال، بانگ درا)

زندگیاں بسر کرنے والے کبھی ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوسکتے (40/58)۔اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی معاشرہ کا توازن بگڑا ہوا ہو تو اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم حسن پید کرنے والے کام کرتے جاؤ، بگاڑ خود بخود رفع ہوجائے گا۔اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَۃَ (23/96)۔اگر تم بہت زیادہ ہمواریاں پیدا کروگے تو ناہمواریاں خود بخود مٹ جائیں گی۔اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡھِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11/114)۔سورۃ رعد میں مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ (13/22 نیز 28/54) وہ سیئات کو حسنات کے ذریعے دور کردیتے ہیں۔واضح رہے کہ ان آیات سے یہ مفہوم نہیں کہ قرآن کریم ''ایک گال پر طمانچہ مارنے والے کے سامنے دوسرا گال کردینے'' یا ''جو کوٹ اتار لے اسے کرتا خود اتار کردینے'' کی تعلیم دیتا ہے۔اس قسم کی تعلیم مجرمین کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے۔اس کے لیے اس نے قانونِ عدل کی تلقین کی ہے۔یعنی جرم کی سزا دینا تاکہ مجرمین کی جرأتیں بے باک نہ ہونے پائیں۔لیکن اس کے لیے بھی اس نے اصول یہ دیا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُھَا (42/40 نیز 10/27)۔سزا ہمیشہ جرم کی نوعیت اور مقدار کے مناسب اور مطابق ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ ذرا سے جرم کی سنگین ترین سزا دے دی جائے نیز جہاں اصلاح کا امکان نظر آئے وہاں معاف بھی کردینا چاہیے (42/40)۔اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں کہ جو تم سے برائی کرے تم بھی اس سے اسی طرح کی برائی کرو۔اس میں جرم اور اس کی پاداش (تعزیر) کا اصول بیان کیا گیا ہے جو خدا کے قانونِ مکافات پر مبنی ہے۔یعنی سزا، جرم کی مناسبت سے۔وَّلَنَجۡزِیَنَّھُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (41/27) ''یقیناً ہم انہیں اُن کے اس قسم کے اعمال پر جو وہ کرتے رہے ہیں بدترین سزادیں گے۔''

قرآن کریم انسان کو ایسی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے جس سے اس کی اپنی ذات میں بھی حسن (ہمواری و خوشگواری) پیدا ہو اور معاشرہ میں بھی۔یہ نتیجہ ہوتا ہے قرآنی پروگرام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔اس کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اپنی ذات میں بھی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور معاشرہ میں بھی۔نیکی یا بدی، بھلائی یا برائی کا قرآنی تصور یہی ہے۔

س و ر

جنت میں سونے کے کنگنوں کا جو ذکر آیا ہے (18/31) تو اس کا مطلب وہ قوت وحشمت اور سرفرازی و سربلندی ہے جو جماعت مومنین کو اس دنیا کی جنتی زندگی میں حاصل ہوتی ہے۔باقی رہیں اس کے بعد کی زندگی کی سرداریاں اور سرفرازیاں، تو اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ حقیقت کا تمثیلی بیان ہے۔تم اپنے شعور کی موجودہ سطح کی رو سے ان چیزوں کی کنہ و حقیقت کو نہیں پاسکتے۔

س و ع

قرآن کریم میں اَلسَّاعَۃُ کا لفظ کثرت سے آیا ہے۔قرآن کریم غلط روش پر چلنے والوں کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ اس روش کا نتیجہ ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔تم نے اس روش کو نہ چھوڑا تو تم پر تباہی آجائے گی۔تمہارے سعی و عمل ضائع ہوجائیں گے۔تم ہلاک اور برباد ہوجاؤ گے (اسی کو اِنْذَارٌ کہتے ہیں)۔وہ اس انذار پر کان نہیں دھرتے اور اپنی روش پر جمے رہتے ہیں۔ان کے غلط اعمال اپنے تباہ کن اثرات مرتب کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے جب یہ اندر ہی اندر مرتب ہونے والے اثرات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور وہ لوگ تباہ اور برباد ہوجاتے ہیں۔

حق و باطل کی کشمکش چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی چلی آرہی ہے۔لیکن قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ جب زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اور حقائق بےنقاب ہوتے جائیں گے تو نوعِ انسانی کی ربوبیت عامہ کے تصور اور مفاد پرستیوں میں ایک عالمگیر ٹکراؤ ہوگا جس کے بعد زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔یہ وہ عظیم اَلسَّاعَۃُ ہے جس کا ذکر بڑے ہیبت انگیز انداز سے قرآن کریم میں آتا ہے۔

چونکہ نہ تو انسانی زندگی موت سے ختم ہوجاتی ہے اور نہ ہی اعمال کے نتائج کا سلسلہ یہیں منقطع ہوجاتا ہے، اس لیے اس زندگی کے بعد ظہورِ نتائج کو بھی اَلسَّاعَۃُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔قرآن کریم کے مختلف مقامات میں، سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہاں کون سا انقلاب مراد ہے۔یعنی اسی دنیا میں ظہورِ نتائج کا وقت (حق و باطل کی کشمکش کا انقلاب) یا آخرت کی زندگی میں ظہورِ نتائج کا وقت۔

قوموں کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن اثرات ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کا مجموعی نتیجہ (Accomulative Effect) ایک وقت پر جا کر ظاہر ہوتا ہے یہ ان کے لیے انقلاب کی گھڑی (اَلسَّاعَۃُ) ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا کہ یہ گھڑی کب آئے گی۔سورہ اعراف میں ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ (7/187) ''یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ انقلاب کی گھڑی (جس سے تم ہمیں اس طرح ڈراتے ہو) کب آئے گی؟ کہو کہ اس کا علم صرف میرے رب کو ہے۔اسے اس کے وقت پر خدا کے سوا کوئی اور ظاہر نہیں کرے گا'' (نیز 44-79/42)۔دوسری جگہ ہے: يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ○ (33/63) ''لوگ تجھ سے الساعۃ کی بابت پوچھتے ہیں۔ان سے کہو کہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔اور تجھے کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو'' (نیز 42/17)۔دیگر مقامات پر بھی یہی کہا ہے کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔(دیکھئے 31/34، 43/85، 41/47)

س وی

سورۃ النجم میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے فَاسْتَوٰی (53/6)۔ اس ایک لفظ میں شرفِ انسانیت کا انتہائی کمال، معجزانہ طور پر سمٹ کر آ گیا ہے۔ یعنی حضور ﷺ سیرت و کردار اور علم و بصیرت کے اعتبار سے انتہائی اعتدال لیے ہوئے تھے اور آپ کی ذات میں یہ خصوصیتیں کمال تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کے بعد آپؐ مقامِ نبوت پر فائز ہونے کے اہل قرار پائے تھے۔ نبوت ہر کس و ناکس کو نہیں مل جایا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ جسے اس موہبتِ کبریٰ کے لیے منتخب کرتا تھا اس کی تربیت خدا کی نگرانی میں ہوتی تھی اور اس کی ذات معراجِ انسانیت کی مظہر بن جاتی تھی۔

س ی ح

مومن عورتوں کی صفت سٰٓئِحٰتٍ (سیاحت کرنے والیاں) کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہ نظریہ کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس رکھنا چاہیے کس قدر غیر قرآنی [1] ہے۔

ش أ ن

سورۃ الرحمٰن میں ہے: یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (55/29) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے (انسانیت سمیت) وہ سب اپنی نشوونما کے لیے ربوبیت خداوندی کے محتاج ہیں۔ یہ اس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ ہے۔ دوسرے حصے میں هُوَ سے مراد اللہ لیا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں کہ وہ ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے۔ خدا ایک مستقل بالذات ہستی ہے جو ہمیشہ ایک ہی شان میں رہتی ہے۔ اگرچہ اس کے امر (قدرتوں) کی نمود مختلف مظاہر میں ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے آیت مذکورہ بالا کے دوسرے حصہ میں هُوَ سے مراد مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لیا جائے تو بہتر ہے۔ اس اعتبار سے پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشوونما کے لیے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے، اور ان اشیاء کی نشوونما کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی مختلف حالتوں میں نشوونما کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ربوبیت خداوندی ان کی ہر ایک حالت کے مطابق ان کی نشوونما کے سامان فراہم کرتی رہتی ہے (14/34)۔ اور اس طرح اشیائے کائنات کی ترقی (Development) کا سلسلہ قانونِ ارتقاء کے مطابق جاری رہتا ہے۔

ش ت ت

سورۃ اللیل میں ہے: اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰی (92/4) تمہاری جدوجہد مختلف اور ایک دوسرے سے جداگانہ (سمتوں میں

---

① لیکن اس کے لیے قرآنی تربیت شرطِ اوّل ہے۔ (منظور الحسن)

ہوتی) ہے۔یعنی ہر فرد کے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی کوششیں اس مقصد کے حصول کے لیے ہوتی ہیں۔ نیز ایک فرد کی زندگی میں بھی مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں جن کے حصول کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے۔اس کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ ہر چند یہ مقامات مختلف اور متنوع ہوتے ہیں لیکن اگر بہ ہیئت مجموعی ان کی تقسیم کی جائے تو یہ دو بنیادی شقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ایک اَعْطٰی کی شق (92/5) اور دوسری بَخِلَ کی شق (9/82)۔اَعْطٰی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے بھی دے۔اور بَخِلَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنے مفاد تک محدود رکھے۔پہلی شق وجہ بالیدگی شرف انسانیت ہے اور دوسری شق، باعث تذلیل انسانیت۔

ش ج ر

قرآن کریم میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا تھا کہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ[①] (2/35) اس شجر کے قریب نہ جانا۔قصۂ آدم درحقیقت نوع انسانی کی تمثیلی سرگزشت ہے۔انسان اپنی تمدنی زندگی سے پہلے ایسی حالت میں تھا کہ اس کی ضروریات بہت قلیل تھیں اور سامانِ خورد ونوش بافراط تھا۔اس لیے ان میں باہمی افتراق و اختلاف نہ تھا۔اس کے بعد جب انسانی شعور نے ذرا ترقی کی تو اس نے تمدنی اور معاشرتی زندگی شروع کی۔اس سے مختلف افراد (اور اس کے بعد مختلف قبائل) کے مفاد میں تصادم (Clash of Interests) شروع ہوا اور اس تصادم سے باہمی اختلاف وافتراق پیدا ہوا۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (10/19) ''نوع انسانی پہلے ایک ہی جماعت تھی لیکن بعد میں انہوں نے آپس میں اختلافات شروع کر دیئے۔''[②] یہ مطلب ہے وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2/35) سے۔یعنی ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ دیکھنا! تم سب کی اصل ایک ہی ہے۔اس لیے تم باہمی اختلاف وافتراق پیدا نہ کر لینا۔لیکن عقلِ خود بیں (ابلیس) نے جو ہر فرد کو اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے (برعکس عقلِ جہاں بیں کے جو پوری نوع انسانی کے تحفظ کی فکر کرتی ہے) انہیں انفرادی مفاد پرستیوں کی طرف مائل کر دیا، اور اس طرح یہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے (2/36)۔لہٰذا اس مقام پر شَجَرٌ سے مفہوم انسانوں کے وہ باہمی اختلافات ہیں جو ان میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا حل صرف یہ ہے کہ انسان وحی کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرے (2/38)۔اسی کو ربوبیت عالمینی کہتے ہیں۔

---

① علامہ اقبال نے اس آیت کا بڑے حسین انداز میں ترجمہ کیا ہے۔فرماتے ہیں:

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

② نوع انسانی کو پھر سے ایک ہی جماعت بن کر رہنا ہے لیکن یہ وحدت انسانیہ وحی کے ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں۔(2/213)

ش ح ح

قرآن کریم کا نظامِ ربوبیت یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کی نشوونما کی فکر کرے اور ان کی ضروریات کو اپنی ضرویات پر ترجیح دے۔ لہٰذا شُحّ نَفْس اس خصوصیت کی ضد ہوا۔ یہ مفہوم سورہ حشر کی اس آیت سے بالکل واضح ہوجاتا ہے جس میں کہا ہے کہ مومنین کی صفت یہ ہے کہ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59/9)۔ وہ خود تنگی میں ہی کیوں نہ ہوں دوسروں کی ضروریات کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (59/9) یادرکھو! جوشخص (یا قوم) شُحّ نَفْس سے اپنے آپ کو بچائے انہی کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ یعنی دنیا کے عام قاعدے کی رو سے، اسی کسان کی کھیتی میں فصل اُگتی ہے جو اسے سیراب کرلے۔ لیکن نظامِ ربوبیت میں اس کی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو دوسرے کے کھیت کی سیرابی کو اپنے او پر ترجیح دے۔

ش د د

قرآن کریم میں سن بلوغ وسن رشد کے لیے لفظ اَشُدَّ اکثر مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً 17/34؛ 6/153؛ 40/67)۔ سورۃ نساء میں (4/6) میں یتیموں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب تک وہ ''نکاح کی عمر'' کو نہ پہنچیں ان کے مال کی نگرانی کرو۔ اور دوسرے مقامات (17/34؛6/153) میں کہا گیا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کرو جب تک وہ جوانی کو نہ پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر، جوانی ہے، صغرسنی نہیں۔

ش ر ح

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے، يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (6/126) اسلام کے لیے اس کے سینے میں کشادگی پیدا کردیتا ہے۔ اس لفظ میں بات کے سمجھنے کی صلاحیت، صحیح بات کو قبول کرنے کی استعداد، اور حق کو اختیار کرلینے کی جرأت، سب خصوصیات آجاتی ہیں۔ اس کے برعکس غلط راستے پر چلنے والوں کے متعلق فرمایا کہ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (6/126) وہ اس کا سینہ تنگ، بھنچا ہوا کردیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرح صدر بہت بڑی خصوصیت ہے جسے حاصل ہوجائے۔ تعصب سے ہٹ کر، بات کو دلائل وبصیرت کی بناء پر (On Merits) سمجھنا، حق وصداقت اور حسن وخوبی جہاں بھی ہو، اسے (Appreciate) کرنا، اور پھر تمام مخالفتوں کے علی الرغم اسے اختیار کرلینا۔ نیز اسے اسی طرح تفصیل و تبیین سے آگے پہنچانا۔ ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آنا، دشمن تک سے فراخ دلی برتنا، کہیں تنگ نظری کا ثبوت نہ دینا۔ یہ سب باتیں شرح صدر میں آجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولوالعزم انبیائے کرام نے ہمیشہ خدا سے شرح صدر (وسعت قلب ونگاہ اور رفعتِ عزم وہمت) کی دعائیں مانگی ہیں (20/25)۔ اور خود نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ یہ شرح صدر کی

بدولت ہے کہ ان کی اس قدر سخت مہم یوں آسان ہوگئی اور اس طرح ان سے ذمہ داریوں کا وہ بوجھ ہلکا ہوگیا جس سے ان کی کمر ٹوٹ رہی تھی (94/1-2)۔ ورنہ مخالفین کی کمینہ حرکات ایسی تھیں جن سے انسان کا دم گھٹنے لگ جائے (15/97)۔

لہٰذا قرآن کریم کی رو سے معاملات کے آسان ہونے کے لیے شرح صدر نہایت ضروری ہے (94/1-2؛20/25-26) اور ہر مسلم کا یہی شعار ہونا چاہیے (6/126)۔ جس شخص میں تنگ نظری اور دوں ہمتی ہو، سمجھ لیجئے کہ اس کا سینہ اسلام کی روشنی کے لیے کشادہ نہیں ہوا۔ (39/22) میں اسے قساوتِ قلبی یعنی تنگ دلی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ش ر ر

شَرٌّ کے معنی ہوں گے انسان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا اس طرح صرف (یا ضائع) ہونا، بکھر جانا اور منتشر ہو جانا کہ ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اس کے برعکس خیر کے معنی ہوں گے انسانی توانائیوں کا تعمیری نتائج پیدا کرنا۔ پانی دریا کے ساحلوں کے اندر مقید ہو کر بہے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ سیلاب کی شکل میں اِدھر اُدھر بکھر جائے تو شر کا موجب ہو جاتا ہے۔ ہوا نرم روی کے ساتھ ایک سمت میں چلے تو موجب خیر ہے لیکن جب جھکڑ اور آندھی بن جائے تو تباہی کا موجب۔ توانائیوں کا بکھر جانا، قوتوں کا بدلگام ہو کر منتشر ہو جانا شر ہے۔ یہی چیز خود انسانی ذات کے متعلق بھی ہے۔ اگر اس کی قوتیں منتشر (Diffused) ہوں تو اس کی نشوونما نہیں ہوتی۔ اگر وہ مرتکز (Crystallised) ہو جائیں تو اس میں استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

خیر اور شر کے ان گوشوں کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گا جہاں سے وہ حقائق واضح ہو جائیں گے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مسئلہ خیر اور شر (Good and Evil) کی بحث فلسفیانہ طور پر نہیں کی۔ اس لیے کہ اس کا موضوع فلسفہ نہیں۔ اس کا مقصود ایسی راہ نمائی دینا ہے جس سے شر، شر ہی نہ رہے۔ یعنی توانائیاں بکھر کر تخریبی نتائج (Disintegration) نہ پیدا کریں۔ بلکہ نظم وضبط کے ساتھ مجتمع ہو کر تعمیری نتائج پیدا کریں۔

ش ر ع

سورۃ شوریٰ میں ہے: شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ (42/13) خدا نے تمہارے لیے اس نظام زندگی (الدین) یا قانون حیات کو نمایاں اور واضح کیا ہے۔ سورۃ جاثیہ میں ہے: ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ (45/18) پھر ہم نے تجھے الامر (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا۔

ان آیات میں (شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ یا شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ سے) مفہوم خود الدین ہے۔ یعنی خدا کا متعین کردہ راستہ۔ سورۃ مائدہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ''ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو ان حقائق کو سچ کر کے

دکھانے والی ہے جواس سے پہلی آسمانی کتابوں میں آچکے ہیں۔اور یہ ان سب کی تعلیم کی محافظ ہے۔سوتو ان کے متنازع فیہ معاملات میں ماانزل اللہ کے مطابق فیصلہ کر۔اور جب تمہارے پاس حق آچکا تو پھر ان کے جذبات وخواہشات کا اتباع مت کرو۔'' اس کے بعد ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (5/48)''اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شرعۃ (راستہ) اور منہاج (طریقہ) مقرر کیا (تھا)۔'' یہاں شِرْعَةً کے معنی الدین کے وہ غیر متبدل اصول نہیں جو حضرت نوحؑ سے نبی اکرم ﷺ تک ہر نبی کو یکساں طور پر دیئے گئے تھے (42/13)۔ یہاں اس سے مراد، الدین کے اصولوں کے تابع وہ جزئی احکام ہیں جو انبیائے سابقہ کو وقتی ضروریات کے لیے دیئے جاتے رہے اور جن میں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی۔قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ (یہود ونصاریٰ) جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم منجانب اللہ ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو ہماری شریعت کے خلاف ہیں۔تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کے اصول اور دوسری چیز ہے جزئی احکام۔ دین کے اصول ہمیشہ ایک رہے لیکن جزئی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔اس لیے اگر قرآن کریم کا کوئی حکم، سابقہ اقوام کے کسی جزئی حکم سے مختلف ہے تو اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن کریم منجانب اللہ نہیں۔ اس مفہوم کی تائید، سوۃ حج کی وہ آیت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ (22/67)''ہم نے ہر قوم کے لیے (دین کو عملاً نافذ کرنے کے لیے) طریقہ تجویز کیا تھا جس پر وہ چلیں۔(اس طریق میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اصلِ دین میں نہیں) اس لیے یہ تجھ سے الامر (اصل دین) کے بارے میں تو تنازع نہ کریں۔''

اس آیت (لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا) کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر جبر نہیں کرتے۔جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے، ہم اس کے اس اختیار وارادہ میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارا کام الدین دے دینا ہے۔ یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں۔اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (5/48) اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔لیکن اس طرح تمہارا اختیار وارادہ سلب ہوجاتا اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔شریعت سے مراد وہ جزئی احکام لیے جاتے ہیں جن پر امت کے لیے چلنا ضروری ہے۔اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دیئے ہیں۔ یہ اصول (اور وہ چند حکام جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں) ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی امت اپنے لیے جزئی احکام، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشورہ سے خود مرتب کرے گی۔قرآنی اصول غیر متبدل رہیں گے اور یہ جزئی احکام تبدیل

ہوتے رہیں گے۔ان احکام کوشریعت کہا جائے تو یہ شریعت بدلتی رہے گی اور اصولِ شریعت غیر متبدل رہیں گے۔

ش ر ق

سورۃ نور میں، نور خداوندی کے تمثیلی بیان میں لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ (24/35) آیا ہے۔یعنی وہ مشرق ومغرب کی نسبتوں سے بلند و بالا ہے۔اس کی روشنی عالمگیر (Universal) اور تمام کائنات کو محیط ہے۔جس طرح خدا تمام نوع انسانی کا خدا ہے اسی طرح اس کا ضابطہ قانون (قرآنِ کریم) بھی تمام نوع انسانی کی آنکھوں کے لیے روشنی ہے اور اس کا نظامِ ربوبیت تمام انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔یہی وہ نظام ہے جس کی روشنی سے آخر الامر تمام روئے زمین جگمگا اٹھے گی۔وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39/69)۔

ش ر ک

اَلْشِرْكُ: قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے۔اس کے معنی ہیں غیر خدائی قوتوں کو خدا کے ہمسر سمجھنا۔جو اختیارات صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں ان کا حامل دوسروں کو بھی سمجھنا۔انسانوں کے خودساختہ قوانین کو، قانون خداوندی کے برابر سمجھنا۔خدا کے حقِ ملکیت میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا۔قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر شے انسان کے لیے تابع فرمان کردی گئی ہے اور انسان سب برابر ہیں۔کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے سے اپنی اطاعت کرائے۔لہٰذا اس کائنات میں انسان سے برتر کوئی اور قوت نہیں۔(انسان سب برابر اور کائنات کی دیگر اشیاء انسان سے فروتر)۔بس ایک خدا کی ذات ہے جو انسان سے برتر ہے۔لہٰذا انسان کا خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنے سے برتر سمجھنا خود اس کی اپنی تذلیل ہے۔اسی کو شرک کہتے ہیں۔شرک سے خدا کی خدائی (خدا ہونے) میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔خود انسان اپنے مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔اس لیے قرآن کریم کی رو سے شرک سب سے بڑا جرم ہے جو انسان سے اس کا صحیح مقام چھین لیتا ہے (31/13)۔مشرکین وہی ہیں جو مقام انسانیت سے گر جاتے ہیں اور (خدا کے علاوہ اور) قوتوں کو اپنے سے برتر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔بس ایک خدا کے قانون کی اطاعت (جو اس نے وحی کے ذریعے قرآن کریم میں عطا کردیا ہے) اور ساری کائنات کی تسخیر۔یہ ہے توحید اور اس میں ذرا بھی خرابی، شرک۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ:

① جو خصوصیات اور قوتیں خدا کے لیے مختص ہیں، ان میں سے کسی دوسرے کو شریک سمجھنا، شرک ہے۔

② اپنے آپ کو خدا کے سوا، کائنات کی کسی قوت یا کسی انسان کا محکوم اور تابع فرمان سمجھنا اور اس کے سامنے جھکنا، شرک ہے۔

③ قرآن کریم کے علاوہ، کسی اور کی محکومی اختیار کرنا شرک ہے۔ اس ضابطہ کے علاوہ کسی اور ضابطہ کو اپنانا، حکم ماننا، شرک ہے۔

④ الدین ملت میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ فرقوں میں بٹ جانا اور گروہ در گروہ ہو جانا، شرک ہے۔

⑤ ایک خدا، اس کا عطا کردہ ایک ضابطہ زندگی، اس پر چلنے والی ایک اُمت، اس امت کا ایک نظام۔ یہ ہے توحید۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے شرک ہے۔

ش ط ن

قرآن کریم میں ہے: اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (19/44) شیطان احکامِ خداوندی سے سرکشی برتنے والا ہے۔ سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے غصہ میں آ کر اس قبطی کے مکا مارا جس سے وہ مر گیا تو آپ نے کہا کہ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (28/15) یہ تو شیطانی کام ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر جو غلط کام کیا جائے اسے شَيْطَنَتْ سے تعبیر کیا جاتا ہے (نیز 12/5)۔ جو لوگ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے ان کے سرغنوں کو بھی شیاطین کہا گیا ہے۔ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ (2/14) کے یہی معنی ہیں کہ جب یہ لوگ اپنی پارٹی کے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں۔

ان وحشی اور سرکش قبائل کے لوگوں کو بھی جنہیں حضرت سلیمانؑ نے مطیع بنا کر کام میں لگا رکھا تھا شَيٰطِيْنِ کہا گیا ہے (21/82، 38/37)۔ سانپ کے لیے یہ لفظ قصہ حضرت ایوبؑ میں آیا ہے (38/41)۔

شَيْطَانٌ کے معنی پیاس کی شدت کے بھی ہیں۔ اس لیے حضرت ایوبؑ کے قصے میں اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ (38/41) کے معنی سانپ کا چھو جانا اور پیاس کا غلبہ دونوں ہو سکتے ہیں۔[1]

کاہنوں اور نجومیوں کو بھی شِيَاطِيْنٌ کہا گیا ہے (37/7، 67/5)۔ قرآن کریم کی رو سے ہر وہ قوت جو قانونِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہے شیطان ہے، خواہ وہ انسان کے اپنے بے باک اور سرکش جذبات ہوں اور خواہ نظام خداوندی کی مخالف جماعتیں اور ان کے سرغنے۔ سرکشی اور تخریب ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے، اور صحیح نظام کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کرنا ان کا کام۔ شیطان اور طاغوت ایک ہی ہیں اور طاغوت ہر غیر خداوندی قوت کا نام ہے (4/76 و 2/256)۔

ش ع ب

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ تمام نوع انسان امت واحدہ، ایک عالمگیر برادری ہے (2/213) لیکن باہمی

---

① ویسے بھی جسے سانپ ڈس لے عام حالات میں اسے بہت پیاس لگتی ہے۔ (منظور الحسن)

تعارف کی غرض سے یہ مختلف شعوب وقبائل [1] میں بٹ جاتی ہے۔ان شعوب وقبائل کی تقسیم سے مقصد محض تعارف ہے،جس طرح ہم اپنے بیٹوں کے نام رکھ لیتے ہیں تا کہ ان کے تعارف میں آسانی رہے۔اس سے کسی قسم کی برتری یا تفوق مقصود نہیں ہوتا۔

ش ع ر

ذہنی فلسفہ اور تجریدی تصورات عربوں کے ہاں شعور نہیں کہلاتے تھے۔ان تصورات کو شعور سے تعبیر کرنا عجمی اصطلاح ہے جو یونانی طرزِ فکر سے پیدا ہوئی ہے۔شاعر کو شاعر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنی فطانت وذہانت سے ان معانی کا ادراک کر لیتا ہے جن کا ادراک عام لوگ نہیں کر سکتے۔کبھی شِعْرٌ سے جھوٹ بھی مراد لیتے ہیں اور شَاعِرٌ جھوٹ بولنے والے کو کہتے ہیں۔اور چونکہ بیشتر جھوٹ شاعری میں جگہ پاتا تھا اس لیے یہ مثل بن گئی تھی کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَكْذَبُهٗ یعنی سب سے عمدہ شاعری وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ اپنے اندر رکھتی ہو۔مخالفین رسول اللہ ﷺ کو شاعر اور قرآن کریم کو شعر اسی مفہوم کے اعتبار سے کہتے تھے۔

قرآن کریم نے جہاں شاعری کی مخالفت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نثر میں بیان کردہ مفہوم قابل قبول ہے اور نظم میں بیان کردہ مذموم۔قرآن اسلوب پر بحث نہیں کرتا،مقصودِ بیان سے بحث کرتا ہے۔شاعری سے اس کی مراد،وہ جذبات پرستی ہے جو حقائق سے بحث نہیں کرتی۔چنانچہ سورۃ یٰسین میں جہاں اس نے کہا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ (36/69)''ہم نے رسول کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی شاعری ایک پیغامبر انقلاب کے شایانِ شان ہوتی ہے۔'' تو اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ(36/69) جو کچھ ہم نے رسول کو دیا ہے وہ تاریخی شواہد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا(36/70) جن لوگوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے یہ انہیں اس کے ذریعہ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔یعنی قرآن کریم تاریخی شواہد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ہے۔اور شاعری اس کے خلاف محض جذبات سے کھیلتی ہے۔(کولرج [2] کے الفاظ میں) شاعری کی ضد (Antithesis) نثر نہیں بلکہ سائنس ہے۔قرآن کریم چونکہ سائنٹفک حقائق سے بحث کرتا ہے اس لیے شاعری (جو ان حقائق کی نقیض ہے) اس کی بارگاہ میں قبول نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ دیگر اقوام عالم (مثلاً اہل یونان وغیرہ) کی طرح عربوں کے ہاں بھی یہ

---

[1] اگرچہ سورت الحجرات میں شعوب قبائل کا ذکر ہے جس کا آج کے دور میں یہ مفہوم بنتا ہے کہ رب العالمین نے ہمیں اوّل مسلمان بنایا اور دوم پاکستانی۔ (منظور الحسن)

[2] کولرج (Colleridge) ایک یورپین شاعر۔(منظور الحسن)

عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعروں کو بھی الہام ہوتا ہے۔جس طرح آج بھی انگریزی زبان میں جب (Poet) کہا جاتا ہے تو اس سے مراد روح پھونکنا (Inspired) ہوتے ہیں۔یعنی شاعر (Poet) وہی ہوتا ہے جسے وجدان (Inspiration) ہوتا ہو۔قرآن، وحی اور انسانی ملکات میں نہایت شد و مد سے تمیز کرتا ہے تاکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہوجائے کہ خدا کی طرف سے براہ راست علم اور انکشافِ حقیقت صرف وحی کے ذریعے ہوسکتا ہے جو ایک نبی کو ملتی تھی۔(اور سلسلۂ نبوت کے ختم ہوجانے کے بعد، اب کسی کو نہیں مل سکتی)۔

سورہ مائدہ میں ہے: لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ (5/2) شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو۔اسلام ایک دین ہے جو مملکت کی شکل میں متمکن ہوتا ہے۔ایک مملکت کے کچھ شعائر (یعنی علامات یا Symbols) ہوتے ہیں جن کی تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا۔جھنڈا تو ویسے کپڑے کے ایک ٹکڑے سے عبارت ہوتا ہے لیکن یہ نشانی ہوتا ہے اس مملکت کی۔جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔انہی علامات کو شعائر کہا جاتا ہے۔لہٰذا شَعَآئِرَ اللّٰہِ سے مراد، اس مملکت کی محسوس علامات ہوں گے جو قوانین خداوندی (قرآنی نظام) کے نفاذ کے لیے دنیا میں قائم ہو۔ان شعائر کا احترام درحقیقت ان قوانین کا احترام ہوگا۔واضح رہے کہ ان شعائر کی پرستش نہیں کی جائے گی۔صرف ان کا احترام کیا جائے گا اور وہ بھی اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ شعائر (علامات) فی ذاتہٖ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ان کا احترام، قوانین خداوندی کے احترام کا محسوس طریق ہے اور بس۔

شعیب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں (ان کی تیسری بیوی قطورا سے) جو اولاد پیدا ہوئی ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔یہ حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں، سکونت پذیر ہوا اور اس کی نسل، تاریخ کے اوراق میں قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ان کا زمانہ قریب 2000 ق۔م سمجھنا چاہیے۔یہ قوم یہیں بڑھی پھولی۔قریب چار سو سال تک ان کی یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی۔جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں، تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔قرآن کریم میں ہے کہ یہاں انہوں نے ایک مرد بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کرلی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی۔اس مردِ بزرگ نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کردیا (دیکھئے 20/40 و 28/22-28)۔قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مرد بزرگ کون تھے۔لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ تھے۔

حضرت شعیبؑ نے انہیں جو تلقین کی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کس کس قسم کے جرائم پیدا ہوچکے تھے۔آپ نے ان سے کہا: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (7/85) اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو۔اس کے سوا تمہارا

کوئی اور الہٰ نہیں ۔۔۔ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَھُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِھَا (7/85) تمہیں چاہیے کہ ماپ تول پورا پورا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت پیدا کرو۔

اس سے واضح ہے کہ اس قوم میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں جنہیں دور کرنے کے لیے حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے۔ آپ نے ان تک اپنی دعوت پہنچائی اور (حسب معمول) قوم کے سرمایہ دار طبقہ (سردارانِ قوم) نے آپ کی سخت مخالفت کی اور دھمکی دی کہ آپ اور آپ کے ساتھی انہی کا مسلک اختیار کرلیں ورنہ وہ ان سب کو بستی سے نکال دیں گے (7/88)۔

سورۃ ہود میں اس قوم کی طرف سے ایک ایسا اعتراض کیا گیا ہے جو اسلام کی ایک عظیم حقیقت کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے کہا: یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11/87) ''اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ (ہمیں کہے کہ) ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آباءواجداد پوجتے رہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت میں جس قسم کا تصرف کرنا چاہیں نہ کریں؟

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں صلوٰہ اور معاشیات کا تعلق کس قدر گہرا ہے۔ صلوٰۃ سے مقصود ہے قوانین خداوندی کا اتباع۔ اور قوانین خداوندی معاشیات کو بھی اپنے دائرے کے اندر رکھتے ہیں۔ اس لیے صلوٰۃ اور معاشیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ش ف ع

شُفۡعَۃٌ فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک خاص حق ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دے کر جائداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قیمت دوسرے لوگ اس جائیداد کی لگائیں۔

شَفۡعٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا۔ اس کے بعد شَفَاعَۃٌ کے معنی سفارش اس لیے ہو گئے کہ اس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کی معاونت کے لیے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے۔ نیز اس کے معنی دعا کرنے کے بھی آتے ہیں۔

قرآن کریم انفرادی زندگی کی بجائے اجتماعی زندگی سکھاتا ہے کیونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اس کی ذات کی بالیدگی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے۔ اس اعتبار سے جماعتِ مومنین کا ہر فرد دوسرے کا شَفِیۡعٌ ہوتا ہے۔ یعنی اس کی معاونت کے لے ہر وقت اس کے ساتھ۔ اور اس نظام کا مرکز (امیر) ہر ایک کا شَفِیۡعٌ۔ وہ افرادِ کارواں میں سے کسی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ تنہا ہے۔ یہی باہمگی (شفاعت) اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔

ہمارے ہاں مروجہ عقیدہ یہ ہے کہ جب قیامت میں حساب کتاب ہوگا اور مجرمین کو دوزخ کی سزا کا حکم ہو جائے گا تو خدا کے مقرب بندے، بالخصوص حضرات انبیاء کرامؑ (اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ نبی اکرم ﷺ) خدا کے حضور ان مجرمین کی سفارش کریں گے اور ان کی سفارش پر اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا اور وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ اسے شفاعت کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دین کی ساری عمارت منہدم کر دیتا ہے جس کی بنیاد قانونِ مکافات عمل پر ہے۔ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ○ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ○ (99/7-8) ہر عمل کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور سامنے آجاتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار ہے۔ جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے اور ان کی سفارش پر مجرمین کو معافی مل جایا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی۔ وہ جب کہتے ہوں گے کہ ہمارے رسول (حضرت عیسیٰؑ) کو دیکھو کہ جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ دے کر اسے جہنم سے بچا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس تمہارا رسولؐ گنہگاروں کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ تو اس اعتراض کے پیش نظر اس قسم کی روایات وجود میں آگئیں کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو چکے گا اور مجرمین دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے تو نبی اکرم ﷺ سجدے میں گر جائیں گے اور جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی امت کے تمام افراد کو دوزخ سے نکال کر جنت میں نہیں بھیج دے گا حضور ﷺ نہ سجدے سے سر اٹھائیں گے نہ خود جنت میں جائیں گے۔ اس سے عیسائیوں کے اعتراض کا تو جواب وضع کر لیا گیا لیکن دین کی ساری عمارت بنیاد سے ہل گئی اور قوم تباہیوں کے جہنم میں جا گری۔ قرآن کریم سے اس قسم کی شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی (نہ ہی اس میں اس قسم کے عقیدہ کی گنجائش ہوسکتی تھی)۔ اس میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ قانونِ مکافات کی رو سے لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (2/48) کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا نہ ہی کسی کی شفاعت (سفارش) قبول کی جاسکے گی نہ ہی کسی سے ان کے گناہوں کا معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآن کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے: مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ (2/255) ''وہ کون ہے جو اس کے پاس اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔'' اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جاسکتی ہے اور حضور ﷺ اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت ہی سے کریں گے۔

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ہے۔ سب سے پہلے تو اس لیے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانون مکافات کے یکسر خلاف ہے جو قرآن کریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ہے۔ لہٰذا اگر قانونِ مکافات کے ساتھ

شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآن کریم میں موجود ہوتو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن کریم میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دیئے گئے ہیں۔ مثلاً اسی آیت کو دیکھئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت یہ ہے ''اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اسے (ربوبیت عامہ کے لیے) کھلا رکھو قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ (2/254) جس میں نہ گناہوں کی قیمت ادا کر کے جنت خرید جا سکے گی، نہ کسی بزرگ کی دوستی کسی کے کام آئے گی اور نہ ہی کسی کی شفاعت۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے: مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (2/255) اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جا سکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ہو جائے گی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ قانونِ مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جزا وسزا کی مجرد حقیقت کو سمجھانے کے لیے تشبیہاً ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ ملزم ہوتا ہے، مستغیث ہوتا ہے، گواہ ہوتے ہیں، پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں وغیرہ۔ ایک جگہ ہے کہ جس شخص کا احتساب ہو رہا ہوگا وہ عدالت کے کٹہرے میں اکیلا کھڑا ہوگا۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى .... وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ ... (6/95) تم ہمارے حضور تنہا پیش ہو گے۔۔۔ تمہارے ساتھ کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور ''پولیس کا سپاہی'' تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے لائے گا۔ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ (50/21) ''ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا'' اس کے علاوہ گواہ بھی ہوں گے ... وَّ شَهِيْدٌ (50/21) یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ ان میں سے جسے بلایا جائے گا وہ آجائے گا اور اسے گواہی دینے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ ہیں وہ شفیع (ساتھ کھڑے ہونے والے) جن کا ذکر قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (2/255) ''وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔'' یہ گواہ بھی رسول ہوں گے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے: يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (5/109) جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کائناتی قوتیں بھی اسی طرح بلائی جائیں گی۔ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (78/38) جس دن ''الروح اور ملائکہ'' صف باندھے کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ درست بات کہے۔'' لہٰذا ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اس لیے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت دے دینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت خود قرآن نے کر دی ہے جہاں فرمایا: وَ

لَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ ۔۔۔ (43/86) جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے ۔ اس کا اختیار وہ رکھتا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے ۔ یعنی شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں ۔ اسی التباس کے رفع کرنے کے لیے قرآن کریم نے رسول اللہ کو شَهِيْدٌ (16/89) کہا ہے، شفیع کہیں نہیں کہا ۔ اور دوسرے مذاہب کے لوگ جو شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (74/47) انہیں ان کے سفارشیوں کی سفارش کچھ کام نہیں دے سکتی ۔ اس لیے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (6/165) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔ جنت فقط اعمال کے بدلے ملتی ہے ۔ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (7/43) سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوتِ عمل سے محروم ہو جاتی ہے ۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ یہودیوں میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ اپنی پستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بجز چند دنوں کے کبھی جہنم میں نہیں رہیں گے (2/80) ۔ اس پر قرآن کریم نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ سب عقائد غلط ہیں ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط روش اختیار کرے گا وہ تباہ و برباد ہو گا اور جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کرے گا وہ جنت کا وارث ہو گا (2/81-82) ۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ:

① اس دنیا میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کام میں کسی کی مدد کے لیے اس کے ساتھ ہو جانا ۔ اگر وہ کام اچھا ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو بھی اس کا اچھا اجر ملے گا ۔ اگر وہ کام برا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ سزا کا کچھ حصہ پائے گا ۔

② آخرت میں شفاعت کا تصور اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دینے کے لیے کھڑا ہو جائے ۔ یہ تمثیلی بیان ہے ۔

③ مجرموں کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا، یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حق دار نہیں، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے ۔ اس لیے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں ۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہیے کہ وہاں کون سا مفہوم متصور ہے ۔

ش ک ر

خدا کی طرف سے شُكُرٌ کے معنی پورا پورا بدلہ دینا یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہیں ۔ (مثلاً کوئی شخص اگر اپنے آپ کو تنگی میں رکھ کر دوسرے کی تھوڑی سی مدد بھی کرتا ہے تو اس کی یہ قربانی، اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہو گی جو اپنی

ضروریات سے زائد چیز دوسرے کو دے دے۔ یہ مطلب ہے ''تھوڑے عمل کا زیادہ اجر دینے'' کا)۔

سورۃ بقرہ میں ہے: وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (2/152) اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ہمیشہ بے نقاب رکھو تا کہ اس سے نوع انسانی فائدہ اٹھائے۔ انہیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو۔

خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سب سے پہلے وہ صلاحیتیں آتی ہیں جو خود انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشوونما پانا (اور اس طرح ابھر کر سامنے آجانا) ان کا شُکر ہے۔ اور یہ چیز اعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ اس لیے اعمال صالحہ خدا کی نعمتوں کے شُکر کا موجب بنتے ہیں۔ سورۃ احقاف میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جب کہا گیا ہے کہ تم دعا مانگا کرو (اس کی آرزو کیا کرو) کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ ... وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا (46/15) اے میرے نشوونما دینے والے مجھے توفیق عطا کردے کہ میں تیری دی ہوئی نعمتوں کا ''شکر'' کروں۔ یعنی میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ اسی لیے دوسری جگہ کہا ہے کہ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (31/12) جو خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھتا ہے اس سے خود اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور جو ان پر پردے ڈالتا ہے تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خود اس کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خدا اپنی ذات میں قابل حمد و ستائش ہے۔ تمہارے سہاروں کا محتاج نہیں ہے۔

خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں خدا کے قانون کے مطابق صرف میں لایا جائے۔ یعنی نوع انسانی کی ربوبیت کے لیے کھلا رکھا جائے۔ اس حقیقت کو سورۃ نحل میں ایک بستی کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ اس بستی میں رزق کی بڑی فراوانی تھی لیکن فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (16/112) انہوں نے خدا کی نعمتوں پر پردے ڈالنے شروع کر دیئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب آ گیا۔ ان کی طرف خدا کے رسول آئے لیکن انہوں نے ان کی بھی تکذیب کی۔ اس کے بعد جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16/114) اگر تم صرف اسی کے قانون کی اطاعت کرتے ہو تو۔ اس سے ظاہر ہے کہ شکر نعمت کے معنی ہیں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں (سامان رزق وغیرہ) کو خدا کے قانون کے مطابق عام رکھنا۔ اور کفر نعمت کے معنی ہیں انہیں اپنے خود ساختہ قوانین ونظریات (بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۔ 16/112) کے مطابق چھپا چھپا کر رکھنا۔ اسی کو سورۃ اعراف میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے کہ شٰكِرِيْنَ وہ ہیں جو ابلیس کی راہوں پر نہیں چلتے اور اس کے دام فریب میں نہیں آتے (7/17)۔

سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2/56) ہم نے تمہیں موت کے بعد نئی زندگی عطا کی تا کہ تم ''شکر کر سکو۔'' اس سے ظاہر ہے کہ قوموں کو ان کی موت کے بعد حیاتِ نو اس لیے ملتی ہے کہ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کر سکیں۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ زندہ نہیں کہلا سکتیں نہ ہی زندہ

رہ سکتی ہیں۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ:

① مساعی کے مشکور ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان میں بھرپور نتائج پیدا ہو جائیں۔ وہ پوری طرح ثمر بار اور نتیجہ خیز ہو جائیں۔

② انسان کی طرف سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو بے نقاب کرے یعنی

(الف) وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کرے اور

(ب) کائنات میں پھیلے ہوئے سامانِ نشوونما کو نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھے۔ ان پر پردے نہ ڈالے۔

③ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہ انسان کی طرف سے شکر ہوگا اور

④ خدا کی طرف سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ وہ انسانی اعمال میں بھرپور نتائج پیدا کر دے۔ یہ قانون خداوندی کی خصوصیت ہے کہ جو اس کے مطابق چلتا ہے اس کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔

ش ک ل

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (17/84) اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ کائنات میں ہر چیز کے اندر اس کی ممکنات (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں۔ آم کی گٹھلی میں یہ امکانی قوت رکھ دی گئی ہے کہ وہ مناسب نشوونما کے بعد آم کا درخت بن جائے جس میں آم جیسا میٹھا، خوشبودار، رنگین پھل آئے۔ لیکن کیکر (ببول) کا بیج اگرچہ درخت بن جاتا ہے لیکن اس میں کانٹے لگتے ہیں۔ آم کی گٹھلی کا منتہیٰ (Inner-Destiny) آم کا پھل ہے۔ کیکر کے بیج کا منتہیٰ کانٹے دار درخت۔ ان میں سے کوئی شے اپنی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جس کا امکان اس کے اندر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک جانور اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس تک اس کی شَاكِلَةٌ اسے پہنچے دیتی ہے۔ مندرجہ صدر آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اپنی شَاكِلَةٌ کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ فطرت نے اس کا جو منتہیٰ معین کر دیا ہے وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

یاد رہے کہ انسانی اختیارات کی ایک حد ضرور ہے (جس طرح وہ ایک پاؤں اٹھا کر تو کھڑا رہ سکتا ہے لیکن دونوں پاؤں اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا)۔ لیکن جس حد تک اسے اختیار دیا گیا ہے اس میں وہ بالکل آزاد ہے۔ اس کے اختیار و ارادہ میں کوئی دخل انداز نہیں ہوتا۔

ش م ز

سورۃ زمر میں ہے: وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحۡدَہُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ (39/45) جب ان لوگوں کے سامنے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل منقبض ہوجاتے ہیں۔ وَاِذَا ذُکِرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِذَا ھُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (39/45) اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ انسان شخصیت پرستی سے خوش ہوتا ہے اور خالص قانون کی اطاعت اس پر شاق گزرتی ہے۔ اس لیے کہ انسانوں کو جذبات کی رو سے خوش کرلینا آسان ہوتا ہے اور قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ قرآن کریم نے جو دین نوع انسانی کے لیے تجویز کیا ہے اس میں خالص قانون خداوندی کی اطاعت مقصود تھی۔ شخصیت پرستی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن انسانی آمیزشوں نے اس دین کی حالت یہ کردی ہے کہ کوئی بات لیجئے، اس کی آخری سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے۔ خدا کا قانون (قرآن کریم) بہ حیثیت آخری سند (Final Authority) کے کہیں نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو ان ارباب من دون اللہ سے الگ کر کے خالص اطاعت خداوندی کی دعوت دی جائے تو وہ اس داعی کا سخت مخالف ہوجاتا ہے۔ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے (مندرجہ بالا آیت میں) توجہ دلائی ہے۔

ش ھ د

خدا کو شَہِیۡدٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ ہر چیز اس کی نگاہوں کے سامنے ہے (22/17)۔ اور رسول اس اعتبار سے شَاھِدًا (48/8) ہوتا ہے کہ جن حقائق کو وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھتا ہے (اسی کو نبوت کہتے ہیں) انہیں وہ دوسروں کے سامنے پوری قطعیت کے ساتھ بیان کردیتا ہے (اسے رسالت کہتے ہیں)۔ یا اس لیے کہ وہ اپنی جماعت کے اعمال کا نگران (شَہِیۡدًا) ہوتا ہے (2/143)۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو جو شَہِیۡدٌ کہا جاتا ہے تو یہ اصطلاح قرآن کریم نے استعمال نہیں کی۔ یعنی قرآن کریم نے ایسے شخص کو اس لفظ سے مختص نہیں کیا۔ ویسے معنوی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو شہید زندہ انسان بھی ہوسکتا ہے اور (جسمانی طور پر) مردہ بھی۔ جو شخص اپنے مَآ اٰمَنَ بِہٖ (جس پر وہ ایمان رکھتا ہے) کی عملی شہادت پیش کردے وہ شہید ہے۔ خواہ جان سے ہو یا مال سے یا کسی اور مطلوب شے سے۔ اور پھر آخر وقت تک اس روش پر قائم رہے۔ راہ خدا میں جان دینا، اپنے ایمان کی صداقت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

قرآن کریم کی رو سے پوری کی پوری ملت اسلامیہ شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2/143) ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی (مختلف اقوامِ عالم) کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی۔ ان سب پر نگران۔ اور ان کا مرکز (رسولؐ) ان کے اعمال کا نگران (2/143)۔ غور

کیجئے کہ ملت اسلامیہ کا دنیا میں فریضہ کیا تھا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اس کا مقام کس قدر بلند تھا۔ ایک وہ ملت اسلامیہ تھی اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہیں کہ دوسروں کے اعمال و کردار کے نگران و محاسب ہونا تو ایک طرف، ہم اپنی ذرا ذرا سی ضرورت کے لیے بھی غیروں کے محتاج ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ ملت، قرآن کریم کو اپنا ضابطہ حیات سمجھتی تھی اور ہم افسانوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

ش ھ و

سورۃ مریم میں مختلف انبیاء کے تذکرہ کے بعد ہے: فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (19/59) ان کے بعد ایسے لوگ آ گئے جنہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے۔ اس کے معنی واضح ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ قوانین خداوندی کے پیچھے چلیں وہ اپنے جذبات اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ اگر انسانی خواہشات کو وحی کی روشنی میں پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ جنتی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے لیکن اگر انہیں وحی کی پابندیوں کو توڑ کر پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا (19/59)۔

ش و ر

مشورہ کے معنی ہوئے دوسرے کے خیالات کا نچوڑ حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ اور اگر خود شہد سے مفہوم لیا جائے، تو جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے اپنی محنت کا ماحصل ایک جگہ جمع کر دیتی ہیں، مشاورت کے معنی ہوں گے مختلف افرادِ معاشرہ کی اپنی اپنی رائے، فکر، خیالات اور غور و خوض کے نتائج کو ایک جگہ جمع کر دینا تا کہ اس سے کسی فیصلہ تک پہنچا جائے۔

قرآن کریم نے نوع انسانی کی راہنمائی کے لیے اصولی قوانین دیئے ہیں جو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہیں۔ قرآنی نظام یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود وضع کریں۔ یہ چیز باہمی مشورہ سے طے ہوگی۔ اسی لیے جماعت مومنین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42/38)۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ چونکہ سب سے پہلے قرآنی نظام خود نبی اکرم ﷺ نے قائم کیا تھا، اس لیے حضور ﷺ کو بھی حکم دیا گیا کہ شَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ (3/158) معاملات میں ان (مومنین) سے مشورہ کیا کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ چونکہ مشورہ کا حکم تمام مومنین کے لیے ہے اس لیے ان کا نظام شریعت کبھی جامد اور متصلب (Rigid and Static) نہیں ہوسکتا۔ ہر دور کے مومنین اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھیں گے۔ اگر ان کے زمانے کا تقاضا ہو تو وہ باہمی مشورہ سے، کسی سابقہ دور کے فیصلوں میں رد و بدل بھی کر سکتے ہیں اور نئے فیصلے بھی کر سکتے

ہیں۔اس طرح قرآن کریم کے غیر متبدل اصول تو اپنی جگہ قائم رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں وضع کردہ جزئیات زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔ یہ ہے مشاورت کے قرآنی حکم کا عملی مفہوم۔یہی خود رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا(جس پر قرآن کا حکم شاہد ہے)اس لیے سنت رسول اللہ ﷺ بھی یہی ہے کہ ہر دور کے مسلمان ایسا ہی کریں۔یہی وہ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ (4/115) ہے جس کے اتباع کا حکم ہے۔مغربی انداز حکومت میں کوئی شے غیر متبدل نہیں ہوتی۔قوم جس قسم کے فیصلے چاہے کرسکتی ہے۔ان فیصلوں کے اوپر کوئی ایسی پابندی یا حدود نہیں جن کا علی حالہ رکھنا ضروری ہو۔اس طرز حکومت کو سیکولر (Secular) کہتے ہیں۔دوسری طرف قدامت پرستی کے مسلک کی رو سے شریعت میں کوئی چیز قابل تغیر و تبدل نہیں۔جو فیصلے پہلے ہو چکے ہیں وہ من وعن نافذ ہوتے رہیں گے۔ان دونوں کے برعکس قرآنی نظام یہ ہے کہ قرآن میں بیان کردہ احکام و اصول غیر متبدل ہیں۔ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر قوم اپنے اپنے زمانے اور حالات کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی۔اس طرح ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے امتزاج سے، انسانی زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی جائے گی۔

ش ی أ

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (2/20) یہاں شے کے معنی چیز، معاملہ یا حقیقت کے ہیں۔سورۃ بقرہ میں ہے: لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا (2/48)''(جس دن) کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہیں آئے گا۔''

اس حقیقت کے سمجھ لینے کی بڑی ضرورت ہے کہ''خدا کی مشیت''سے اصل مفہوم کیا ہے؟ ہمارے ذہنوں میں خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا تصور یہ ہے کہ اس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔نہ کوئی اصول ہے نہ کوئی ضابطہ۔وہ ایک خود مختار (اور معاذ اللہ) مطلق العنان حاکم کی طرح جو جی میں آئے کرتا چلا جائے۔کبھی خوش ہوا تو جاگیر بخش دی، ناراض ہو گیا تو گاؤں کا گاؤں ہلاک کر دیا۔

خدا کے قادر مطلق ہونے کا وہ مفہوم قطعاً نہیں جو اوپر لکھا گیا ہے۔اس لیے خدا کی مشیت کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی قانون اور ضابطہ کا کوئی دخل نہیں۔

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کہ ہر شے علت اور معلول (Cause and Effect) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے۔لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ضرور ایسا آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور وہاں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک معلول (Effect) بغیر کسی سابقہ علت (Cause) کے ظہور میں آ گیا ہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمام کائنات کا سلسلہ، خدا کی مرضی، منشاء، ارادہ اور پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلہ

کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا۔ اس مقام پر مشیت خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہاں یہی کہا جائے گا کہ اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (36/82) اس گوشہ میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے۔ (''کہہ دینے'' کے معنی یہ نہیں کہ وہ سچ مچ ''کن'' کا لفظ زبان سے نکالتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی پیدائش کا آغاز ہو جاتا ہے)۔

اس سے آگے بڑھیے تو ہمارے سامنے کائنات کا محسوس سلسلہ آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز ایک خاص قانون اور قاعدے کے مطابق عمل کر رہی ہے۔ اس گوشہ میں خدا نے اپنے امر کو پیمانوں اور اندازوں کے اندر محدود کر دیا ہے۔ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرًا (33/39) یہاں خدا کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔ یعنی اب کائنات کی ہر شے ان قوانین کے تابع چلنے لگی جنہیں خدا نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق (اول الذکر گوشے میں) بنایا تھا۔ اس کے لیے کہا گیا ہے کہ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا (65/3) اللہ نے ہر شے کے لیے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔ یہ تمام پیمانے (قوانین فطرت) خدا ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں لیکن خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان قوانین میں دخل اندازی کی نہیں جائے گی۔ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا (33/61) ''تو سنت اللہ (خدا کے قاعدوں) میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ اس گوشے میں مشیت خداوندی کے معنی ہوں گے خدا کے وہ قوانین جن کے مطابق یہ تمام سلسلہ کائنات چل رہا ہے کائنات کی کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکے۔ چونکہ اس پہلے گوشے کے متعلق (جہاں سے کائنات کی ابتدا ہوتی ہے اور ہر شے کے لیے قانون مقرر کیا گیا ہے) ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے حیطہ ادراک سے باہر ہے۔ اس لیے ہم خدا کے متعلق جو کچھ جان سکتے ہیں وہ ان قوانین ہی کی رو سے جان سکتے ہیں جو کائنات میں کارفرما ہیں۔ یعنی مشیت خداوندی کا یہ گوشہ، علم و تجربہ کی بنا پر ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے۔

انہی قوانین کی رو سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے خدا نے انسان کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جون سا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ (18/29) جس کا جی چاہے ایمان کی راہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔ یعنی خارجی کائنات کی چیزوں کے برعکس، انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی پابندی کرے جو اس کے لے وضع کیے گئے ہیں اور چاہے تو ان سے سرکشی برت لے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ فلاں روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا اور فلاں کا نتیجہ کامرانی و کامیابی۔ یعنی اس گوشے میں انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جونسی روش جی چاہے اختیار کر لے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ اپنے اعمال کے نتائج بھی

اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرلے۔ اس کا ہر عمل وہی نتیجہ مرتب کرے گا جو اس کے لیے قانون خداوندی (مشیت) نے مقرر کر رکھا ہے۔ مثلاً اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو سنکھیا کھالے اور جی چاہے تو مصری کی ڈلی منہ میں ڈال لے۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ سنکھیا کھا کر اس کا نتیجہ مصری کی ڈلی کا سا پیدا کرلے۔ یہ قوانین کہ فلاں روش کا نتیجہ کیا ہوگا، انسان کو وحی کے ذریعہ عطا کیے گئے ہیں (جو آج قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) لہٰذا جب انسان، خدا کے متعلق کچھ سمجھنا چاہے گا تو اسے قوانین فطرت کو بھی سمجھنا ہوگا جو خارجی دنیا میں کارفرما ہیں اور وحی کے قوانین کو بھی جو اس کی اپنی دنیا سے متعلق ہیں۔ جب وہ ان دونوں قوانین کو سمجھ لے گا تو یہ حقیقت بھی اس کے سامنے آجائے گی کہ یہ دونوں قوانین درحقیقت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ کے متعلق مَا يَشَآءُ کا لفظ آیا ہے وہاں یہ دیکھنا ضروری ہوگا وہ متذکرہ صدر تینوں گوشوں میں سے کس گوشے سے متعلق ہے۔ جس گوشے سے مَا يَشَآءُ متعلق ہوگا اس ے مطابق اس کا مفہوم لیا جائے گا۔ ہر جگہ اس کے ایک ہی معنی لینے سے ذہن میں وہ تمام الجھاؤ پیدا ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں۔ تضاد صرف ہماری اپنی کوتاہ نگہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ (اس جگہ صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گی)۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے: يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (2/142) اس کے واضح معنی ہیں کہ جو شخص خدا سے راہنمائی لینا چاہے خدا اسے راہنمائی دیتا ہے۔ یعنی مَنْ يَّشَآءُ کے معنی ہیں جو شخص چاہے۔ لیکن اگر اس کے معنی یہ کیے جائیں کہ ''اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی طرف سے راہنمائی اس کے قانون مشیت کے مطابق ملتی ہے۔ (یعنی مَنْ يَّشَآءُ کے معنی قانونِ مشیت کے ہوں گے)۔ اس قانون کی تفصیل قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے: يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ (5/16) یعنی اللہ اس (قرآن) کے ذریعے اسی کو راہنمائی دیتا ہے جو اس کے قانون کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرنا چاہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ یعنی اس کے لیے ابتداء (Initiative) ہمیشہ انسان کی طرف سے ہوگی۔ اگر یہ قوانین خداوندی کے مطابق چلتا جائے گا تو اسے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی مل جائے گی۔ اگر یہ اس سے انحراف برتے گا تو اس کا رُخ تباہی کی طرف مڑ جائے گا۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (61/5) جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانون) نے ان کے دل ٹیڑھے کردیئے۔

سورہ بقرہ میں اس حقیقت کو ایک اور انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک کمانڈر مقرر کردیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو کمانڈر مقرر کردیا تو بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کا انتخاب کس خصوصیت کی بنا پر ہوا ہے، حالانکہ وہ صاحب مال و دولت نہیں۔ اس کے جواب میں نبی نے کہا کہ اسے اس لیے منتخب کیا گیا

ہے کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (2/247) اللہ نے اسے جسمانی قوت اور علم فراواں عطا کیا ہے۔ یعنی انہیں بتا دیا کہ خدا کا انتخاب یونہی اندھا دھند نہیں ہوتا۔ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے جسے جو کچھ ملتا ہے اس لیے ملتا ہے کہ اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہے: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (2/247) اللہ کی طرف سے قوت و ملک اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے۔ یہاں مَنْ يَّشَآءُ کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی قانون کے مطابق، یونہی اندھا دھند نہیں۔ یہاں سے سورۃ آل عمران کی اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (3/25) قوت و اختیار اور عزت و حکومت کا ملنا اور چھننا ''مشیت'' پر موقوف ہے۔ یعنی یہ سب اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جس کی بنیاد اس پر ہے کہ جس قوم میں صلاحیت ہوتی ہے اسے اقتدار و اختیار ملتا ہے (21/105)۔ جس میں صلاحیت نہیں رہتی اس سے یہ چھن جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ مشیت ایزدی (قانونِ خداوندی) کے تین گوشے ہیں:

① وہ گوشہ جہاں ہر شے کے لیے قوانین متعین ہوتے ہیں۔ اس گوشے میں خدا کا امر کارفرما ہوتا ہے اور سب کچھ اس کے اپنے پروگرام کے مطابق طے پاتا ہے۔ ہم اس گوشے کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے۔

② دوسرا گوشہ خارجی کائنات کا ہے۔ جہاں ہر شے ان قوانین کے مطابق چلنے پر مجبور ہے جو اس کے لیے گوشۂ اول مقرر رہتے ہیں۔ ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے۔

③ تیسرا گوشہ انسانی دنیا کا ہے۔ اس کے ایک حصہ (انسان کی طبعی زندگی) میں تو وہی قوانین کارفرما ہیں جو خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ لیکن اس کی انسانی سطح پر جن قوانین کی ضرورت ہے انہیں وحی کے ذریعے عطا کیا گیا ہے۔ یہ قوانین (مستقل اقدار) بھی غیر متبدل ہیں۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے۔ وہ جیسی روش اختیار کرے گا اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے۔ جتنی صلاحیت پیدا کرے گا اتنی ہی خوبیاں اور بڑائیاں اسے حاصل ہو جائیں گی۔ اسے خدا کا قانونِ مکافات کہتے ہیں جو غیر متبدل ہے۔

یہ ہے مشیت خداوندی سے مفہوم۔ واضح رہے کہ جس گوشے میں خدا نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے، وہ (خدا) اس میں کبھی مخل نہیں ہوتا۔ اس میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے اور اس سے کہہ دیا گیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41/40)۔ اس گوشے میں تم اپنی مرضی (مشیت) کے مطابق عمل کرو۔ ''جو تم چاہتے ہو کرو، ہم مخل نہیں ہوں گے۔'' البتہ تمہارے اعمال کے نتائج قانونِ مشیت خداوندی کے مطابق مرتب ہوں گے۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (41/40)۔

اس ضمن میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے انسان کے ذہن میں عجیب الجھاؤ پیدا ہوتا

ہے۔سورہ دہر میں ہے:اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76/29)''یہ قرآن کریم یقیناً ایک یاددہانی ہے، سوجس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف (کا) راستہ اختیار کرلے۔'' یہاں تک تو بات بالکل صاف ہے۔یعنی خدا کی طرف سے وحی مل گئی ہے۔اس کے بعد انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو اس وحی کا تجویز کردہ راستہ اختیار کرلے اور جی چاہے تو اس کے خلاف عمل کرے۔لیکن اس کے آگے ہے:وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76/30)اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے''اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو اللہ چاہے۔''اس ترجمہ کی رو سے (ظاہر ہے کہ) نہ صرف یہ کہ یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی نقیض بن جاتی ہیں بلکہ انسانی اختیار وارادہ کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔یعنی ایک طرف تو قرآن کریم کہتا ہے کہ تم چاہو تو ایسا کرلو اور چاہو تو ویسا۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چاہ نہیں سکتے۔تم وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسے تم اپنا فیصلہ کہتے ہو وہ دراصل تمہارا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے تم سے کرالیتا ہے۔لہٰذا انسان مجبورِ محض ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔یعنی کہ تم جیسا جی چاہے کرو۔لیکن تمہیں چاہیے یہ کہ اپنے اختیار وارادہ کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔

ش ی ع

وہ لوگ جو کسی کے پیچھے چل کر ایک پارٹی بن جائیں اور اس طرح ایک دوسرے کی تقویت اور مدد کا موجب ہوں۔اگر یہ اتباع قانونِ خداوندی ہے جس میں تعاون بِرّ اور تقویٰ میں ہوتا ہے تو اس پارٹی کا نام جماعت مومنین ہے، جن کے ساتھ شامل ہونا باعث صد فخر وسعادت ہے۔چنانچہ قوم نوح کے مومنین کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (37/83) یقیناً ابراہیم ان ہی کے گروہ میں سے تھا۔لیکن اگر اس قسم کی گروہ بندی انسانوں کے پیچھے چل کر بنائی جائے تو قرآن کریم اسے شرک قرار دیتا ہے۔چنانچہ اس نے امت مسلمہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (3/103)تم سب کے سب اس کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ○ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ○ (30/31-32) (دیکھنا تم مومن بن جانے کے بعد کہیں) مشرک نہ بن جانا۔یعنی ان لوگوں جیسے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کرلیے اور گروہوں میں منقسم ہوگئے۔(اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہر فرقہ اس پر اکڑتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔لہٰذا قرآن کریم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کون سا فرقہ حق پر ہے اور کون سا باطل پر، جبکہ اس کی رو

سے خود فرقہ بندی ہی شرک ہے۔ اسی بنا پر اس نے رسول سے کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (6/160) جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور گروہ گروہ بن جائیں اے رسول! تیرا ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے پیدا ہو چکے ہیں تو ان میں وحدت کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ وہی صورت جسے قرآن کریم نے خود واضح کر دیا ہے۔ یعنی اِعْتِصَامٍ بِحَبْلِ الله۔ خدا کی کتاب کو مرکز قرار دے کر نظام قائم کر لینا۔ اس سے فرقے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اگر شخصیتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے اور ایک نظام کے ذریعہ اطاعت صرف اللہ کی کی جائے تو فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ (''نظام کے ذریعے قرآن کریم کی اطاعت'' کی شرط بڑی اہم ہے۔ انفرادی طور پر، اپنے اپنے خیال کے مطابق، خدا کی اطاعت سے فرقے پیدا ہوتے ہیں۔ نظام کی رو سے اطاعت خداوندی سے وحدت امت برقرار رہتی ہے)۔ یہ بھی واضح رہے کہ فرقوں سے مراد صرف مذہبی فرقے ہی نہیں، سیاسی پارٹیاں بھی ہیں۔ مومنین تو ایک طرف، قرآن کریم نے ہر قوم میں فرقہ بندی، پارٹی بازی اور گروہ سازی کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے (6/65)۔ اس نے بتایا ہے کہ دنیا میں ''حکمتِ فرعونی'' ہمیشہ یہی کرتی ہے۔ یعنی پارٹیاں بناتی اور توڑتی رہتی ہے (28/4)۔

صالح علیہ السلام

امم سامیہ میں جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عادِ اولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادی قریٰ کہتے تھے۔ حجر اِن کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ ان کا علاقہ بڑا پر فضا اور زرخیز تھا (26/146-47)۔ یہ لوگ میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے تھے جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (7/74)۔

اس قوم کی طرف، انہی کے بھائی بند، حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے (7/73)۔ انہوں نے ان تک وہی پیغام پہنچایا جو اس سے پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ اپنی اپنی قوم تک پہنچا چکے تھے۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (7/73)۔ ''اے میری قوم! تم اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں''۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (7/74)۔ ''ملک میں سرکشی کرتے ہوئے فساد نہ پھیلاتے پھرو''۔ حسب معمولی مترفین کے طبقہ (سردارانِ قوم) نے اس دعوت کی مخالفت کی (7/75)۔

اس زمانے میں مویشی اور چراگاہیں، چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے۔ ارباب اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لیے مختص کر لیتے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکوں مر جاتے۔ حضرت

صالحؑ نے سردارانِ قوم سے کہا کہ رزق کے یہ سرچشمے تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہیں۔ یہ بات ایسی معقول تھی کہ ان سے اس کا جواب نہیں بن سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تا کہ کسی پر زیادتی نہ ہو۔ وہ اس پر بھی راضی ہو گئے تو آپ نے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔ اسے میں اس کی باری کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ تم نے اگر اسے آزاد چرنے اور اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائے گا۔ کہ تم اپنے معاہدے میں سچے ہو۔ اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روشِ کہن پر قائم ہو۔ (7/73)۔ انہوں نے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا (7/77)۔ اور خدا کے عذاب نے (جو کڑک اور زلزلہ کی شکل میں نمودار ہوا) انہیں تباہ کر دیا (7/78)۔

ص ب ر

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا: لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ (2/61)۔ ہم ایک ہی کھانے پر ہمیشہ کے لیے نہیں رہ سکتے۔ اسی سورۃ (بقرۃ) میں ہے: رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا'' (2/250) نے صبر کے معنوں کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی ثابت قدم رہنا۔

سورۃ آل عمران میں صَابِرِیۡن کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَآ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا (3/146)۔ انہیں خدا کی راہ میں جس قدر بھی مشکلات کا سامنا ہوا ان سے وہ نہ تو سست گام ہوئے، نہ ان میں کمزوری آئی، اور نہ ہی وہ مغلوب ہوئے۔ اگلی آیت میں اسی کو پھر ''ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا سے تعبیر کیا گیا ہے (3/146)۔

سورۃ انفال میں ہے کہ اِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ يَغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ (8/65)۔ اگر تم میں سے بیس مجاہد بھی ایسے ہوں جو جم کر مقابلہ کریں تو فریق مخالف کے دو سو پر غالب آ جائیں گے۔

سورۃ مریم میں ہے: وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ (19/65)۔ خدا کی عبادت نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے اختیار کرو۔ یہ ہے وہ صَبۡرٌ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ (2/153) اپنی قوتوں کی پوری نشوونما اور اعتدال وتناسب کے لیے صبر اور صلوٰۃ کی راہ اختیار کرو۔ اور اس کے بعد ہے: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ۔ اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لیے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں، اور مسلسل ایسا کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ صابر جن کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ (2/157)۔

یہ ہے صَبۡرٌ کا قرآنی مفہوم۔ اس کے برعکس صبر کے جو معنے ہمارے ہاں مروج ہیں وہ بالکل اس کی ضد ہیں۔ ہمارے

ہاں صبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان بے کس، مجبور بن کر بیٹھا رہے اور زبردست اور ظالم کے ظلم وزیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلتا ہے چلا جائے۔ چنانچہ ہم اپنی انتہائی بیچارگی میں کہتے ہیں کہ ''اچھا! جو تمہارے جی میں آئے کرلو۔ میں صبر کے سوا کیا کرسکتا ہوں''۔ اور اسی کی تلقین یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ ''میاں! صبر کرو۔ صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے''۔

یعنی صبر انتہائی بیچارگی کا نام ہے۔ غور کیجئے کہ نگاہوں کا زاویہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم کیا سے کیا ہوجاتا ہے؟ قرآنی صبر کا مفہوم تھا ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ اور ہمارے صبر کا مفہوم ہے انتہائی بے چارگی میں سپر ڈال دینا۔

دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، نہ آگے بڑھ سکتی ہے، جب تک وہ قرآنی مفہوم میں) اَلصَّابِرُ نہ ہو۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں ''صابروشاکر'' ہو اسے کبھی زندگی نصیب نہیں ہوسکتی۔

ص ب غ

قرآن کریم میں ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (2/138)۔ اللہ کا رنگ۔ اس رنگ سے زیادہ حسن وزیبائی پیدا کرنے والا رنگ اور کون سا ہوسکتا ہے! سوال یہ ہے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب آیت کے باقی حصے نے خود ہی دے دیا۔ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (2/137)۔ یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت اختیار کرلینا۔ ایسی اطاعت جس طرح رنگ کپڑے کے رگ وریشے میں سرایت کرجاتا ہے اور اس میں یکسر تبدیلی پیدا کردیتا ہے۔ لہٰذا قوانین خداوندی کی ہم آہنگی سے انسان کے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے جو اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ ایک بالکل ''دوسرا'' انسان بن جاتا ہے۔ یعنی اس کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پالیتی ہیں اور اس میں صفاتِ خداوندی کا رنگ منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جس طرح اللہ کی ذات میں مختلف اور متضاد قسم کی صفات (مثلاً غفور ورحیم اور جبار وقہار) اس طرح متوازن طور پر جمع ہیں کہ ان میں کبھی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ (انہی کو الاسماء الحسنیٰ کہتے ہیں۔ یعنی مختلف صفات کا حسن کارانہ انداز سے یک جا ہونا)۔ اسی طرح انسان کے اندر یہی متضاد صفات پورے توازن کے ساتھ یکجا رہتی ہیں اور ان میں کبھی کشمکش نہیں ہوتی۔ لیکن یہ چیز صرف معاشرہ کے اندر ممکن ہے۔ اس لیے صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد کوئی ایسی ''روحانیت'' نہیں جسے خانقاہوں میں چلہ کشی سے حاصل کیا جائے یا اس میں کسی باطنی طریق سے ترقی کی جائے۔ یہ نام ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو قرآنی معاشرہ کے اندر ممکن ہے۔

ص ح ب

قرآن کریم میں اَصْحَابُ النَّارِ اور اَصْحَابُ الْجَنَّةِ آیا ہے۔ اَصْحَابٌ کا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنت اور دوزخ مادی مقامات کا نام نہیں جن میں رہنا ہوگا۔ یہ کیفیات کا نام ہے جو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، اور لگی

رہیں گی۔

ص ح ف

رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے: يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (98/6)۔ جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے۔ ان لکھی ہوئی آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتا ہے جو ہر قسم کے اسقام ونقائص سے پاک اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزہ ہیں۔ غور کیجئے۔ قرآنی آیات کو صحف کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ شروع ہی سے لکھی جاتی تھیں۔ اس کی تفسیر (15-80/13) میں کر دی، جہاں فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ کہہ کر بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ سے اس کی تشریح کر دی کہ وہ، واجب العزت والتکریم کاتبوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پورے قرآن کریم کو لکھا کر اُمت کو دے کر گئے تھے۔ یہ صحیح نہیں کہ اسے بعد میں صحابہؓ نے جمع کیا تھا۔

ص د ر

قرآن کریم نے اپنے آپ کو وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (10/57)۔ کہا ہے۔ یعنی تمام ذہنی اور نفسیاتی امراض [1] کے لیے شفاء۔

ص د ع

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کائنات میں ہر شے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ (بِالْحَقِّ)۔ لیکن ہم دیکھتے ہین کہ اس میں بعض عمل تخریبی بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تخریب درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہے۔ مثلاً ہم زمین میں تخم ریزی کرتے ہیں تو اس کے بعد دانہ پھٹ جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ زمین بھی شق ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ تخریبی عمل ہے۔ لیکن اس سے فصل کی ابتداء ہوتی ہے جو یکسر تعمیری نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر تعمیر سے پہلے تخریبی عمل ہوتا ہے۔ اَللّٰهُ سے پہلے لَآ اِلٰهَ ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی پروگرام میں صرف لَآ ہی لَآ ہو تو وہ تخریب ہی تخریب پیدا کرتا ہے۔

ص د ق

جب قرآنی نظام اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں جو کچھ افراد کی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب معاشرہ (یا نوع انسانی) کی فلاح وبہبود کے لیے وقف ہو جاتا ہے۔ لیکن عبوری دور میں اسلامی معاشرہ ایک معین رقم افراد پر واجب قرار دیتا ہے، جو عام حالات میں وصول کر لی جاتی ہے۔ (اس کے لیے زکوٰۃ کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کر لیا گیا ہے)۔ لیکن

---

[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم اپنی زندگی قرآنِ حکیم کے عملی پروگرام کے مطابق ڈھال لیں تو پھر نہ ہمیں کوئی ذہنی مرض لاحق ہوگا اور نہ ہی کوئی نفسیاتی بیماری ہمیں گھیرے گی۔ (منظور الحسن مؤلف کتاب ہذا)

ہنگامی حالات (Emergency) میں افراد سے اپیل کی جاتی ہے۔ جو کچھ وہ اس طرح دیتے ہیں وہ صَدَقَۃٌ ہے۔ لیکن یہ بھی اجتماعی طور پر وصول اور اجتماعی طور پر خرچ کیا جاتا ہے (9/103:9/60)۔

سورۃ بقرہ میں ہے کہ نیکی اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی کی راہ یہ ہے کہ تم صحیح تصوراتِ حیات کے بعد، اپنے اعمال و کردار سے انہیں سچ کر کے دکھا دو۔ ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے، اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا (2/177)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ عمل سے سچ کر دکھانے کے علاوہ، اعتقادات و تصورات حیات کے معاملہ میں صادق وہ ہے جو اپنے دعوی کی تائید میں دلیل و برھان پیش کر سکے (2/111)۔ اسی میں اس دعویٰ کی تقویت کا راز ہے۔

کسی واجب کام کے نہ کر سکنے کی وجہ سے جو کچھ بطور کفارہ دیا جاتا ہے اسے بھی صَدَقَۃٌ کہا گیا ہے (2/196)۔ سورۃ بقرہ میں صَدَقَاتٌ کا لفظ الرِّبٰوا (سود) کے مقابلہ میں آیا ہے (2/276)۔ یعنی رِبٰوا تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارا واجب ہے اس سے زیادہ لو، اور صَدَقَۃٌ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر واجب ہے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لیے) اس سے بھی زیادہ دو۔ اسی لیے کہا ہے کہ یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ (2/276)۔ ربٰوا (جسے تم بزعمِ خویش سمجھتے ہو کہ ہم نے زیادہ وصول کر لیا) تباہ و برباد ہو کر رہتا ہے اور صدقات (جسے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خواہ مخواہ دے دیا) بہت بڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق بار بار کہا ہے کہ یہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ (2/41) ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اہل کتاب کے پاس ان کی مزعومہ کتابیں بالکل سچی ہیں۔ یہ معنی اس لیے غلط ہیں کہ خود قرآن کریم میں ان کتابوں کی بابت واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان میں تحریف و الحاق ہو چکا ہے۔ لہٰذا جن کتابوں کو قرآن کریم خود محرّف قرار دے رہا ہو وہ ان کے سچا ہونے کی تصدیق کس طرح کر سکتا ہے؟ دراصل (مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ) میں ایک بڑی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ عام اخلاقی اصول دنیا کی ہر قوم کے پاس بالعموم موجود ہیں۔ سب کی تعلیم یہ ہے کہ سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ کسی کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے ہاں یہ تعلیم محض نظری حیثیت سے موجود ہے۔ کوئی عملی نظام ایسا نہیں جو اس تعلیم کو سچا کر کے دکھائے۔ قرآن کریم کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ یہ صرف اس تعلیم کو بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا عملی نظام بھی دیتا ہے جس میں یہ تعلیم سچ بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا لیکن اس کے باوجود ہم ظالموں کو پنپتا دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے کہ اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ (6/135) لیکن وہ اس کے ساتھ ایک عملی نظام ایسا دیتا ہے جس میں یہ اہم حقیقت (کہ ظالم کی کھیتی کبھی بار آور نہیں ہو سکتی) عملاً سچ بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ۔ یعنی وہ اخلاقی اصول جو دنیا میں محض نظری تعلیم بن کر رہ چکے ہیں قرآنی نظام میں ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائیں گے، اور

اس طرح دنیا دیکھ لے گی کہ وہ اصول فی الواقعہ صداقت پر مبنی ہیں۔ اس طرح قرآن کریم ان اصولوں کو سچ کر کے دکھا دینے والا ہے۔ جو اقوام عالم کے ہاں موجود ہیں اور ان اصولوں کو بھی جو ان کے علاوہ، قرآن کریم میں آئے ہیں اور جن سے آسمانی ہدایت عالمگیر اور مکمل ہوئی ہے نیز اس اعتبار سے بھی کہ کتب سابقہ (تورات و انجیل) میں ایک ایسے آنے والے نبی کے متعلق جس قدر نشانات مذکور تھے قرآن کریم نے ان سب کو نبی اکرم ﷺ کے ظہور میں سچا ثابت کر دیا۔

صِدْقٌ کسی شکل میں بھی استعمال ہو، اس میں دل کی ہم آہنگی اور رضامندی کا پہلو ضرور شامل ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کیا جائے یا دیا جائے وہ بھی دل کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے ہو اور جو کچھ مانا اور تسلیم کیا جائے وہ بھی بطیب خاطر ہو۔ اس میں جور و اکراہ کا شائبہ تک نہ ہو۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ انسان کی ہر بات اور ہر عمل دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہی وہ عمل ہے جو وجہ تقویت ہو سکتا ہے۔

ص ر ط

قرآن کریم نے الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (1/5) کو دوسرے مقام پر طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ (46/30) کہہ کر صِرَاطٌ کے معنے طَرِيقٌ (راستہ) بتا دیئے ہیں۔ (قرآن کریم میں پل صراط کا کوئی ذکر نہیں)۔

ص ر ف

قرآن کریم میں تَصْرِيفِ الرِّيحِ (2/164) متعدد مقامات میں آیا ہے۔ یعنی ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانا یا ان کی حالت بدل دینا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ (17/41 نیز 17/89؛ 18/54)۔ ہم نے اس قرآن کریم میں حقائق و قوانین کے مختلف پہلوؤں کو لوٹا لوٹا کر بیان کیا ہے۔ لِيَذَّكَّرُوْا (17/41) تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ تاکہ ان کے تمام پہلو لوگوں کی نگاہ کے سامنے آجائیں۔ قرآن کریم نے اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنے ایک چیز کو بار بار پھرا کر لانا تاکہ اس کے متعدد گوشے سامنے آجائیں۔ یہ چیز ہے جسے سطح بین نگاہیں ''تکرار'' ٹھہراتی ہیں۔

ص ع د

سورۃ فاطر میں ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔ خوشگوار نظریۂ حیات، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، بلند ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اس طرح اس کی رفتار انسانی حساب کے مطابق بہت سست ہوتی ہے۔ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (35/10)۔ عمل صالح اسے بلند کرتا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ صحیح نظریاتِ زندگی میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلند

ہوتے جائیں۔اور عام حالات میں وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتے رہتے ہیں۔لیکن اگر ان کے ساتھ انسانوں کے اعمال صالحہ شامل ہوجائیں توان کے ذریعے وہ بہت تیزی سے پروان چڑھ جاتے ہیں۔

ص ف ح

سورۃ حجر میں ہے فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ (15/85)۔ان سے نہایت جمال آفریں انداز سے کنارہ کش ہوکر (اپنی جداگانہ تنظیم کرتے جاؤ) (15/94)۔یعنی وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا (73/10)۔قرآن کریم کا انداز معاشرت ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی سے بنا کر رکھنا تو ایک طرف، اگر کسی سے کنارہ کش ہونا ہوتو بھی نہایت حسن کارانہ انداز سے، بڑی خوبصورتی سے، جمال آفرین ① کے اسلوب سے الگ ہو۔جو ضابطۂ حیات کسی سے کنارہ کشی کی صورت میں اس انداز کی تلقین کرتا ہو،غور کیجئے کہ وہ دوستداری اور رفاقت کے تعلقات کوکن بلندیوں تک لے جاتا ہوگا۔اوران میں کس قدر حسن پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوگا؟

ص ل ح

اعمالِ صالحہ کے معنی ہیں ایسے کام جن سے انسان کی مضمر صلاحیتیں بیدار ہوجائیں اوراس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔نیز جن سے معاشرہ کا حسن وتوازن قائم رہے اور ناہمواریاں دور ہوجائیں۔جو زندگی کی خوشگواریوں کو اپنے ساتھ لائیں۔ٹھیک وہ کام کرنا جو اُس وقت کے حالات کے عین مطابق اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو۔فساد اس کی ضد ہے۔

قرآن کریم میں آپ شروع سے آخر تک دیکھیں گے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آیا ہے۔یعنی قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اوراس کے ساتھ ہی صلاحیت بخش کام کرنا۔اس سے واضح ہے کہ ایمان اور عمل لازم وملزوم ہیں۔وہ اعمال جن کا سرچشمہ دل کا یقین نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو میکانکی طور پر (Mechanically) سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہوسکتے۔اسی طرح وہ ایمان جو اعمال صالحہ کا محرک نہیں بنتا، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے، جو اُسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمال بلا ایمان بے نتیجہ ہوتے ہیں۔سورۃ روم میں قرآن کریم نے مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا کے مقابلہ میں مَنۡ کَفَرَ لاکر (30/44)۔اس حقیقت کو واضح کردیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں توایمان، ایمان نہیں ہوتا۔

---

① وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اِک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا ساحرلدھیانوی

نیز اعمال بھی وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے صالح قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں اپنی دانست میں اعمال صالحہ سمجھیں۔ ان اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور نوعِ انسانی کے معاملات سنور جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے اعمال صالحہ کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دے دی۔ اعمال صالحہ سے اس کی مراد تمام ایسے کام ہیں جو مذکورہ خصوصیات کے حامل ہوں۔ یعنی جو کام زمانے کے تقاضوں کے عین مناسب ہوں بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں، کیونکہ اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان لانے کی شرط ہے۔ اگر ہم ایمان کے متعلق یہ کہیں کہ یہ ان بلند اقدار کی صداقت پر یقین محکم کا نام ہے اور اعمال صالحہ، ان اقدار کے تحفظ کو کہتے ہیں، تو یہ چیز حقیقت کے مطابق ہوگی۔ اسی کو بالالفاظ دیگر کیریکٹر کہا جائے گا۔ لہٰذا کیریکٹر پیدا نہیں ہوسکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو۔ یقین علم وبصیرت کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے۔

ص ل و(ی)

''صلوٰۃ'' دین کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآن کریم میں یہ اصطلاح اور اُس کے متعلقات بڑی کثرت سے آئے ہیں اس لیے یہ عنوان بڑا اہم اور اس کے مباحث خاص غور وفکر کے محتاج ہیں ہم انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کریں گے۔

قرآن کریم میں جو ہے: لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ (74/43)۔ ''ہم مصلین میں سے نہیں تھے''۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ''ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔'' صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم کیا ہے۔ اس سوال کے سمجھنے کے لیے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا، اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلندترین، مکمل ترین، مستحکم ترین، اور حسین ترین ہے۔ اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے۔ (اور اسے ''روحنا'' کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ذات، ذات خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے۔ اسے اپنی نشوونما کے لیے صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے۔ ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نے اپنی جو صفات وحی کے ذریعہ (قرآن کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشوونما کا موجب بنتا ہے۔ قرآن کریم نے صفات خداوندی کو ''الاسماء الحسنیٰ'' سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان اسماء (صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ کر، ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لیے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے) وہ یہ ہے کہ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (1/5)۔ یعنی اس توازن بدوش راستے کی طرف راہنمائی کی تمنا جو ہمیں انسانیت کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔ اور سورۃ ہود میں ہے:

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (11/56)۔ ''میرا رب صراط مستقیم پر ہے''۔ یعنی جس صراط مستقیم پر چلنے کے لیے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وہی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رہا ہے۔ ہم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے سے چل سکتے ہیں۔ لہٰذا صلٰوۃ کا بنیادی مفہوم ہے کتاب اللہ کے ساتھ پوری پوری وابستگی سے اپنے اندر (علی حد بشریت) صفات خداوندی کا منعکس کئے جانا۔

سورۃ نور میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ (24/41)۔ ''کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ وہ ہے کہ اس کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرندبھی۔ ہر ایک اپنی اپنی صلٰوۃ اور تسبیح کو جانتا ہے''۔ یعنی کائنات کی ہر شے اپنی صلٰوۃ اور تسبیح کو اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے (اپنی فطری جبلت کی رو سے) جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اسے کس راستے پر چلنا اور کس منزل تک پہنچنا ہے۔ اس کی جدوجہد کے دوائر کون سے ہیں۔ اسی چیز کو ان کی صلٰوۃ اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا علم (حیوانات کی طرح) جبلّی طور پر نہیں دیا گیا۔ اسے یہ سب کچھ وحی کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ جہاں تک اس کی طبعی ضروریات کا تعلق ہے، انسان ان چیزوں کا علم، عقل وفکر اور تجربہ ومشاہدہ سے حاصل کرسکتا ہے لیکن جہاں تک اس کی ''انسانیت'' کے تقاضوں کا تعلق ہے یہ چیزیں وحی کے ذریعے ہی معلوم ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا انسان کو یہ جاننے کے لیے کہ اس کی ''صلٰوۃ وتسبیح'' کیا ہے، وحی کا ماننا اور جاننا ضروری ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے وحی کے دیئے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ اسے قرآن کریم نے اِقَامَتِ صَلٰوۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ (2/3)۔ یعنی قوانین خداوندی کا اتباع کرنا۔

لیکن وحی کے دیئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا (اِقَامَتِ صَلٰوۃ) انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لیے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں حتّٰی کہ ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہی یہ بتایا ہے: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (22/41)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے''۔ انہی کو دوسری جگہ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (9/112)۔ کہا ہے۔ یعنی رکوع کرنے والے۔ سجدہ کرنے والے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ اقامت صلٰوۃ اور امور مملکت کے لیے باہمی مشاورت کا اِکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (42/38)۔ ''وہ اقامت صلٰوۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں''۔ اور چونکہ جماعت مومنین کی زندگی کے تمام امور قوانین خداوندی (کتاب

اللہ) کے مطابق سرانجام پاتے ہیں اس لیے سورۃ اعراف میں یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ اور وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے (7/170)۔ لہٰذا اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہے ایسا نظام (معاشرہ) قائم کرنا جس میں تمام افراد، قرآن کریم کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں، اور یوں کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں۔ اس مقصد کی مزید وضاحت کے لیے قرآن کریم میں صَلّٰی کے مقابلہ میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے (75/30-31)۔ تَوَلّٰی کے معنی ہیں صحیح راستہ سے روگردانی کرنا، گریز کی راہیں نکالنا، پھر جانا، منہ موڑ لینا۔ اس لیے صَلّٰی کے معنی ہوئے قوانین خداوندی کے مطابق صحیح راستہ پر چلتے جانا۔ نظام خداوندی کے متعین کردہ فرائض منصبی کو ادا کرتے جانا۔ سورۃ علق میں ہے: اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی ○ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی (96/9-10)۔ یعنی جب خدا کا بندہ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنا چاہتا ہے تو یہ (مخالف) اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

ان فرائض منصبی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کو یہ محیط نہ ہو۔ چنانچہ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم نے کہا کہ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11/87)۔ ''کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا اختیار کئے چلے آ رہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں''؟ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی صلوٰۃ ہے جو معاشیات تک کو بھی اپنے دائرے کے اندر لے لیتی ہے۔ اس سے بھی صلوٰۃ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں، قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلوٰۃ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو) بات سمٹ سمٹا کر یہاں آ جاتی ہے کہ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی مرضی (خواہشات اور جذبات) کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔ یا وحی خداوندی کے مطابق؟ اپنے تمام معاملات کو وحی خداوندی کے تابع رکھنے کا نام ''اِقامت صلوٰۃ'' ہے۔ چنانچہ سورۃ مریم میں ''اقامت صلوٰۃ'' اور ''اتباع جذبات'' کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (19/59)۔ (انبیائے کرام کے بعد) '' ایسے ناخلف پیدا ہو گئے کہ انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنے جذبات و خیالات (اپنی خواہشات) کے پیچھے چلنے لگ گئے'' گویا انسان کا اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کو ضائع کر دینا ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کا قائم رکھنا ہے۔ سورۃ انعام میں ''محافظت صلوٰۃ'' کو آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے مرادف قرار دیا گیا ہے (6/93)۔ اسی بنا پر ابن قتیبہ نے اَلصَّلٰوۃ کے معنی اَلدِّیْنَ کئے ہیں۔ یعنی اقامت صلوٰۃ درحقیقت اقامت دین ہے۔

صلوٰۃ کے ایک معنی جھکانا اور کسی کو اپنی طرف مائل کرنا بھی ہیں۔ اس جہت سے صلوٰۃ کا مفہوم ہوگا کائنات کو مسخر کرنا

اور اسے اپنے تابع فرمان بنانا۔

الصلوٰۃ کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں۔یعنی اپنے عملی پروگرام سے کائنات کونشوونما دینے والے (رب العالمین) کی عظمت کو ثابت کرنا۔ اس سے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا باہمی تعلق واضح ہوجاتا ہے۔یعنی قوانین خداوندی کے مطابق ایسا پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عملاً چلنا جس سے تمام نوع انسان کی نشوونما ہوتی جائے۔ایک عبد مومن، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے، وہ فریضۂ صلوٰۃ ہی کو ادا کررہا ہوتا ہے۔اس کے لیے وقت، مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔مثلاً

(ا) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ (5/6) ''اے ایمان والو جب تم صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔'' اس کے بعد ہے کہ اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمّم کرلیا کرو۔

(ب) سورہ نساء میں ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4/43)۔ ''اے ایمان والو! تم صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم حالتِ سکر (نشہ یا نیند) میں ہو۔ تآنکہ تم جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھو (کہ کیا کہہ رہے ہو)۔''

(ج) نبی اکرم ﷺ سے ارشاد ہے کہ وَاِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْیَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۔۔۔ (4/102) ''اور جب تو ان کے درمیان ہو پھر ان کے لیے قیام صلوٰۃ کرے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو، اور چاہیے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں۔ پھر جب وہ سجدہ کرچکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہوجائیں اور چاہیے کہ دوسرا گروہ جنہوں نے صلوٰۃ ادا نہیں کی وہ تیرے ساتھ صلوٰۃ ادا کریں۔ اور وہ اپنے بچاؤ (کا سامان) اور اپنے ہتھیار لیے رہیں۔'' اس کے بعد ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (4/102) ''پھر جب تم صلوٰۃ ادا کرچکو تو کھڑے، بیٹھے، لیٹے جس طرح جی چاہے اللہ کا ذکر کرو۔ پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو قیام صلوٰۃ کرو۔''

اس سے پہلی آیت یہ ہے: وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (4/101) ''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو اس میں تمہارے لیے ہرج کی بات نہیں کہ تم صلوٰۃ کو

کم کرلو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار (مخالفین) تمہیں تکلیف پہنچائیں گے۔''

سورۃ الجمعہ میں ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (62/9-10) ''جب جمعہ کے دن (یا اجتماع کے وقت) صلوٰۃ کے لیے بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی آجایا کرو اور کاروبار کو چھوڑ دیا کرو۔ اگر تمہیں (اس کی اہمیت کا) علم ہو (تو تم پھر اس حقیقت کو محسوس کرلو گے کہ) یہ تمہارے لیے (کس قدر) بہتر ہے۔ پھر جب صلوٰۃ ختم ہوجائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو اور ''اللہ کا بہت ذکر کیا کرو'' تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔''

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لیے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں، پہلوی[1] زبان کا ہے)۔ ان اجتماعات کے سلسلہ میں ایک خاص بات خاص طور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ''خدا کی عبادت'' سے مفہوم اس قسم کی ''پرستش'' یا ''پوجا پاٹ'' نہیں جو عام طور پر اہل مذاہب کے ہاں پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کا مفہوم خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت یا ''اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔'' ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ محکومیت زندگی کے ہر سانس اور کاروبار حیات کے ہر شعبہ میں اختیار کی جائے گی۔ اس کی عملی شکل وہ نظام مملکت ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل کیا جاتا ہے۔ اسی نظام کے حاملین کے متعلق فرمایا: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ○ (42/38) ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں اور اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں وہ اسے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لیے) کھلا رکھتے ہیں۔'' ان آیات میں اطاعت خداوندی، اقامت صلوٰۃ اور امور مملکت طے کرنے کے لیے باہمی مشاورت کا ارتباط غور طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے نافذ کے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرنے کے لیے باہمی مشاورت کی ضرورت ہوگی اور مشاورت کے لیے اجتماعات بھی ضروری ہوں گے۔ وسیع معنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اجتماعات بجائے خویش ''اقامت صلوٰۃ'' ہی کا ایک حصہ ہوں گے۔ لیکن ان اجتماعات میں ایک اور حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہوچکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم وغصہ، خوشی، تعجب، عزم وارادہ، ہاں اور نہ، وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار، انسان کی طبعی حرکات سے بلاساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذباتِ عزت واحترام اور اطاعت وانقیاد کے اظہار

---

[1] یعنی فارسی زبان کا۔

کی ہے۔ تعظیم کے لیے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لیے ''سرتسلیم خم'' ہوتا ہے۔ اگر چہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے اور محض بناوٹ (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لیے شکل (Form) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں بشرطیکہ اس شکل (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام وسجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آئی ہے وہ اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہو تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے گا۔ احترام وعظمت، انقیاد واطاعت، اور فرماں پذیری و خودسپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم وضبط کا ملحوظ رکھنا، بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ ہے جذبات اطاعت وتسلیم کے اظہار کی وہ منضبط شکل (صلوٰۃ) جسے قرآن کریم، جماعتِ مومنین کی مجالس و مشاورت کا ضروری حصہ قرار دیتا ہے۔ (جس طرح آج کل ہمارے ہاں جلسوں کی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے اگر چہ یہ چیز محض رسماً ادا کردی جاتی ہے)۔ ﴿وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ﴾ ان اجتماعات کے پیش نظر، قرآن کریم نے انہیں کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4/103) کہا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ''خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ۔'' اور دوسرے معنی ہیں ''ایسا فریضہ جو وقت پر ادا کیا جاتا ہے۔'' اجتماعات کے لیے وقت کی پابندی جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لیے سورۃ الجمعہ کی جو آیت پہلے درج کی جاچکی ہے، اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جب اس اجتماع کے لیے بلایا جائے تو اسے تمام دیگر مصروفیات پر ترجیح دو۔ تمام کاروبار چھوڑ کر فوراً اس طرف آجاؤ اور جب تک اس سے فارغ نہ ہوجاؤ کسی اور کام کی طرف دھیان مت دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا امیر، تمہارے سامنے ضروری معاملات پیش کررہا ہو، ان کی اہمیت سمجھارہا ہو اور تم کاروبار کے لیے باہر نکل جاؤ۔ (وَ تَرَکُوْکَ قَآئِمًا)۔

یوں تو جماعت مومنین کی ساری زندگی دن رات، صبح شام، قوانین خداوندی کی اطاعت اور ان کے نفاذ کی تگ و تاز میں گزرتی ہے لیکن اجتماعات کے لیے خاص اوقات کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ خواہ یہ اجتماعات معمولاً منعقد ہوں یا ہنگامی طور پر بلائے جائیں۔ ذہن انسانی کی توہم پرستیوں نے جہاں زندگی کے اور گوشوں میں ''سعد ونحس'' کے افسانے تراشے تھے وہاں دن اور رات کے بعض اوقات کے لیے بھی اس قسم کے تصور قائم کر رکھے تھے۔ سورج نکلتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہیے۔ زوال کے وقت یوں نہیں کرنا چاہیے۔ دن اور رات کے ملتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ قرآن

کریم نے جہاں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ کر دیا وہاں اوقات کے سلسلہ میں بھی یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ دن اور رات میں نہ کوئی ساعت نحس ہے نہ سعد۔ اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک اجتماعات صلوٰۃ کا تعلق ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ... (17/78) تم ''دلوک الشمس'' سے رات کی تاریکی تک اقامت صلوٰۃ کر سکتے ہو اور صبح کے وقت کا قرآن بھی۔ ''دلوک'' میں صبح سے شام تک کا سارا وقت آجاتا ہے، بالخصوص جب سورج کے بلند ہونے، مائل بہ زوال ہونے اور غروب ہوجانے کی مختلف منازل کو (خاص طور پر) اس میں شامل کرنا مقصود ہو۔ ان مختلف منازل کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود، ان توہم پرستیوں کی تردید تھا جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَىِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ (11/114) ''دن کے دونوں اطراف اور رات کے حصوں میں اقامت صلوٰۃ کرو۔''

ان اوقات کا ذکر تو خصوصیت سے لفظ صلوٰۃ کے ساتھ کیا گیا ہے، ویسے اقامت دین کے سلسلہ میں جماعت مومنین کی تگ و تاز کے سلسلہ میں (جسے قرآن کریم تسبیح، تحمید و تذکیر کے اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے) دن، رات کے تمام اوقات کا ذکر آیا ہے۔

سورۃ نور میں صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء کا ذکر (ضمناً) آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھر کے ملازمین کو چاہیے کہ وہ تمہارے تخلیے (Privacy) کے اوقات میں اجازت لے کر کمرے کے اندر آیا کریں۔ یعنی: مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوةِ الۡفَجۡرِ وَ حِيۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِيَابَكُمۡ مِّنَ الظَّهِيۡرَةِ وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوةِ الۡعِشَآءِ (24/58) ''صلوٰۃ الفجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتار دیتے ہو اور صلوٰۃ العشاء کے بعد'' اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اجتماعات صلوٰۃ کے لیے (کم از کم) یہ دو اوقات متعین تھے۔ جبھی تو قرآن کریم نے ان کا ذکر نام لے کر کیا ہے۔

جہاں تک صلوٰۃ میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے، یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم کیا پڑھ رہے ہو (4/43)۔ دوسرے مقام میں ہے: وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا وَ ابۡتَغِ بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا (17/110) ''اور اپنی صلوٰۃ کو نہ تو بلند آواز سے ادا کر نہ خاموشی سے۔ ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کر۔'' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد عام دعا یا ذکر ہے نماز نہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نظر نہیں آتا۔ ''ذکر'' کے متعلق قرآن کریم میں بہ صراحت موجود ہے (7/205) کہ اسے خاموشی سے دل میں کرنا چاہیے، بہ آواز بلند نہیں۔ (ذکر سے مراد قانون خداوندی کی یاد ہے)۔ اس لیے مندرجہ بالا آیت میں صلوٰۃ سے مراد ''نماز'' ہی ہو سکتی ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں صلوٰۃ سے مراد اجتماعات صلوٰۃ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں ''اقیمو الصلوٰۃ'' کہا ہے وہاں بہ ہیئت مجموعی اس سے مراد ہے اقامت دین۔ (یعنی نظام خداوندی کی تشکیل

واستحکام)۔قوانین واحکام خداوندی کا اتباع، ان فرائض منصبی کی ادائیگی جو ایک عبدمومن پر عائد ہوتے ہیں۔لیکن بعض مقامات پر اس سے مراد ہیں اجتماعات صلوٰۃ جو خود دین کے نظام کا جزو ہیں۔متعلقہ مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہاں اقامت صلوٰۃ سے مقصود کیا ہے؟ اسی طرح جہاں جہاں ''مصلین'' آیا ہے وہاں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے مراد جماعت مومنین (بہ ہیئت مجموعی) ہے یا صرف اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شرکت کرنے والے۔اس لیے کہ قرآن کریم نے ان ''مصلین'' کا بھی ذکر کیا ہے جو شرف انسانیت کی بلندیوں پر ہیں (دیکھئے 35-70/22) اور ان کا بھی جن کے لیے تباہی ہے (107/4-7)۔

سورۃ احزاب میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے: هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ ... (33/43) ''خدا اور اس کے ملائکہ (کائناتی قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں، تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں، تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔'' یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامت دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبراتے نہیں۔حوصلہ نہیں ہارتے بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ (2/157) یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحق وتبریک وتہنیت ہیں۔انہیں خدائی تائید ونصرت حاصل ہے۔خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، ان کی کوششوں کو کامیاب بناتا ہے، ان کی نشوونما کرتا ہے۔یہ تو رہا عام جماعت مومنین کے متعلق۔خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (33/56) خدا اور اس کے ملائکہ نبی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔اس کے بعد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡهِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (33/56) ''اے جماعت مومنین! تم بھی اپنے نبی کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو۔ اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اس کی مدد کرو اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔'' (4/65)۔ وَ تُعَزِّرُوۡهُ وَ تُوَقِّرُوۡهُ (48/9)۔تم اس کی مدد کرو، اس کی عزت وتوقیر کرو۔مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے: وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ (7/157) ''جنہوں نے اس کی تائید وتعظیم کی، اس کی مدد کی۔'' اس طرح کہ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ (7/157) جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا۔'' یہ ہے مومنین کی طرف سے صَلُّوۡا عَلَیۡهِ کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق۔یہ ہے خدا اور اس کے ملائکہ کے صلوٰت جماعت مومنین پر اور خود نبی اکرم ﷺ پر، اور یہ ہے جماعت مومنین کا صلوٰۃ وسلام نبی اکرم ﷺ پر۔

آپ نے غور فرمایا کہ صَلُّوۡا عَلَیۡهِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا کا حکم کتنے عظیم عملی پروگرام کا متقاضی ہے۔یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کرنا جسے نبی اکرم ﷺ لے کر تشریف لائے تھے۔دوسری طرف نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ جب جماعت مومنین کے افراد، انفاق فی سبیل اللہ کے لیے تیرے پاس اپنی کمائی

لے کر آئیں تو اسے قبول کر، وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (9/103) اور ان کی حوصلہ افزائی کر۔ اس لیے کہ تیری طرف سے حوصلہ افزائی (Encouragement)، تحسین وتبریک (Appreciation)، ان کے لیے موجب تسکین ہوتی ہے۔ وہ اس انفاق فی سبیل اللہ کو قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ (9/99) کا موجب سمجھتے ہیں۔ یعنی قربِ خداوندی کا باعث اور رسول کی طرف سے تحسین وتبریک اور حوصلہ افزائی کا موجب۔

ص م د

قرآن کریم میں اللہ کے لیے الصمد آیا ہے: اَللّٰهُ الصَّمَدُ (112/2)۔ ''اللہ ہی صمد ہے۔'' قرآن کریم نے اس ایک لفظ سے خدا کے متعلق کیسا وسیع اور بلند تصور پیش کیا ہے۔ یعنی ایسی بلند اور محکم چٹان کہ جب ہر طرف سے سیلاب کا پانی گھیر لے اور کہیں پناہ کی جگہ نہ ملے تو لوگ اس کی طرف رجوع کریں اور انہیں وہاں پناہ مل جائے۔ نیز وہ ذات جو دوسروں کی تمام ضروریات کو تو پورا کرے لیکن خود ان سب سے مستغنی ہو۔ نیز اس کی نوازشات غیر منقطع ہوں اور اس کی ربوبیت مسلسل جاری رہے۔

جو قوم اپنے اندر اس خصوصیت کو پیدا کر لے اس کے مقام بلند کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں بھوک اور پیاس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہو اور دوسروں کی نشوونما میں سردی اور قحط بھی اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں۔ چٹان کی طرح محکم اور سب بے آسروں کا آخری سہارا اور قابل اعتماد آسرا۔ لیکن دوسروں کے سہاروں سے مستغنی۔

خدا کے متعلق قرآن کریم نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ (112/1-2) کہہ کر ایک اور بلند حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ احد کے معنی ہیں منفرد، یگانہ (Unique)۔ اس انفرادیت میں مخلوق سے بےہمگی (Transcendence) کا پہلو مضمر ہے۔ لیکن صمدیت کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کی ایک ایک سانس اس کی ربوبیت سے وابستہ ہے۔ اس سے اس کی باہمگی (Immanence) کا پہلو نمایاں ہے۔ لہٰذا وہ ذات باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ یہی صفت مومن کی ہونی چاہیے۔ اقبال کے الفاظ میں

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو

یعنی اَحَدِیَّتْ اور صَمَدِیَّتْ دونوں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین اور بلند ترین ہے۔ یعنی (The Most Developed, Complete and Perfect Personality) اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے، لیکن غیر نشوونما یافتہ شکل (Un-Developed Form)

میں۔ صفاتِ خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، ذاتِ خداوندی کے مختلف تعلق گوشے (Facets) ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو صرف خدا کی ذات سے مخصوص ہیں۔ (مثلاً ھُوَ الْاَوَّلُ)۔ لیکن دوسری صفات ایسی ہیں جو (حدود بشریت کے اندر) انسانی ذات میں منعکس ہوسکتی ہیں۔ ان میں صمدیت بھی شامل ہے۔ یعنی جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی وہ خارجی سہاروں سے مستغنی ہوتی جائے گی اور دوسروں کو سہارا دینے کا موجب بنتی جائے گی۔ حریت اور استغناء (Freedom and Independance) ذات کے بنیادی خصائص (Basic Characteristics) ہیں۔

ص م م

قرآن کریم میں صُمٌّ کا لفظ بہروں کے لیے آیا ہے، نیز ان لوگوں کے لیے بھی جو حق کی آواز نہ سنیں اور اپنی مرضی کرتے چلے جائیں۔ وہ لوگ جو جانوروں کی طرح ہوں اور عقل وفکر سے کام نہ لیں (8/22)۔ قرآن کریم اندھے، بہرے، گونگے، حتیٰ کہ مردے ان لوگوں کو کہتا ہے جو عقل وبصیرت اور دلائل و براہین سے کام نہ لیں اور جذبات سے مغلوب ہو کر یا تقلیدی طور پر غلط راہوں پر چلتے جائیں۔

ص ن ع

سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ ہم نے تجھے فرعون کے محلات میں پہنچا دیا تا کہ وہاں ہماری زیر نگرانی تمہاری تربیت ہو اور تم سلطنت کے امور اور مملکت کے انداز سیکھ سکو۔ لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (20/39) اِس سے ظاہر ہے کہ ہونے والے رسول کی پیدائش خدا کے پروگرام کے مطابق ہوتی تھی اور شروع ہی سے اس کی تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ آگے چل کر نبوت جیسی عظیم القدر ذمہ داری کا اہل بن سکے۔ اسی لیے حضرت موسیٰؑ کی قبل از نبوت زندگی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا: ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (20/40) اتنی کٹھالیوں میں تاؤ کھانے فُتُوْنًا (20/40) کے بعد تب کہیں جا کر تم نبوت کے پیمانے پر پورے اترے۔ لہٰذا یہ سمجھنا محض ''شاعری'' ہے کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ اس سے آگے ہے: وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ (20/41) آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری تربیت خاص پروگرام کے مطابق کی گئی ہے۔ اس لیے کہ ہمیں تجھ سے ''اپنا کام'' لینا تھا۔ یہ سب کچھ ہم نے اپنے ایک مقصد کے لیے کیا ہے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (20/24) فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے حد اعتدال سے نکل کر بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی استبداد و سرکشی کی قوتوں کو مغلوب کر کے مظلوم انسانیت کو ان کے آہنی پنجہ سے چھڑانا اور پھر ان کی ایسی تربیت کرنا کہ وہ شرفِ انسانیت کے اہل بن جائیں۔ یہ ہے وہ مقصد عظیم جس کے لیے ایک نبی کی تربیت کی جاتی تھی

اور جسے خدا نے خود "اپنا کام" کہا ہے (واضح رہے کہ نبی کو اس دوران میں کچھ علم نہیں ہوتا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ انسان اپنی سعی و عمل سے مقامِ نبوت تک پہنچ سکتا ہے مقامِ نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے)۔

ص ن م

ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دے صَنَمٌ کہلاتی ہے۔ لہٰذا اَصْنَامٌ وہ تمام جاذبیتیں اور مفاد پرستیاں ہیں جو انسان کو قانونِ خداوندی سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی تھی کہ وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (14/35) اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کر لیں۔ تو اس سے مراد ایسی ہی چیزوں کے پیچھے لگ جانا تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو اس کا اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12/106) ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ خدا پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مشرک کے مشرک بھی رہتے ہیں۔ ہم اس آیت کو پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق نہیں۔ ہم تو کسی بت کی پرستش نہیں کرتے، یعنی ہماری نگاہ مٹی اور پتھر کے بتوں کی طرف رہتی ہے اور ان بتوں کو کبھی نہیں دیکھتی جو ہر آن ہمارے قلب و دماغ کے صنم کدوں میں ڈھلتے رہتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی آستینوں [1] میں لیے لیے مسجدوں میں سجدے اور حرمِ کعبہ میں طواف کرتے رہتے ہیں۔ اس سے بڑی اصنام پرستی اور اس سے سنگین تر شرک اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہی وہ بت پرستی تھی جس کا خدشہ حضرت ابراہیمؑ [2] کے دل میں (اپنی اولاد کی طرف سے) پیدا ہوا تھا اور ہم (ملت ابراہیمی کے مدعی) ان کے اس خدشہ کو سچا کر کے دکھلا رہے ہیں۔

ص ھ ر

قرآن کریم میں ہے: فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (25/54)۔ نسب سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ہو اور صِهْرٌ سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ قرآن کریم عائلی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ میاں بیوی دونوں کے رشتہ داروں کو مشترکہ رشتہ دار [3] قرار دیتا ہے۔

---

(83) اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں ۔۔۔ مجھے ہے حکمِ اذاں، لاالٰہ الا اللہ (علامہ اقبالؒ)

(2) براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ۔۔۔ ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں (ایضاً)

(3) میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ مسلم معاشرے میں جب ایک مرد کی شادی کسی عورت سے ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک خاندان کے تعلقات دوسرے خاندان سے شادی کی وجہ سے خود بخود مستقل بنیادوں پر قائم ہو جاتے ہیں۔ (منظور الحسن)

ص و ت

سورۃ حجرات میں ہے: لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (49/2) اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔ اگر اس میں صَوْتٌ کے حقیقی معنی لیے جائیں تو یہ حکم آدابِ معاشرت سے متعلق ہوگا۔ اور اگر مجازی معنی لیے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنے فیصلے کو رسول کے فیصلے پر فائق نہ سمجھو۔ مشورہ میں رائے دو لیکن اطاعت اس کے فیصلے کی کرو (4/65؛ 33/36)۔

ص و ر

قرآن کریم میں جہاں نفخ صور کا ذکر آیا ہے (مثلاً: يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ۔ 78/18) تو اس کے معنی ہوں گے جب صورتوں میں روح پھونکی جائے گی۔ جب اقوام کے مردہ پیکروں میں قانون خاوندی کے مطابق تازہ قوتیں پیدا ہو جائیں گی۔ جب انہیں (نظام خداوندی کی رو سے) حیات تازہ مل جائے گی۔ اس دنیا میں حیات تازہ بھی اور مرنے کے بعد حیات نو بھی۔ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ (69/13) کا تعلق اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب نظامِ خداوندی کے انقلاب کے لیے باطل کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے گا۔

ص و م

قرآن کریم میں صِيَامٌ کو فرض قرار دیا گیا ہے (2/183)۔ اس کے لیے بتا دیا کہ یہ صبح سے رات تک کھانے پینے اور جنسی اعمال سے مجتنب رہنے کا نام ہے (2/187)۔ یہ رمضان کے مہینے کے روزے ہیں جس میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تھا (2/185)۔ جو شخص مقیم ہو (سفر میں نہ ہو) اور تندرست ہو (مریض نہ ہو) اور اس کی طبعی حالت ایسی ہو کہ اسے روزہ رکھنے میں مشقت نہ اٹھانے پڑے (2/184) تو اس پر روزہ فرض ہے۔ مسافر سفر سے واپسی پر اور مریض شفا یاب ہونے کے بعد گنتی کو پورا کرے (2/184) لیکن جو بمشقت روزہ رکھ سکتا ہو وہ اس کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا دے (2/184)۔

روزے درحقیقت جماعت مومنین کو جہاد کی مشقت انگیز زندگی کا خوگر بنانے کے لیے سالانہ عسکری ٹریننگ کے مرادف ہیں۔ ان کا مقصد قرآن کریم نے خود واضح کر دیا جہاں کہا کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2/183) تا کہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کے قابل ہو جاؤ۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2/185) تا کہ تم قرآن کریم کی روشنی میں قوانین خداوندی کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و نظام ہائے حیات پر غالب کر سکو۔ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2/185) تا کہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔

صَآئِمٌ (33/35) روزہ رکھنے والا یا اپنے آپ کو غلط راستوں سے روک لینے والا، اپنے آپ پر کنٹرول (ضبطِ نفس) کرنے والا، حدود اللہ کے اندر رہنے والا۔

ض ر ر

تَزَوَّجْتُ الْمَرْاٰةَ عَلٰی ضِرٍّ میں نے اس عورت سے پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود عربوں کو بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مضرت رسانی کا احساس تھا۔[1]

ض ر ع

سورۃ غاشیہ میں اہل جہنم کی غذا کو ضَرِیْعٌ کہا گیا ہے (88/6)۔ یعنی دوسروں کے ردی سمجھ کر پھینکے ہوئے ٹکڑے جن سے نشوونما ہونے کی بجائے انسانی صلاحیتیں اور بھی پژمردہ ہوجائیں۔ محکوم اور کمزور اقوام کو اسی طرح کی غذا ملتی ہے۔ یعنی وہ ذلت کی روٹی جس سے شرفِ انسانیت کی تمام توانائیاں ختم ہوجائیں۔

ض ل ل

جب رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے تلاش حقیقت میں حیراں و سرگرداں پھرتے تھے تو قرآن کریم نے اس کیفیت کو وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (93/7) سے تعبیر کیا ہے۔ ایک ہونے والا نبی، نبوت سے پہلے بھی غلط تصورات زندگی سے غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن چونکہ صحیح تصورات اس کے سامنے نہیں ہوتے اس لیے وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے بعد اسے خدا کی طرف سے راہنمائی مل جاتی ہے تو یہ سرگردانی ختم ہوجاتی ہے۔

ضَآلِّیْنَ (1/7) سے مراد ایسے لوگ ہیں جو وحی کی راہ نمائی کی بجائے اپنے ذہنی قیاسات کی تجربہ گاہوں یا توہم پرستانہ عقیدتمندیوں کی بھول بھلیوں میں اس طرح مارے مارے پھرتے ہیں جس طرح لق و دق صحرا میں ایک راہ گم کردہ مسافر حیران و پریشان پھرتا ہے۔ وہ دن بھر چلتا رہتا ہے لیکن شام کے وقت اس کی منزل اس سے دور ہوچکی ہوتی ہے۔ اس طرح اس کی تمام کوششیں رائگاں چلی جاتی ہیں اور وہ انجام کار ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں منعم علیہ ہیں (1/6) جن کی کیفیت ان لوگوں کے برعکس ہوتی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ہے (2/282) کہ لین دین کے معاملہ میں دو مرد بطور گواہ ہونے چاہئیں اور اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد

---

[1] یہ بات اسلام لانے سے پہلے کی ہے بعد میں نہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم کی روشنی میں جو تربیت دی جائے گی اس میں بلند حوصلگی، کشادنگہی اور فراخ دلی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ (منظور الحسن)

اور دو عورتیں۔ دو عورتیں اس لیے کہ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى (2/282) اگر ان میں سے ایک کسی تفصیل میں پریشان (Confused) ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ وہ اس بات کو سامنے لے آئے۔ اس سے حافظہ کی کمزوری (بھول جانا) مراد نہیں بلکہ (عورت کے زیادہ جذباتی اور حیادار ہونے کی وجہ سے) گھبراہٹ میں (Confused) ہو جانا مقصود ہے۔ اسی کے لیے قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَهُوَ فِی الۡخِصَامِ غَيۡرُ مُبِيۡنٍ (43/18) وہ جھگڑے (متنازعہ فیہ معاملہ) میں واضح طور پر مافی الضمیر کو بیان کرنے والی نہیں ہوتی ہے۔ جھگڑے میں جذبات کی شدت ہوتی ہے جس سے وہ اپنے معاملہ (Case) کو بھی اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی۔ واضح رہے کہ لطیف جذبات کی زیادتی عورت کے فطری وظائف زندگی (اولاد کی پرورش) کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے یہ عورت کا نقص نہیں۔ البتہ مناسب تعلیم وتربیت [1] سے اس کے یہ جذبات بھی باقی رہتے ہیں اور وہ فصیح البیان بھی ہو سکتی ہے۔

ض و أ

ضَوْءٌ کسی کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس روشنی کو جو دوسرے سے اکتساب کی گئی ہو۔ غالباً اس جہت سے شمس کو ضِيَاءٌ اور قمر کو نُوْرٌ کہا گیا ہے (10/5)۔ کیونکہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی، سورج سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہے۔

طالوت

طَالُوْت۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اُن افواج کا کمانڈر مقرر کیا تھا جو جالوت کے مقابلہ کے لیے جا رہی تھیں۔ ان میں علم بھی تھا اور جسمانی توانائی بھی۔ اور یہی چیزیں ایک کمانڈر کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کے اس تقرر کے خلاف بنی اسرائیل نے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ دولت مند نہیں۔ یعنی وہ (Aristocrat) اُمراطبقہ میں سے نہیں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کمانڈر کی صفات، فنونِ حرب کا علم اور توانائی ہیں، نہ کہ مال و دولت کی فراوانی (2/247)۔

ط ر د

قرآن کریم میں ہے: وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ (6/52) جو لوگ اپنے نشوونما دینے والے کو پکارتے ہیں انہیں حقیر و ذلیل سمجھ کر اپنے سے دور نہ رکھو۔ انہی کے متعلق حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (26/114) میں ان مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نہیں نکالوں گا۔

---

[1] مراد ہے قرآنی تربیت۔

ط غ ی (و)

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اللہ کے مقابلہ میں الطاغوت کا لفظ آیا ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہر غیر خدائی قانون اور نظام ہر وہ قوت جو خدا کے قانون سے سرکشی اختیار کر جائے۔ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ (2/256) میں یہ مفہوم واضح ہے۔ یعنی جو خدا پر ایمان لائے اور ہر غیر خدائی قوت (نظام، قانون) سے انکار کر دے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے یہی معنی ہیں۔ اسی کو دوسری جگہ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ (16/36) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز (4/76) میں ہے: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ۔ یہاں سبیل اللہ اور سبیل الطاغوت نے بتا دیا کہ طاغوت کے معنی ہر غیر خدائی اقتدار و نظام ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو سبیل الطاغوت (غیر خدائی نظام کی خاطر) جنگ کرتے ہیں، اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ (4/76) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ طاغوت اور شیطان مرادف المعنی ہیں۔ اس کی تشریح میں یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ (4/60) یعنی ''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں'' کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ طاغوت یا شیطان محض ذہنی تصورات نہیں بلکہ طاغوت کے معنی ہیں تمام وہ حاکم، وہ عدالتیں، وہ حکومتیں، وہ نظام جو خدا کے قانون (قرآن) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رو سے معاملات کے فیصلے کریں، ان کی طرف رجوع کرنا خدا سے انکار اور طاغوت کی عبادت ہے۔ جو لوگ اس قسم کے نظام کی تقویت کے لیے کوشش کرتے ہیں وہ اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ (یعنی غیر خدائی اقتدار کے رفقائے کار) ہیں۔

ط ف أ

یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ (9/32) کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ (61/8) کے معنی یہ ہیں کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ وہ خدا کے نور کو بجھا سکیں۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پورا[1] (مکمل) کر کے رہے گا اور یہ اس طرح ہوگا کہ اس کا بھیجا ہوا نظام، باقی تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ جائے۔ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ (61/9؛9/33)۔

ط ل ق

قرآن کریم کی رو سے نکاح ایسے معاہدہ کا نام ہے جو بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے۔ اس لیے اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کی ازدواجی زندگی ناممکن ہو جائے تو یہ معاہدہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق تفصیلی احکام دیئے ہیں کہ اس معاہدہ کے فسخ ہونے کی کیا کیا صورتیں ہیں اور اس کے لیے طریق کار کیا ہے۔

---

[1] قرآن حکیم کے نظامِ زندگی (دین) کا تمام غیر قرآنی نظام ہائے زندگی پر غالب آ جانا۔ (منظور الحسن)

لیکن یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد نے جب جی چاہا طلاق، طلاق، طلاق کہہ دیا اور نکاح ٹوٹ گیا اور اس کے بعد اس جوڑے کا باہمی ملاپ نہیں ہوسکتا جب تک یہ عورت کسی دوسرے سے نکاح (حلالہ) کر کے ایک شب اس سے ہم آغوشی نہ کر لے۔ تو یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

طلاق کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب میاں بیوی عقد نکاح سے آزاد ہوجائیں۔ طلاق کے ارادے یا اس کے ابتدائی مراحل کو طلاق نہیں کہا جائے گا۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد نکاح کا فسخ کرنا میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں ہے۔ اس کے لیے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے اور طلاق کا فیصلہ عدالت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس طرح لفظ طَلَاقٌ کے معنی آزاد کرانا بالکل صحیح بیٹھتے ہیں۔

ط م ث

جنتی معاشرہ کی عورتوں کی عفت وعصمت کے ضمن میں کہا ہے کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ [1] (55/56) اس سے قبل کسی انسان نے (جن وانس میں سے کسی نے) انہیں چھوا نہیں ہوگا۔ کیسا فردوس آفریں ہے یہ اطمینان کہ جس لڑکی سے میں شادی کر رہا ہوں اسے اس سے پہلے کسی نے نہیں چھوا۔

ط م ن

سورہ بقرہ میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے کہا کہ مجھے بتا کہ تو مردے کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے کہا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں؟ انہوں نے جواب دیا ''بَلٰی''۔ ایمان تو ہے وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (2/260) لیکن میں اپنا اطمینانِ قلب چاہتا ہوں۔ اس سے (اِطْمِئْنَانٌ) کا صحیح مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی تسکین قلب کی وہ کیفیت جو علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہو۔ جو علم وفکر، دلائل وبرہان بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ ہو۔

اگرچہ اطمینان کے لیے اَمْنٌ (بے خوفی) کو ضروری شرط قرار دیا گیا ہے (4/103)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ملک میں امن ہو تو قلوب کو بھی اطمینان ہو۔ امن خارجی خطرات سے محفوظ ہونے کا نام ہوگا۔ لیکن (اِطْمِئْنَانٌ) اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان اپنی داخلی کشمکش سے محفوظ ہو اور یہ چیز فریبِ نفس سے حاصل نہ ہوتی ہو بلکہ علم وحقیقت کی بنا پر ہو۔ انسانی ذات (نفس) کی یہی وہ کیفیت ہے جسے ''جنت کی زندگی'' سے تعبیر کیا گیا ہے (89/27)۔ لیکن اس حقیقت کو ساتھ ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ چیز خلوت گاہوں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے

---

[1] اس آیت کے لفظ ''جان'' سے واضح ہوتا ہے کہ جان سے مراد غیر مہذب (Uncivilized) انسان ہیں اور انسان سے مہذب (civilized) افراد۔ کیونکہ کوئی لڑکی بھی کسی جنّ سے شادی نہیں کرتی۔ اسی لیے جنوں وغیرہ کو ماننا یکسر غیر قرآنی نظریہ ہے۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

حاصل ہوگی۔اسی لیے ارشاد ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ○وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ○(89/29-30) جنت میں داخلہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ''خدا کے بندوں'' کے ساتھ شامل ہو۔اور پھر یہ سب مل کر قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ(13/28) ''اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ صحیح اطمینان قلب قوانین خداوندی ہی سے نصیب ہوسکتا ہے۔''

اللہ کے ذکر سے مراد تسبیح پر اللہ، اللہ پکارنا یا دل پر ضربیں لگانا نہیں۔اس سے مفہوم خدا کے قانون (قرآن) کو ہر وقت سامنے رکھنا ہے۔اس کا پہلا نتیجہ رزق کی فراوانی ہوتا ہے(16/112)۔اگر مقصودِ حیات ہر فرد کا اپنا اپنا اطمینانِ قلب ہو تو دنیا سے خیر و شر کی تمیز ہی اٹھ جائے۔ایک ڈاکو یا ٹھگ جب کسی کی جان لے کر کالی دیوی کے استھان پر مقررہ نذر چڑھا دیتا ہے، یا برہمن بت کی پوجا کر لیتا ہے تو اسے ایسا اطمینان نصیب ہوجاتا ہے جو ایک خدا پرست کے اطمینان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا۔لہٰذا مقصد زیست اپنا اطمینان نہیں (جو بسا اوقات فریب نفس ہوتا ہے)، مقصد ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں ہر معاملہ عدل و احسان کی رو سے طے ہو اور اس طرح ہر فرد کو صحیح اطمینان میسر آجائے۔

ط ھ ر

سورۂ واقعہ میں قرآن کریم کے متعلق ہے کہ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ(56/89) تو اس سے مراد یہی ہے کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے وہی لوگ مس رکھتے ہیں، وہی ان تک پہنچ سکتے ہیں، وہی ان سے باخبر ہوسکتے ہیں جن کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو۔جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی طرف آئیں۔جو متوازن دل و دماغ کے مالک ہوں۔جو اپنے ذہن کو تمام تعصّبات سے خالی کر کے اور اپنے دلوں کو تمام ذاتی رجحانات و میلانات سے منزہ رکھ کر اسے سمجھنا چاہیں۔اگر ذہن پہلے ہی سے غیر قرآنی تصورات کی آماجگاہ ہو اور دل ذاتی مفاد پرستیوں سے آلودہ، تو پھر قرآن کریم کے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے۔جو لوگ زندگی کی آلودگیوں اور تباہ کاریوں سے بچنے کا احساس رکھتے ہوں انہیں مُتَّقِیْنَ کہا جاتا ہے اور قرآن کریم مُتَّقِیْنَ ہی کی صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔(ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔2/2) اس کی بنیادی شرط ہے۔

وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ (74/4) کے معنی ہوں گے اپنی ذات کو تمام پست خیالات سے بلند کر کے پاکیزگی قلب و نگاہ کا پیکر بناؤ۔اور اگر ثیاب کے معنی دعوت کے لیے جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنی اس انقلابی دعوت کو تمام ایسے لوگوں سے دور رکھو جن کے قلب و دماغ پاکیزہ نہیں۔اس جماعت میں وہی لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو اپنے دل اور دماغ کو تمام غیر خدائی تصورات سے پاک اور صاف رکھیں۔نیز اس دعوت میں نظری طور پر بھی کوئی غلط تصور شامل نہ ہونے پائے۔

سورۂ احزاب میں رسول اللہ ﷺ کے اہل خانہ کے متعلق ہے: وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (33/33) خدا تمہیں ہر قسم کے الزامات سے دور رکھے گا اور قلب و نظر کی پاکیزگی عطا کرے گا۔جنتی معاشرہ کے پاکیزہ سیرت اور تربیت یافتہ ہم نشینوں کو اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ(2/25) کہا گیا ہے۔اس میں بیویاں بھی شامل ہیں اور دوسرے رفقائے کار بھی۔

طوع

سورہ بقرہ میں ہے: وَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا (2/158) اس کے معنی ہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر عمل خیر کرنا۔ اس میں دل کی رضامندی تو بہر حال ہوگی لیکن اس میں اگر تھوڑی سی مشقت بھی اٹھانی پڑے (جو قابل برداشت ہو) تو ایسا عمل خیر بھی کر لینا چاہیے (2/184)۔

قرآن کریم میں قوانین خداوندی کی اِطَاعَةٌ پر زور دیا گیا ہے۔ درحقیقت سارے قرآن کی تعلیم کا منشا ہی یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ یعنی کسی کام کو دل کی پوری پوری رضامندی، وسعت اور کشادگی سے کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت کسی مستبد حاکم کی فرمانبرداری نہیں بلکہ اپنے دل کی مرضی سے خود اختیار کردہ حدود و قیود (Self-imposed Restrictions) کی پابندی ہے (اسی کو اِسۡلَامٌ کہتے ہیں)۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت نہ زبردستی کرائی جا سکتی ہے نہ اندھے طور پر کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے کتاب (قانون) کے ساتھ حِكۡمَةٌ (اس کی علت غائی، اس کے نتائج) کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ ہر شخص علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لے کہ ان حدود کی پابندی میں کیا کیا فوائد مضمر ہیں اور اس کے بعد اپنے دل کی پوری رضامندی سے ان پر عمل پیرا ہو جائے۔ یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے مطابق قرآن نظام خداوندی قائم کراتا ہے۔ یعنی اس جماعت کے ہاتھوں جس کی افراد دل کی پوری کشاد کے ساتھ علی وجہ البصیرت اس نظام کے نتائج سے متفق ہوں اور کامل رضامندی سے اس کے قیام و استحکام کے لیے کوشاں۔ یہ ہے اطاعت کا صحیح مفہوم۔

اس کے مقابل میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے (3/31)۔ یعنی منہ موڑ لینا یا گریز کی راہیں نکالنا۔ اصل یہ ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں ذرا سا بھی تردد، تامل، تذبذب، ہچکچاہٹ یا کبیدگی خاطر ہو تو اسے اطاعت نہیں کہیں گے، کیونکہ اطاعت کی بنیاد میں دل کی رضامندی شامل ہے (4/65) اطاعت کی جاتی ہے، کرائی نہیں جاتی۔ نادانستہ یا لغزش سے کسی حکم کی خلاف ورزی اور بات ہے، لیکن جو شخص دل کی رضامندی سے نظام خداوندی (اسلام) میں نہ رہنا چاہے اُسے زبردستی نہیں رکھا جا سکتا۔ نہ ہی کسی کو اس کے اندر زبردستی لایا جا سکتا ہے۔ اس لیے دین میں اکراہ نہیں (2/256)۔ جو لوگ بطیب خاطر اس نظام کو قبول نہ کریں، وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہیں گے۔ انہیں تمام حقوق انسانیت حاصل ہوں گے لیکن اس نظام میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔

طوف

سورہ بقرہ میں ہے کہ خانہ کعبہ طَآئِفِيۡنَ اور عٰكِفِيۡنَ کے لیے مرکزی مقام ہے (2/125)۔ طَآئِفِيۡنَ کے معنی ہیں نوع

انسانی کے چوکیدار۔ وہ لوگ جو انسانیت کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ اور عٰکِفِیۡنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دے، بلکہ اسے ایک رشتہ میں پروئے رکھے۔ ان کے معاملات کو درست رکھے۔ دنیا کے نظم ونسق میں درستگی اور آراستگی پیدا کرے۔ قرآن کریم نے ملت اسلامیہ (جماعت مومنین) کو ایک بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے احوال وکوائف اور اعمال وافعال کی نگرانی کرے اور ان کے معاملات کو درست رکھے۔ اس مقصد کے لیے وہ جس نظام کی تشکیل کرتے ہیں اس کا مرکز کعبہ کو قرار دیا ہے (2/143)۔ لہٰذا اس نظام کو قائم کرنے والی جماعت، طائفین کی جماعت ہے۔ یعنی نوع انسانی کی چوکیداری کرنے والی۔ حقوق انسانیت کی حفاظت کرنے والی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے پوچھا کہ ان کی اولاد میں بھی خانہ کعبہ کی تولیت (اور نوع انسانی کی امامت) کا منصب جاری رہے گا تو ان سے کہہ دیا کہ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ (2/124) جو لوگ حقوق انسانیت میں کمی کریں گے وہ اس منصب کے اہل نہیں رہیں گے۔

یہ ہے طواف کعبہ کا صحیح مفہوم جس کی تمثیلی شکل (Symbolical Form) خانہ کعبہ کے گرد گھوم کر اس فریضہ کی یاد تازہ کرنا ہے۔ جس طرح صلوٰۃ کے اجتماعات میں رکوع وسجود اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ہم قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے سوا اور کسی کے آئین وقانون کے سامنے نہیں جھکتے، اسی طرح حج کے ان مناسک سے مراد یہ ہے کہ ہمارا یہ اجتماع، نوع انسان کی حفاظت کے لیے نظام خداوندی کا عملی نشان ہے۔

طوق

قرآن کریم میں جہاں آیا ہے کہ لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (2/286) تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو۔ اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بہ مشقت کر سکیں، جن کا کرنا ہمارے لیے دشوار ہو۔

روزوں کے احکام کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے: وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ فِدۡیَةٌ طَعَامُ مِسۡكِیۡنٍ (2/184) اس کے عام طور پر معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کو (روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کی) طاقت ہو وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کا فدیہ دے دیں۔ یہ معنی بالبداہت غلط ہیں۔ اگر وہ لوگ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہے یا جو فدیہ دے سکتے ہیں روزہ سے مستثنیٰ ہیں تو پھر روزہ کن پر فرض ہے؟ کیا انہی پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہو یا اتنے غریب ہوں کہ فدیہ بھی نہ دے سکیں؟ اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکیں وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ دے دیں۔ اس لیے کہ یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ (2/185) خدا تمہارے لیے آسانیاں چاہتا ہے، مشقتیں نہیں چاہتا۔

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد ہیں ضعیف، بوڑھے، وہ اپاہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کی ہمیشہ کی معاش مشقت انگیز کاموں میں ہو۔ نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاموں پر لگایا جائے۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں۔ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (2/184) جو شخص قابل برداشت مشقت سے نیک کام کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اس میں يُطِيْقُوْنَ اور تَطَوَّعَ کا فرق قابل غور ہے۔ يُطِيْقُوْنَ سے مراد سخت مشقت ہے اور تَطَوَّعَ سے مراد ایسی اطاعت جس میں ذرا سی تکلیف کا پہلو ہو۔

طوی

سورۃ الزمر میں ہے: وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (39/67) اس دن (یوم القیامۃ) میں اَرْضٌ سب کی سب اللہ کے قبضہ میں ہوگی۔ اور سَمٰوٰتٌ بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ ان دونوں مقامات کے ملانے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جب قرآن کے قوانین کے مطابق انسانی معاشرہ متشکل ہوگا تو اس انقلابی دور میں معاشی ذرائع اور اخلاقی اقدار (اَرْضٌ اور سَمَآءٌ) دونوں کا مرکز ایک ہی ہوگا۔ یہ دونوں ایک ہی مرکز کے کنٹرول میں ہوں گے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ معاشی ذرائع ایسے نظام کے ہاتھوں میں ہیں جس نے اخلاقی اقدار کو الگ رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن اس دور میں یہ دونوں یک جا ہو جائیں گے اور اس طرح توحید عملاً متشکل ہو جائے گی۔ اسی لیے اس کے بعد کہا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (39/67)۔ یہ لوگ جو معاشی نظام اور اخلاقی اقدار کو الگ الگ رکھ کر عملاً شرک کرتے ہیں، خدا ان سے بہت دور اور بہت بلند ہے۔ لیکن اگر یوم القیامۃ سے مراد دنیا کا طبعی انجام لیا جائے تو ارض وسماء سے مراد طبعی کائنات لی جائے گی۔

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز کیے جانے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى اس سے عقلی طریق تحقیق اور وحی کے عمل انکشاف کا فرق نکھر کر سامنے طُوًى (20/12) آجاتا ہے۔ عقلی طریق تجرباتی ہوتا ہے جس میں مسافت بڑی لمبی ہوتی ہے۔ لیکن وحی اس مسافت کو لپیٹ کر راستے کو بہت مختصر کر دیتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں (It Economises Human Efforts)[1] ۔ عقل کی راہیں بڑی پُر پیچ وخم ہوتی ہیں۔

عقل کے تجرباتی طریق سے آپ کی مسافت بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ لیکن وحی شروع ہی میں آپ کے سامنے صحیح حل رکھ دیتی ہے اور اس طرح آپ کو ان تمام ناکام تجارب سے بچا لیتی ہے جو آپ کو عقل کے طریق کار کی رو سے کرنے تھے۔ اس طرح سفر حیات میں آپ کی مسافت بہت مختصر ہو جاتی ہے۔ نبی کے سامنے حقیقت اپنے آپ کو خود بخود منکشف کر دیتی

---

[1] وہ انسانی کوششوں کو مختصر کر دیتا ہے۔ (منظور الحسن)

ہے۔اس طرح تلاش حقیقت میں اس کی مسافتیں سمٹ جاتی ہیں۔لہٰذا نبوت سے سرفرازی کے معنی یہ ہیں کہ نبی سے عقلی تجربات کے لمبے راستوں کو چھڑا کر اسے ''الواد المقدس طوی'' میں پہنچا دیا جاتا ہے، جہاں مسافتیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں۔اس اعتبار سے اس وادی کو طُوًی کہا گیا ہے۔

ط ی ب

سوہ سبا میں بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ (34/15) اس شہر کو کہا گیا ہے جس کے دائیں بائیں باغات ہوں اور اس میں سامان رزق کی فراوانی ہو۔اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم مومنین کو حَيٰوةً طَيِّبَةً (16/97) عطا کرتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔یعنی ایسی زندگی جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہوں۔جس میں انہیں تمام عمدہ اور پسندیدہ چیزیں بافراط میسر ہوں۔ایسی چیزیں جن سے حواس اور دل دونوں لذت یاب ہوں۔

حلت وحرمت کے متعلق قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حلال ہے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دے دیا ہے۔لیکن اس نے حلال کے ساتھ طیب کا بھی اضافہ کیا ہے (كُلُوۡا مِمَّا فِي الۡاَرۡضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۔ 2/168)۔یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں خوشگوار اور پسندیدہ ہوں وہ کھاؤ۔لہٰذا ان چیزوں کو چھوڑ کر جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، دنیا کی ہر خوشگوار چیز سے متمتع ہوا جاسکتا ہے۔اس کے یہ معنی ہیں کہ نہ تو کوئی شخص کسی حلال شے کو حرام قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اسے مجبور کرسکتا ہے کہ وہ ہر حلال شے کو بالضرور کھائے۔اگر کوئی حلال شے کسی کو مرغوب نہیں یا نقصان دہ ہے تو اس کے لیے کسی قسم کی مجبوری نہیں کہ وہ اسے ضرور کھائے۔وہ جس چیز کو خوشگوار سمجھے اسے کھائے۔اس معاملہ میں نہ خدا کی طرف سے کوئی جبر ہے نہ کسی انسان کی طرف سے کوئی جبر ہونا چاہیے۔

ط ی ر

سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ اَنِّيۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـئَةِ الطَّيۡرِ (3/48) اس کے لفظی معنی ہیں ''میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی مانند بناتا ہوں۔'' لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں تمہارے لیے اسی آب و گل سے ایسے نظامِ نو کی تخلیق کروں گا جس سے تم اپنی اس موجودہ پستی (خاک نشینی) سے اُبھر کر فضا کی بلندیوں میں بال کشا ہوجاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر وعمل کی رفعتیں نصیب ہوجائیں گی۔(آپ اناجیل میں دیکھئے حضرت مسیحؑ کا اندازِ تبلیغ یہ تھا کہ آپ تمثیلات اور استعارات میں حقائق بیان کیا کرتے تھے)۔

اَلطَّائِرُ کے معنی نحوست (اعمال کے تباہ کن نتائج) یا شامت اعمال کے بھی لیے جاتے ہیں۔اَلطَّائِرُ: عربوں کے نزدیک بخت یا نصیبہ کو بھی کہتے ہیں، لیکن قرآن کریم میں اسے اعمال نامہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔كُلَّ اِنۡسَانٍ

اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ (17/13) اس میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے۔ اس لیے بھی کہ عمل سے پہلے تو انسان کو اس پر اختیار ہوتا ہے کہ اسے کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس کے سرزد ہو جانے کے بعد اسے اس کا اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے لے (یعنی اس کے نتیجہ سے بچ جائے)۔ یعنی وہ اس کے ہاتھوں سے اُڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اس عمل کا نتیجہ تو اس انسان سے جدا نہیں ہوتا۔

حضرت سلیمانؑ نے انہی کے متعلق کہا تھا کہ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ (27/16) اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہمیں اَلطَّیْر کی بولی سکھائی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد وضوابط سکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح سورہ نمل میں حضرت حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے: وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَالِیَ لَآ اَرَی الْھُدْھُدَ (27/20) اس میں طیر انہی تیز رفتار گھوڑوں (کے رسالوں) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ھُدْھُدْ انہی رسالوں کے ایک رسالدار کا نام تھا (اس زمانہ میں پرندوں کے نام پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے تھے جیسا کہ تورات کتاب سلاطین سے ظاہر ہے)۔ نیز لسان العرب میں ہے کہ ھُدْھُدْ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اسی رعایت سے اس کے ہر فرد کو ھُدْھُدْ کہا جاتا تھا، جیسے قزلباش ایک قبیلہ کا نام ہے لیکن اس قبیلہ کے افراد کو بھی قزلباش کہتے ہیں۔

ظ ل م

قرآن کریم میں ظَالِمِیْنَ کا لفظ بکثرت آیا ہے جس کے معنی ہیں قانون شکنی، حدود فراموشی، دوسروں کی ملکیت پر ناجائز تصرف کرنے والے، حقوق انسانیت میں کمی کرنے والے، دوسروں کے واجبات کو پورا پورا ادا نہ کرنے والے، دوسروں کی محنت کو اپنے مصرف میں لے آنے والے، دوسروں پر زیادتی کرنے والے اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما میں کمی کرنے والے۔

سورۃ بقرہ میں ہے: مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (2/229) جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ ظَالِمِیْنَ کی یہ بڑی جامع تعریف (Definition) ہے۔ اس لیے کہ انسانیت کے حقوق کا تعین، قوانین خداوندی ہی کی رو سے ہوسکتا ہے۔ اور جو شخص ان قوانین کو توڑتا ہے وہ حقوق انسانیت غصب کرتا ہے۔ لہٰذا حدود اللہ (قوانین خداوندی) کو توڑنے والا ظالم ہے کیونکہ وہ حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا کہ جو حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے وہ سمجھتا تو یہ ہے کہ میں دوسروں کی کسی چیز میں کمی کر رہا ہوں اور اپنے ہاں اضافہ، لیکن درحقیقت وہ شخص خود اپنی ذات (نفس) کی نشوونما میں کمی کرتا ہے۔ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ (3/116)۔

سورہ بقرہ میں نُوْرٌ کے مقابل میں ظُلُمٰتٌ کا لفظ آیا ہے (2/17)۔ جس کے معنی تاریکیاں ہیں۔ نُوْرٌ وحی خداوندی ہے اور ظُلُمٰتٌ ذہن انسانی کی پیدا کردہ توہم پرستیاں اور غلط اندیشیاں۔ وحی کی تعلیم ایک ہی ہوتی ہے لیکن ذہن انسانی کی پیدا

کردہ تاریکیاں مختلف قسم کی ہوسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نُوْرٌ کی جمع کہیں نہیں آئی لیکن ظُلُمٰتٌ بطور جمع آیا ہے۔ حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے، افسانے [1] مختلف ہوتے ہیں۔

ظ م أ

''آدم'' کی جنت کے متعلق ہے کہ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا (20/118)۔ تو اس میں پیاس محسوس نہیں کرتا۔ پانی بافراط ملتا ہے۔ پانی کی کمی اور فراوانی کی اہمیت کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ صحراؤں میں رہنے والے ہی لگا سکتے ہیں جن کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہوتا ہے۔ ان کے لیے پانی کی قلت سب سے بڑی مصیبت اور پانی کی فراوانی سب سے بڑی خوشحالی ہوتی ہے۔ جنتی معاشرہ میں کسی کو بنیادی ضروریات زندگی (کھانا پینا، لباس، مکان وغیرہ) کے لیے جگر پاش مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں، نہ ہی ان سے کوئی محروم رہتا ہے۔ (20/117)۔

ظ ن ن

دین کی ساری عمارت علم اور یقین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں آپ کو یقینی طور پر علم نہ ہو کہ اس کی بابت خدا کا کیا حکم ہے تو آپ کے اعتقاد و عمل کی ساری عمارت متزلزل رہے گی۔ اس لیے دین کا یقینی ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اسی لیے لیا ہے (15/9) کہ ہمیں یقینی طور پر علم رہے کہ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جسے خدا نے نازل کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی قرآن کریم کو مرتب شکل میں امت کو دیا تھا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا تھا۔ اس لیے دین میں صرف قرآن کریم یقینی ہے اور باقی سب ظنیات ہیں۔ اور اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا (10/36) خدا کا ارشاد ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے مقابلہ میں کوئی دوسری چیز دین نہیں ہوسکتی۔ دین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ خارج از قرآن، جو باتیں قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح مانا جاسکتا ہے اور جو اس کے خلاف ہوں وہ غلط ہوں گی۔

ظ ھ ر

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (24/31) وہ اپنی زینت (آرائش) کی چیزوں کی نمائش نہ کریں، بجز ان کے جو (خودبخود) ظاہر ہوجائیں۔ اسے مثال دے کر یوں سمجھا دیا کہ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (24/31) اور وہ اپنے پاؤں کو (زمین پر) اس طرح مار کر نہ چلیں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت کی اشیاء سے چھپائے ہوئے ہیں ان کا دوسروں کو علم ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ آواز دار زیور ہے

[1] سچ کی ایک ہی شکل ہوتی ہے اور جھوٹ کئی رنگوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ (منظور الحسن)

جسے پنڈلیوں پر پہنا جاتا ہے اور جو معمولاً ڈھنپا رہتا ہے۔ اس کی نمود کا طریق یہ ہے کہ زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلا جائے جس سے اس زیور (چھاگل، جھانجن وغیرہ) سے آواز پیدا ہو جائے۔ یہ وہ اشیائے زینت ہیں جو شلوار وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہیں۔ باقی رہیں وہ اشیائے زینت جو اوپر کے حصہ میں پہنی جاتی ہیں، سو ان کے لیے کہہ دیا کہ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (24/31) وہ اپنے سر کی چادروں کو جیب گریبان (سینے پر) ڈال لیا کریں۔ دوسری جگہ ہے: يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (33/59) وہ اوپر اوڑھے ہوئے (یا اوورکوٹ کی طرح پہنے ہوئے) کپڑے کو جسم کے ساتھ لگائے رکھیں۔

اوڑھنی یا جلباب سے ہاتھ اور چہرہ بہرحال کھلے رہتے ہیں اور قرآن نے انہیں چھپانے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ یہ جو اس نے کہا ہے کہ مرد اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، انہیں بے باک نہ ہونے دیں (يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ۔ 24/30-31) تو اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا منشاء یہ نہیں کہ چہرہ کو بھی چھپایا جائے۔ اس لیے کہ اگر عورتیں اپنے چہرے کو بھی چھپا کر باہر نکلیں تو مردوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہیں اظہار زینت کے متعلق قرآن کریم کی ہدایات۔ ممانعت نمود آرائش کی ہے۔ خودبخود ظاہر ہو جانے والی اشیائے زینت کی نہیں۔

سورہ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے خدا کو محض بطور ظِهْرِيًّا (11/92) رکھ چھوڑا ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک اہمیت تو تمہارے اپنے فیصلوں کی ہے اور انسانوں کے خودساختہ قوانین کی ہے، لیکن خدا کو (محض بطور Extra) ساتھ اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر کبھی ضرورت پڑ جائے تو اسے بھی اپنے مفاد کے لیے استعمال کر لیا جائے۔ غور کیجئے کہ یہی چیز آج ہم پر بھی کس طرح صادق آتی ہے۔

خدا اپنے تخلیقی مظاہر (Created World) کی رو سے سامنے آتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشیائے کائنات خود خدا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اشیاء اپنے خالق کی ہستی کی علامات (آیات اللہ) ہیں اور جو قانونِ خداوندی رگ کائنات میں خونِ حیات بن کر دوڑ رہا ہے وہ اس کے اقتدار و اختیار کی زندہ شہادت ہے۔ اسی اعتبار سے خدا اَلظَّاهِرُ ہے۔ لیکن خدا کی ذات کی کنہ وحقیقت سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے وہ اَلْبَاطِنُ ہے۔ اس سے (Immanence and Transcendence of God) کا وہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے جو مفکرین الٰہیات کے لیے اس قدر وجۂ پیچ و تاب بنا رہتا ہے۔ یعنی یہ مسئلہ کہ خدا کائنات میں حاضر و موجود ہے یا اس سے الگ (کہیں اور مثلاً عرش پر) بیٹھا ہے۔ وہ (اپنے قانون و اقتدار کے اعتبار سے) کائنات سے بالا ہے لیکن اس سے الگ (Excluded) نہیں۔ وہ بیک وقت اَلظَّاهِرُ بھی ہے اور اَلْبَاطِنُ بھی۔ طبعی (Immanent) بھی ہے اور ماورائے ادراک (Transcendent) بھی۔ وہ اپنی ذات (Personality) رکھتا ہے لیکن متشخص (Personified) نہیں۔ اس کا اقتدار، ایک توانائی (Divine Energy) ہے لیکن بغیر ذات (Personality) کے نہیں۔

ع ب ث

پوری کائنات کے متعلق ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (21/16)۔ ہم نے اس سلسلہ کائنات کو بطور کھیل تماشا کے نہیں بنادیا۔ اس کی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے۔ اسے بِالْحَقِّ پیدا کیا گیا ہے (44/38)۔ یعنی ایک غیر متبدل محکم پروگرام کے مطابق تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ ہندو فلسفہ کی رو سے یہ تمام کائنات ''ایشور کی لیلا''[1] ہے۔ یعنی خدا کا رچایا ہوا ناٹک،[2] جس میں وہ خود سب سے بڑے ایکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ اسی لیے اسے ''نٹ راجن'' کہا جاتا ہے۔ یعنی نٹوں (کھلاڑیوں) کا بادشاہ۔ قرآن کریم نے اس تصور کی خاص طور پر تردید کی ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقت (Seriousness) پر بڑا زور دیا ہے۔ اسی بنیاد پر انسان کے وہ تمام ایسے کام جو یونہی، بلا صحیح غرض و غایت، عمل میں آتے رہیں اس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس نے قوم عاد کا ایک جرم یہ بھی بتایا کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں محض اس لیے بناتے تھے کہ وہ بطور یادگار قائم رہیں۔ اسے اس نے تَعْبَثُوْنَ سے تعبیر کیا ہے (26/128)۔ یعنی عمارت کا کوئی افادی مقصد ہونا چاہیے۔ یونہی ایک عظیم الشان مقبرہ بنادینا جو کسی مصرف میں نہ آسکے فعل عبث ہے۔ کس قدر عبرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ جس قوم (مسلمانوں) کو اس قسم کی تعلیم دی گئی تھی ان کے سلطنت کے باقیات، مقبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ان پر ہم فخر کرتے ہیں۔ یادگار ایسی ہونی چاہیے جس سے منفعت بخش اور جمال آفرین نتائج مسلسل طور پر جاری رہیں۔ اسی لحاظ سے زندگی کا ہر کام جو نوع انسانی کے لیے نفع رساں نہیں فعل عبث ہے۔

ع ب د

انسان قوانین خداوندی کی اطاعت سے جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے بظاہر ان میں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ نفس انسانی کی وسعت اور کشود کے لیے ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو تین آیتوں میں واضح کر دیا ہے۔ اس نے پہلے کہا کہ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (51/55) ان کے سامنے خدا کا ضابطۂ قانون (واضح طور پر) پیش کرتا رہ کیونکہ یہ ان کے لیے نہایت منفعت بخش ثابت ہوگا۔ اس کے بعد بتایا کہ وہ منفعت بخش اصول حیات کیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51/56) ان سے کہہ دے کہ ہم نے تمام انسانوں کو، خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جن میں ابتداً مشقت اٹھانی پڑے گی (اس لیے کہ السابقون الاولون کو ہمیشہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مشقت اس لیے ہے کہ تم محنت کرو اور ہم تمہاری محنت کی کمائی کھائیں۔ بالکل نہیں۔ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (51/57)۔ ہم ان سے رزق نہیں چاہتے۔ یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ کمائی اور ہم

---

[1] کھیل تماشا [2] ڈرامہ جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

کھائیں۔ان کی یہ مشقت خود انہی کے فائدے کے لیے ہے (تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ)۔آپ پہلے پہل جو پابندی بھی اپنے اوپر عائد کریں گے اس سے آپ کو اپنے سابقہ معمول سے ہٹنا پڑے گا اور یہ گراں گزرے گا۔لیکن اس کے بعد جب اس پابندی کی نفع رسانیاں آپ کے سامنے آئیں گی تو وہ عین راحت بن جائیں گی۔

عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش و بے باک رکھنے کی بجائے) قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال کر ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح منشائے خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعت عامہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ (16/36) سے اس مفہوم کو واضح کر دیا۔طاغوت کے معنی ہیں سرکش قوتیں۔لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی قوتوں کو سرکش و بے باک رکھنے کی بجائے یا سرکش قوتوں کے منشاء کے مطابق صرف کرنے کی بجائے قوانین خداوندی کے تابع رکھ کر صرف کرو۔دوسری جگہ ہے لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ (19/44) اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو۔''شیطان'' کا یہ مفہوم آیت کے اگلے ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا (16/44) کیونکہ شیطان خدا کے قوانین واحکام سے سرکشی اختیار کیے ہوئے ہے۔اس میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے جذبات بھی آجاتے ہیں جو قانون خداوندی سے سرکشی برتیں۔نیز قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ (45/23) کیا تو نے اسے بھی دیکھا ہے جس نے اپنے جذبات کو ہی اپنا الٰہ بنالیا؟

قرآن کریم نے ''خدا کی عبادت'' کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آج کل ''حکومت'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔سورۃ کہف میں ایک جگہ ہے کہ وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا (18/110) ''ان کو چاہیے کہ وہ اپنے رب کی ''عبادت'' میں کسی کو شریک نہ کریں۔'' اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وَّلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18/26) ''وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔'' اسی طرح سورہ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12/40) ''حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی۔'' اور اس کے بعد کہا اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ (12/40) ''اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو۔'' آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کس طرح ''حکومت'' اور ''عبادت'' کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ہے۔قصۂ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ آپ نے فرعون سے کہا کہ تم اپنے جو احسانات جتا رہے ہو تو وہ ان کے سوا کیا ہیں: اَنۡ عَبَّدْتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ (26/22) کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے! اسی طرح قوم فرعون کا یہ قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) کیا ہم ان دو (بھائیوں) کی بات مان لیں جو ہمارے جیسے انسان ہیں۔وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23/47) اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ان مقامات میں بھی یہ مادہ، حکومت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔قرآن کریم کا مقصود یہ ہے کہ انسان صرف قوانین خداوندی کی محکومی

اختیار کرے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5/44)۔ جو قوم قرآن کریم کے مطابق حکومت نہیں کرتی تو یہی لوگ کافر ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جماعت مومنین کو حکومت اسی لیے دی جائے گی کہ (1) ان کے دین کا تمکن ہو سکے (2) یہ خدا کی ''عبادت'' کر سکیں (یَعْبُدُوْنَنِیْ) اور (3) اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں (لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ۔ 24/55)۔ ظاہر ہے کہ اگر ''عبادت'' سے مراد محض پرستش ہو تو اس کے لیے اپنی حکومت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پرستش تو ہر حکومت میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی ''خدا کی پرستش'' کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ لہٰذا ''اللہ کی عبادت'' سے مفہوم اس کے احکام کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ [1]

① جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا اس کے معنی ہوں گے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت جس میں نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہوں گے۔ چونکہ جذباتِ اطاعت و فرماں پذیری کے اظہار کے لیے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا (مثلاً جھکنا) انسان کے لاشعور میں چلا آ رہا ہے اس لیے قرآن کریم نے بھی اظہارِ جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی حیثیت دے دی ہے۔ یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع و سجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں۔

② جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی عقیدت مندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ''خدا کی عبادت'' سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت، خدا کی محکومیت۔

③ جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی تو ہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبۂ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے۔

④ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کے معنی ہوں گے وہ لوگ جو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کریں۔ جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اُس راستہ (Channel) پر ڈال دیں جو اس کے قانون نے متعین کیا ہے۔ اسی سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1/4) کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں، ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح) اُس مقصد کے حصول کے لیے صرف کرتے ہیں جو تو نے

---

① اسی تناظر میں علامہ اقبال نے کہا ہے:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اِسلام ہے آزاد!

ہمارے لیے مقرر کیا ہے۔

اجتماعات صلوٰۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت وفرماں پذیری کا محسوس مظہر ہے۔لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں۔اس کی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51/56) سے یہی مقصود ہے۔''قوانین خداوندی کی محکومیت'' اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جنت کی خوشگواریوں کی زندگی نصیب ہوجائے اور اس کی ذات کی ایسی نشوونما ہوجائے جس سے یہ مرنے کے بعد زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوسکے۔یہ ''محکومی'' درحقیقت زندگی کی بلند، مستقل اقدار کو از خود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔یہ اپنے اوپر خود عائد کردہ پابندیاں (Self-Imposed Restrictions) ہوتی ہیں۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔نہ ہی اس میں عبادت (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے فطرت کی قوتوں سے ڈر کر انہیں خوش کرنے کے لیے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

ع ب ر

فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ (59/2) یعنی مظاہر فطرت یا تاریخی شواہد کے مطالعہ سے زندگی کی غرض وغایت اور قوانین خداوندی کے مقصود ومطلوب تک پہنچ جانا ارباب بصیرت کا کام ہے۔

ع ب ق ر

عَبْقَرٌ۔صحرا میں ایک چشمہ یا آبادی کا نام تھا جس کے متعلق عربوں میں مشہور تھا کہ وہاں جن رہتے ہیں۔وہ جب کوئی ایسی چیز دیکھتے جس کا بنانا دشوار ہوتا اور اس میں نادرہ کاری کا نمونہ ہوتا تو وہ کہہ دیتے کہ یہ انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں، یہ تو عَبْقَرٌ والوں کی بنائی ہوئی ہے۔عَبْقَر یمن کے ایک شہر کا نام ہے جہاں کپڑوں اور فروش پر نقاشی، کڑھائی اور زری کا کام کیا جاتا تھا۔وہاں کے کپڑے حسن ورعنائی میں ضرب المثل تھے۔چنانچہ جب کسی چیز میں انتہائی حسن وجودت بتانی ہوتی تو اس کی طرف نسبت کردی جاتی تھی۔اس کے بعد اَلْعَبْقَرِیُّ ہر کامل، غیر معمولی اور سب سے اعلیٰ شے، نیز قبیلے کے سردار اور بلند مرتبہ شخص کو کہنے لگ گئے۔

ع ت ق

قرآن کریم میں خانہ کعبہ کو اَلْبَيْتِ الْعَتِيْقِ کہا گیا ہے (22/29)۔یعنی نظامِ خداوندی کا وہ مرکز جو دنیا میں ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے آزاد ہے۔جس پر کسی کا اثر وغلبہ نہیں۔نہ ذہنی نہ حکمرانی۔کس قدر بلند ہے وہ مقام جو ہر قسم کی غلامی سے

آزادہو۔اورکس قدرصاحب شرف وعظمت ہے وہ قوم جس کے مرکز کی یہ شان ہو۔

کعبہ کے اَلْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (22/29) ہونے میں اس کا آزاد، صاحب قوت اور شرف وعظمت و نیز زمان کے اعتبار سے سب سے بلند اور آگے ہونا،تمام معانی آجاتے ہیں۔یہی مقام اقوام عالم میں امت مسلمہ کا تھا۔اس لیے کہ کعبہ درحقیقت نشان (Symbol) ہے نظامِ خداوندی کا اوراس قوم کا جس کا وہ مرکز ہے۔جس طرح دارالسلطنت یاعلم کسی مملکت کا نشان ہوتا ہےاورعلم کی سربلندی سے مرادخوداس مملکت کی سربلندی ہوتی ہے۔

زمان (Time) کے لحاظ سے کعبہ کے متقدم ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے قومی مرکز (بیت المقدس) سے بہت پہلے [1] (ملت ابراہیمی کے مرکز کی حیثیت سے) وجود میں آیا تھا۔

ع ج ز

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ غلط روش پر چلنے والے جو جی میں آئے کرلیں، وہ کبھی قانونِ خداوندی کوشکست نہیں دے سکتے۔ جوقانون انسانوں سے شکست کھاجائے وہ خدا کا قانون کیا ہوا؟ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرانسانوں کی جماعت اس قانون کے نفاذ کی کوشش کرے تو وہ اپنے نتائج انسانی پیمانوں کے مطابق (جلدی) سامنے لے آتا ہے، اور اگر وہ کائناتی طریق پر کارفرما ہے تو اس کے نتائج کائناتی پیمانوں کے مطابق برآمد ہوتے ہیں (جن کی رو سے ایک ایک ''یوم'' ہزار ہزار سال کا بھی ہوتا ہے، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے۔ 70/4)۔شکست اس قانون کو کبھی نہیں ہوسکتی۔

ہمارے ہاں جن معنوں میں معجزہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے (یعنی نبی سے کسی ایسی خارق عادت یا بات کا سرزد ہونا جسے دیکھ کر دوسرے عاجز آجائیں) قرآن کریم میں یہ لفظ [2] ان معنوں میں نہیں آیا۔

ع ج ل

قرآن کریم میں تَعَجَّلَ بمقابلہ تَأَخَّرَ آیا ہے (2/203)۔اور عَاجِلَةَ بمقابلہ اٰخِرَةَ (75/20-21؛17/18-19)۔قرآن کریم کی یہ دو اصطلاحات (عَاجِلَةَ اور اٰخِرَةَ) بڑی غور طلب ہیں۔مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے جو انہوں نے بیج کے لیے رکھے ہیں۔ان کے ہاں کھانے کی تنگی ہے۔ان میں سے ایک کسان اٹھتا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوالاتا ہے۔اس کے گھر میں گھنٹہ بھر میں روٹیاں ہی روٹیاں ہوجاتی ہیں۔

---

[1] سورۃ آل عمران، آیت نمبر:96

[2] گویا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ معجزات کا قرآن حکیم میں کوئی ذکر نہیں۔(منظورالحسن صاحب کتاب)

لیکن دوسرا کسان اس وقتی تنگی کو برداشت کر لیتا ہے اور اس گندم کو اپنے کھیت میں بو دیتا ہے۔ اس پر چھ سات مہینے کا زمانہ تو بڑا سختی کا گزرتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے گھر دانے ہی دانے ہو جاتے ہیں اور وہ بڑی فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اول الذکر کسان نے عجلت سے کام لیا یعنی اس کی نگاہ مفادِ عاجلہ پر تھی۔ ایسے مفاد پر جو جلدی سے ہاتھ آ جائیں۔ لیکن دوسرے کسان کی نگاہ مفادِ آخرہ پر تھی، یعنی مستقبل کی خوش حالی اور فارغ البالی پر۔ یہ ہے فرق عَاجِلَۃ اور اٰخِرَۃ کا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ صرف مفاد عاجلہ (پیش پا اُفتادہ) پر ہوتی ہے ہم انہیں مفاد عاجلہ دے دیتے ہیں۔ لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا (2/200؛17/18)۔ اس کے برعکس جو لوگ مستقبل کی خوشگواریوں پر نگاہ رکھتے ہیں تو ان کا مستقبل بھی درخشندہ ہو جاتا ہے اور (ابتدائی محنت کے بعد) حال بھی خوشگوار (2/201؛17/19)۔ یہی دو گروہ ہیں جن کا تقابل سارے قرآن کریم میں نظر آتا ہے۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس میں انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے بھی بطریق احسن پورے ہو جاتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتی ہے۔ یوں ''دنیا اور آخرت'' دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے: وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (17/11) انسان جلد باز ہے۔ اس لیے (21/37) میں بھی اس کے یہی معنی لیے جائیں تو زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ بالخصوص جب اُسی آیت میں فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ بھی آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ ہمیشہ مفاد عاجلہ کے پیچھے جاتا ہے۔ یہ صرف وحی کا قانون ہے جس کے تابع چلنے سے اس کی نگاہ مستقبل پر بھی رہتی ہے۔ دوسری طرف اسی عجلت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ اس کی غلط روش کے نتائج فوراً سامنے کیوں نہیں آتے۔ حالانکہ خدا کے قانون مہلت کی رو سے ہر عمل اور اس کے نتیجہ میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جس طرح بیج اور اس کے پھل کے درمیان ایک مہلت کی مدت ہوتی ہے)۔ جن کی نگاہ خدا کے اس قانون پر ہوتی ہے وہ اس سے نہیں گھبراتے کہ مخالفین کی غلط روش کا نتیجہ فوراً کیوں سامنے نہیں آتا؟ انہیں خدا کے محکم قانون کی نتیجہ خیزی پر یقین ہوتا ہے۔

ع د د

عِدَّةٌ اس شمار کی ہوئی مدت کو کہتے ہیں جس میں عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔

ع د ل

قرآن کریم نے عَدْلٌ اور اِحْسَانٌ کا حکم دیا ہے (16/90)۔ کسی کو پورا پورا معاوضہ دے دینا عدل ہے اور اس کی کمی کو

پورا کر کے اس کے توازن (حسن) کو قائم کر دینا اِحسَانٌ ہے۔

قرآنی معاشرہ کی بنیادیں عدل واحسان پر استوار ہوتی ہیں۔اس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ہے۔کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔لیکن اس معاشرہ کے افراد نے شروع ہی سے یہ عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ اتنا ہی لیں گے جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لیے کھلا چھوڑ دیں گے (2/219)۔ یہ بقایا ان لوگوں کے لیے ہوگا جو کسی وجہ سے محنت کرنے کے قابل نہیں رہے اور جن کی محنت کا ماحصل ان کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔ان کی اس کمی کو پورا کر دینے کا نام اِحسَانٌ ہے۔ یہ احسان کسی پر ''احسان'' نہیں ہوتا، نہ ہی اس کی شکل خیرات کی ہوتی ہے۔ان تمام افراد معاشرہ نے اس امر کا عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ ان کی محنت کا ماحصل سب کی نشوونما کے لیے کھلا رہے گا۔ یہ سب کچھ نظام معاشرہ کی تحویل میں رہتا ہے اور تمام افراد معاشرہ کی نشوونما کے کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عدل واحسان کے حکم کے ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ فَحْشَآءِ اور مُنْکَر سے باز رہو (16/90)۔ فَحْشَآءِ کہتے ہیں بخل کو، اور مُنْکَر کہتے ہیں عقل فریب کار کی حیلہ جوئیوں کو جو انسان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے پر اُکساتی رہتی ہے۔

ع ذ ب

قرآن کریم کی رو سے دنیاوی زندگی میں ذلت وخواری، خدا کا عذاب ہے (20/134)۔ بھوک اور خوف، عذاب ہے (16/112)۔ برکاتِ سماوی اور ارضی کے دروازوں کا بند ہوجانا عذاب ہے (7/96)۔ گروہ بندی اور پارٹی بازی عذاب ہے (6/65)۔ باہمی اختلاف، عذاب ہے (3/104)۔ اختلافات کا مٹ جانا رحمت ہے (11/118-119)۔ یہ عذاب خداوندی کی صرف چند شکلیں ہیں۔ تفصیل اس کی قرآن کریم کے صفحات میں شروع سے آخر تک پھیلی ہوئی ہے۔

ع ر ج

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے سلسلہ ارتقاء کے ضمن میں آیا ہے: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ خدا کسی اسکیم کو اپنے قانونِ مشیت کی رو سے طے کرتا ہے پھر اس کا آغاز پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32/5) پھر وہ شے اس نقطۂ آغاز سے بتدریج بلندیوں کی طرف اٹھتی ہے اور ایک ایک مرحلہ کو ہزار ہزار سال (اور پچاس پچاس ہزار سال (70/4) کی مدت میں طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔اسی نہج سے خدا نے اپنے آپ کو ذِی الْمَعَارِجِ (70/3) کہا ہے۔ ''سیڑھیوں والا خدا۔'' یعنی جو اس طرح بتدریج تمام اشیاء کو ان کی ارتقائی منازل طے کراتا ہے۔ وہ خدا صراطِ مستقیم پر بھی ہے (11/56)۔ یعنی ایک توازن بدوش سیدھے راستے

پر اور اس کے ساتھ ہی ذی المعارج بھی ''صراطِ مستقیم'' پر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے سلسلہ کائنات کو آگے کی طرف بڑھا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے ایک دفعہ اس کائنات کو بنا دیا اور اب یہ کائنات فضا کی پہنائیوں میں ایک ساکن اور جامد ڈھیلے کی طرح پڑی ہے، بلکہ یہ کہ اس میں حرکت ہے اور یہ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ (Dynamic) ہے۔ نیز اس کی حرکت خط مستقیم پر (Linear) ہے۔ دَوری (Cyclic) نہیں۔ یہ تصور یونانیوں کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ اوپر کی طرف بھی چڑھ رہی ہے یعنی اس میں ارتقاء بھی ہے۔ یہ ہے کائنات کا تصور جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ یعنی ہر آن آگے بڑھنے والی اور اوپر چڑھنے والی۔ قوانین خداوندی کی یہی راہ ہے جس پر چلنے کی تاکید انسان کو کی گئی ہے۔ یعنی انسان کو بھی ساکن اور جامد نہیں رہنا چاہیے۔ اسے آگے بڑھنا اور بلندیوں کی طرف جانا چاہیے (Progressive and Ascending) ارتقاء صعود۔

عرش

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لیے عرش کا لفظ متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (27/26) اس کے معنی اقتدار اعلیٰ، مرکزی کنٹرول کے ہیں۔ یعنی ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور اس کا اقتدار اور کنٹرول بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ کنٹرول اس کی بڑی محکم گرفت میں ہے جس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آسکتی۔ استویٰ کے معنی کسی چیز پر جم کر بیٹھنا، یعنی پوری طرح غالب آجانا ہیں۔

سورہ ہود میں ہے: وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (11/7) اس کا عرش (مرکزی اقتدار) پانی پر ہے۔ یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ سورہ انبیاء میں ہے: وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21/30) ہم نے ہر شے کو پانی سے زندگی عطا کی ہے۔ یعنی حیات کا سرچشمہ پانی ہے۔ اس کی تائید دورِ حاضر کی تحقیق سے ہو رہی ہے کہ پانی کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ حیات کی جل پری نے آنکھ ہی پانیوں میں کھولی ہے۔ لہٰذا جب قرآن کریم نے کہا کہ خدا کا عرش پانی پر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرچشمۂ حیات پر واحد کنٹرول خدا کا ہے۔ خدا کا یہ کنٹرول اس کے قانون کی رُو سے کارفرما ہے۔ اس نے ہر شے کے لیے ایک قانون بنا دیا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ اس قانون کی خلاف ورزی کر سکے۔ خارجی کائنات کی طرح انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے لیے بھی خدا کا قانون ہے (جسے وحی کہتے ہیں)۔ انسان کو چونکہ صاحب اختیار بنایا گیا ہے اس لیے اسے اس کا اختیار ہے کہ یہ جی چاہے تو خدا کے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اپنے لیے کوئی اور قانون وضع کر لے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قانونِ خداوندی کے خلاف چلنے سے زندگی کے خوشگوار نتائج مرتب کر لے۔ نتائج ہمیشہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہی مرتب ہوں گے۔ اس پر صرف خدا کا کنٹرول ہے، کسی اور کا نہیں۔ خدا کا عرش تمام کائنات پر بچھا ہوا ہے۔

ع رف

خدا کا علم (ہر شے کے متعلق) یقینی ہوتا ہے۔اس کے برعکس خدا کی ذات کا علم انسان کو حاصل نہیں ہوسکتا۔البتہ کائنات پرغور وفکر کرنے سے اس کی صفات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اسے خدا کی معرفت کہہ سکتے ہیں۔ (قرآن کریم میں اللہ کے لیے معرفت کا لفظ نہیں آیا)۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں عارف باللہ (خدا کی معرفت رکھنے والوں) کے متعلق جو عام تصور ہے کہ وہ خدا کی ذات کا علم رکھتے ہیں، کس قدر غلط ہے۔کائنات کے مشاہدہ اور قرآنی حقائق پرغور وفکر سے قوانین خداوندی کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔خود ذات خداوندی کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے خدا پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے، اس کے عرفان کا نہیں۔

مَعْرُوْفٌ سے مراد ہیں وہ تمام امور جنہیں ایک قرآنی معاشرہ اپنے ہاں تسلیم (Recognise) کر لے اور مُنْكَرٌ وہ تمام باتیں جنہیں وہ صحیح تسلیم نہ کرے۔جنہیں وہ (Recognise) نہ کرے۔یہ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام وقوانین سے لے کر اس معاشرہ کے روزمرہ کے رسوم وآداب تک سب آجاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان رسوم وآداب کے بنیادی اصول تو غیر متبدل رہیں گے کیونکہ وہ قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں لیکن ان کی شکل و صورت اور تفاصیل وجزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔لہٰذا ایک قرآنی معاشرہ جن آئین وآداب کو اپنے وقت میں تسلیم (Recognise) کر لے وہ معروف ہوں گے، خواہ وہ پہلے سے موجود ہوں یا وہ انہیں خود تجویز کرے، حتیٰ کہ کسی قوم یا ملک کے رسم ورواج کو بھی وہ اپنے ہاں رائج رہنے دے تو وہ بھی مَعْرُوْفٌ کے ذیل میں آجائیں گے۔لیکن اس کے ساتھ اس شرط کو بھی پیش نظر رکھیے کہ ان میں سے کوئی چیز قرآن کریم کے اصول واحکام کے خلاف نہیں ہونی چاہیے۔ایسی بات منکر ہوجائے گی۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر اَلْاَعْرَافُ کا بھی ذکر آتا ہے: وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ (7/46) عام طور پر اعراف اس مقام کو کہا جاتا ہے جو جنت اور دوزخ کے بین بین ہے اور ان لوگوں کو اعراف والے سمجھا جاتا ہے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر برابر ہوں گی اور ان کا معاملہ ہنوز طے نہیں ہوا ہوگا کہ انہیں کدھر بھیجا جائے۔لیکن یہ مفہوم درست نہیں۔قرآن کریم میں صرف اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اور اَصْحٰبُ النَّارِ کے دو گروہوں ہی کا ذکر ہے۔کسی ایسے (تیسرے) گروہ کا ذکر نہیں جو بین بین معلق ہو۔دوسرے یہ کہ ان اہل اعراف کا مقام اتنا بلند بتایا گیا ہے کہ وہ تمام اہل جنت اور اہل جہنم کو ان کی نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے۔یہ طبقہ بلند ترین انسانوں کا ہے۔یہ حضرات اپنے اپنے گروہوں پر بطور شاہد سامنے آئیں گے (4/41)۔یہ گروہ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ میں سے غالباً وہ طبقہ ہے جسے السّٰبِقُوْنَ اور الْمُقَرَّبُوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے (56/10-11)۔یہ وہ جماعت مومنین ہے جسے شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2/143) کہا گیا ہے۔

حج کے اجتماع میں عَرَفَاتٍ کا بھی ذکر ہے (2/198) یہ وہ میدان ہے جس میں تمام دنیا کی ملت اسلامیہ کے نمائندوں کا باہمی تعارف ہوتا ہے۔

ع رو

سورہ بقرہ میں خدا پر ایمان کو بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی (2/256) کہا ہے۔ یعنی ایسا محکم آسرا جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے۔ زندگی کا ایسا قانون جو اپنی نتیجہ خیزی میں کبھی خطا نہ کرے۔ جس کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد ہو۔ جو کبھی دغا نہ دے۔ جو راستہ ہی میں نہ ٹوٹ جائے۔

ع زر

سورۃ اعراف میں ہے: فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (7/157) اور سورۃ فتح میں ہے: لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ (48/9) ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے رسول کی مدد کریں (نصرت)، تعظیم کریں (توقیر)، اور عَزَّرُوْهُ اس کے معنی ہیں رسول کی ایسی مدافعت کرنا جس سے اس کی ذات اور اس کا پیغام تمام شر پسند عناصر کی تخریب سے محفوظ رہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہونے دی جائے جس سے حضور ﷺ کی ذات پر کسی قسم کا طعن آئے یا آپ ﷺ کی تعظیم پر کوئی اعتراض وارد ہو۔

ع زز

قرآن کریم میں خدا کے لیے اَلْعَزِیْزُ آیا ہے (2/129)۔ یعنی کائنات میں غلبہ و اقتدار صرف اسی کے قانون کو حاصل ہے اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کے قانون پر غالب آ سکے۔ انسانی معاشرہ میں اس قسم کا غلبہ و اقتدار اس جماعت کو حاصل ہو سکتا ہے جو ایک مرکز کے ماتحت، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے (63/8)۔ اقتدار اور غلبہ صرف خدا کے لیے ہے۔ لیکن اس نے ایسے قوانین بنا دیئے اور بتا دیئے ہیں جن کے مطابق چلنے سے انسان کو بھی اپنے دائرے میں غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ قوانین طبعی دنیا سے بھی متعلق ہیں اور انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے بھی متعلق۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ یہ معنی ہیں وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (3/25) کے۔ یعنی اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق عزت اور ذلت عطا کرتا ہے۔ یونہی اندھا دھند کچھ نہیں ہو جاتا۔

ع ز ل

سورہ بقرہ میں ہے کہ حیض کے دوران فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ عورتوں سے الگ رہو۔ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ (2/222) اس کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی جب تک وہ حیض سے پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب [1] نہ جاؤ۔

ع ز م

قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ اور مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ صاحب عزیمت (بڑی ہمت اور استقلال کے مالک) ہوتے ہیں اور ان کے عزائم بڑے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن اب عَزِيۡمَةٌ کے معنی ہیں تعویذ اور عَزَائِمُ الۡقُرۡآنِ کے معنی ہیں قرآن کریم کی آیات جن سے تعویذ لکھے جاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کی جاتی ہے۔ اور اَلۡمُعَزِّمُ کے معنی ہیں جھاڑ پھونک کرنے والا۔

عزیر

سورۃ توبہ میں ہے: وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرٌ ابۡنُ اللّٰهِ (9/30) ''یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔''

عزیرؑ یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ یہودی لٹریچر میں ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیانات ملتے ہیں۔ جیوئش انسائیکلو پیڈیا نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ پر شریعت نازل نہ ہوئی ہوتی تو عزیرؑ پر نازل ہوتی۔

قرآن کریم نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا نہ ہی زمرۂ انبیاء کرام میں ان کا نام لیا ہے۔ اس لیے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ (قرآن کی اصطلاح میں) نبی تھے یا نہیں۔ یہودیوں کے ہاں ''نبی'' ہیکل کے ایک بڑے منصب دار کو کہتے تھے جس کا کام کہانت ہوتا تھا۔

ع س ر

قرآن کریم نے آسانیاں حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ تم مشکلات کا سامنا کرو۔ جو مشکلات کا سامنا نہیں کرتا اسے آسانیاں نصیب نہیں ہو سکتیں (94/5)۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ یہ نہیں کہ جب یُسر (آسانیاں) مل جائیں تو انسان مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ اس وقت بھی انسان کے سامنے مشکلات آئیں گی جن پر غلبہ پانے کے لیے اسے سعی و عمل کی ضرورت ہوگی۔ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است۔ [2] فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا ۝ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا ۝ (94/5-6) یقیناً تنگی

① یعنی جنسی اختلاط سے منع کیا گیا ہے۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

② پوری رباعی یوں ہے:

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(پیام مشرق، علامہ اقبال)

کے ساتھ آسانی ہے۔ فی الواقعہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔

ع س ع س

قرآن کریم میں ہے: وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ (81/17) اس کے معنی رات کی تاریکی جانے کے ہی ہوں گے۔ کیونکہ اس سے آگے وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (81/18) ہے۔ یعنی طلوع فجر۔ قرآن کریم نے ان مظاہر فطرت کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (81/19) یہ ایک صاحب عزت وتکریم رسول کی (زبان سے تم تک پہنچی ہوئی) بات ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کے قوانین خدا کے متعین فرمودہ اور اٹل ہیں اسی طرح قرآنی حقائق بھی خدا کے نازل کردہ اور غیر متبدل ہیں۔

ع ص ر

قرآن کریم میں ہے: وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ○ (103/1-2) زمانہ (یعنی تاریخِ انسانیت) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان (جو وحی کی روشنی کے بغیر چلتا ہے) وہ ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔

ع ص م

سورۃ آل عمران میں ہے: وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (3/100) جس نے قانونِ خداوندی کو مضبوطی سے تھام لیا اُسے زندگی کی متوازن راہ کی طرف راہنمائی مل گئی۔ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (3/102) کے بھی یہی معنی ہیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (5/67) (اے رسول تو اس قانونِ خداوندی کو لوگوں تک پہنچائے جا۔۔۔) وہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں حضور ﷺ کے جسم کی حفاظت مراد نہیں۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کے متعلق خود قرآن کریم میں آیا ہے: اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (3/143) تو کیا اگر وہ مرجائے یا قتل کردیا جائے۔ یعنی اس میں قتل کردیئے جانے کے امکان کی وضاحت ہے، لہٰذا (5/67) میں حضور ﷺ کے جسم کی حفاظت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ حفاظتِ رسالت (پیغاماتِ خداوندی) مقصود ہے۔

ع ص و

عصائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً (20/18) اگر اسے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے تو اس سے مراد لاٹھی ہوگی۔ لیکن اگر اسے مجازی معنوں میں لیا جائے اس سے مفہوم وہ ضابطۂ خداوندی (وحی کا پیغام) ہوگا جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کے لیے وجہِ تقویت تھا اور جس کے سامنے ساحرین فرعون کی باطل تعلیم کوئی

حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کیے جا سکتے ہیں۔

ع ض و

سورۃ الحجر میں ہے: الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ (15/91) جنہوں نے قرآن کریم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ جس بات سے اپنا مطلب حل ہوتا ہوا سے مان لیا۔ جو بات اپنے مفاد کے خلاف جاتی ہو اس کی جگہ اپنی خود ساختہ شریعت کا اتباع کر لیا۔ یا اسے مخصوص منتروں کی طرح پڑھنے[1] یا تعویذ گنڈے لکھنے کے لیے رکھ چھوڑا۔

ع ط ل

سورۃ تکویر میں ہے: اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (81/5) جب حاملہ اونٹنیوں کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔ اَلْعِشَارُ ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں جو بچہ دینے کے قریب ہوں۔ عربوں میں اونٹ کی جو اہمیت تھی وہ واضح ہے۔ اور ایسی اونٹنیاں جو بچہ دینے کے قریب ہوں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی اونٹنیوں کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دینے سے مفہوم یہ ہے کہ اُس دور میں خود اونٹنیوں کی قدر و قیمت ہی نہیں رہے گی۔

ع ط و

قرآن کریم میں ہے: وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17/20) جو سامانِ زیست نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے خدا کی طرف سے مفت عطا ہوا ہے (یعنی رزق کے قدرتی وسائل) ان پر کوئی روک نہیں۔ جب خدا نے انہیں عالمگیر انسانیت کے نشوونما کے لیے عام کر دیا ہے تو ان پر روک کون ڈال سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (92/5) جو دیتا ہے اور اس طرح زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسی کے لیے آسانیاں ہیں۔ برخلاف اس کے اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى (92/8) جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لیے رکھتا ہے اور اس طرح دوسروں سے بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے تو اس کے لیے دشواریاں ہی دشواریاں ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانی جسم کی پرورش کا مدار ہر اس چیز پر ہے جسے انسان اپنے لیے لیتا ہے۔ جسے وہ خود کھاتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نوالہ آپ کے منہ میں جائے اور پرورش میرے جسم کی ہوتی جائے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس، انسانی ذات (Self) کی نشوونما ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشوونما کے لیے دیتا ہے۔ قرآنی نظام کی یہی اصل و بنیاد

---

[1] یا اِسے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اُن کے نام رکھ دیئے مثلاً حمائل شریف یا پنج سورۃ وغیرہ۔ حالانکہ قرآن حکیم غیر منقسم وحدت ہے۔ (منظور الحسن)

ہے۔ پوری پوری محنت کرنا لیکن اپنی محنت کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی سب نوع انسانی کی نشوونما کے لیے دے دینا۔ یہ ہے جماعت مؤمنین کا شعارِ زندگی۔

ع ف ر

سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے درباریوں میں سے ایک کے لیے عِفۡرِيۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ (27/39) آیا ہے۔ یعنی وحشی اور پہاڑی قبائل میں سے ایک مضبوط، قوی ہیکل اور چست و چالاک آدمی۔ جس میں قوت اور معاملات کے اندر تک گھس جانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم تھی۔ تیز وطرار، زیرک اور ہوشیار، انتہائی معاملہ فہم۔

ع ف ف

قرآن کریم انسانی عفت پر بڑا زور دیتا ہے۔ یعنی جنسی اختلاط کے صرف ایک طریقے کو جائز قرار دیتا ہے جسے نکاح کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنسی اختلاط سخت جرم ہے۔ وہ کھانے پینے کے معاملہ میں اضطراری حالت کو تسلیم کرتا ہے اور اس میں حرام تک کھانے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے اضطراری حالت کو تسلیم نہیں کرتا، اس لیے وہ اس کی تسکین کے لیے ناجائز اختلاط کی اجازت نہیں دیتا۔ بھوک اور پیاس انسان کے اپنے کنٹرول میں نہیں ہوتی۔ لیکن جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال سے اُبھرتا ہے۔ اگر اس کا خیال نہ کیا جائے تو یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا۔ اس لیے جس جذبہ پر انسان کا اپنا کنٹرول ہو اس میں اضطراری حالت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ع ف و

قرآن کریم میں ہے کہ یہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت نوع انسانی کی نشوونما کے لیے کھلا رکھیں اور کس قدر خود اپنے لیے رکھیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ قُلِ الۡعَفۡوَ (2/219) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ یہ ہے قرآن کریم کے نظامِ ربوبیت کا اصل الاصول۔ یعنی ہر فردِ معاشرہ پوری پوری محنت کرے اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل سے اپنے لیے صرف اس قدر لے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لیے قرآنی نظام کے حوالے کر دے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد فاضلہ دولت (Surplus Money) ہے۔ قرآنی نظام میں فاضلہ دولت کسی فرد کے پاس رہنے نہیں پاتی۔ تمام افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری نظام کے سر پر ہوتی ہے اور افراد اپنی محنت کا ماحصل اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ اس لیے نہ کوئی شخص بھوکا مرتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے۔

ع ق ب

قرآن کریم میں عُقْبٰی کا لفظ مومنین کی جزا اور کفار کی سزا دونوں کے لیے آیا ہے (13/35)۔ قرآن کریم میں ہے:
وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (13/41) اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔ اس کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آ سکتا۔

قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کے لئے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف راہ نمائی کی ہے۔ قانونِ مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ اس کے ساتھ ہی لگا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی آگے آگے کام جاتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے اس کا نتیجہ چلا جاتا ہے۔ اسے جزا اور سزا کہتے ہیں۔ لہٰذا جزا یا سزا کہیں خارج سے نہیں آتی، خود اعمال کے اندر ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اعمال کا جزو ہوتی ہے۔ جیسے ورزش کا نتیجہ (صحت) خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ اسی لیے سورہ رعد میں کہا ہے کہ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (13/11) ہر انسان (یا اس کے عمل) کے ساتھ اس کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں لگی ہوئی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق اس کی نگرانی کرتی ہیں اور اس کے ہر عمل کو آخری نتیجہ تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں، اسی کو مآل کار یا کام کا آخری نتیجہ کہتے ہیں۔ یہی ہر انسانی عمل کی عَاقِبَةٌ یا عُقْبٰی ہے۔

عُقْبٰی کے معنی اس دنیا کے بعد دوسری دنیا ہی نہیں، اس کے معنی ہر کام کا نتیجہ یا انجام ہیں۔ خواہ وہ انجام اسی دنیا میں سامنے آ جائے (یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔

جاہلیت کے بعد اسلام قبول کرنا اور اسلام کے بعد پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جانا۔ (3/143) میں یہی معنی ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نظام، رسول اللہ ﷺ کی زندگی تک ہی نہیں کہ ان کی وفات کے بعد تم پھر نظامِ جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ۔ یہ نظام علیٰ حالہٖ جاری رہے گا۔ اس سے قرآن کریم نے اس حقیقت عظمیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نظام، افراد یا شخصیتوں کی زندگی سے وابستہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اصولوں کے زور پر آگے چلتا ہے۔ شخصیتیں آتی جاتی ہیں لیکن جب تک وہ اصول قائم رہتے ہیں جن پر وہ نظام متشکل ہوا تھا، وہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ختم نبوت کے معنی ہی یہ تھے کہ اب یہ نظام (اسلام) شخصیتوں کے سہاروں کا محتاج نہیں رہے گا۔ یہ اپنے محکم اصولوں کی قوت پر آگے چلے گا۔ جب تک امت ان اصولوں پر قائم رہی وہ نظام آگے بڑھتا گیا۔ جب اس نے وہ اصول چھوڑ دیئے تو وہ نظام بھی ختم ہوگیا۔ اب اس کے احیاء کی صورت یہی ہے کہ قرآن کریم کے اصولوں کو پھر سے ضابطۂ حیات بنالیا جائے۔

ع ق ل

قرآن کریم میں عقل وفکر سے کام لینے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے انہیں حیوانات سے بدتر قرار دیا گیا ہے، اوران کا مقام جہنم بتایا گیا ہے (7/179)۔ قرآنی حقائق کو نہ ماننے والوں (کفار) سے بار بار کہا گیا ہے کہ تم عقل وفکر سے کام کیوں نہیں لیتے۔ تم قرآن کریم میں غور وتدبر کیوں نہیں کرتے۔ انہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ اگرتم اپنے دعویٰ میں سچے ہوتو اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو (27/64)۔ اس اعتبار سے عقل کا مقام بہت بلند ہے۔ خود عربوں کے ہاں بھی اَلْعَقِيْلَةُ اس صاحب شرف وعزت خاتون کو کہتے تھے جو پردہ نشین ہو۔ نیز قوم کے سردار کو۔ بلکہ ہر اعلیٰ اور بہترین چیز کو۔

عقل کا صحیح منصب یہ ہے کہ وہ انسان کو نامناسب باتوں سے روکے۔ لیکن یہی عقل اگر جذبات کے تابع ہوجائے تو تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بن جاتی ہے (29/38)۔ ایسا انسان (یا قوم) علم وعقل کے باوجود زندگی کی غلط روش پر چل نکلتا ہے۔ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (45/23) اوراس کے ذرائع علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔ (46/26) جس طرح نشے کی حالت میں انسان کے حواس صحیح کام نہیں کرتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہوکر اس کی عقل صحیح کام نہیں کرتی۔ وہ جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے حصول کا ذریعہ۔ اس مقام پر عقل، انسان کواس کی انفرادی مفاد پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے اور اسے ربوبیت عامہ (عالمگیر انسانیت کی نشوونما) سے روکتی ہے۔ لہٰذا عقل کا صحیح مقام یہ ہے کہ اسے وحی کے تابع رکھا جائے۔ یعنی انسان اپنے جذبات کو وحی کے تابع رکھے تو اس کی عقل اسے صحیح فائدہ پہنچا سکتی ہے (28/50)۔

بالالفاظ دیگر عقل کو اپنی راہنمائی کے لیے اسی طرح وحی کی روشنی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہے۔ یہ ہے تعلق عقل اور وحی کا۔ اس طرح عقل سے کام لینے والوں کو مومن کہا گیا ہے (65/10)۔ جو عقل وحی کے تابع نہیں چلتی اسے شَيْطَانٌ اور اِبْلِيْسُ کہا گیا ہے۔

ع ک ف

سورہ حج میں ہے کہ کعبہ کو سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ (22/25) بنایا ہے۔ یعنی وہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لیے یکساں۔ وہ تمام نوع انسانی کے لیے مشترکہ طور پر جائے پناہ ہے اور کسی پر اس کے دروازے بند نہیں۔ نہ ہی کسی کے حقوق زیادہ ہیں۔

کعبہ کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے کہا کہ اسے طَآئِفِيْنَ اور عٰكِفِيْنَ کے لیے پاکیزہ

بنا دیں (2/125)۔ عٰکِفِیۡنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جونوع انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انہیں ایک رشتہ میں پروکر ان کے معاملات کو درست حالت میں رکھے۔ ان کے الجھے اور بکھرے ہوئے بالوں کی مشاطگی کرے اور اس طرح گیسوئے انسانیت کوسنوار دے۔ یہ ہے منصب امت مسلمہ کا جس کے نظام کا مرکز کعبہ ہے۔یعنی یہ امت اپنے آپ کو اپنے مرکز نظامِ خداوندی (کعبہ) سے متمسک رکھتی ہے اورنوع انسانی کے معاملات کوسنوارتی ہے۔اسی کو شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2/143) بھی کہا ہے۔یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگران۔لیکن دوسروں کے اعمال کی نگران وہی جماعت ہوسکتی ہے جو خودقوانین خداوندی پر جم کر رہے اوراپنی تمام توجہات کواسی نقطہ پرمرکوز رکھے۔

ع ل م

عربوں کے نزدیک عِلۡمٌ کا درجہ معرفت اورشعور سے زیادہ بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کے لیے عِلۡمٌ کا لفظ استعمال کرتے ہیں،معرفت یا شعور کا نہیں۔ چنانچہ خدا کو عَالِمٌ یا عَلِیۡمٌ کہہ سکتے ہیں۔ عَارِفٌ (معرفت رکھنے والا) یا شَاعِرٌ (شعور رکھنے والا) نہیں کہہ سکتے۔اس علم کی مثال جوتدبر وتفکر سے حاصل نہیں ہوتا وحی ہے۔(42/52)

قرآن کریم نے (2/7) سمع، بصراور قلب کوحصولِ علم کے ذرائع قرار دیا ہے (جو ایمان تک پہنچنے کا ضروری ذریعہ ہے)۔دوسرے مقام پر قَلۡبٌ کی جگہ فُؤَادٌ بھی کہا ہے(17/36)۔اس میں علم بذریعہ حواس (Perceptual Knowledge) اور بذریعہ تصورات (Conceptual) دونوں آجاتے ہیں اورفُؤَادٌ کی نسبت اس میں احساسات بھی آجاتے ہیں۔لیکن چونکہ علم اس وقت علم کہلاسکتا ہے جب وہ یقین کے درجے تک پہنچ جائے اس لیے قرآن کریم نے وحی کو عِلۡمٌ کہا ہے اوراس کی ضد کو اَهۡوَاءٌ (2/120)۔یعنی انسان کے خودساختہ تصورات یا جذباتی عقیدت مندیاں جن کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم خارجی کائنات کے متعلق علم حاصل کرنے پر بڑا زور دیتا ہے۔اس لیے کہ اس علم کی بنیاد دلائل و براہین اور حقائق وشواہد پر ہوتی ہے۔جذباتی عقیدت مندی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دعویٰ کو دلیل و برہان کے زور سے پیش کرتا ہے (4/175)۔اوران دعاوی سے انکار کرنے والوں سے بھی دلائل و براہین طلب کرتا ہے (27/64)۔اسے اپنے دعاوی کی محکمیت پر اتنا یقین ہے (اور یقین علم سے پیدا ہوتا ہے) کہ وہ ان دعاوی سے انکار کرنے والوں کے متعلق علانیہ کہہ دیتا ہے کہ وہ ان کی تردید میں کوئی برہان پیش نہیں کرسکتے (23/117)۔اسی لیے قرآن کریم کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت دعوت ہے (12/108)۔یعنی (Rational) عقلی طریق۔

خدا کا علم، کائنات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس لیے ساری کائنات عَالِمٌ کہلائی جانے لگی۔ نیز کائنات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں میں سے ہرایک بھی عَالِمٌ کہلائے گا۔

رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (1/1) کے معنی، دورحاضر کی اصطلاح میں ''بین الاقوامی انسانیت کی نشوونما دینے والا'' بھی ہوسکتے

ہیں۔یعنی خدا کی عالمگیر ربوبیت انسانیہ۔اور تمام کائنات کا نشوونما دینے والا بھی جس میں انسان بھی شامل ہوں گے۔لہٰذا خدا کی رَبُّ الْعَالَمِیْنِیْ کی صفت محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آنی چاہیے۔محض ذہنی تصور یا عقیدہ میں نہیں رہنی چاہیے۔ قرآن کریم میں ہے: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2/31) اللہ نے آدم (آدمی) کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا۔ یا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (96/5) اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (96/4) اسے قلم سے (لکھنا) سکھایا۔عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (55/3) سے بولنا (اپنے آپ کو Express کرنا) سکھایا۔ان مقامات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس طرح سکھایا جس طرح ایک استاد بچے کو تعلیم دیتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کے اندر ان باتوں کی صلاحیت رکھ دی۔اسے ان کی استعداد عطا کر دی۔اس کی واضح مثال سورہ مائدہ میں ملے گی جہاں فرمایا کہ تم اپنے شکاری کتوں کو (شکار پکڑنا) سکھاتے ہو مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (5/4) اس علم کی رو سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ظاہر ہے کہ اللہ کسی انسان کو شکاری کتوں کو سدھانے کا طریقہ نہیں سکھاتا۔اس نے انسان میں اس کی استعداد رکھی دی ہے جس سے انسان اس علم کو خود حاصل کرتا ہے۔

لہٰذا ایک علم تو وہ ہے جو نبی کو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے، اسے وحی کہتے ہیں۔اور دوسرا علم وہ ہے جس کی استعداد تمام انسانوں میں رکھ دی گئی ہے، اور جو انسان چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے۔قرآن کریم کے ان مقامات میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔یعنی یہ فرق کہ کس مقام پر علم سے مراد وحی کا علم ہے اور کس مقام پر عام انسانی استعداد۔یہی فرق ایک نبی کے علم میں بھی ہوتا ہے۔ایک علم اسے بذریعہ وحی ملتا ہے جس میں کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہوتا۔اور اس کا دوسرا علم انسانی استعداد ہوتی ہے جس میں اس کی حیثیت نبی کی نہیں ہوتی، بشر کی ہوتی ہے۔یہی وہ حیثیت ہے جس میں اسے دوسروں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (3/158)۔

سورۃ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا۔کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے۔وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ: اور پہاڑوں میں (دیکھو کہ کس طرح) سفید اور سرخ خطے (یا طبقات) ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں اور بعض ان میں سے بہت سیاہ ہیں۔وَمِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ: اور اسی طرح انسانوں میں، اور دیگر جانداروں میں اور مویشیوں میں بھی مختلف اقسام ہیں۔

ان مقامات میں دیکھئے قرآن کریم نے ان علوم کا ذکر کیا ہے جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں خالصتاً علوم سائنس کہا جاتا ہے۔اس کے بعد ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ... (35/27-28) یہ حقیقت ہے کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی اس (کی عظمت وقدرت) کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں جو ''علماء'' ہیں۔یعنی جو ان علوم کا علم رکھتے ہیں۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے 'علماء'' کا لفظ ٹھیک ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں آج کل سائنسدان (Scientist) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔قرآن کریم علم الاشیاء کو بڑی بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

ع ل و

عِلِّيِّيۡنَ .... عِلِّيُّوۡنَ (83/18-19) بلندیوں کے اوپر بلندیاں۔لیکن (83/20) میں عِلِّيُّوۡنَ کی تفسیر کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ سے کی گئی ہے۔لہٰذا اس کے معنی اعمال نامہ کے ہوں گے۔لکھی ہوئی کتاب۔لیکن ایسا اعمال نامہ جو انسان کو بلندیوں کی طرف لے جائے۔اس کے برعکس سِجِّيۡنٍ ایسا اعمال نامہ ہے جو انسانی نشوونما کو جکڑ کر رکھ دے (83/7-9)۔

ع م د

قرآن کریم میں ہے: رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا (13/2) خدا نے فضائی کروں کو بغیر مرئی (Visible) اور محسوس ستونوں کے کھڑا کر رکھا ہے۔ان کے ستون، وہ باہمی کشش وجذب ہے جو آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتی۔

ع م ر

قرآن کریم میں ہے: مَا كَانَ لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ اَنۡ يَّعۡمُرُوۡا مَسٰجِدَ اللّٰهِ (9/17) مشرکین کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں۔مسجد، خدا کے نظامِ توحید کا مرکز ہے۔یعنی اس نظام کا جس میں اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کی جاتی ہے۔لہٰذا جو لوگ ان قوانین کے ساتھ انسانوں کے خودساختہ قوانین کو بھی شامل کریں وہ ان مراکز کی آبادی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس مسجد کو جو امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی، جہنم کا ایندھن بتایا (9/107-109)۔اس لیے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ پرستی بھی شرک ہے (30/32)۔

ع م ل

عمل ایک گونہ مشقت سے کسی کام کو کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔اسی لیے عَمِلَ کا لفظ خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔فَعَلَ کا لفظ کیا جاتا ہے۔

قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ہی ایمان اور عمل ہے۔یعنی قوانین خداوندی (یا مستقل اقدار) کی صداقت پر یقین اور ان کے حصول اور بقا کے لیے مسلسل عمل۔

ع م ی

قرآن کریم میں ہے: وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17/72) جوشخص اس دنیا کی زندگی میں اندھا ہوگا وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھا ہوگا اور بالکل گم راہ کردہ۔

آیت مطلب یہ ہے کہ جوقوم اس دنیا میں نعمتوں اورآسائشوں سے محروم ہے وہ مستقبل کی زندگی میں بھی نعمتوں سے محروم رہے گی۔ وہ شاہراہِ حیات سے اس قدر بھٹکی ہوئی ہوگی کہ صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں وَاَضَلُّ سَبِيْلًا کے ٹکڑے نے اَعْمٰى کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ جوشخص سیدھے راستے سے بھٹک کر غلط راہوں میں دور نکل جائے، وہ بھوک، پیاس، خستگی اور واماندگی جیسی صدہا مشکلات سے دور چار ہوتا ہے اور زندگی کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسے صحرائے حیات میں کوئی نشان راہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی تشریح خود قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کردی ہے جہاں کہا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20/124) جو ہمارے قانونِ حیات سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ ہوجائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کے چھوڑ دینے سے دنیاوی زندگی میں محتاجی اور ذلت نصیب ہوتی ہے اور جس کی دنیاوی زندگی یوں ذلیل ہواس کی آخرت بھی ذلیل ہوتی ہے۔ سورۃ انعام میں بتادیا گیا ہے کہ جووحی کی روشنی میں چلے وہ بَصِيْرٌ ہے اور جواس کا اتباع نہ کرے وہ اَعْمٰى ہے (6/50)۔

قرآن کریم نے کہا کہ ملائکہ، آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ لہٰذا مقام آدم یہ ہے کہ کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہوں۔ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کرلے اور مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کرکے انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف میں لائے۔ لہٰذا اگر کسی قوم کا اشیائے فطرت پر تصرف نہیں تو وہ قوم مقام آدم تک بھی نہیں پہنچ سکی، چہ جائیکہ اسے مقام مومن نصیب ہو۔ جس قوم کو اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں نصیب نہیں اسے مقامِ آدم حاصل نہیں۔ اس لیے ایسی قوم کی آخرت کی زندگی کس طرح روشن ہوسکتی ہے۔ لیکن جس قوم کو مقامِ آدم نصیب ہے لیکن مقامِ مومن نصیب نہیں تو اس کی دنیا کی زندگی پُرآسائش ہوگی، آخرت کی زندگی اس کی بھی تاریک ہوگی۔ مومن کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی تابناک ہوگی۔

ع و ذ

یوں تو نظامِ خداوندی قائم کرنے والی جماعت کو ہمیشہ اپنے نظام کی حفاظت کے لیے قوانین خداوندی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں جبکہ ان کی اپنی قوت ہنوز کم اور مخالفین کی مخالفت

شدید تر ہوتی ہے، انہیں ان قوانین کے ذریعے اپنی حفاظت و پرورش کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے (جیسے ایک نوزائیدہ بچے کو شروع شروع میں اپنی ماں کی حفاظت و پرورش کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے)۔ یہ ہے وہ مرحلہ جس میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (113/1) اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (114/1) کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی ہر وقت قوانین خداوندی اور نظام کے ساتھ چمٹے رہنا۔ اس سے ذرا دور نہ ہٹنا۔ ذرا سے خطرے اور آہٹ کے وقت جھٹ سے اس کی آغوش میں آ جانا اور اس طرح مخالفین کی سرکش قوتوں سے محفوظ ہو جانا۔

ہم نے لکھا ہے کہ قرآنی نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں تعوذ کی ضرورت خاص طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قیام نظام کے بعد تعوذ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن کریم سے دور لے جانے والے میلانات و جذبات اور طاغوتی قوتوں سے پناہ جوئی کی ضرورت تو زندگی کے ہر سانس میں رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نظام کے ابتدائی ایام میں چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لیے بھی مرکز کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن جب ایک طرف حقائق واضح ہو جائیں اور دوسری طرف نظام محکم ہو جائے تو پھر چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ از خود ہوتا جاتا ہے۔

سورۂ نحل میں ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (16/98) اس کے عام معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ جب تم قرآن پڑھنے لگو تو پہلے اعوذ پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم سے مستمسک رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے سرکش جذبات کے اثرات اور مستبد قوتوں کا آلۂ کار بننے سے محفوظ رہے۔ چنانچہ اس کی تشریح اگلی آیت میں یہ کہہ کر کر دی گئی ہے کہ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (16/99) شیطان (یا ان سرکش قوتوں) کا غلبہ ان لوگوں پر کبھی نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتے ہیں اور قوانین خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے استبداد سے حفاظت حاصل کی تھی جب کہا تھا کہ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ (40/27) میں ہر متکبر (کے استبداد سے بچنے کے لیے) اپنے اور تمہارے نشوونما دینے والے کی حفاظت میں جاتا ہوں۔

یہ ہے تعوذ کا قرآنی مفہوم، یعنی خطرے کے وقت اپنے نظام سے اور زیادہ شدت سے متمسک ہو جانا اور قوانین خداوندی کی اور زیادہ پابندی سے اطاعت کرنا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں تَعَوُّذٌ سے مقصود صرف اتنا رہ گیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ پڑھ لیا جائے یا قرآن کریم کی آیات کے تَعْوِيْذ لکھ کر گلے میں ڈال لیے جائیں۔ (ذرا تَعْوِيْذٌ کے مفہوم پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے؟)۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت (پڑھنا) ضروری ہے (تا کہ اسے سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے) اور جس طرح ہر عبد مومن ہر کام کی ابتدا خدا کے تصور سے کرتا ہے، اسی طرح قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز بھی غیر خدائی قوتوں سے حفاظت خداوندی (تَعَوُّذ) کے احساس سے کیا جائے

(اور اس کے لیے اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ کے الفاظ کہہ لیے جائیں تو یہ انسان کے جذبات کا اظہار کا طریق ہوجائے گا)۔لیکن یہ سمجھ لینا کہ مقصود صرف ان الفاظ کا دہرالینا ہے، ٹھیک نہیں۔ الفاظ اظہارِ مقصد کا ذریعہ ہیں۔مقصود بالذات نہیں۔ اعوذ اور بسم اللہ درحقیقت قرآن کریم کی اس بنیادی تعلیم کا اعلان ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی لَا انۡفِصَامَ لَہَا (2/257) جوشخص ہر غیر خدائی قوت سے انکار کرے اور صرف خدا کے قوانین کو تسلیم کرے، تو اس نے ایک ایسا محکم سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

ع ی ش

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ آدم جس جنت میں تھا اس میں سامانِ زیست (روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ) بڑی فراوانی سے ملتا تھا اور اس کے لیے اسے جگر پاش مشقتوں سے نہیں گزرنا پڑتا تھا (20/117-118)۔ یہ انسان کی قدیمی زندگی تھی جس میں افراد کے باہمی مفاد میں تصادم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے تمدن و معاشرت کی زندگی شروع کر دی جس میں سامان زیست کے حصول کے لیے باہمی مقابلہ شروع ہوگیا اور انسان مشقتوں میں پڑ گیا۔ اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ جو ضابطۂ قوانین خدا کی طرف سے ملے اس کا اتباع کرو۔ اس سے رزق کی فراوانی ہوجائے گی (20/123)۔ اس کے بعد ہے: وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا (20/124) اور جو قوم ہمارے اس ضابطۂ قوانین سے اعراض برتے گی تو اس کی معیشت تنگ ہوجائے گی۔ وَّ نَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی (20/124) اور ہم اسے قیامت میں بھی اندھا اُٹھائیں گے۔

کس قدر واضح ہے قرآن کریم کا یہ فیصلہ کہ جو قوم خدا کے قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اس کی روزی تنگ ہوجاتی ہے۔ اسے سامانِ زندگی کی محتاجی ہوتی ہے۔ وہ مفلس اور مفلوک الحال ہوجاتی ہے اور پھر اس کی عاقبت بھی خراب ہوجاتی ہے۔ لہٰذا دنیاوی زندگی افلاس اور محتاجی کی گزارنا اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر اطمینان دے لینا کہ ہماری ''روحانی ترقی'' ہورہی ہے قرآن کریم کی رو سے کھلا ہوا فریب ہے۔ اس دنیا کی خوشگواریاں مومن کی زندگی کی لازمی شرط بلکہ ایمان وعمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور یہاں کی محتاجی اور زبوں حالی قرآن کریم کو چھوڑ دینے کی زندہ شہادت۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کی معاشی زندگی کو اس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے لیے مکمل نظام عطا کر دیا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس سے وہ تمام مشکلات حل ہوجاتی ہیں جن میں اس وقت پوری انسانی دنیا گرفتار ہے۔

غ ب ن

قرآن کریم نے قیامت کو یَوۡمُ التَّغَابُنِ (64/9) کہا ہے۔ اس دن ظاہر ہوجائے گا کہ لوگوں نے جو معاملہ اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا [یعنی اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ کر اس کے بدلے میں جنت لے لی (9/111)] اس میں کس نے

کس قدر کمی کی ہے۔ یا اس کے معنی ہیں وہ دن جب چیزیں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف ظاہر ہوں گی جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگا رہے تھے۔

قرآن کریم نے ظہورِ نتائج کے وقت کے متعلق کہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا وزن معلوم ہو جائے گا اور نظر آ جائے گا کہ کامیابی کے معیار تک پہنچنے کے لیے ان میں کس قدر کمی رہ گئی ہے (101/6-8)۔

تَغَابُنٌ کے لفظی معنی ہیں باہم غبن کرنا۔ یعنی ایک دوسرے کے حقوق یا مال میں کمی کرنا۔ ایک دوسرے کی تغلیط کرنا۔ ایک دوسرے کو خفیہ طریق سے دھوکا دینا، قیامت کے دن (یعنی مرنے کے بعد ظہور نتائج کے وقت) مختلف افراد یا گروہوں کا ایک دوسرے پر الزام دھرنے (ایک دوسرے کو کم عقل بتانے) کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، اس لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اس اعتبار سے يَوْمُ التَّغَابُنِ کہا گیا ہو۔ البتہ وہاں ایک دوسرے کے حقوق میں کمی کرنے یا دھوکا دینے کا موقع نہیں ہوگا۔ اس لیے ان معانی کے اعتبار سے یہی سمجھا جائے گا کہ لوگوں نے ایک دوسرے کو جو دھوکے پہلے دیئے تھے ان کے نتائج وہاں سامنے آ جائیں گے۔

غ ر ف

سورہ فرقان میں مومنین کے متعلق ہے: أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا (25/75) انہیں ان کی استقامت کے بدلہ میں اَلْغُرْفَةُ دیا جائے گا۔ اس میں فراوانی اور بلندی سب کچھ آ گیا۔ یعنی بلندیاں، روانیاں، فراوانیاں (نیز 29/58؛ 39/20؛34/37)۔ مصافِ زندگی میں آگے آگے بڑھتے جانا اور ارتقائی منازل کا حسن وخوبی سے طے کرنا۔ آپ غور کیجئے کہ اس ایک جامع لفظ سے قرآن کریم نے کیا کچھ بیان کر دیا ہے۔ سامانِ زیست کی فراوانیاں، سرفرازیاں، زندگی کے جوئے رواں کا یہاں (دنیا) سے وہاں (آخرت) تک مسلسل آگے بڑھتے اور سطح زندگی کا بلند ہوتے چلے جانا۔

غ ز ل

سورۃ نحل میں ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (16/92) دیکھنا! کہیں تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جو نہایت محنت ومشقت سے سوت کاتتی ہے اور اس کے بعد اسے خود ہی ادھیڑ دیتی ہے۔ غور کیجئے وحی کے مقابلہ میں) عقل کے تجرباتی طریق کا نقشہ کس حسن وخوبی سے کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ عقل ایک نظریہ کو لیتی ہے۔ ساری دنیا میں ڈنکا بج جاتا ہے کہ اس نظریہ میں انسانیت کی مشکلوں کا حل پا لیا گیا ہے۔ وہ اس پر تجربہ کرتی ہے۔ اس میں بے انتہا توانائی صرف ہوتی ہے، وقت لگتا ہے، کتنے انسان قربانیاں دیتے ہیں، کتنے مشقتیں اٹھاتے ہیں، اس میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس پر یہی عقل اپنے کیے کرائے کو خود اپنے

ہاتھوں سے برباد کردیتی ہے اور ایک اور نظریہ پر عمل کرنا شروع کردیتی ہے۔(Error and Trial) کے اسی تجرباتی طریق سے وہ ہزاروں برس میں جا کر کہیں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچتی ہے۔ انسانی ترقی کی ساری تاریخ اسی ''ادھیڑ بن'' کی صبر آزما داستان ہے۔ اس کے برعکس وحی براہِ راست حقیقت کو سامنے لے آتی ہے اور انسان کو ان تمام جانکاہ مراحل سے بچا لیتی ہے جن میں اسے عقل کے تجرباتی طریق کے ذریعے گزرنا ناگریز تھا۔ وحی اور عقل میں یہی فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

ہر دو امیر کارواں، ہر دو بہ منزلے رواں
عقل بہ حیلہ می بُرد عشق بُرد کشاں کشاں

غ ص ب

انسانوں کے خودساختہ نظامِ حکومت میں ہوتا ہی یہ ہے کہ طاقتور، کمزوروں کے وسائل رزق کو زبردستی چھین لیتے ہیں۔ خدا کا نظام اس لیے آتا ہے کہ کمزوروں پر کسی قسم کا ظلم اور استبداد نہ ہونے پائے اور غصب وسلب (Exploitation) کا دور دورہ ختم ہو جائے۔

غ ص ص

قرآن کریم میں جہنم کے متعلق ہے: وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (73/13) حلق میں اٹک جانے والا کھانا، اس دنیا میں بے عزتی کی روٹی جسے انسان نہ نگل سے نہ اُگل سکے۔ ناجائز کمائی جس سے شرف انسانیت کا گلا گھٹ جائے اور اُخروی زندگی میں انسان آگے بڑھنے کے قابل نہ رہے۔ غور کیجئے! وہی رزق جو انسانی نشوونما کا موجب ہوتا ہے جب گلے میں اٹک جائے تو انسان کی موت کا باعث بن جاتا ہے۔ انسانی ذات کے لیے رزق حلال اور اکل حرام میں یہی فرق ہے۔

غ ض ب

''خدا کے غضب'' کا نتیجہ انفرادی اور اجتماعی تباہی اور بربادی ہے۔ اس لیے کہ اس سے خدا کے قانونِ مکافات کی بے پناہ قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جب خدا کی طرف غَضَبٌ کی نسبت ہوگی تو اس کا مطلب وہ ہیجانی کیفیت نہیں ہوگی جو انسان پر غصہ کی حالت میں طاری ہوتی ہے۔ خدا، انسانی جذبات اور ان کی پیدا کردہ کیفیات سے بہت بلند ہے۔ اس لیے ''خدا کے غضب'' سے مراد اس کے قانون کی خلاف ورزی کے فطری نتائج ہیں، جس طرح ''خدا کی خوشنودی'' کا مطلب اس کے قوانین کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ہیں۔

غ ض ض

قرآن کریم میں یہ مادہ اَبْصَارٌ کے لیے (24/30) میں آیا ہے جہاں اس کے معنی نگاہوں کو نیچا رکھنے، یا آنکھ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے روکنے کے ہیں جن کا دیکھنا اس کے لیے جائز نہیں۔ اور صَوْتٌ کے لیے (31/19) میں۔ یعنی آواز کا پست رکھنا۔ دونوں میں سرکشی اور بے باکی کے مقابلہ میں شرافت کے جھکاؤ کا پہلو ہے۔ جھکانا، کم کرنا، سمیٹ کر رکھنا، بے باک نہ ہونے دینا، نگاہوں کو بھی اور آواز کو بھی۔ یہ ہوگا قرآنی معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کا انداز۔ نہ چلنے پھرنے میں ان کی نگاہیں بے باک اور آوارہ ہوں گی، نہ بات چیت کرنے میں ان کی آواز اعتدال سے اونچی ہوگی۔

غ ف ر

جب کوئی قوم غلط روش اختیار کرتی ہے تو اس روش کے مضر اثرات مرتب ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اثرات اس حد تک آگے بڑھ جائیں کہ ان کی ہلاکت یقینی ہوجائے، اگر وہ قوم اس غلط روش کو چھوڑ کر قانونِ خداوندی کے مطابق صحیح روش اختیار کر لیتی ہے تو اس سے اس پر دہرے اثرات مرتب ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ ایک تو اس کی سابقہ روش کے مضر اثرات سے اس کی حفاظت ہوجاتی ہے اور دوسرے اسے زندگی کے خوشگوار نتائج ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔ ان نتائج کے استحکام کے لیے بھی حفاظتی پہلو کا ساتھ ساتھ رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے جیسے مرض کے علاج کے لیے پہلے حفاظتی تدابیر (Preventives) اور اس کے بعد اصلاحی تدابیر (Curatives) اختیار کی جاتی ہیں، اسی طرح تندرست انسان کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحت کو خراب کرنے والے مضر عناصر سے محفوظ رہے اور اسے ایسی غذا ملتی رہے جس سے اس کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ لہٰذا

① اگر غلط روش پر چلنے والی قوم کسی مقام پر پہنچ کر اپنی اصلاحِ حال کی فکر کر کے قانون خداوندی کی طرف رجوع کرتی ہے (جسے توبہ کہتے ہیں) تو اس سے اس کے اندر ایسی توانائی پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے جس سے وہ اپنی سابقہ غلط روش کے مضر اثرات سے محفوظ ہوجاتی ہے۔ یہ اس کی مَغْفِرَةٌ ہے اور

② قانون خداوندی کے مطابق چلنے والی قوم ان تخریبی قوتوں کی مذموم کوششوں سے محفوظ رہتی ہے جو اس کی تباہی و بربادی کی تدابیر کرتی رہتی ہیں۔ یہ ان کی مَغْفِرَةٌ ہے۔ اور

③ قوانین خداوندی کے اتباع سے اپنی ذات کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرتے رہنا جس سے انسان تخریبی عناصر کے مضر اثرات سے محفوظ رہے، اور اجتماعی طور پر ملت اور اس کے نظام کے استحکام کے لیے سامان حفاظت بہم پہنچاتے رہنا اِسْتِغْفَارٌ (مغفرت طلب کرنا) ہے۔ چنانچہ اَلْاِسْتِغْفَارُ کے معنی ہیں قول اور عمل سے کسی فساد انگیز بات کی

اصلاح کی خواہش کرنا، حفاظت چاہنا، اور مَغۡفِرَۃٌ کے معنی ہیں بندہ کی لغزشوں سے تجاوز کر کے اس سزا سے اس کو بچا لینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو۔

ہمارے ہاں مَغۡفِرَۃٌ کے معنی لیے جاتے ہیں ''خدا کا بندے کے گناہوں کو بخش دینا'' (''اللہ مغفرت کرے'' یا ''خدا بخشے'' ہم ہر روز بولتے ہیں)۔ ''بخشش'' کا تصور قرآن کریم کے پیش کردہ قانون مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ غلط عمل مضر نتائج پیدا کرتے ہیں اور صحیح عمل خوشگوار نتائج۔ غلط اعمال کے مضر نتائج کا ''بخش دینا'' بے معنی سی بات ہے۔ ''بخشش'' کا یہ تصور ملوکیت کی فضا کا پیدا کردہ ہے جس میں بادشاہ خوش ہو کر مجرموں کے گناہ بخش دیا کرتا تھا۔ قرآن کریم کی رو سے ''جنت'' انسانی اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ کسی سے ''بخشش'' کے طور پر نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ حسن عمل سے انسان کے اندر وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ہے مَغۡفِرَتْ کا قرآنی مفہوم۔

غ ل ل

نبی کا کام تبلیغ رسالت ہے۔ جو وحی اس کی طرف بھیجی جاتی ہے وہ بلا کم و کاست اسے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اب اگر اس میں کوئی بات ایسی ہے جو کسی کے معتقدات یا مفاد کے خلاف جاتی ہے تو اس میں رسول کا کوئی قصور نہیں۔ وہ یہ کر ہی نہیں سکتا کہ وحی کا کچھ حصہ چھپا کر رکھ لے اور کچھ حصہ ظاہر کر دے۔ وہ وحی کو بہ تمام و کمال ظاہر کر دے گا۔ وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا (10/15)۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے: يَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ (7/157) وہ ان بوجھوں کو اتار دے گا جن کے نیچے نوع انسانی دبی ہوئی چلی آ رہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔ یعنی وہ نوع انسان کو، جسم اور قلب و دماغ کی ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر کے انہیں فقط قوانین خداوندی کی اطاعت پر لے آئے گا اور اس طرح انہیں صحیح آزادی عطا کر دے گا۔ کس قدر بلند تھا مقصد بعثت نبوی کا اور کس قدر کامیاب اور حسین تھا۔ وہ طریق جس سے حضور ﷺ نے اس بلند مقصد کو پورا کیا۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہوں نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو (جنہیں قرآنی نظام نے اس حسن و خوبی سے توڑ کر رکھ دیا تھا) مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور ان اغلال و سلاسل کو انتہائی تعظیم کے ساتھ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس ابتداء کی یہ انتہا کس قدر عبرت ناک اور تاسف انگیز ہے!

غ و ی

سورہ شعراء میں ہے: وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الۡغَاوٗنَ (26/224) اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ شاعروں کے پیچھے لگنے

والے فریب خوردہ ہیں۔ اس لیے کہ شاعری اس ذہنیت کا نام ہے جس میں حقائق کی بجائے صرف جذبات سے کام لیا جاتا ہے اور زندگی کا کوئی غیر متبدل نصب العین سامنے نہیں رکھا جاتا۔ اس لیے ایسے لوگوں کے پیچھے لگنے والے (جو ان جذبات پرستیوں کو حقائق سمجھ لیتے ہیں) فریب خوردہ ہوتے ہیں۔ لیکن پیاس کی جہت سے اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی پیاس کبھی نہیں بجھ سکتی، کیونکہ پیاس کی تسکین صرف مثبت حقائق سے ہو سکتی ہے مشتعل جذبات سے نہیں۔ اسی لیے خود شاعروں کو بھی یَّہِیۡمُوۡنَ (26/225) کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ یعنی پیاسے اونٹ کی طرح سخت پریشانی میں مبتلا اور مارے مارے پھرنے والے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ خود شاعروں کو بھی اپنے مدح سراؤں سے دھوکا لگ جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ فی الواقعہ ہمارے متبعین ہیں۔ حالانکہ وہ محض ٹڈی دل کی طرح ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں لاکھوں، لیکن بالکل بغیر کسی نصب العین کے۔ ان سب کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ ''بدہضمی'' کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ شعراء کا اتباع کرنے والوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ ان کی فکر کا جزو نہیں بنتا بلکہ یونہی بلانتیجہ ضائع ہو جاتا ہے۔ چند الفاظ جو ذہن کو وقتی لذت دے کر موجب تباہی بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں اس مادہ کے الفاظ میں ایک چیز بقدر مشترک ملے گی۔ یعنی اس میں قوانین خداوندی کے اتباع کے بجائے انسان اپنے مفاد، خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور حق کی راہ چھوڑ کر دوسری طرف جھک جاتا ہے، صحیح راستے سے بھٹک جاتا ہے، دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس میں یہ تمام باتیں آ جاتی ہیں۔

غ ی ب

قرآن کریم نے اللہ کے لیے عٰلِمُ الۡغَيۡبِ کہا ہے (59/22)۔ اسی لیے ایمان بالغیب (2/3) کے معنی ''اَن دیکھے خدا پر ایمان'' ہی نہیں۔ اس سے ایک تو مراد ہیں انسانی اعمال کے وہ نتائج جو مرتب تو اسی وقت ہونے شروع ہو جاتے ہیں جب وہ عمل سرزد ہو لیکن مشہود ہو کر سامنے اپنے وقت پر آتے ہیں۔ اسی طرح نظامِ خداوندی کے خوشگوار نتائج اس کے اندر تو ہر وقت موجود ہوتے ہیں لیکن جب تک اس نظام کو متشکل نہ کیا جائے وہ مشہود ہو کر سامنے نہیں آتے۔ مومنین کی جماعت اس نظام کے اَن دیکھے نتائج پر یقین محکم رکھتی ہے اور یقین کے ماتحت اس نظام کے قیام کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیئے جاتی ہے۔ اگر انہیں اس نظام کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان نہ ہو تو وہ اس کے لیے ایک قدم بھی نہ اٹھائیں۔ لہٰذا اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لیے اس کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان اولین شرط ہے۔ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ (2/3)۔ ایک کسان سردی گرمی، دن رات، مسلسل محنت کرتا ہے، صرف اس لیے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ بیج جسے اس نے بویا ہے ایک دن ثمر بار ہو کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس کھیتی کے لیے ایک دن بھی محنت نہ کرے۔ جو جماعت نظامِ خداوندی کو متشکل کرنے کے لیے پہلے پہل اٹھتی ہے اس کے سامنے اس نظام کے نتائج موجود نہیں ہوتے۔ یہ نتائج اس وقت سامنے

آنے والے ہوتے ہیں جب وہ نظام متشکل ہوجائے۔ وہ اس نظام کی تشکیل کے لیے صرف اسی بناء پر قربانیاں دیئے جاتے ہیں کہ انہیں اس کی بارآوری پر یقین محکم ہوتا ہے۔ اسی کو ایمان بالغیب کہا جاتا ہے اور دوسرے الغیب سے مراد وہ تمام اشیاء یا حقائق ہیں جو عالم محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں خود ذاتِ خداوندی بھی آجاتی ہے۔

سورہ ہود میں ہے: وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (11/123) اس سے مراد ہیں کائنات کی تمام وہ چیزیں اور قوتیں جو ہنوز انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن مستقبل میں سامنے آجانے والی ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ کے سوا غیب کا علم کسی کو نہیں۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ... (27/65) ''ان سے کہو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اللہ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب جانتا ہو۔'' حتیٰ کہ رسولوں کو از خود غیب کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا اعلان ہوتا ہے کہ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (11/31) ''میں غیب نہیں جانتا۔'' البتہ اللہ تعالیٰ انہیں غیب کی بعض باتوں کا علم وحی کے ذریعے عطا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ہے: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (3/43) ''یہ غیب کی ان باتوں میں سے ہے جنہیں اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔'' چونکہ وحی تمام تر قرآن کریم کے اندر آگئی اور اس کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لیے اب کسی شخص کو غیب کا علم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کا دعویٰ قیاس آرائیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اسے قرآن کریم نے رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ (18/22) کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی یونہی اندھیرے میں تیر چلانا، اٹکلیں دوڑانا، قیاس آرائیاں کرنا۔ جن میں سے کبھی کوئی ٹھیک بھی نکل آتی ہے۔ البتہ تحقیقات کے ذریعے فطرت کی پوشیدہ قوتوں کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب تک وہ قوتیں دریافت نہیں ہوں گی ''غیب'' سے متعلق ہوں گی۔ جب دریافت ہو کر، محسوس طور پر سامنے آجائیں گی، مشہود ہو جائیں گی۔ لیکن بعض ''غیب'' ایسے ہیں جنہیں محسوسات کے دائرے میں لانا انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ مثلاً ذاتِ خداوندی یا مرنے کے بعد کی زندگی کی کنہ و حقیقت وغیرہ۔

غ ی ر

قرآن کریم میں قوموں کے عروج و زوال کے متعلق اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13/11؛ 8/53) اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں بدلتی اس کی حالت میں تبدیلی[1] نہیں آتی۔ جو قوم اپنے سفر زندگی میں اپنے ساز و سامان پر نگاہ رکھتی ہے اور ساتھ ساتھ اس کی مناسب مرمت اور تطابق (Adjustment) کرتی جاتی ہے وہ حسن و خوبی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔

---

[1] مولانا ظفر علی خاں (1873-1956ء) کا شعر ہے ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔۔۔ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ف أ د

سورہ بنی اسرائیل میں ہے: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17/36) ''جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! سماعت، بصارت اور فؤاد، ان میں سے ہر ایک کی بابت پوچھا جائے گا۔'' اس میں سمع اور بصر، حواس (Sense Perceptions) کے ذرائع ہیں اور فؤاد سے مراد (Mind) ہے یا جذبات۔ (Mind) اس لیے کہ حواس کے ذریعے جو اطلاعات بہم پہنچتی ہیں وہ ان سے نتیجہ نکالتا ہے۔ اور ''جذبات'' اس لیے کہ اگر ان اطلاعات کو جذبات متاثر کردیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لیے قرآن کریم نے ایمان کے لیے حواس اور فؤاد دونوں کی ضرورت بتائی ہے۔ یعنی ان حقائق کو عقل و فکر سے پرکھا جائے اور دل کے جھکاؤ سے قبول کیا جائے (6/111-114)۔

ف ت ح

سورۃ الفتح میں ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (48/1) اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے تیرے لیے زندگی کی راہیں کھول دی ہیں۔ یا علوم و معارف کے دروازے (وحی کے ذریعے) کھول دیئے ہیں۔ یا ایک واضح، فیصلہ کن انقلاب عطا کر دیا ہے۔ بہرحال قوانین خداوندی کی رُو سے مشکلات کا رفع ہو جانا، رکاوٹوں کا دور ہو جانا، زندگی کی راہیں کھل جانا، حقائق کا منکشف ہو جانا، ایک فیصلہ کن انقلاب برپا ہو جانا اور اس طرح حق و باطل کا نکھر کر الگ الگ ہو جانا، فَتْحٌ ہے۔

ف ت ر

رسول اللہ ﷺ سے پہلے آسمانی تعلیم میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لیے ایک نئے نبی کی ضرورت ہوتی تھی، کیونکہ علاوہ دیگر وجوہ عناصر اس فَتْرَةٌ کے زمانہ میں سابقہ نبی کا پیغام بھی اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہتا تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے بعد اس دعوت میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لیے کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کا پیغام قیامت تک اپنی اصل شکل میں موجود رہے گا۔ لہٰذا اس میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لیے اس پیغام (قرآن کریم) کو ابھار کر سامنے لانے کی ضرورت ہوگی، اور یہ کام وارثین کتاب (امت محمدیہ) کے کرنے کا ہوگا۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہوگا کہ پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیا جائے جسے نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم کے مطابق قائم کیا تھا۔

ف ت ن

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے: وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (20/40) ہم نے تجھے کئی کٹھالیوں میں سے گزار کر تیری تربیت کی اور اس طرح تجھے مقامِ نبوت کے شایانِ شان بنایا۔ یعنی فِتْنَۃٌ کے معنی ہیں ایسے مواقع بہم پہنچانا جن سے انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے اور انسان پر ظاہر ہو جائے کہ اس کی کس حد تک ربوبیت ہوئی ہے۔ جہاں تک انسانی معاشرہ کا تعلق ہے اس کا قوانین خداوندی کے مطابق نہ رہنا، فِتْنَۃٌ ہے۔ نیز فتنہ انگیزی (2/193)؛ (8/39)۔ بہ ہیئت مجموعی یہ لفظ قرآن کریم میں ان رکاوٹوں کے لیے آیا ہے جو دین خداوندی کی راہ میں حائل کی جاتی ہیں۔

ف ج ر

سورۃ شمس میں نفس انسانی (انسانی ذات) کے متعلق ہے: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (91/8) اس کے معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ خدا نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز کا علم رکھ دیا ہے۔ (یہ مفہوم کس طرح قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے) اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس آیت میں فُجُوْرَهَا اور تَقْوٰىهَا کہا گیا جو نفسِ انسانی (انسانی ذات ۔Human Personality) کی دو کیفیتوں کا نام ہے۔ فجر کے معنی پھاڑ دینا ہیں۔ لہٰذا انسانی ذات کا فُجُوْرٌ اس کا منتشر (Disintegrate) ہو جانا ہے۔ اور تَقْوٰىهَا چونکہ اس کے مقابل پر آیا ہے اس لیے اس کے معنی ہوں گے انسانی ذات کا تشتت وانتشار سے محفوظ رہنا۔ (Disintegrate نہ ہونا)۔

درحقیقت جو انسان خدا کی راہ سے ہٹتا (اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا) ہے اس کی ذات (Personlaity) میں انتشار (Disintegration) واقع ہو جاتا ہے۔ اس لیے فاجرہ وہ ہے جس کی ذات مستحکم ہونے کی بجائے منتشر ہو جائے۔ نشوونما یافتہ ذات (Developed Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ متحد و محفوظ (Integrated) ہوتی ہے۔ لہٰذا سورۃ شمس کی مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی ذات میں بننے اور بگڑنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اب جو شخص چاہے تو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت سے اپنی ذات کی نشوونما کر کے اسے مستحکم کر لے اور جو چاہے اس سے منحرف ہو کر اسے منتشر و متفرق (Disintegrate) کر دے۔ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت انسانی ذات میں نہیں۔ اس کی تمیز صرف وحی کی رو سے ہو سکتی ہے۔ یعنی وحی بتا سکتی ہے کہ خیر کسے کہتے ہیں اور شر کیا ہے۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر انسان مطلق خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو وحی [1] کی روشنی کے بغیر خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

---

① اسی لیے انسانی راہ نمائی کے لیے قرآن حکیم کی قیامت تک ضرورت رہے گی۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

ف ح ش

سورۃ بنی اسرائیل میں زنا کو فَاحِشَۃٌ میں شمار کیا گیا ہے (17/32)۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں فَاحِشَۃٌ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی زنا ہی ہوں گے۔ سورہ انعام میں ہے: وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ (6/152) ''تم فواحش کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوا اور جو چھپی ہوئی ہو'' ان کے قریب مت جاؤ۔ لہٰذا فواحش میں ہر قسم کی حدود شکنی اور بے حیائی آ جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر سورۃ نساء میں جہاں فرمایا کہ وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ (4/15) ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو فَاحِشَۃٌ کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ'' تو اس میں فَاحِشَۃٌ سے مراد زنا نہیں۔ اس لیے کہ اول تو زنا کے لیے چار عینی شاہدوں کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ہے۔ زنا کی سزا دوسرے مقام پر سو دُرّے (کوڑے) لکھی ہے (24/2)۔ لیکن اس جگہ فَاحِشَۃٌ کے جرم کی سزا صرف گھروں میں روک لینا کہا گیا ہے۔ اس لیے یہاں فَاحِشَۃٌ سے مراد زنا سے ورے بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا تک منتج ہو سکتی ہیں۔ قومِ لوط کے متعلق کہا گیا ہے: اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ (7/80) اور اس سے اگلی آیت میں بتا دیا ہے کہ اس سے مراد لواطت ہے (7/81) نہ کہ زنا۔ اور جس طرح دو مردوں کا اختلاط فَاحِشَۃٌ ہے اسی طرح عورتوں کا باہمی اختلاط (سحاقت) بھی فَاحِشَۃٌ ہے۔

نیز لفظ فَوَاحِش (بطور جمع) خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ فَاحِشَۃٌ صرف زنا ہی نہیں، دوسرے بے حیائی کے کام بھی فَاحِشَۃٌ میں داخل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (پیشہ ور عورتوں سے قطع نظر) فعل زنا کا ارتکاب یک لخت (فوری طور پر) ظہور میں نہیں آ جاتا۔ اس کے لیے (غیر) مرد اور عورت باہمی (ملنے جلنے) کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ پھر ذرا بات آگے بڑھتی ہے تو ہم آغوشی وغیرہ کی نوبت آتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ جنسی اختلاط (زنا) تک بات پہنچتی ہے۔ قرآن کریم ان مبادیات کو روکنا چاہتا ہے تاکہ بات آگے بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ فواحش ہیں جن کا ذکر (4/15) میں آیا ہے۔

ف خ ر

اَلۡفَخُوۡرُ وہ اونٹنی یا بکری جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو اور دھار بھی پتلی ہو۔ اس سے اَلۡفَخۡرُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی باتیں بڑی بڑی کرنا لیکن جوہرِ ذاتی کا بہت کم ہونا۔ ایسی باتوں پر ناز کرنا جو انسان کے ذاتی جوہر نہ ہوں بلکہ اضافی ہوں۔ مثلاً حسب و نسب، دولت و حکومت وغیرہ۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یونہی نمائشی نسبتوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی بجائے جوہرِ ذاتی میں بڑھنے کی کوشش کرو (2/148)۔

ف د ی

حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق ہے: وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (37/107) یعنی ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لیے بچالیا۔ انہیں حضرت ابراہیمؑ کی چھری سے محفوظ کرلیا اور تولیت کعبہ کی خدمت عظیم ان کے سپرد کردی (2/125)۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی جس میں تمام آرام اور چین چھوڑ کر اپنے آپ کو عمر بھر کے لیے اس مقصد عظیم کے لیے وقف کردینا تھا۔

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (47/4) انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو یا ان کا معاوضہ لے کر (قیدیوں کے عوض قیدی یا مال لے کر چھوڑ دو) بہر حال انہیں چھوڑنا ہوگا۔ لہٰذا جنگ کے قیدیوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنالینے کا خیال قرآن کریم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ غلامی کا یہی ایک دروازہ تھا، اسے قرآن کریم نے اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔

واضح رہے کہ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے یہ مراد نہیں کہ جنگ کے قیدیوں کو گرفتاری کے فوراً بعد رہا کردینا ہوگا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انہیں غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ بہ تقاضائے حالات انہیں قید میں رکھا جاسکتا ہے (فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۔47/4) اس کے بعد جب اَثْخَان (غلبہ) حاصل ہوجائے تو پھر ان کی مرضی (Disposal) کا سوال سامنے آجائے گا جس کا بہ تقاضائے حالات فیصلہ کیا جائے گا کہ انہیں احساناً چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے کر۔

ف ر ج

قرآن کریم میں حفاظت عصمت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے: يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (24/30) اور عورتوں کے متعلق ہے: يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (24/31) وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔ حضرت مریمؑ کی پاک دامنی کا اظہار بھی انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (21/91) جس نے اپنی عصمت کا تحفظ کیا۔

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ فَرْجٌ مقامِ مخصوص ہی کو نہیں کہتے بلکہ عربی محاورہ میں یہ لفظ عصمت کے لیے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ برخلاف ہماری زبان کے جس میں فَرْجٌ کا لفظ صرف عورت کی شرمگاہ کے لیے آتا ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، ان کے ترجمہ میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ف ر د

قانونِ مکافات کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کے نتائج سے خود متاثر ہوتا ہے۔ اس سے نفس انسانی (Self) کی یکتائی (Uniqueness) اور انفرادیت (Individuality) ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (6/95) ''اور یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح انفرادیت لیے ہوئے آتے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ منفرد حیثیت سے پیدا کیا تھا۔'' اس میں انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انسان اپنی مفاد پرستیوں کے لیے بہت سے لوگوں کو اپنا ساتھی بنالیتا ہے اور بہت سے مال و اسباب کو ان کے حصول کا ذریعہ۔ لیکن ان اعمال کا اثر اس کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے جس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کا مال و اسباب اسے اس سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

قرآن کریم کا قانونِ مکافات ایک عظیم حقیقت ہے جس کی بنیادوں پر انسانیت کی ساری عمارت اٹھتی ہے۔ ہر عمل کا اثر اس فرد کی اپنی ذات پر ہوتا ہے۔ اس میں سے نہ آپ کوئی حصہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کے عمل کا اثر آپ کی طرف منتقل ہو کر آ سکتا ہے۔ یہ انسانی ذات کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

ف ر د س

قرآن کریم میں جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ (18/107) آیا ہے۔ یعنی وسیع اور فراخ، سرسبز اور شاداب باغات۔ اس دنیا میں ایسا جنتی معاشرہ جس میں ہر قسم کی وسعتیں اور فراخیاں، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں اور اخروی زندگی میں ہر قسم کی وسعت اور شادابی۔

ف ر ض

قرآن کریم میں عورتوں کے مہر کے لیے فَرِيْضَةٌ کا لفظ آیا ہے (2/236)۔ کیونکہ اس کی متعینہ مقدار اپنے اوپر لازم کرلی جاتی ہے۔ ترکہ کے حصہ کو نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (4/7) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی مقررہ حصہ ہوتا ہے۔ سورہ توبہ میں جہاں صدقات کی تقسیم کا اصول بیان ہوا ہے اسے فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ (9/60) کہا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے مقرر کردہ اصولِ تقسیم۔ سورہ نور میں ہے: سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا (24/1) وہ سورۃ جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور اس میں درج شدہ احکام کو فرض ٹھہرایا گیا۔ لیکن یہ چیز کسی ایک سورت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ سارے کا سارا قرآن اسی طرح فرض کر دیا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ (28/85) بے شک وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن کریم کو فرض قرار دیا ہے۔ یعنی یہ فرض قرار دے دیا ہے کہ اس کے تمام احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے۔

قرآن کریم نے جس کام کے کرنے کا حکم دے دیا ہے وہ فَرْضٌ ہے اور جس سے روک دیا ہے وہ ممنوع ہے۔ لہٰذا فرض کے ساتھ دوسری اصطلاحات (مثلاً واجب، مستحب وغیرہ) یا دوسری طرف حرام کے ساتھ اس قسم کی اصطلاحات (مثلاً مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی وغیرہ) فقہ کی اصطلاحات ہیں، قرآنی نہیں۔

فرط

جنت اور جہنم میں یہ بنیادی فرق ہے کہ جنت میں انسان زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور جہنم میں انسان کی نشوونما رک جاتی ہے اور وہ متحرک کی بجائے جامد[1] ہو جاتا ہے۔

فرغ

سورۃ الانشراح میں نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ اب جو تجھ سے ان تمام تفکرات کو دور کر دیا گیا ہے جن سے تیری کمر ٹوٹ رہی تھی (یعنی نظامِ خداوندی کے متشکل کرنے کی راہ میں جو مشکلات تھیں انہیں آسان کر دیا گیا ہے) تو اب اپنے پروگرام پر جم کر عمل کر۔ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (94/7) یعنی آپ کے پروگرام کا پہلا حصہ جس میں قدم قدم پر مزاحمت ہوتی تھی اور اس لیے تعمیری کاموں کے لیے یکسوئی نہیں ملتی تھی، ختم ہو گیا ہے۔ اب پورے اطمینان کے ساتھ اس پروگرام کے تعمیری حصہ پر تمام توجہات کو مرکوز کر دیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب مشکلات کا دور ختم ہو جاتا ہے تو پھر انسان اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن نظامِ خداوندی میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب تخریبی پروگرام کے ابتدائی مراحل ختم ہوتے ہیں اور مخالفتوں پر قابو پا لیا جاتا ہے تو پھر اس پروگرام کا تعمیری حصہ شروع ہوتا ہے اور اس میں پہلے سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ تعمیری پروگرام، پوری انسانیت کی نشوونما پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا کام نہیں۔

فرق

سورۃ انفال میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے قوانین خداوندی کی نگہداشت کی تو يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (8/29) اللہ تمہیں ایک امتیازی[2] زندگی عطا کر دے گا۔ مومن دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے کے لیے آتا ہے۔ ایسی بلند کردار زندگی جسے دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ یہ عام انسانوں سے ممتاز انسان ہے۔ مومن کی زندگی حق و باطل میں امتیاز کا معیار ہونی چاہیے۔ دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان۔[3]

قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو ایک جماعت (ملت واحدہ) بنایا ہے۔ اسی جماعت میں الگ الگ فرقوں اور پارٹیوں کا وجود قرآن کریم کے واضح الفاظ میں شرک ہے (30/32) اور ایسا کرنے والے مشرکین ہیں (30/32)۔ جن سے اللہ اور

---

① جس طرح فیل شدہ طالب علم اگلی کلاس میں نہیں جا سکتا اور اُسی کلاس میں رہتا ہے۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

② خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی (علامہ اقبال)

③ علامہ اقبال کا پورا شعر اس طرح ہے:

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

رسول کا کوئی واسطہ نہیں رہتا(6/160)۔قرآن کریم کے اس کھلے ہوئے فیصلے کے بعد فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وحدت خالق کا عملی ظہور وحدت امت (بلکہ وحدت انسانیت) کی شکل میں ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جس طرح الوہیت کے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کرنا بھی شرک ہے۔امت کی وحدت کی بنیاد ایک خدا کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے۔امت میں تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فرقے اپنی زندگی مختلف ضوابط کے ماتحت بسر کرتے ہیں اور یہ شرک ہے۔

ف س د

فَسَادٌ درحقیقت صَلَاحٌ کی ضد ہے۔ صَلَاحٌ کے معنی ہیں حالات کا مستقیم ومتوازن رہنا۔لہٰذا فساد کے معنی ہیں توازن کا بگڑ جانا۔ بے ترتیبی (Disorder) پیدا ہو جانا۔

قرآن کریم نے مُفْسِدِیْنَ کے مقابلہ میں مُصْلِحِیْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے(2/11)۔حرث ونسل کے تباہ کر دینے کو بھی فَسَادٌ قرار دیا ہے(2/205)۔ ماپ تول کو پورا نہ رکھنا، دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا، معاشی ناہمواریاں پیدا کر دینا، لوگوں کے حقوق کو دبا لینا، یہ سب فَسَادٌ ہے(7/85؛26/183)۔صالح نظام کو درہم برہم کر دینا، صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فَسَادٌ ہے (27/34)۔ارتکاب جرم کو بھی فَسَادٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (12/73)۔ فَسَادٌ درحقیقت معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہونے کا نام ہے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا ہے۔دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں (7/74)۔ نیز ''حکمت فرعونی'' کا بھی یہی شیوہ ہوتا ہے کہ ملک میں مختلف پارٹیاں پیدا کر کے معاشرہ کے توازن کو بگاڑتے رہیں (28/4)۔منشائے خداوندی کے مطابق صحیح زندگی یہ ہے کہ خدا کے عطا فرمودہ رزق کے سرچشموں کو بقدر ضرورت لیا جائے اور اس سے زیادہ پر قبضہ کر کے معاشرہ کا توازن نہ بگاڑا جائے (2/60)۔

اللہ نے جو پروگرام انسانوں کے لیے (بذریعہ وحی) تجویز کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرنا فَسَادٌ ہے۔اس سے انسان کی اپنی ذات میں انتشار (Chaos) پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ میں بدنظمی (Disorder)۔کائنات کا یہ عظیم القدر اور محیر العقول سلسلہ اس نظم وضبط اور حسن وخوبی سے اس لیے چل رہا ہے کہ اس میں صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے۔اگر اس میں متعدد ''خداؤں'' کا اقتدار کارفرما ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21/22) انسانی زندگی بھی اسی حسن وخوبی سے اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب یہ خدائے واحد کے ضابطۂ واحد[1] کے ماتحت بسر کی جائے۔

---

[1] مراد ہے قرآنِ حکیم۔(منظور الحسن صاحب کتاب)

ف س ر

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق کہا ہے: وَ اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا (25/33) اس کی نہایت عمدہ وضاحت اور تشریح خود خدا نے کردی ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ (75/19) اسے ظاہر اور واضح کرنا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر و توضیح، تصریف آیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی ایک بات کو مختلف آیات میں پھیر پھیر کر بیان کرنے سے (6/65،106)۔ اس لیے قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم ہی سے ہوگی۔ اور اس کے دعاوی کی تائید اور شہادت کائنات کے نظم و نسق اور تاریخی شواہد سے۔ یا اس کے نظام کو عملاً متشکل کرنے سے جو درخشندہ نتائج سامنے آئیں، ان سے۔

ف س ق

قرآن کریم ایک ایسا نظام معاشرہ یا زندگی کا قالب عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد کی صلاحیتوں کی صحیح صحیح نشوونما ہوجاتی ہے۔ جو فرد (یا گروہ) اس نظام کے قالب سے باہر نکل جائے اسے فَاسِقٌ کہتے ہیں۔ اس کی صحیح نشوونما نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ہر شخص جو قانونِ خداوندی کے دائرے سے باہر نکل جائے وہ فاسق ہے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ پہلی مرتبہ آیا ہے وہاں اس کی تشریح ان الفاظ سے کی گئی ہے: اَلَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ (2/26-27) یعنی فاسقین وہ ہیں جو اللہ سے پختہ عہد باندھ کر اسے توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ کو ملانے کا خدا نے حکم دیا ہے (یعنی نوع انسانی کا رشتہ) اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیتے ہیں اور انسان کی تمدنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ظَالِمِیۡنَ کو بھی فَاسِقِیۡنَ کہا گیا ہے (2/59) اور کَافِرِیۡنَ کو بھی (2/99)۔ نیز معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے گریز کی راہیں نکالنے والوں کو بھی (3/81)۔ سورۃ المائدہ میں فِسۡقٌ کا لفظ احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کے لیے بولا گیا ہے، خواہ وہ حکم چھوٹا ہو یا بڑا۔

ف ص ل

قرآن کریم کے متعلق وَتَفۡصِیۡلَ الۡکِتٰبِ (10/37) نیز الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا (6/115) کہا گیا ہے۔ عام طور پر تفصیل کے جزیات معنی (Details) لیے جاتے ہیں اور مفصل کے معنی جُز جُز کرنا (Detailed) لیے جاتے ہیں۔ اس لیے جب قرآن کریم کو مُفَصَّلٌ کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس میں تمام باتوں کی تفاصیل (Details) دی ہوئی ہیں۔ لیکن تَفۡصِیۡلٌ کے معنی وضاحت ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح۔ یعنی جس میں ہر بات نکھار کر اور الگ الگ کرکے (Distinctly) بیان کی گئی ہو۔ قرآن کریم ایک واضح کتاب ہے جس کے مطالب میں کوئی ابہام (Confusion) نہیں۔ لیکن اس میں تمام امور کی تفاصیل (Details) نہیں دی ہوئیں۔ اس نے (بجز چند احکام کے) اصولی قوانین بیان کیے ہیں جو ہمیشہ کے لیے غیر

متبدل ہیں۔ ان اصولی قوانین کی تفاصیل و جزئیات قرآنی نظام کو قائم کرنے والی جماعت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے خود طے کرے گی۔ ان تفاصیل میں زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ مناسب ردّ و بدل ہوتا رہے گا۔ لیکن قرآن کریم کے اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہیں گے۔ یہی الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (30/30) ہے۔ اور یہی مستقل اقدار کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ (98/3)۔

پھر سمجھ لیجئے کہ تَفۡصِیۡلٌ کے معنی توضیح اور تشریح کے ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح اور صاف، متمیّز، نکھرا ہوا (Distinct) نہ کہ (Detailed) تفصیل۔

فضل

فضل کا عمومی مفہوم زندگی کی خوشحالیاں اور معاشی فارغ البالیاں ہیں جن کے حاصل کرنے کی مومنین کو تاکید کی گئی ہے (62/10)۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیات (17/18-21) میں اس مفہوم کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جہاں مختلف روش پر چلنے والی قوموں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ دیکھو ہم نے کس طرح ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں زیادہ خوشحالیاں عطا کی ہیں۔ یہ اس کا عمومی مفہوم ہے۔ خصوصی مفہوم ہر وہ نعمت ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو ملے جس میں وحی بھی شامل ہے۔ کیونکہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ تمام قومی امتیازات اور ملی سرفرازیاں خدا کا فضل ہیں۔ اور اپنی ہم عصر اقوام کے ساتھ مقابلہ میں ممتاز پوزیشن کا حاصل ہو جانا بھی اس کی نعمت ہے (2/47)۔

سورۃ النحل میں ہے: وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ یعنی جہاں تک رزق کمانے کی استعداد کا تعلق ہے وہ مختلف انسانوں میں مختلف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جس شخص کو خدا نے زیادہ استعداد دی ہے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اس استعداد سے جس قدر زیادہ کما لے وہ اس کا مالک ہے اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِھِمۡ عَلٰی مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُھُمۡ فَھُمۡ فِیۡہِ سَوَآءٌ جن لوگوں کو زیادہ استعداد دی گئی ہے وہ زائد رزق کو اپنے ماتحتوں کی طرف نہیں لوٹاتے اس خیال سے کہ اس طرح رزق سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں سب مساوی ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ اَفَبِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ (16/71) یہ لوگ خدا کی دی ہوئی نعمت سے انکار کرتے ہیں۔ یعنی زیادہ رزق کمانے کی استعداد، خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملی تھی۔ یہ لوگ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی واحد ملکیت قرار دے کر اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملی تھی۔

یہ آیت (اور اسی قسم کی دیگر آیات مثلاً 16/53؛ 43/32؛ 56/63-73؛ 41/10 وغیرہ) قرآن کریم کے معاشی نظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ اس نظام کی رو سے ہر شخص صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حق دار ہے۔ مؤمنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ زیادہ

سے زیادہ محنت کر کے کمائیں اور اپنی ضرورت سے زائد رزق، دوسرے لوگوں کی پرورش کے لیے کھلا چھوڑ دیں۔

ف ط ر

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6/14) کے معنی ہیں وہ خدا جس نے پہلی مرتبہ کائنات کی تخلیق کی ہے۔ اسی کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6/102) کہا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (17/51) کہہ کر اس کی وضاحت کر دی۔ لہٰذا فِطْرَۃٌ کے معنی ہوئے خدا کا قانونِ تخلیق۔ وہ قانون یا طریقہ جس کے مطابق اس نے کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کی۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ فطرت کے معنی عام طور پر (Nature) کے لیے جاتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت یہی ہے۔ اس سے مراد ہوتی ہے ایسی خصوصیتیں جو ہر انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوں اور جو بدلی نہ جا سکتی ہوں۔ لیکن لفظ فطرت کا یہ مفہوم بعد کی پیداوار ہے۔ جب یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا تو اس میں (Nature) کا لفظ آیا۔ اس لفظ کا ترجمہ ''فطرت'' کے لفظ سے کیا گیا اور اس طرح جو مفہوم لفظ (Nature) کا تھا وہی مفہوم لفظ فطرت کا ہو گیا۔

نیچر (Nature) کے بھی دو مفہوم ہیں۔ ایک تو وہ قوانین جو کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ انہیں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں اور ہر شے کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ فطرت کے اس مفہوم میں کوئی حرج نہیں۔ اس مفہوم کی رو سے حیوانات کی جبلت (Instinct) کو بھی ان کی فطرت کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی غیر متبدل ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ بکری گھاس کھاتی ہے اور شیر گوشت۔ یہاں تک بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ انسان میں بہت سا حصہ حیوانی زندگی کا ہے۔ یعنی اس کا جسمانی نظام کم و بیش وہی ہے جو حیوانات کا ہے۔ لہٰذا جو قوانین اس کے جسمانی نظام سے متعلق ہیں انہیں قوانین فطرت کہہ دینے میں بھی کچھ حرج نہیں۔ یعنی وہ قوانین جن کے مطابق انسان کی طبعی زندگی کی مشینری چل رہی ہے اور جو غیر متبدل ہیں۔ مثلاً کھانا پینا، سونا، افزائش نسل، بیماری، موت وغیرہ۔

لیکن جب اس سے آگے بڑھ کر خود ''انسان'' کی فطرت کا تصور سامنے لایا جاتا ہے تو یہ چیز محل نظر اور قابل اعتراض ہو جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اسی فطرت کے مطابق دین ہے۔ یہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے کہ بچہ بڑا ہو کر کسی دوسری روش پر چل پڑتا ہے۔ یعنی اگر کسی انسانی بچہ کو خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رکھا جائے تو وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ اگر آپ کسی بچے کو پیدا ہوتے ہی جنگل میں چھوڑ دیں جہاں کوئی اور انسان نہ ہو اور وہیں اس کی پرورش ہو تو آپ

دیکھیں گے کہ وہ بڑا ہوکر بالکل جانور بن جائے گا۔ چنانچہ اس قسم کے کئی بچے ملے ہیں جن کی پرورش جانوروں کے اندر ہوئی، وہ بالکل جانوروں کی مانند تھے۔ اس وقت (1960ء) اس قسم کا ایک بچہ ہندوستان کے ایک ہسپتال میں زیرِ علاج اور زیرِ مشاہدہ ہے۔ یہ بالکل حیوانوں کی سی عادات وخصائل رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر انسان کو اس کی ''پیدائشی فطرت'' پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جانور ہوگا۔ لہٰذا اگر یہی وہ ''فطرت اللہ'' (خدا کی فطرت) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہ تو کوئی قابلِ شرف بات نہیں۔ (نیز خود خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اس کی یہی ''فطرت'' ہے بڑی گستاخی ہے)۔

خود قرآن کریم نے انسان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی ''فطرت اللہ'' کے مظاہر ے نہیں ہو سکتے۔ (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ جو کچھ اس انسان کے متعلق کہا ہے جو وحی کی راہ نمائی میں نہیں چلتا بلکہ اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے) مثلاً اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (70/20) انسان بڑا ہی بے صبرا ہے۔ اس کی نیت ہی نہیں بھرتی۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33/72) بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (80/17) بڑا ہی ناشکرا ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (17/11) بڑا ہی جلد باز ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (18/54) اکثر باتوں میں جھگڑتا رہتا ہے۔ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (36/78) بڑا ہی جھگڑالو ہے۔ یہ کچھ قرآن کریم نے ''الانسان'' کے متعلق کہا ہے۔ اگر یہ مانا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس سے خود ''خدا کی فطرت'' کے متعلق جو تصور سامنے آتا ہے وہ (نعوذ باللہ) بڑا گھناؤنا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال اس قدیم تصور سے متاثر ہوکر پیدا ہوا ہے جس کی رو سے کہا جاتا تھا کہ ''خدا نے آدم کو اپنی شکل پر ڈھالا تھا۔''

اسی (غلط) تصور کی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک چیز ہے جو اسے نیکی اور بدی کا علم دے دیتی ہے۔ اسے ''انسانی فطرت'' کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی فطرت خود خدا کی فطرت ہے اس لیے اس کے اندر کی آواز، خود خدا کی آواز ہے۔ یہ تصور بھی غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو مطلق حق (Absolute Right) اور مطلق باطل (Absolute Wrong) میں تمیز کر دے۔ اگر یہ قوت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی تو پھر انسانوں کے لیے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ چیز حیوانوں تک تو چلی آئی ہے۔ یعنی حیوانات وغیرہ کو ان کے فرائض اور وظائف زندگی کا علم جبلی طور پر دیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ یعنی ایک فرد (نبی) کے ذریعے باقی افراد کو۔ انسان کے اندر یہ امکانی قوت موجود ہے کہ وہ چاہے تو حق کو اختیار کر لے اور چاہے باطل کو اختیار کر لے۔ یہی اختیار انسان کی بنیادی خصوصیت ہے جو حیوانات کو حاصل نہیں۔ اگر انسان وحی کی راہنمائی کو اختیار نہ کرے تو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور تباہیاں خریدتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ يَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ (17/11) وہ بھلائی کو بلانے کے بجائے شر کو

آوازیں دے کر بلا تار رہتا ہے۔ اگر انسان کے اندر ''خیر وشر'' کی تمیز ودیعت کر کے رکھ دی جاتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ اسے ایسا کرنے کی آزادی ہی نہ ملتی۔ جس طرح حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس روش کے خلاف چلیں جس پر چلنے کی تمیز ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔

لہٰذا یہ تصور غلط ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی ''فطرت'' پر پیدا کیا ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بخود اسلام کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیت کی طرف آیئے جس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عربی زبان میں (جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے) لفظ فِطْرَةٌ کے معنی ہیں وہ قانون یا قاعدہ جس کے مطابق کسی چیز کی پہلی مرتبہ تخلیق کی جاتی ہے۔ خدا فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ لہٰذا فطرت اللہ کے معنی ہوئی خدا کا قانون تخلیق۔ آیت یہ ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (30/30) اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا یعنی جس طرح اس نے تمام ارض وسما (کائنات) کو ایک خاص قانون کے مطابق پیدا کیا اسی طرح اس نے انسان کو بھی پیدا کیا۔ اس کے قانونِ تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ہے دین قیم یعنی محکم نظام۔ تم ہر طرف سے منہ موڑ کر اس قانون پر سیدھے چلتے جاؤ۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (30/30) اور اس کی تفسیر یہ ہے: مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (30/31) اس کی طرف توجہ کیے ہوئے۔ سو تم اس کے قوانین کی نگہداشت کرو اور نظام صلوٰۃ کو قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ تصور کہ انسان کی ایک غیر متبدل فطرت ہے۔ وہ فطرت ''اللہ کی فطرت'' کے مطابق ہے اور اس فطرت کی رو سے انسان خیر اور شر، حق اور باطل میں از خود تمیز کر سکتا ہے اور اسلام اس فطرت کا دین ہے۔ یہ سب غلط عمارت اسی بنیاد پر اٹھی ہے کہ ہم نے لفظ فطرت کے وہ معنی لے لیے جو یونانی لفظ نیچر کے معنی تھے۔ اگر اس لفظ کے وہ بنیادی معنی سامنے رکھے جائیں جو عربوں کے ہاں رائج تھے تو ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ یاد رکھئے! ان حیوانی رجحانات کے علاوہ جو انسان کی طبعی زندگی کا خاصہ ہیں، انسان کی کوئی غیر متبدل فطرت نہیں۔ اسے اپنی راہ نمائی وحی سے حاصل کرنی ہے۔ اور اس کا اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس راہ نمائی کو قبول کر لے اور چاہے اس سے انکار کر کے اپنے لیے کوئی اور راہ اختیار کر لے۔ اختیار و ارادہ کی صلاحیت (The Capacity to Choose) وہ خصوصیت ہے جو صرف انسان کو دی گئی ہے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اس میں ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے شریک ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی انسان کو دی گئی ہو اور کسی کو نہ دی گئی ہو۔ لیکن یہ خصوصیت مضمر شکل (Un-Developed Form) میں دی گئی ہے جس کی نشوونما کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے وہ

خاص ساخت جس کے مطابق خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر انسان کی کوئی ''فطرت'' ہوتی تو اسے اختیار و ارادہ کی صلاحیت کبھی نہ ملتی۔ ''فطرت'' اور اختیار و ارادہ دو متضاد باتیں ہیں۔ خارجی کائنات میں ہر شے کی ایک فطرت ہے اس لیے ان میں سے کسی کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل نہیں۔ انسان کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل ہے اس لیے اس کی کوئی فطرت نہیں۔ انسان کے اندر بہت سی امکانی قوتیں ہیں جنہیں نشوونما دینا اور قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا، مقصد زندگی ہے۔

ف ق ر

قرآن کریم میں فَقْرٌ بمقابلہ غِنًی آیا ہے (3/180؛2/273)۔ لہٰذا فَقْرٌ کے معنی احتیاج کے ہوں گے۔ ضرورتوں کا کما حقہٗ پورا نہ ہوسکنا۔ یعنی فُقَرَاءُ معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو پوری محنت کرنے کے بعد بھی اتنا نہ کما سکیں کہ وہ ان کی ضروریات کے لیے مکتفی ہو سکے۔ اصحابِ احتیاج (24/32)۔ لیکن اس کے معنی صرف طبعی ضروریات کی احتیاج ہی نہیں بلکہ انسان کی نشوونما کے لیے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہو ان کی احتیاج بھی فَقْرٌ ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا تھا کہ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (28/24) جو کچھ بھی تو نے میرے لیے خیر میں سے بھیجا ہے میں اس کی احتیاج رکھتا ہوں۔ اس میں طبعی ضروریات اور شرفِ انسانیت کے اسباب و وسائل دونوں آجاتے ہیں۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر شے اور ہر انسان اپنی نشوونما اور تکمیل ذات کے لیے ربوبیت خداوندی کا محتاج ہے۔ يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (55/29) کائنات کی ہر شے اس کی محتاج ہے۔ سورۂ فاطر میں تمام نوع انسان سے کہا گیا ہے کہ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (35/15) تم سب اپنی نشوونما کے لیے عطایائے خداوندی کے محتاج ہو، اور اللہ کسی معاملہ میں بھی تمہارا محتاج نہیں۔

> طبعی ضروریات کے لیے انسان، فطرت کے عطا کردہ سامان پرورش کا محتاج ہے۔ اور شرفِ انسانیت کی نشوونما کے لیے وحی کی راہ نمائی کا محتاج۔

ف ق ہ

اَلْفِقْهُ علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں۔ یعنی محسوسات کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کرکے ان کے ذریعے مجرد حقائق (Abstract Truths) کا سمجھنا۔ فَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (9/122) کا یہی طریقہ ہے۔ یعنی زمانہ کے ٹھوس واقعات پر غور کرکے یہ سمجھنا کہ ان پر دین کے کون سے حقائق و قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے تَفَقَّهُ فِي الدِّيْنِ کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ ہر مقام سے کچھ لوگ مرکز میں آئیں اور دین میں تفقہ حاصل کریں۔ پھر یہ واپس جا کر باقی لوگوں کو

اس سے آگاہ کریں (9/122)۔ یعنی تَفَقَّهُ فِي الدِّيْنِ کسی خاص گروہ کا اجارہ (Monopoly) نہیں۔ دین میں تفقہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ ان حالات میں بتایا گیا تھا جو ابتدائے اسلام میں تھے۔ ویسے از روئے قرآن کریم تفکر، تدبر، تفقہ ہر مومن کے لیے ضروری ہے۔

فقہ ایک قانونی اصطلاح تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں اور روز مرہ کے حالات کے مطابق جزئی قوانین مستنبط کیے جائیں۔ یہ کام اسلامی نظام کا تھا۔ لیکن اب فقہ کے معنی ہیں کسی خاص امام کا مسلک۔ مثلاً فقہ حنفی کے معنی ہیں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یا ان فقہاء کے فتاویٰ جو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے پیرو تھے۔ اہل فقہ، اہل حدیث کے مقابلہ میں ایک فرقہ ہیں۔ غور کیجئے! قرآن کریم کی رو سے تَفَقَّهُ فِي الدِّيْنِ کا مفہوم کیا تھا اور اب اس کا مفہوم کیا رہ گیا ہے؟ جب دین ایک نظامِ اجتماعی کی بجائے انفرادی چیز بن جائے تو اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

فکر

قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھتے جائیے، قدم قدم پر آپ کو غور وفکر کی دعوت ملے گی۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا اور اسے فکر و تدبر کے بعد ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے غور وفکر پر کس قدر زور دیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی زبان سے کہلواتا ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (34/46) ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ غور کیجئے کہ اتنا بڑا جلیل القدر رسول کہتا ہے کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ بات جو کہی جائے گی کس قدر اہم ہوگی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بات ایسی نہیں کہ تم یونہی چلتے چلتے سن لو۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى (34/46) اس کے لیے ضروری ہے کہ تم جس سیلاب میں بہے جا رہے ہو اس میں بہے نہ جاؤ، کھڑے ہو جاؤ۔ یعنی پہلی بات جس کی تاکید کی جاتی ہے یہ ہے کہ یونہی اندھا دھند نہ چلے جاؤ، بلکہ رکو، تھمو، ٹھہرو، کھڑے ہو جاؤ۔ سب کے سب نہیں تو ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ لیکن خالصۃً للہ۔ دل میں کوئی اور خیال، جذبہ یا مقصد لیے ہوئے نہیں۔ اور پھر؟ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34/46) پھر تم سوچو، غور کرو۔ بس یہ ہے وہ بات جس کی میں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہے: مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (34/46) یہ دعوت فکر جو تمہیں دی جا رہی ہے وہ اس داعی کے جنون کا نتیجہ نہیں۔ اس قدر تھی تاکید غور وفکر کی!

لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ غور وفکر ہم پر حرام قرار پا چکا ہے۔ کوئی معاملہ ہو، کوئی مسئلہ ہو، قرآن کریم کی کوئی آیت ہو، اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس کی بابت اسلاف نے کیا کہا ہے۔ اگر آپ غور وفکر کے بعد کوئی ایسی بات کہیں جس کی سند اسلاف کے ہاں سے نہ ملتی ہو تو آپ فتنہ پرداز، ملحد، بے دین قرار پا جاتے ہیں۔ یعنی زندگی کے معاملات، حتیٰ کہ قرآن کریم کے متعلق جو کچھ سوچا سمجھا جانا تھا وہ سب سوچا سمجھا جا چکا ہے۔ اب ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم اس کی اندھی

تقلید کرتے جائیں۔خود نہ کچھ سوچیں نہ سمجھیں۔حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم نے جو غور وفکر کا حکم دیا تھا تو وہ کسی خاص زمانے کے انسانوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ تمام زمانوں کے انسانوں کے لیے یکساں حکم تھا۔اس لیے (قرآن کریم کی رو سے) جس طرح ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ (اسلاف) غور وفکر کے لیے مکلّف تھے اسی طرح ہم پر بھی غور وفکر لازم ہے۔اگر ہم غور وفکر نہیں کرتے تو یہ روش قرآن کریم کے واضح حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے۔لیکن ہم ہیں کہ غور وفکر کو الحاد اور بے دینی قرار دے رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب قومیں قوتِ عمل سے محروم ہوجاتی ہیں تو وہ اندھی تقلید ہی میں عافیت سمجھتی ہیں۔غور وفکر بجائے خویش ایک عمل ہے جس میں ذہن کو بڑی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ پھر غور وفکر سے زندگی کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں جنہیں حرکت وعمل ہی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ بے عمل قوم اس سے بھی گھبراتی ہے۔غور وفکر سے بھاگنے کی اصل وجہ تو یہ ہوتی ہے لیکن انسان کی خوئے بہانہ سازی اسے ''سلف صالحین'' کا اتباع قرار دے کر جھوٹے اطمینان کا موجب بنا دیتی ہے۔

یاد رکھئے! جو قوم غور وفکر سے محروم رہ جاتی ہے وہ انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتی ہے۔انسان وحیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان کو غور وفکر کی استعداد دی گئی ہے اور حیوان اس سے محروم ہے۔ہم اپنے اسلاف کے غور وفکر کے نتائج سے مستفید ہوسکتے ہیں، لیکن ان کا غور وفکر ہمارے لیے حرفِ آخر نہیں ہوسکتا کہ اس سے اختلاف، اِلحاد و بے دینی قرار پا جائے۔ زمانے کی علمی اور فکری سطح بلند ہورہی ہے۔اس لیے ہر آنے والی نسل سابقہ نسل سے علم وفکر میں آگے ہوتی ہے۔اورقرآن کریم چونکہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے ضابطہ حیات ہے اس لیے اس پر مسلسل غور وفکر ہوتے رہنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں غور وفکر کرنے کے لیے اس قدر کثرت سے تاکید آئی ہے کہ ان مقامات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔اس کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ جب آپ قرآن کریم کا مطالعہ کریں گے تو وہ تمام مقامات آپ کے سامنے آجائیں گے اوران سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ اس میں غور وفکر نہ کرنے والوں کے خلاف کتنی سخت تنبیہات آئی ہیں۔

ف ک ک

قرآن کریم میں فَكُّ رَقَبَةٍ (90/13) آیا ہے جس کے لفظی معنی کسی گردن کا آزاد کرنا ہیں۔اس میں مظلوموں کو استبداد سے چھڑانے اور زیردستوں کو ظلم سے بچانے کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

سورۃ البینہ میں ہے: لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (98/1) اہل کتاب اور مشرکین اپنے باطل عقائد و رسوم کی خودساختہ زنجیروں سے رہا نہیں ہوسکتے تھے جب تک ان کے پاس (اَلْبَيِّنَةُ) خدا کا یہ قانون نہ آتا۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا ہے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي

كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7/157) یہ اس لیے آیا ہے کہ انسانوں نے اپنے اوپر جو (خواہ مخواہ کے) بوجھ لاد رکھے تھے اور اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا یہ انہیں ان سے آزادی دلائے۔ قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ نوع انسانی کو انسانوں کے ہر قسم کے (ذہنی وجسمانی) استبداد سے نجات دلائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد ہم نے ان تمام زنجیروں کو جو آپ ﷺ نے توڑی تھیں، ایک ایک کر کے اکٹھا کیا اور پھر سے انہیں اپنی گردنوں میں ڈال لیا۔ اب ہم ان جکڑ بندیوں کے ہاتھوں سخت نالاں ہیں لیکن وہ ایسی مقدس بن چکی ہیں کہ انہیں اتار پھینکنے کی ہمت کسی میں نہیں پڑتی۔ ان زنجیروں کو صرف قرآن کریم کی تعلیم توڑ سکتی ہے، اور قرآن کریم کی طرف ہم آنا نہیں چاہتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ف ک ہ

اَلْفَكَاهَةُ [1] دلچسپ اور دل کو شگفتہ کرنے والی باتیں۔ خوش گپی، مزاح۔ قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے: فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ [2] (36/55) وہ کام میں لگے ہوئے خوش ہوں گے۔ ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے خوشی کی باتیں اور مزاح کریں گے۔ یا فرحت وانبساط سے بھرے ہوں گے۔

ف ل ح

مُفْلِحُوْنَ وہ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں۔ جن کی محنت ثمر بار ہو جائے۔ جنہیں کامیابی اور بقاء نصیب ہو جائے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مومنین کے متعلق ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (2/5) یہی لوگ کامیاب ہیں۔ نفس انسانی کی نشوونما پا کر انسان کامیاب وکامران ہونے کے متعلق ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا (91/10) جس نے اس کی نشوونما کی وہ کامیاب ہو گیا۔

قرآن کریم نے انسانی سعی وعمل کا حاصل ''نجات'' نہیں بتایا۔ نجات کے معنی ہوتے ہیں کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینا۔ یعنی یہ صرف سلبی (Negative) چیز ہوتی ہے۔ ایک شخص اچھا بھلا بیٹھا ہے وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا، اس کے بعد اس نے دوڑ دھوپ کی اور اسے اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ اس طرح وہ شخص پھر اپنی پہلی حالت میں پہنچ گیا۔ اس دوڑ دھوپ سے اسے کوئی مثبت (Positive) فائدہ نہیں ہوا۔ یہ قرآنی تصور نہیں۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جو ہر انسانی بچہ کو پیدائشی طور پر گناہ گار قرار دیتی ہے۔ اس کا ان گناہوں کی مصیبت سے چھوٹ جانا نجات (Salvation) ہے۔ یا

---

1. اسی سے فکاہیہ کالم ہے یعنی اخبارات وغیرہ میں جو صحافی مزاح نگار ہوتے ہیں ان کی تحریریں۔
2. الفاکھہ ہر قسم کے پھل کو کہتے ہیں۔ 36/55 سے مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل جنت پھلوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ (منظور الحسن)

ہندوؤں کا تصور ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے دنیا کے جیل خانے میں محبوس ہے۔اس قید و بند سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام مکتی (نجات) ہے۔یہی تصور بدھ مت میں ہے۔ویدانت (تصوف) کی رو سے بھی انسانی سعی و کاوش سے یہی مقصود ہے۔یعنی انسان کی روح اپنی اصل (ذات خداوندی) سے الگ ہوکر مادہ کے دلدل میں پھنسی ہوئی چیخ رہی ہے۔اس کا اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرکے اپنی اصل سے جاملنا مقصودِ حیات ہے۔ لیکن قرآن کریم کا یہ تصور نہیں۔اس کا تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک صاف (Slate) سلیٹ لے کرآتا ہے۔وحی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔اِس سے اُسے اِس زندگی کی تمام خوشگواریاں بھی حاصل ہوجاتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی۔یہ سب مثبت نتائج ہیں، اس لیے انہیں فَلَاحٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔یعنی کھیتی کا پروان چڑھنا، اس کا ثمر بار ہونا۔

ف ل ق

کائنات میں سلسلۂ ارتقاء اس طرح جاری ہے کہ ایک چیز پھٹتی ہے تو اس میں سے نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے جو آگے بڑھتی اور اوپر کو اُٹھتی ہے پھر اِس میں سے اسی طرح ایک اور زندگی کی نمود ہوتی ہے۔دانے میں سے کونپل نکلتی ہے پھر اس میں سے شاخ پھوٹتی ہے، شاخ میں سے پتہ پھوٹتا ہے پھر شگوفہ، پھر پھول۔پھر اس میں پھل لگتا ہے۔پھل میں بیج پیدا ہوتا ہے۔بیج سے پھر ایک نئے درخت کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ (6/96) ''اللہ دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔یہ ہے خدا کا متعین کردہ قانون حیات وارتقاء اور یہ ہے رَبِّ الْفَلَقِ (113/1)۔

ف ن ن

قرآن کریم میں جنت (بلکہ جَنَّتٰنِ) کے متعلق ہے کہ وہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (55/48) ہے۔جس کی مختلف شاخیں ہوں۔ جہاں مختلف علوم وفنون عام ہوں۔قرآن کریم کی رو سے جنتی معاشرہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ مختلف فنون کی آماجگاہ ہوگا۔

ف ن ی

قرآن کریم میں ہے: کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ○ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ○ (55/26-27) اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ زمین پر جو کچھ ہے سب معدوم ہوجائے گا اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے اس میں ہر آن تغیر واقع ہوتے رہتے ہیں۔لیکن خدا کی ذات ایسی ہے جو تغیر پذیر نہیں۔جسے ''تغیر'' (Change) کہا جاتا ہے، اگر غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ کسی شے کے اندر تبدیلی نہیں ہوتی۔اس

طریق (Process) سے ہوتا یہ ہے کہ جس چیز میں تبدیلی آتی ہے وہ چیز معدوم ہوجاتی ہے اوراس کی جگہ ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔لیکن یہ دونوں کام اس طرح بیک وقت ہوتے ہیں کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ پہلی چیز کب معدوم ہوئی اور اس کی جگہ دوسری چیز کب وجود میں آئی۔(برگسان نے اس نکتہ کی بڑی عمدہ تشریح کی ہے) لیکن (برگسان کے فلسفہ کی رو سے) ذات (Personality) ایسی شے ہے جس میں نشوونما اور ارتقاء تو ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ معدوم ہوجائے (It does not cease to exist) اسی کو بارڈیؤ نے (Changelessness in change) سے تعبیر کیا ہے۔اور خدا چونکہ مکمل اور مطلق ذات ہے اس لیے اس میں تغیر اور معدوم ہوکر پھر سے متشکل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے دور میں ہنوز فلسفہ یہیں تک پہنچا ہے۔لیکن اس سے بھی قرآن کریم کی مندرجہ صدر آیات (55/25-26) کے مفہوم پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے۔

ف و ج

سورۃ النصر میں ہے: يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا (110/2) ''اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہوتے ہیں۔'' یہاں اس میں تیزی اور کثرت دونوں مفہوم ہے۔نظامِ خداوندی کی تشکیل میں پہلا مرحلہ تو وہ ہے جس میں داعی الی الحق کی بڑی محنت اور مشقت کے بعد اِکا دکا کرکے، مدت مدید میں کچھ افراد جمع ہوتے ہیں۔پھر ان کی محنت شاقہ اور سعی پیہم سے اس نظام کے اولین مراحل طے ہوتے ہیں۔یہ السابقون الاولون کی جماعت ہوتی ہے جنہیں قدم قدم پر سینکڑوں قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن ان کی اس سعی مسلسل کے بعد جب یہ کھیتی پروان چڑھتی ہے تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو دیکھ کر لوگ جوق در جوق اس نظام میں داخل ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔یہ ہے وہ منزل جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا۔

ف و ز

الفوز اگرچہ اس کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا پالینے کے بھی ہیں۔لیکن اس کا دوسرا مفہوم اپنی آرزو یا خیر کو حاصل کرلینا، مقصود کو پالینا ہے۔مصیبت سے رہائی پالینا محض ایک سلبی (Negative) چیز ہے۔لیکن قرآن کریم جنت کی زندگی کو ایک ایجابی (Positive) مقصد کا حصول (Achievement) قرار دیتا ہے۔اس لیے وہ اہل جنت کو الۡفَآئِزُوۡنَ (59/20) کہتا ہے۔یعنی وہ جو فَازَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا (33/71) کے حامل ہیں۔اس میں اس دنیا کا مال ومتاع اور خوشگواریاں بھی شامل ہیں، جیسا کہ قرآن کریم نے (4/73) میں خود واضح کردیا ہے۔دوسری جگہ اسے مَفَازًا کہا ہے (78/31)۔سورۃ آل عمران میں ہے کہ جو شخص تباہیوں سے محفوظ رہا اور ''جنت میں داخل ہوگیا'' فَقَدۡ فَازَ (3/184) تو یہ ہے جسے کامیاب کہا جائے گا۔دیکھئے اس

میں دونوں پہلو موجود ہیں۔تباہیوں سے بچنا اور زندگی کی خوشگواریوں کا حاصل ہوجانا۔ یہ ہے کامیابی۔

دنیائے مذاہب میں زندگی کا مقصد ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرلینا ہے جن میں انسان گرفتار ہوتا ہے۔لیکن قرآن کریم اس چیز کو مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک ان تباہیوں سے بچ کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا نام کامیابی ہے۔ یہ مثبت کامیابی (Positive Achievement) اس دنیا میں سربلندی اور سرفرازی کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت۔ یہی فوز عظیم ہے۔

فیٔ

قرآن کریم نے فیٔ اور غنیمت کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ مال فیٔ کے متعلق سورۂ حشر میں ہے: وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ... (59/6) ''اور اللہ نے اپنے رسول کو ان سے جو مال فیٔ دلایا تو تم نے اس پر گھوڑے نہ دوڑائے تھے نہ اونٹ۔لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط دے دیتا ہے۔'' اس سے ظاہر ہے کہ مال فیٔ وہ ہے جو بغیر لشکرکشی کے حاصل ہوجائے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں (دشمن سے حاصل کردہ مال کے علاوہ) وہ مال بھی شامل ہو جو صوبے اپنی ضروریات سے فاضل، مرکز کی طرف بھیج دیں۔ مال فیٔ کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ یہ ''اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور ذی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل کے لیے ہے۔'' اس کے بعد ہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ''تا کہ یہ مال تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے۔'' یہ اصول قومی معیشت کے ایک بنیادی نکتہ کو بیان کرتا ہے۔یعنی دولت کی گردش (Circulation) اوپر کے طبقہ ہی میں نہیں ہوتی رہنی چاہیے۔ اس کے بعد ہے: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (59/60) ''جو کچھ تمہیں رسول دے اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ۔'' اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے مملکت کی دولت کے مصارف کی اصولاً نشاندہی کردی ہے لیکن اس کی تفصیلی تقسیم کا حق مرکز کو دیا ہے جو مقتضائے حالات کے مطابق خرچ کرے گا۔

مالِ غنیمت کے متعلق سورہ انفال میں ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (8/41) اور سمجھ لو کہ جو کچھ تمہیں بطور غنیمت ملے، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور ذی القربیٰ کے لیے، یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل کے لیے۔'' صدقات کے مصارف کے متعلق سورۃ توبہ میں ہے کہ وہ ''فقراء، مساکین اور صدقات کے کارکنوں کے لیے ہیں۔اور ان کے لیے جن کی تالیف قلوب ضروری ہے۔اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگوں کو آزاد کرانے کے لیے اور مقروض و مصیبت زدوں کے لیے۔ اور ''اللہ کی راہ'' میں خرچ کرنے کے لیے اور ابن السبیل کے لیے۔۔۔ (9/60)۔''

فیل

قرآن کریم میں اَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ (105/1) آیا ہے۔اس کے متعلق تاریخ میں ہے کہ ابرہۃ الاشرم حبشی اپنی ہاتھیوں کی فوج لے کر کعبہ کومسمار کرنے کے لیے مکہ پر چڑھ آیا تھااوراس کے لیےاس نے پہاڑیوں کی اوٹ میں خفیہ راستہ اختیار کیا تھا۔لیکن گِدّھوں کے جھنڈ جو اپنی جبلی ذہانت سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فوج کسی طرف جارہی ہے اس لیے ہمیں ان کے ساتھ جانے سے بہت سا سامان خوراک (لاشیں) ملیں گی، ان کے اوپر منڈلاتے ہوئے آ گئے۔انہیں دیکھ کر قریش عرب نے بھانپ لیا کہ کوئی لشکر ادھر آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے زور کا پتھراؤ کیا۔کچھ تو خود ان پتھروں سے، اور کچھ اس طرح کہ ان سے ہاتھی بھڑک اٹھے اور اپنی فوج کو کچلتے ہوئے بھاگے، وہ فوج بھُس کی طرح ہوگئی۔ یہ سارا واقعہ سورۃ فیل میں بیان ہوا ہے۔واقعہ ایسا تھا جسے مخاطبین عرب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اس لیے وہ جانتے تھے کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے۔قرآن کریم کا اس سے مقصد یہ بتانا تھا کہ تم اس دین حق کی مخالفت چھوڑ دو ورنہ تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

قارون

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ [1] کو فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا تھا(40/24)۔اوران دونوں کی طرح قارون بھی ہلاک ہونے والوں میں سے تھا(29/39)۔قارون قوم موسیٰؑ میں سے تھا اور سرمایہ داری کی لعنت کا مجسمہ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

چونکہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت انقلاب نظام سرمایہ داری (Capitalism) کو مٹانے کے لیے ہوتی تھی اس لیے قرآن کریم نے خصوصیت سے قارون کا ذکر کیا ہے۔سرمایہ پرست کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ (وہ سمجھتا ہے کہ) میں جو کچھ کماتا ہوں وہ میری اپنی ہنرمندی اور چابکدستی کا نتیجہ ہے اس لیے وہ میری واحد ملکیت ہے جس میں کسی اور کا حق اور حصہ نہیں۔ میں جتنا چاہے جمع کروں اور اسے جس طرح جی چاہے صرف کروں۔قارون (جسے قرآن کریم نے اس ذہنیت کے ایک ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا ہے) یہی کہتا تھا: قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُهٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ (28/78)''وہ کہتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنرمندی سے ملا ہے۔'' قرآن کریم کہتا ہے کہ بَلۡ هِیَ فِتۡنَةٌ (39/49) یہ ان لوگوں کی بڑی غلط نگہی اور گمراہی ہے۔جس چیز کو انسان اپنی ہنرمندی اور ذاتی صلاحیت کہتا ہے ذرا سوچئے تو سہی کہ اس میں کتنا حصہ اس کا اپنا ہے اور کتنا

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ فرعون، قارون اور ہامان ایک مثلث (تکون) کا نام ہے۔یہ تینوں اُس معاشرے کی علامتیں (Symbols) ہیں جو تباہی کے دہانے پر واقع ہوتا ہے۔(i) فرعون ملوکیت کی علامت ہے۔(ii) قارون نظام سرمایہ داری کا نمائندہ ہے اور (iii) ہامان مذہبی پیشوائیت کا مجسمہ۔ جب یہ تینوں یک جا ہو جائیں تو اس معاشرے کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔جیسا کہ العنکبوت میں بیان ہوا ہے۔(منظور الحسن)

حصہ قدرت کا عطیہ۔خود انسانی ذہن اوراس کی استعداد کو لیجئے۔ یہ کسی فرد کی نہ اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے نہ زرخرید۔ یہ خالصۃً موہبت خداوندی (عطیہ فطرت) ہے۔اس سے آگے وسائل پیداوار (زمین اور مافیہا) کو لیجئے تو یہ تمام کے تمام فطرت کے عطا کردہ ہیں۔اس لیے اگر بغور دیکھا جائے تو انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے اس میں محنت (Labour) اس کی اپنی ہوتی ہے، باقی سب کچھ خدا کا عطا کردہ ہے۔لہٰذا اس میں اس کا صرف حق المحنت ہوتا ہے۔باقی سب کچھ خدا کا ہوتا ہے۔خدا ''اپنے حصے'' کے متعلق کہتا ہے کہ اسے نوع انسانی کی عام پرورش (ربوبیت عامہ) کے لیے کھلا رکھنا چاہیے۔لہٰذا قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت، قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی ضد ہے اوراس کا نتیجہ تباہی اور بربادی۔اسی لیے قرآن کریم نے قارون کے اس قول کے بعد جسے اوپر درج کیا گیا ہے کہا ہے کہ اَوَلَمۡ یَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَہۡلَکَ مِنۡ قَبۡلِہٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مَنۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُ قُوَّۃً وَّ اَکۡثَرُ جَمۡعًا (28/78) ''کیا اسے علم نہ تھا کہ اللہ نے اس سے پہلے ایسی ایسی قوموں کو تباہ کردیا جو طاقت اور جمعیت میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔'' یعنی نظام سرمایہ داری کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔اس لیے یہ نظام کبھی پنپ نہیں سکتا۔

ق ب ر

قرآن کریم نے مُردوں کے متعلق قبر یا مرقد وغیرہ کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں (مثلاً: مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ۔36/53) تو اس سے مراد یہ نہیں کہ مردے کسی خاص مقام (قبروں) سے اٹھائے جائیں گے۔اگر یہ مراد ہوتو ان مردوں کی بابت کیا کہا جائے گا جنہیں دفن نہیں کیا جاتا؟ دفن کرنا تو مُردوں کی (Disposal) کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے ہاں اور طریقے بھی رائج ہیں۔قرآن کریم کا مقصد موت کے بعد کی زندگی کو بیان کرنا ہے۔ عربوں کے ہاں چونکہ مُردے قبروں میں گاڑے (دفن کیے) جاتے تھے اس لیے قرآن کریم نے قبروں کا ذکر کیا ہے۔ورنہ حیات بعد الممات کے لیے نہ کسی مقام کی خصوصیت ہے نہ اس جسم کی ضرورت ہے جو موت کے ہاتھوں تلف ہوجاتا ہے۔ موت کے بعد زندگی یقینی ہے لیکن اس زندگی کے لیے پیکر یا مظہر کس قسم کا ہوگا، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کرسکتے۔ویسے بھی اصل مقصد تو زندگی سے ہے، نہ کہ اس کے مظاہر سے۔

ق ب ل

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ (5/27) ''اللہ صرف متقین کا عمل قبول کرتا ہے۔'' ان آیات میں ''قبول کرنے'' سے مراد کسی چیز کا لے لینا ہیں (جیسے ہم کسی کا نذرانہ لے لیتے ہیں)۔مطلب یہ ہے کہ ان اعمال کا خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق عمدہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو اعمال اس کے مقرر کردہ قانونِ اور قاعدے کے مطابق سرزد ہوں وہی خوشگوار نتائج کے

حامل ہوتے ہیں۔

اَلْقِبْلَۃُ۔ اس لفظ کے اصل معنی جہت یا سمت کے ہوتے ہیں۔لیکن عرفِ عام میں اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف نماز میں رخ کیا جائے۔ جسے سامنے رکھا جائے۔ جو ''پیش نظر'' رہے۔ جو مقصودِ نگاہ یا نصب العین ہو۔

دین کے نظام میں قبلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہر نظام، ہر مملکت، ہر حکومت کا ایک مرکز ہوتا ہے جس کی طرف تمام افرادِ معاشرہ کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ جو ان میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرتا ہے۔ یہ دراصل نشان (Symbol) ہوتا ہے اس نظام یا حکومت کا جسے ہر وقت پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسے پیش نظر رکھنے سے مقصود اس نظام یا حکومت سے اپنی وابستگی اور وفا شعاری کا اظہار ہوتا ہے۔ حکومت خداوندی کا محسوس قبلہ، اس مقام کے علاوہ اور کون سا مقام ہوسکتا تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ(3/95) یعنی دنیا کے بت کدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا جسے تمام اقوام عالم کے لیے راہ نمائی کا نشان بنایا گیا۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا(3/96) ''جو اس میں داخل ہوگیا اسے دنیا جہاں کی آفات سے امن مل گیا۔'' قبلہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس کے اتباع کو قرآن کریم نے دین کے اتباع سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ایک جگہ ہے: وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ (2/145) ''اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے تمام آیات (دلائل) بھی لے آئے تو بھی وہ تیرے قبلہ کا اتباع نہیں کریں گے اور نہ ہی تو ان کے قبلہ کے تابع ہوگا اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں۔'' دوسری جگہ ہے: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (2/120) ''یہود اور نصاریٰ تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تو ان کی ملت (مسلک) کا اتباع نہ کرے گا۔'' اس سے ظاہر ہے کہ قبلہ، درحقیقت ملت و مسلک (دین) کا محسوس نشان ہے اور اتباع قبلہ سے مراد اتباع دین ہے۔

جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہوں، وہ اپنی توجہات کو اپنے دین کے مرکز (قبلہ) کی طرف مرکوز رکھیں۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ(2/150) ''تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اسی کی طرف رکھو۔'' یعنی اپنی توجہات کو اس کی طرف مرکوز کرو۔ تمہارا نصب العین حیات ایک ہو اور یہی وحدت نصب العین تمہاری وحدت ملت کی بنیاد قرار پائے۔ اسی کی محسوس شکل، اجتماعات صلوٰۃ میں کعبہ کی طرف رخ کرنا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ضروری ہے لیکن اسے مقصود بالذات نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی تبیین کے لیے فرمایا کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2/177) ''کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔'' [اگر قِبَلٌ کو قِبْلَۃٌ کی جمع تصور کرلیا جائے تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مشرق و مغرب میں جس قدر

قبلے ہیں، وہ کسی قوم کے یا کسی مذہب کے ہوں ان کی ساری اہمیت اضافی ہے، ذاتی نہیں]۔بات بالکل واضح ہے۔ جو چیزیں کسی نظام کے لیےمحسوس نشانات کا کام دیتی ہیں جب تک وہ نظام قائم رہے، ان نشانات کی اہمیت حتمی اور یقینی اور ان کا احترام والتزام نہایت ضروری ہوتا ہے۔(اسی کو دوسری جگہ شعائر اللہ کہا گیا ہے)لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہے تو ان نشانات کا احترام محض ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ لطیف اور اہم نکتہ جس کی وضاحت کے لیے قرآن کریم نے ایک جگہ تاکیداً کہا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اپنے دین اور نظام کے محسوس مرکز کی طرف رکھو۔اس سے معلوم ہوجائے گا کہ تمہاری وفاشعاریوں کا مرکز کیا ہے۔لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس مرکز کی طرف منہ کرنا مقصود بالذات ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نظام گم ہوجائے اور قوم انفرادی زندگی بسر کر رہی ہو،لیکن اس کے دل میں اس نظام کے قیام کی آرزو ہو،تو اس وقت قِبۡلَۃٌ کیسے بنایا جائے؟ یعنی اس وقت اجتماعی زندگی کی ابتدا کہاں سے کی جائے؟ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ ایسے حالات میں وَّاجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (10/87) یعنی ''اپنے گھروں کو اپنی توجہات کا مرکز بناؤ اور وہیں سے نظام صلوٰۃ کے قیام کی ابتدا کردو۔'' یعنی اس نظام کا آغاز اپنے گھروں سے (ایک خاندان کو وحدت (Unit) تصور کرکے) کرو۔رفتہ رفتہ یہ نظام پوری کی پوری قوم کو محیط ہوجائے گا اور سب کے لیے ایک قبلہ قائم ہوجائے گا۔

یہودیوں کے لیے یہ اجتماعی مرکز بیت المقدس تھا۔لیکن یہودیوں نے دین خداوندی کو اپنی نسل تک محدود کرلیا،لہٰذا یہ مرکز بھی ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا۔عالمگیر انسانی برادری کا مرکز نہ رہا۔ایک یہود پر ہی کیا موقوف،اُس وقت دنیا کے کسی مذہب اور کسی قوم کے سامنے بھی عالمگیر انسانیت کی وحدت کا تصور نہیں تھا۔اِس کے برعکس،قرآن کریم کے پیش نظر تمام نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔اس لیے وہ مختلف قومی مراکز میں سے کسی کو بھی اپنا مرکز قرار نہیں دے سکتا تھا۔وہ اس کعبہ کو مرکز قرار دے سکتا تھا جس کی بناء حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں اسی مقصد کے لیے رکھائی گئی تھی (2/127)۔اس مقام کو مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا (2/125) قرار دیا گیا تھا۔یعنی تمام نوع انسان کے لیے مرجع اور پناہ گاہ۔ یہ سَوَآءَ ۨالۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَالۡبَادِ (22/25) تھا۔یعنی وہاں کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لیے یکساں۔ یہ بنایا ہی تمام انسانوں کے فائدے کے لیے گیا تھا (3/95)۔یہ تھا وہ مقصد جس کے لیے کعبہ کو دین خداوندی کا مرکز (قبلہ) بنایا گیا۔

جہاں تک خود امت مسلمہ کا تعلق ہے، تعیین قبلہ کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَھِیۡدًا (2/143) ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنادیا تاکہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رہو اور رسول (تمہارا مرکز ملت) تمہارے اعمال کا نگران رہے۔'' اس آیت جلیلہ میں مسلمانوں کے مقصدِ حیات، مقام اور طریق عمل کو ابھار اور نکھار کر سامنے لایا گیا ہے۔کعبہ کو قبلہ اس لیے بنایا

گیا ہے کہ دین، قومی دوائر سے نکل کر عالمگیر انسانیت کو محیط ہوجائے۔ اس دین کی حامل اُمت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیگر اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رہے کہ کون سی قوم (نوع انسان کے لیے) کیا کچھ کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اجتماعی نظم کی ضرورت ہے۔ اس نظم کا مرکز رسول (اور رسول کے بعد اس کے سچے جانشین) ہیں۔ جب تک یہ نظام قائم رہا، تعیین قبلہ کا منشا پورا ہوتا رہا۔ جب یہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا نہ اس اُمت کا وہ مقام رہا، نہ اس کے قبلہ کی وہ حیثیت۔

رہ گئی رسم اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

اس ''رسم'' میں روح پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پھر سے اُسی نظام کو زندہ اور قائم کیا جائے۔ قرآن کریم کی موجودگی میں اس نظام کا احیاء کچھ بھی مشکل نہیں۔ قرآن کریم ہمیشہ کے لیے محفوظ اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس پر متفرع نظام ہمیشہ قائم رہے اور اگر یہ کسی وقت (بدقسمتی) سے موجود نہ رہے تو اس کی دوبارہ تشکیل کی جا سکے۔ دنیا اب اپنی قومی تنگناؤں سے دل برداشتہ ہو کر کسی عالمگیر نظام کی متمنی ہوتی جا رہی ہے۔ اس نظام کے لیے ایک مشترکہ ضابطۂ حیات کی ضرورت ہے۔ یہ ضابطہ حیات، قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جس دن دنیا نے اس حقیقت کو سمجھ لیا، عالمگیر نظامِ حکومت کے خواب کی تعبیر سامنے آجائے گی۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والی اُمت اپنے اندر وحدت پیدا کر کے اس قسم کے نظام کو متشکل کر کے دکھائے۔ اگر اسی قوم کے ''قبلے'' مختلف رہے تو ساری دنیا کا ایک قبلہ کس طرح بن سکے گا؟

ق ت ل

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (17/31) نیز وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (6/152) میں قتل اولاد سے مراد بچوں کو سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں علم وتربیت سے محروم رکھنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ان کا اِسْتِحْیَاء (زندہ رکھنا) انہیں علم و بصیرت عطا کرنا ہے۔ یعنی اس خیال سے بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنا کہ اس کے اخراجات سے ہم غریب ہوجائیں گے۔

تذلیل وتحقیر کے مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی ان آیات کا مطلب بھی صاف ہوجاتا ہے جہاں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا ذکر ہے۔ تذلیل وحقیر کے اعتبار سے قتل کے معنی ہیں کسی کو ایسا کر دینا کہ اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دے۔ اس کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہے۔ وہ بے اثر (Ineffective) ہوجائے۔ اُقْتُلُوْا فُلَانًا کے معنی ہیں اسے ایسا کر دو کہ گویا وہ مُردوں میں شامل ہو چکا ہے۔ یعنی اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہوجائے۔ قَتَلَ الشَّرَابَ کے معنی ہیں شراب میں پانی ملا کر اس کی تندی اور کیف آوری کو کم اور ہلکا کر دیا۔

لہٰذا قرآن کریم میں جہاں قتل کا لفظ آئے ہر جگہ اس کے معنی مار ڈالنے کے نہیں ہوں گے۔ سیاق وسباق کے اعتبار سے اس کے معنی متعین کیے جائیں گے۔ کہیں مار ڈالنا، کہیں ذلیل وحقیر کرنا، غیر موثر بنا دینا، تباہ و برباد کر دینا، کہیں علم وتربیت سے بے بہرہ رکھنا اور کہیں پورا پورا علم حاصل کرنا وغیرہ۔ حتیٰ کہ انتہائی کوشش کرنا بھی۔ چنانچہ اِسْتَقْتَلَ فِي الْأَمْرِ کے معنی ہیں اس نے اس معاملہ میں جان کی بازی لگا کر کوشش کی۔

ق د ر

تَقْدِيْرٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے مطابق بنا دینا۔ اور مقدار اس پیمانے یا ماڈل یا نمونہ (Pattern) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔

① قَدْرٌ اور تَقْدِيْرٌ کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانے کے مطابق بنا دینا۔ نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا، متوازن اور معتدل رہنا۔ ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے۔

② چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو، اس لیے قَدْرٌ کے معنی کسی چیز پر اقتدار واختیار رکھنے کے بھی ہیں۔

③ ایک چیز کو آپ بغیر ناپے تولے یونہی دے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی یا فراخی کا پہلو ہوتا ہے۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں، اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قَدْرٌ کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو ماپ تول کر دینا۔ نیز اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یعنی جس مقام پر کوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا۔

امر الٰہی کے مطابق ہر شے وجود میں آتی ہے اور اس کے لیے قواعد وضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں۔ یہی قواعد وضوابط وخواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ انہیں کو ان کی ''تقدیریں'' کہا جاتا ہے۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیال ہے، نشیب کی طرف بہتا ہے، ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے۔ اور جب اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے۔ سورہ فرقان میں ہے: خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (25/2) اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر ان کے لیے پیمانے اور اندازے مقرر کر دیئے۔ تقدیر الٰہی (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہوتا وقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے (جیسے سَمٰوٰتٌ)۔ اور دوسری یہ کہ کسی شے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی۔ جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت۔ یہی اس کی

تَقْدِيْرٌ ہے۔

تَقْدِيْرٌ کے معنی ہیں کسی شے کو ترقی دیتے ہوئے اس قَدَرٌ یعنی نمونے (Pattern) کے مطابق بنا دینا جو اس کے لیے متعین ہے۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities) کا مشہود (Actualise) ہو جانا اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طُور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لیے) بلا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یونہی اتفاقیہ نہیں مل گئی کہ آگ لینے کو آئے پیمبری مل جائے۔ اس کے لیے تمہیں شروع سے تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اس طرح تم مدین کی طرف آئے۔ اس طرح وہاں تم نے گلہ بانی کی۔ اس طرح تمہاری تربیت ہوئی اور یوں ان مختلف منازل میں سے گزر کر ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (20/40) تم اے موسیٰ! اس اندازے پر پہنچ گئے۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے جو نبوت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا۔ ① یہاں لفظ قَدَرٌ نے اپنا مفہوم بالکل واضح کر دیا۔

سورۃ اعلیٰ میں ہے: الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○ (87/2-3) اللہ وہ ہے جو مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق کرتا ہے۔ پھر ان میں مناسب اعتدال کرتا ہے۔ پھر ان کے لیے ان کے پیمانے اور اندازے مقرر کرتا ہے اور ان کی اس راستے کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ ان پیمانوں اور اندازوں کے مطابق بن جائیں۔ یہ ہے خدا کا نظامِ ربوبیت جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تقدیر تک پہنچتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے اندر بھی کچھ بننے کی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن اسے دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور نہیں کر دیا گیا کہ وہ صرف اس راستہ پر چلے جس پر چلنے سے اس کی یہ تمام صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے اور چاہے دوسرا راستہ اختیار کرے جس سے اس کی صلاحیتیں دب کر رہ جائیں۔ ان دونوں راستوں میں امتیاز، وحی کی رو سے ہوتا ہے۔ (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے)۔ اب انسان جو راستہ اختیار کرے گا، یا اس راستے میں جس مقام پر ٹھہر جائے گا، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا۔ جس طرح مثلاً جب تک پانی سیال رہتا ہے تو اس پر سیالت (Liquidity) کا قانونِ نافذ رہتا ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو پھر جمادیات (Solidity) کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان جو کچھ بننا چاہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر

---

① واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ انہیں کن مراحل میں سے گزارا جا رہا ہے اور کس مقصد کے لیے گزارا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ نبی کو نبی ہونے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ نبوت وہبی ہوتی ہے۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

نافذ ہوجاتا ہے۔ ابتداء (Inititative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع (Follow) کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (61/5) جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔

دوسری جگہ ہے: يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (51/8) اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے۔ یعنی انسان جو راستہ اختیار کرتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہوجاتا ہے۔ انسان کی ممکنات (Realisable Possibilities) کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس لیے اس کے لیے تقدیرات (یعنی قوانین خداوندی) کے انتخاب کا میدان بھی لامحدود ہے۔ یہ جیسا خود بن جائے گا ویسی ہی اس کی ''تقدیر'' بن جائے گی۔

تم اگر کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانونِ خداوندی کے نتائج تمہارے لیے ناخوشگوار ہیں تو تم اپنے اندر دوسری مثبت تبدیلی پیدا کرلو۔ اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہوجائے گا اور تمہاری تقدیر بدل جائے گی۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر　　　خواہ از حق حکمِ تقدیر دِگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی روا ست　　　زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا ست

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقدیر کا مفہوم۔ لہٰذا جب کہا جائے گا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون ہر شے پر حاوی اور غالب ہے اور اس شے کو اس کی آخری منزل تک لیے جا رہا ہے۔ انسان بھی جس مقام پر اپنے آپ کو رکھے گا اس کے مطابق خدا کا قانون (تَقْدِیْرٌ) اس پر حاوی ہوگا۔ اب یہ بات انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس مقام پر رکھنا چاہتا ہے، اور اس طرح خدا کی کون سی تقدیر اپنے لیے منتخب کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مقام پر رکھے، خدا کی تقدیر (قانون) سے اپنے آپ کو باہر نہیں لے جاسکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شے کے لیے پیمانے (قوانین، اندازے، تناسب، توازن) مقرر ہیں، علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبردار ہے۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشفات قدم قدم پر اس کی شہادت بہم پہنچا رہی ہیں کہ کائنات میں قانون کی کارفرمائی ہے۔ یونہی اندھیر گردی نہیں۔ یعنی تمام کائنات معقول بنیاد (Rational Basis) پر چل رہی ہے۔ آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو۔ اور (Ratio) قدر، پیمانے، اندازے، تناسب ہی کو کہتے ہیں۔ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (33/39) اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے۔ یہاں ہر بات معقول (Rational) ہے۔ اندھی فطرت (Blind Nature) کارفرما نہیں۔ نہ ہی انسان مجبور اور مقہور ہے۔ ''پہلے سے لکھا ہوا'' صرف قانون ہے (کہ فلاں عمل کا نتیجہ یہ ہوگا) انسان کی ''قسمت'' نہیں۔ اپنی قسمت ہر انسان (خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق) خود بناتا ہے۔

قانونِ خداوندی کوقرآن کریم نے قَدْرٌ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قوانین جس طرح خارجی کائنات میں جاری وساری ہیں (جنہیں قوانین فطرت یا (Laws of Nature) کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہیں۔ مستقل اقدار (Permanent Values) خدا کے یہی غیر متبدل قوانین ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کریم سے مقصد یہ تھا کہ نوع انسان تک ان مستقل اقدار کو پہنچا دیا جائے۔ اسی وجہ سے نزولِ قرآن کریم کی ''رات'' کو لَيْلَةُ الْقَدْرِ (97/1-3) کہا گیا ہے۔ وہ ''شب'' (یا تاریک زمانہ جس میں وحی کی روشنی کہیں موجود نہیں تھی) جس میں دنیا کو نئی اقدار عطا ہوئیں۔ یہ مستقل اقدار ہی ہیں جن کے احترام اور پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے بلند ہوکر، انسانیت کی سطح پر آتا ہے، اور جب کسی مستقل قدر اور طبعی (حیوانی) زندگی کے تقاضا میں تصادم ہوتا ہے (Tie) یعنی گرہ پڑتی ہے تو وہ طبعی زندگی کے تقاضا کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ عندالضرورت جان تک کو بھی۔ دین، نام ہی قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے۔

قدس

الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (5/21) وہ سرزمین جہاں زندگی کے ہر طرح کے سامان واسباب باافراط موجود ہوں۔ بابرکت زمین۔ مصر اور فرات کا درمیانی حصہ۔ عام طور پر فلسطین کے علاقہ کو کہتے ہیں۔

قدم

قرآن کریم میں مَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (2/95) متعدد مقامات میں آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ اس سے مراد اعمال انسانی ہیں۔ چونکہ انسان کی موت اس کے ان تمام اعمال کے بعد ہوتی ہے جو اس سے اس دنیا کی زندگی میں سرزد ہوتے ہیں، اس لیے اعمال انسان سے آگے آگے چلتے ہیں۔ اِس میں ماضی (Past) کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ نیز ہر عمل جو سرزد ہو جاتا ہے، ماضی (گزرے ہوئے زمانے) سے متعلق ہو جاتا ہے اور انسان کی دسترس سے باہر۔ اور چونکہ اعمال کے نتائج بھی ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں اسی لیے ان نتائج کو بھی ''پہلے بھیجے ہوئے'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا (38/61) جس نے اسے ہمارے لیے آگے بھیجا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم پر یہ عذاب آیا ہے۔ لہٰذا جنت اور دوزخ کو انسان خود اپنے ہاتھوں سے ساتھ کے ساتھ تعمیر ① کرتا جاتا ہے۔ البتہ ان کی نمود اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ اس زندگی میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

سورہ یونس میں ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (10/2) ایمان والوں کو بشارت دو کہ ان

① جس طرح عمارت تعمیر کرتے وقت سب سے پہلے اُس کی بنیادیں کھودی جاتی ہیں گویا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی ہے اگرچہ تکمیل کے لیے ابھی کافی وقت درکار رہتا ہے۔ (منظور الحسن)

کے لیے ان کے نشوونما دینے والے کے ہاں قَدَمَ صِدْقٍ ہے۔ یہاں قَدَمَ کے معنی بزرگی، شرف اور بلندی مدارج بھی ہیں اور سبقت بھی۔ یعنی صلاحیتوں کی ایسی نشوونما جس سے انسان، زندگی کے آئندہ مراحل طے کرنے (آگے بڑھنے) کے قابل ہو جائے۔ نیز ثبات واستحکام۔

قدیم اور حادث کی اصطلاحات قرآنی نہیں، متکلمین کی ہیں۔ البتہ قرآن کریم میں قَدِیْمٌ کا لفظ پرانی، یعنی اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو پچھلے زمانہ سے چلی آرہی ہو۔

سورہ حجرات میں ہے: لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (49/1) خدا اور رسول (نظامِ خداوندی) کے احکام کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو۔ یا ان کی باتیں کاٹ کر نہ چلو۔ ان کی اطاعت کرو۔

ق د و

قرآن کریم میں تمام انبیائے سابقہ کے ذکر کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (6/91) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی راہ نمائی (وحی) عطا کی تھی۔ پس انہی کی راہ نمائی کی پیروی تو کر، یعنی جو راہ نمائی انہیں دی گئی تھی اب وہی راہ نمائی اس قرآن کریم میں تجھے دی گئی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی راہ وہی ہے جس پر تمام انبیائے سابقہ چلتے رہے ہیں۔ قرآن کریم پر چلنا انبیاء کی راہ پر چلنا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو واضح کیا ہے کہ اصل کے اعتبار سے تمام انبیاء کرامؑ کو ایک ہی دین ملتا رہا ہے۔ وہ دین اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہا۔ اب وہی اصول (جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے) اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں دیئے گئے۔[1] اس لیے جو شخص قرآن کریم کا اتباع کرتا ہے وہ اسی راستے پر چلتا ہے جس پر انبیاء کرام چلتے رہے ہیں۔ یہی معنی فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (6/91) کے ہیں۔ اقتداء اس ہدایت کی ہے جو خدا کی طرف سے انبیاء کو ملتی رہی ہے۔ اس کے خلاف دوسری راہ اشخاص کی اقتداء ہے جس کی مخالفت قرآن کریم نے جابجا کی ہے (مثلاً: 43/23)۔ لیکن ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جس سے قرآن کریم نے روکا تھا۔ یعنی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی (قرآن کریم) کے بجائے زندہ اور مردہ اشخاص کی اقتداء۔

ق ر أ

قُرْاٰنٌ کو قُرْاٰنٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سورتوں کو جمع کرتا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ کتاب اللہ کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اندر قصص، امر، نہی، وعدہ، وعید اور آیات اور سورتوں کو باہم دگر جمع کر دیا ہے۔

---

[1] جن سابقہ احکام میں (اصول نہیں بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں احکام ہیں) کسی ردّوبدل کی ضرورت تھی ان میں ردّوبدل کر کے نئے احکام قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا اب اطاعت خداوندی صرف قرآن کریم کی رو سے ہو سکتی ہے اور کسی مبینہ آسمانی کتاب کی رو سے نہیں ہو سکتی۔

اس کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ خدا کی تمام نازل کردہ کتابوں کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے۔ بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے۔ قرآن کریم میں ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ (75/17-18) اس کا جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا (جس طرح رحم میں تخم حفاظت سے رکھا جاتا ہے) ہمارے ذمہ ہے۔ سو جب ہم اسے جمع کر دیں (اور اسے تمہارے سینے میں محفوظ اور ثبت کر دیں) تو تم اس جمع شدہ وحی کی پیروی کرنا۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (75/19) پھر اس کا لوگوں کے سامنے کھول کر لانا (اس کی نمود اور ظہور) بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جمع، مرتب اور محفوظ شکل میں وجود میں آ چکا تھا۔ یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے اور اسے بعد میں یکجا کیا گیا تھا۔ علاوہ دیگر شواہد، خود لفظ قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ جمع شدہ (کتاب) کی شکل میں تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ قَرَأَ عبرانی لفظ ہے جس کے معنی اعلان کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ (96/1) کے معنی ہوں گے تو اپنے نشو و نما دینے والے کی صفت ربوبیت کا عام اعلان کر دے۔

قرآن کریم وہ الکتاب (ضابطہ حیات) ہے جس میں ہر بات یقینی ہے اور اس سے ہر قسم کا تذبذب اور نفسیاتی الجھن ختم ہو جاتی ہے (2/2)۔ جو کچھ خدا نے حضور ﷺ پر وحی کیا تھا وہ قرآن کریم میں محفوظ ہے (6/19)۔ مومنین کو اسی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کے اتباع کی اجازت نہیں دی گئی (7/3)۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی قرآن کریم ہی کے اتباع کا حکم تھا (10/109)۔ حضور ﷺ اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے (5/48)۔ جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا، تو ایسے لوگ مومن نہیں کافر ہیں (5/44)۔ اس میں تعلیم خداوندی مکمل طور پر آ گئی ہے اور کوئی شخص اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کر سکتا (6/34 و 6/116)۔ یہ سابقہ تعلیمات کا مہیمن ہے (5/48)۔ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (4/82) اور تمام اختلافات اسی سے رفع ہو سکتے ہیں (42/10)۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت خود خدا نے کر دی ہے (75/19)۔ اسی لیے اسے تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16/89) کہا گیا ہے۔ ایسا تصریف آیات کی رو سے کیا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے (6/106، 17/41)۔ رسول اللہ ﷺ ہر اختلافی معاملہ کی وضاحت قرآن کریم سے کرتے تھے (16/64)۔ اور اسی سے لوگوں کو نصیحت کرتے تھے (50/45)۔ یہ خود روشنی ہے (5/15) جو اس لیے دی گئی ہے کہ انسان اس روشنی میں سفر حیات طے کرے (6/123)۔ اسی لیے اس میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے (47/24)۔ یہ نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان ہے (54/16)۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو انسانی خیالات سے پاک و صاف کر کے اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے (56/79)۔ قرآن کریم میں غیر قرآنی خیالات و نظریات و تصورات و معتقدات کی آمیزش شرک ہے (42/21)۔ لیکن جب انسان شخصیت پرستی کا شکار ہو جائے تو اسے یہی بات سخت ناگوار گزرتی ہے (17/46

و 39/45 و 40/12)۔ چناچہ جو شخص ان کے سامنے قرآن کریم پیش کرے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں (22/72)۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اس کی بات قطعاً نہ سنو اور شور مچاؤ تا کہ دوسرے لوگ بھی قرآن کریم کی آواز نہ سننے پائیں (41/26)۔ اس طرح وہ خود بھی قرآن کریم سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کے قریب آنے سے روکتے ہیں (6/16)۔ قرآن کریم کی مثل کوئی چیز نہیں (6/94)۔ مخالفین چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن کریم میں کچھ تبدیلی کر دیں لیکن حضور ﷺ ایسا نہیں کر سکتے تھے، نہ حضور ﷺ نے ایسا کیا (10/15)۔

قرن اوّل کی جماعت مومنین کے شرف وعظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا (43/43)۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو ذلیل وخوار ہو گئے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرم ﷺ خدا سے کریں گے (25/30)۔ اس لیے کہ الدین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ اسے چھوڑ دینے سے الدین ہی چھوٹ گیا۔ آج بھی اسی الدین سے تمسک ہو سکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ الدین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ دین، قرآن کریم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں وہ دین نہیں۔ اور قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے (15/9)۔

قرب

سورہ مائدہ میں ''آدمؑ'' کے دو بیٹوں کا ذکر ہے (یعنی دو آدمیوں کا) جن کے متعلق کہا ہے کہ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا (5/27) ''جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی۔ سو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی۔'' قرآن کریم نے اس قربانی کی کوئی تفصیل نہیں دی کہ وہ کیا چیز تھی اور کس طرح پیش کی گئی تھی۔ یہ کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے جسے نذرانے کے طور پر پیش کیا گیا ہو، یا کوئی عمل خیر بھی جسے بغرض حصول قربِ خداوندی کیا گیا ہو۔ ہمارے ہاں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جو جانور ذبح کیے جاتے ہیں ان کے لیے قربانی کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔

قربِ الٰہی سے مراد فاصلہ اور مکان کے اعتبار سے خدا کے نزدیک ہونا نہیں۔ اس لیے کہ خدا کسی خاص مقام پر نہیں جہاں سے قرب اور بعد ماپا جا سکے۔ انسان جس قدر اپنے اندر خدا کی صفات منعکس کرتا جاتا ہے اسی قدر وہ ''خدا کے قریب'' ہوتا جاتا ہے۔ اور صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کا اتباع کرے۔ چنانچہ سورۃ علق میں ہے: لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (96/19) تو اس شخص کی بات نہ کر (جو گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ بلکہ خدا کے قوانین کی) اطاعت کر اور اس طرح (خدا کے) قریب ہو جا۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنے اندر صفاتِ خداوندی پیدا کیے جا۔ اسی کا نام انسانی ذات کی بیداری اور اس کا استحکام ہے۔ اسی کو قربِ خداوندی کہتے ہیں جو ہر مومن کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے ''مقربین بارگاہِ خداوندی'' کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا، جس طرح ''اولیاء اللہ'' کا

کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قوانین خداوندی کا اتباع معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ایک نظام کے تابع ہوتا ہے۔ تجرد کی خانقاہوں میں یا ویسے ہی انفرادی طور پر نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی خدا کا قرب کسی اور ''الٰہ'' کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔ (دیکھئے: 46/28) الٰہ، صرف ایک ہے اور وہ خدائے واحد ہے۔

ق ر د

قرآن کریم میں ہے کہ جن یہودیوں نے سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی انہیں قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ (2/65) بنا دیا۔ خَاسِئٌ کے معنی ہیں ذلیل، کمینہ، بیکار۔ سورہ نساء میں ہے کہ ان پر لعنت کی گئی تھی (4/47)۔ یعنی وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے تھے۔ اس کی تشریح (7/163-167) میں کہا ہے کہ اللہ نے حکم دے دیا کہ ان پر ایسے لوگ مسلط رہیں جو انہیں طرح طرح کا عذاب دیتے رہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ وہی عذاب تھا جسے دوسری جگہ ذِلَّۃٌ اور مَسْکَنَۃٌ کا عذاب کہا ہے (2/61)۔ سورہ مائدہ میں منافقین کو بھی قِرَدَۃٌ کہا ہے اور اس کی تشریح عَبَدَ الطَّاغُوْتَ سے کر دی گئی ہے (5/60)۔ یعنی غیر خدائی قوتوں کے غلام اور محکوم۔ اسی چیز کو ان پر لعنت اور غضب کہا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ کُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ (2/65) کے معنی یہ نہیں کہ انہیں سچ مچ کے بندر بنا دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذلتوں اور رسوائیوں کی مار ماری گئی تھی۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ یک نگہی اور یک مرکزی کی زندگی بسر کرنے کی بجائے باہمی اختلافات کیا کرتے تھے (16/124)۔ اور یہ حالت ہر اس قوم کی ہوجاتی ہے جو آئین و قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دے۔ اس سے ان میں کیریکٹر ہی نہیں رہتا۔ یہودیوں کا قواعد سبت کی پابندی سے گریز کی راہیں نکالنا اسی عدم کردار کا مظہر تھا۔

ق ر ر

ہر واقعہ ایک خاص حد تک جاتا ہے جہاں پہنچ کر وہ رک جاتا ہے اور اس کے نتائج ظہور میں آجاتے ہیں۔ یہی اس کا مستقر ہوتا ہے۔ وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (36/38) سورج (اپنی محوری گردش کے علاوہ) اپنے نظام کو لے کر ایک مستقر (Destination) کی طرف تیزی سے جا رہا ہے۔

القارورۃ ہر اس برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب رکھی جائے۔ بالخصوص شیشہ کا برتن۔ اس کی جمع قَوَارِیْرُ ہے (76/16-15)۔ پھر خود شیشے کو قَوَارِیْرُ کہنے لگ گئے (27/44)۔ اہل عرب مجازاً عورتوں کو بھی قَوَارِیْرُ کہہ دیتے تھے یعنی آبگینے۔

ق ر ش

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو تولیت کعبہ کے لیے سرزمین حجاز میں بسا دیا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے قیدار بڑا نامور تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندان میں منقسم ہوگئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔ ان میں فہر (قریب 325ء) اور قصی بن کلاب (قریب 475ء) بڑے مشہور ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اسی خاندان کے چشم و چراغ (اور تمام دنیا کے لیے سراج منیر) تھے۔

کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش دور و نزدیک کے ممالک میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ تجارت ان کا کاروبار تھا۔ اس کے لیے مختلف قبائل و اقوام نے ان سے معاہدے کر رکھے تھے کہ ان کے قافلے محفوظ رہیں گے۔ قرآن کریم نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ○ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ○ (106/1-2) ”ان عہد و پیمان کی وجہ سے جو (دوسری اقوام نے) قریش سے اس لیے کر رکھے ہیں کہ وہ کعبہ کے متولی ہیں ان کے قافلے سردی گرمی میں محفوظ طور پر سفر کرتے ہیں۔“ اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہیں یہ مقام کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ رب کعبہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کریں۔ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ○ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ○ (106/3-4) وہ رب کعبہ جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن عطا کیا۔

کیسی عمدہ دلیل ہے یہ۔ یعنی یہ لوگ خدا کے نام پر اتنے مفاد حاصل کرتے ہیں لیکن اطاعت خدا کو چھوڑ کر اوروں کی کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ اچھی بات نہ ہوئی۔ اگر خدا کے نام سے مفاد حاصل کرتے ہیں تو خدا کے قوانین کی اطاعت بھی کریں۔ اور اگر اطاعت کسی اور سے کرنی ہے تو خدا سے اپنی نسبت ختم کریں۔

ق ر ض

عربوں کے محاورہ میں قَرْضٌ حَسَنٌ کے معنی ہیں اچھا سلوک اور معاملہ بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی اسی معنی میں یہ محاورہ آیا ہے (مثلاً: 2/245)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب نظامِ ربوبیت کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کی جائے تو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ جماعت میں جس جس چیز کی کمی ہو اسے مل کر پورا کیا جائے۔ ہر قسم کی کوشش، ہر قسم کا جانی اور مالی ایثار جو درکار ہو، اسے بطیب خاطر پیش کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ قَرْضٌ حَسَنٌ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ اگر قرض کے دیگر معنی بھی ساتھ ملا لیے جائیں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اَلْقَرْضُ کے معنی ہیں چبانا۔ اَلْقَرِیْضُ چارے کا وہ گولہ جسے اونٹ اپنے پیٹ میں لوٹا کر منہ میں لاتا ہے، پھر اسے چباتا رہتا ہے (جگالی کرتا ہے) اور جب وہ ہضم کے

قابل ہوجاتا ہے تو اسے معدہ میں لوٹا دیتا ہے کہ وہ جزو بدن بن جائے۔ نظامِ ربوبیت کے قیام میں فرد جو کچھ معاشرہ کو دیتا ہے اسے یوں سمجھئے کہ وہ قریض کی شکل میں ہوتا ہے۔ معاشرہ اسے مناسب مقامات میں صرف کر کے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ بہترین نتائج کا حامل بن جائے۔ اس طرح افراد نے جو کچھ دیا تھا وہ بہترین شکل میں پھر افراد کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً (2/245) کوئی ہے جو اللہ کو ''قرض حسنہ'' دے تو وہ اسے اس کے لیے کئی گناہ بڑھا دے! یہ بڑھانا نتائج کے اعتبار سے ہے۔ اللہ کو کوئی قرض نہیں دیا جاتا، اس کے بندوں کو دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ معاشرہ جو اللہ کے قانون کے مطابق متشکل ہو وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے جو خدا نے بندوں کے متعلق اپنے اوپر لے رکھی ہیں اور ان واجبات کو وصول کرتا ہے جو خدا نے بندوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے افراد معاشرہ جو کچھ ایثار کریں اور جس حسن کردار کا ثبوت دیں وہ سب ''اللہ کے لیے قرض حسنہ'' ہوگا۔

ق ر ع

قرآن کریم میں قَارِعَةٌ کا لفظ سخت مصیبت کے لیے آیا ہے جو قوموں پر ان کی شامت اعمال سے (غلط روش کے تباہ کن نتیجہ کے طور پر) آتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے ... تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ (13/31) ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی۔ سورۃ الحاقہ میں ہے: كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ (69/4) اس سے مراد وہ تباہی ہے جو قانونِ مکافات عمل کی رو سے ان پر آنے والی تھی۔ یہی اَلْقَارِعَةُ تھی جو قریش کی سرکشی کی وجہ سے ان پر آئی اور یہی وہ قَارِعَةٌ ہے جو ہر سرکش قوم پر ان کے ظلم و استبداد کی بنا پر ہمیشہ آتی ہے۔ اور جو آج کل قوموں کے باہمی تصادم (ٹکراؤ) سے آئے دن واقع ہوتی رہتی ہے۔ سورۃ القارعۃ (101) میں جو تفصیل دی گئی ہے اس سے اس دنیا میں واقع ہونے والے تصادمات کے علاوہ اخروی زندگی کا محاسبہ بھی شامل ہے۔

قرآن کریم عقل و دانش اور فہم و تدبر سے فیصلے کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم کی رو سے فیصلوں کے لیے ایسے طریق اختیار کرنا جس میں انسان اپنی عقل و فکر اور اختیار و ارادہ کو اتفاقات[1] (Chances) کے سپرد کر دے، مستحسن عمل قرار نہیں پا سکتا۔

ق ر ن

سورہ کہف میں ذِی الْقَرْنَیْنِ کا ذکر آیا ہے (18/83)۔ اس سے مراد شہنشاہ کیخسرو (خرس یا سائرس) ہے اور اس کے

① اسی لیے قرعہ اندازی غیر قرآنی عمل قرار پاتا ہے۔ (منظور الحسن)

دوسینگوں سے مراد میڈیا اور فارس کی دو سلطنتیں ہیں جن پر وہ حکمرانی کرتا تھا۔کوئی سو برس کا عرصہ ہوا، اصطخر کے کھنڈرات سے شہنشاہ خرس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دوسینگ ہیں۔اس لیے کہ ایران میں مملکت کو قَرۡنٌ (سینگ) سے تعبیر کیا جاتا تھا۔یہی وہ شہنشاہ تھا جس نے یہودیوں کو بابل کی المناک اسیری سے نجات دلائی تھی اور جس کے ہاتھوں دانیال، یسعیاہ اور یرمیاہ نبی کی پیشگوئیاں پوری ہوئی تھیں۔یہ پیشگوئیاں تورات میں آج کل بھی موجود ہیں۔دانیال نبی نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک مینڈھا ہے جس کے دو بڑے بڑے سینگ ہیں۔جبریل نے انہیں اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ یہ میڈیا اور فارس کی دوسلطنتوں کا شہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملے گی۔چنانچہ یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔

یہ بادشاہ پہلے ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کا تمام سفر طے کرتا ہوا لیڈیا (ایشیائے کوچک کی شمال مغربی مملکت) کے دارالحکومت سارڈس کو فتح کر کے سمندر کے کنارے تک جا پہنچا جہاں شام کے وقت سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے (18/86)۔پھر اس نے مشرق کی سمت لشکر کشی کی اور باختر کے علاقہ کی طرف گیا (18/90)۔اس کی تیسری لشکر کشی سلسلۂ کوہ کاکیشیا کی طرف تھی جہاں اس نے درۂ کوہ میں ایک دیوار بنائی تاکہ شمالی علاقہ کے وحشی قبائل ان لوگوں پر حملہ آور نہ ہوسکیں (18/94)۔یہ شہنشاہ زرتشت کا متبع تھا۔قرآن کریم کی کشادہ نگہی دیکھئے کہ اس نے اس کی بلندی سیرت و کردار کا کس خوبی سے اعتراف اور ذکر کیا ہے (18/95-98)۔

ق س ط

قِسۡطٌ اور عَدۡلٌ دونوں کے معنی انصاف کے ہیں لیکن ان میں جو باریک فرق ہے اسے یوں سمجھئے کہ عَدۡلٌ کے معنی ہوں گے دو آدمیوں میں برابر برابر سلوک کرنا اور قِسۡطٌ کے معنی ہوں گے کسی کے حقوق و واجبات کا پورا پورا ادا کر دینا۔ چنانچہ سورہ نساء میں جو آیا ہے کہ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی (4/3) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم دیکھو (تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم) یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے حقوق و واجبات کو پورا نہ کرسکو گے۔(یعنی معاشرہ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کے مسئلے کا منصفانہ حل نہ کرسکو، ان کے تقاضوں کو پورا نہ کرسکو) یعنی اس میں کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کا سوال نہیں۔خود ان کے حقوق کو پورا کرنے کا سوال ہے۔اس سے آگے ہے: وَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ (4/129) تمہیں اس کی استطاعت نہیں کہ عورتوں میں عدل کرسکو۔یہاں مختلف عورتوں میں برابر کے سلوک کا سوال ہے، اس لیے عَدۡلٌ کا لفظ آیا ہے۔

قسم

قرآن کریم میں ہے: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (43/32) ''ہم نے ان کی دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کا سامانِ زیست تقسیم کیا ہے۔'' اس کے معنی یہ نہیں کہ خدا یونہی (معاذ اللہ) اندھا دھند رزق تقسیم کر دیتا ہے۔ اس کی تقسیم کے لیے اسی کا قانون مقرر ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53/39) انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کے لیے وہ کوشش کرے۔ یہ جو ہم دنیا میں اصول کے خلاف تقسیم رزق دیکھتے ہیں تو یہ تقسیم، قانونِ خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔

جاہلیت میں جانور کو ذبح کر کے تیروں یا پانسوں کے ذریعے اس کے حصے کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے۔ اس لیے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کے طریقِ کار کو اختیار کرتا ہے اور اپنی فہم و بصیرت کی رو سے فیصلے کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دیتا ہے جو وجہِ تذلیل انسانیت ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی رو سے قمار بازی اور فال لینا ناجائز ہیں۔

مومنین کا شیوہ قسمیں کھانا نہیں بلکہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل و شہادات پیش کرنا ہے۔ قسم توڑنے کا جو کفارہ مقرر کیا گیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ حتی الامکان قسمیں کھائی ہی نہ جائیں تاکہ بعد میں کفارہ ادا نہ کرنا پڑے۔

قصد

ایک طرف اسراف ہے اور دوسری طرف بخل۔ یہ دونوں سرے (Extremities) مذموم ہیں۔ محمود راستہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ یعنی جود و سخا۔ نہ بے جا اور فضول خرچ کرنا اور نہ ہی سب کچھ اپنی ذات کے لیے رکھ چھوڑنا۔ یہ اقتصاد (درمیانہ روی) قابلِ تعریف ہے۔ اب دوسری مثال لیجئے۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری طرف باطل۔ ان میں سے صرف ایک سمت (حق) ہی محمود ہے۔ دوسری سمت (باطل) محمود نہیں۔ لہٰذا ان دونوں کے بین بین چلنا خوبی کی بات نہیں۔ قابل ستائش وہی ہے جو حق پر چلے، نہ وہ جو حق اور باطل کی درمیانی راہ چلے۔ حق اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے۔ جو شخص اس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹ جاتا ہے وہ باطل پر چلا جاتا ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طرف عدل ہے اور دوسری طرف ظلم ہے۔ قابلِ ستائش وہ ہے جو عدل پر چلے۔ لیکن ایک شخص عدل اور ظلم کی درمیانی راہ چلتا ہے۔ یعنی کبھی عدل کرتا ہے، کبھی ظلم کرتا ہے۔ یا نہ عدل کرتا ہے نہ ظلم کرتا ہے۔ ایسے معاملات میں بے گانہ (Indifferent) رہتا ہے۔ اس شخص کو اگر عدل کے پیمانہ سے ماپا جائے تو اس کا یہ عمل محمود نہیں۔ لیکن اگر ظلم کے پیمانہ سے ناپا جائے تو یہ بہر حال، ظالم سے بہتر ہوگا۔ اس کی مثال ہمیں سورہ فاطر میں ملتی ہے جہاں کہا ہے کہ ہم

نے وراثتِ کتاب کے لیے اپنے بندوں میں سے ایک قوم کو چن لیا۔ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ ۔۔۔ (35/32) ''سو ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔'' ظاہر ہے کہ ان تین گروہوں میں سے قابل ستائش (اور قرآنی معیار کے مطابق) سابق بالخیرات کا گروہ ہے۔ اور ظلم کرنے والے بدتر ہیں۔ لیکن ان کے بین بین ایک طبقہ ہے جو نہ بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی اس کا شمار گروہ اول میں ہوتا ہے۔ یہ طبقہ، گروہ اول سے ذرا اونچا ہوگا اور تیسرے گروہ سے بہر حال نیچے۔ لیکن اس کی اس روش کو قرآن کریم کی رو سے قابل ستائش نہیں کہا جائے گا۔ قرآنی معیار پر وہی پورے اتریں گے جو ''سابق بالخیرات'' ہوں گے۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہ جو عام طور پر اسلام کے متعلق مطلقاً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اعتدال کا راستہ ہے اور امۃ وسطا وہ قوم ہے جو درمیان کی راہ چلتی ہے، تو یہ صحیح نہیں۔ اسلام حق کا راستہ ہے، نہ کہ حق و باطل کی درمیانی راہ۔ اور امۃ وسطا حق پر چلنے والی جماعت ہے نہ کہ حق و باطل اور عدل و ظلم کے بین بین چلنے والی جماعت۔ البتہ جہاں دونوں سمتیں مذموم ہیں (مثلاً اسراف اور بخل) وہاں اسلام درمیانی راہ کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ وہی راہ محمود ہوتی ہے۔

ق ص ر

قرآن کریم میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے متعلق ہے: مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِى الۡخِيَامِ (55/72) خیموں میں بہ حفاظت رکھی ہوئی۔ دوسری جگہ انہیں قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ (37/48) کہا ہے۔ اپنی نظروں کو حیا کی وجہ سے سمٹا کر رکھنے والیاں۔ جو نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دیں۔

ق ص ص

ایک حدیث میں ہے: اِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ لَمَّا قَصُّوْا هَلَكُوْا۔ بنی اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہو گئے۔ یا جب انہوں نے (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا تو ہلاک ہو گئے۔ (یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا)۔

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے کہہ دیا کہ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا جس نے کسی متنفس کو مار ڈالا، بجز اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا۔ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا (5/32) اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا تو اس نے گویا

تمام انسانوں کوموت سے بچایا۔اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

① قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

② جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کردے، یا ملک میں فساد برپا کرے، اُسے قتل کیا جا سکتا ہے۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (2/178) تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے۔'' اس آیت میں لفظ قصاص سے مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔قصاص کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ہیں۔لہٰذا قصاص کا مطلب ہوا مجرم کا پیچھا کرنا، اس کا تعاقب کرنا، اسے ایسے ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کیے کی سزا نہ پا سکے۔اس آیت میں خطاب يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (جماعت مؤمنین) سے ہے۔جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں، اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لیے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں اور اگر مجرم ان سے بالا دست ہو تو پھر صبر شکر کر کے بیٹھ رہیں۔لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لیے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لیے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔معاشرہ پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو ''قابل دست اندازی پولیس'' قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (... Crown vs)۔لہٰذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کر کے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے: الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ (2/178) اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔اس لیے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصولِ مساوات بیان کیا گیا ہے۔یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھا یا جائے، خواہ قاتل مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔قرآن کریم نے یہاں عام اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لیے اصولی انداز بیان اختیار کیا

ہے،جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ (2/178)''جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اسے چاہیے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔'' ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔'' کچھ معاف کر دینا'' (شَيْءٌ) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔اس لیے کہ سزائے موت میں سے'' کچھ معاف کر دینے'' (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' کچھ معاف کر دینے'' کی شکل اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔اسے دیت یا خون بہا کہا جاتا ہے۔

جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے۔ارشاد ہے: مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا (4/92) کسی مومن کے یہ شایاں ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ہاں غلطی سے ایسا ہوسکتا ہے۔ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ''اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے گا۔بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔'' یہاں سے بات صاف ہوگئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر، بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں، بلکہ خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔خون بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے،مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔لہٰذا سورہ بقرہ کی آیت 178 میں جو فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خون بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت 92 کے باقی ماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہوگی (سزا اس صورت میں بھی خون بہا ہی مقرر کی گئی ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (4/53)''اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس کی لعنت۔اور اس کے لیے سخت سزا تیار کی گئی ہے۔'' یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لیے انتہائی سزا بتائی ہے۔اس میں دیت (خون بہا) نہیں ہے۔البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی مختلف نوعتیں ہوسکتی ہیں۔مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائے گی۔وہ اس کے لیے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے۔اس قسم کے (Cold Blooded Murder) کی سزا سخت

ترین ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے وہ غیرت میں آ کر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہوگی۔ جرم کی نوعیت اور احوال وظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہوگا۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ کے بعد اللہ کا غضب، اس کی لعنت اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ مثلاً عبور دریائے شور، قید تنہائی، قید بامشقت، معاشرہ کے حقوق سے محروم (Disqualify) کر دینا (لعنت کے یہی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں)۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم، موت (قتل) ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ''جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اسے قتل مت کرو۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو۔ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا'' جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں، اس لیے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں، مجھے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اسے اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہیے۔ مقتول کے ورثاء کے لیے ہم نے معاشرہ کو ''سلطان'' بنایا ہے۔'' معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ ہوگا۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (17/33) اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے، فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ ''اسراف فی القتل'' ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لیے ہے، افراد متعلقہ کے لیے نہیں۔ قتل کا جرم معاشرہ (نظامِ حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی، مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہٰذا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لیے ہے۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

① وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ قتل خطا میں قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً، نادانستہ، بھول چوک میں، غلطی سے کسی کا قتل ہوجائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کیے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہٰذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمداً قتل کیا ہو۔

② معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کرڈالیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار رہے گا۔

③ قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔

اس آیت کو جب سورۃ النساء کی آیت فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔ اور ''اللہ کا غضب ولعنت اور عذاب عظیم'' وغیرہ اس کے ساتھ یا اس سے الگ یا اس سے نچلے درجہ پر، دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

ق ص و

الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا (17/1) بہت دور کی مسجد۔ عام طور پر اس سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد مدینہ منورہ ہے جو مکہ سے قریب تین سومیل دور ہے، اور جس کی طرف نبی اکرم ﷺ رات کے وقت ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے اور جسے اب اس جماعت کی سجدہ گاہ بنتا تھا۔ یعنی ان کے نظامِ اطاعت وفرماں پذیری کا مرکز۔

ق ط ع

سورۃ المائدہ میں چوری کی سزا کے متعلق ہے: فَاقۡطَعُوۡۤا اَيۡدِيَهُمَا (5/38) جس کے معنی عام طور پر یہ لیے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر الگ کردو۔ لیکن لفظ قَطۡعٌ اور قَطۡعُ يَدٍ کے مذکورہ صدر معانی کے پیش نظر اس کے یہ معانی بھی ہوسکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کرو جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں۔ اس مفہوم کی تائید آیت کے باقی ماندہ ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (5/38) یہ ان کے جرم کی سزا ہے قانونِ خداوندی کی طرف سے بطور ایک روک کے۔ یعنی چوری کی سزا میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں۔ اس لیے کہ اس سے آگے ہے: فَمَنۡ تَابَ مِنۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ (5/39) اور جو مجرم ارتکابِ جرم کے بعد پشیمان ہوجائے اور اپنی اصلاح کرلے تو اسے قانون خداوندی کی رو سے معاف کردینا

چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی یہ پشیمانی اور اصلاح سزا ملنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے اور سزا ملنے کے بعد بھی۔ لیکن اگر سزا میں اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تو اسے معافی مل جانے سے کیا حاصل ہوگا؟ اور اگر اَیْدِیْ کے معنی اختیار اور مقدرت کے لیے جائیں تو قطع ید کے معنی ہوں گے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس مقدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے۔ اس میں چوری کے علاوہ ہر قسم کی خیانت بھی آجاتی ہے۔

اسی سورہ مائدہ میں نظامِ مملکت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے متعلق ہے: اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (5/33) انہیں قتل کر دو، یا صلیب پر لٹکا دو یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے قطع کر دو یا انہیں جلا وطن کر دو۔ اس میں قتل کرنے، صلیب دینے اور جلا وطن کرنے کے علاوہ ایک اور سزا قطع ایدی وارجل کی بھی ہے۔ اس کے معنی الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر قید کر دینے کے بھی لیے جا سکتے ہیں۔ یہی الفاظ ساحرینِ دربارِ فرعون کی سزا کے بارے میں آئے ہیں۔ بناء بریں قطع ید کے معنی یہ بھی لیے جا سکتے ہیں کہ ایسا طریقہ اختیار کرو جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ تم نے دستخط کر کے (یا فلاں بات کر کے) اپنے ہاتھ کٹوا دیئے۔ یعنی تم بے بس ہو گئے۔ یا اس کی خلاف ورزی کرنے سے رک گئے۔ اور اگر قطع ید سے مراد سچ مچ ہاتھ کاٹ دینے کے ہیں تو یہ وہ انتہائی سزا ہے جو اس وقت دی جا سکے گی جب یہ جرائم ایسے عام ہو جائیں کہ اس قسم کی عبرت انگیز سزا کے سوا ان کی روک تھام کی اور کوئی صورت نہ رہے۔ جیسے کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں سمگلنگ (Smuggling) اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے انتہائی اقدامات ناگزیر ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بارڈر پولیس کو اجازت ہے کہ وہ سمگلر کو موقعہ پر گولی مار کر ہلاک کر دے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ عام حالات میں موت کی سزا، قتل عمد یا بغاوت کے جرم میں دی جا سکتی ہے، اور وہ بھی اس وقت جب پوری تحقیقات (اور مجرم کو اپنی مدافعت کا موقع دینے کے بعد) جرم ثابت ہو جائے۔ لہٰذا، ایسے حالات میں چوری کی سزا، قطع ید ناگزیر ہو جائے گی۔

یا مثلاً جب ملک میں نظامِ خداوندی قائم ہو جائے جس میں ہر فرد کی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کی ذمہ داری خود مملکت پر ہو تو ایسی صورت میں کسی کی چیز چرانا فی الواقعہ ایک سنگین جرم ہوگا جس کی انتہائی سزا دی جانی چاہیے۔ قرآن کریم کا معاشی نظام قائم نہ کرنا اور فاقہ کش چوروں کو قطع ید کی سزا دینا، کُل کو چھوڑ کر صرف جزو پر عمل کرنے کے مترادف ہے، جس کا نتیجہ (2/85) میں مذکور ہے۔

ق ف و

سورہ بنی اسرائیل میں ہے: وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17/36) ''اور جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ (یاد رکھو) سماعت، بصارت اور قلب سب سے

اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔'' قرآن کریم نے اس آیت میں عظیم حقائق بیان کیے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ محض قیاس وگمان کی بنا پر، تقلیداً اور رسماً کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہیے۔ اس کے متعلق خود تحقیق کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے علم کی تعریف یہ بتائی ہے کہ اس میں سماعت و بصارت وقلب کی شہادت موجود ہونی چاہیے۔ سماعت و بصارت میں علم بذریعہ حواس (Perceptual Knowledge) آجاتا ہے، اور قلب (Mind) میں (Conceptual Knowledge) نیز یہ بھی کہ حواس کے ذریعے جو معلومات تم تک پہنچیں، ان سے نتیجہ مستنبط کرنے میں اپنے جذبات کو دخل مت دو (اس لیے کہ فؤاد میں جذبات کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے)۔ ہر معاملہ کے متعلق پوری پوری خارجی معلومات بہم پہنچاؤ اور پھر جذبات سے الگ ہو کر، اس سے نتیجہ نکالو۔

ق ل ب

چونکہ انسان کا دل کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ لحہ بہ لحہ بدلتا رہتا ہے اس لیے اسے بھی قَلْبٌ کہتے ہیں۔ اور (چونکہ عقل وبصیرت کا کام یہ ہے کہ وہ اشیاء اور اس کے خواص کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے اس لیے) عقل کو بھی قَلْبٌ کہہ دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دو لفظ آئے ہیں (فُؤَادٌ، فَادَ سے ہے جس کے معنی بھوننے کے ہیں، یعنی تپش وخلش، سوز وگداز، درد و داء) ان دونوں لفظوں میں ایک موٹا سا امتیازی خط کھینچنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ قَلْبٌ فہم وبصیرت اور عقل وفکر کا سرچشمہ ہے اور فُؤَادٌ جذباتِ سوز وگداز کا منبع۔ سورہ بقرہ میں منافقین کے ضمن میں ہے: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (2/10)۔ اس سے ان کی نفسیاتی کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہے اور ذہنی کیفیت کی طرف بھی۔ اس لیے کہ اس سے پہلے ان کے متعلق کہا ہے: وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (2/9) وہ اپنے آپ کے سوا اور کسی کو دھوکا نہیں دیتے لیکن اسے سمجھتے نہیں۔'' اس میں دونوں (نفسیاتی اور ذہنی) کیفیات کے بگاڑ کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے قَلْبٌ کا لفظ عقل اور جذبات دونوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان کا لفظ (Mind) قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دونوں کے لیے بولا جاسکتا ہے۔ نیز قرآن کریم میں بھی قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کو مرادف معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

ق ل د

تَقْلِيْدٌ کے معنی ہیں نکیل کی نتھنی جسے ناک میں یا پٹا جسے اپنے گلے میں ڈال لیا جائے اور رسّی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی جائے اور پھر اس کے پیچھے انسان جانور کی طرح چلتا جائے۔

قرآن کریم اس لیے آیا تھا کہ نوع انسانی کے گلے سے وہ تمام زنجیریں اتار دے جو اس نے اشخاص پرستی کی رُو سے

پہن رکھی تھیں اورجن میں وہ غلاموں کی طرح جکڑے چلی آرہی تھی (7/156)۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کے ذریعے ان تمام زنجیروں کوتوڑ کرٹکڑے ٹکڑے کردیا لیکن مسلمانوں نے ان ٹکڑوں کوایک ایک کرکے اپنی مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیااور پہلے سے بھی زیادہ کڑی زنجیروں میں اپنے آپ کوجکڑ لیا۔اسی کوتقلید کہتے ہیں جس سے انسانیت کا جوہرِ حریت فکر وعمل جل کرراکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔قرآن کریم،قانونِ خداوندی کی اطاعت اورساری کائنات پرحکومت کا سبق دیتا ہے، نہ کہ انسانوں کی غلامی کا سبق۔تقلید غلامی کی بدترین شکل ہے۔اس لیے کہ غلامی میں انسان کا صرف جسم مقید ہوتا ہے،لیکن تقلید میں اس کی عقل وفکر ماؤف ہوجاتی ہے۔قرآن کریم قدم قدم پرتدبر وتفکر کا حکم دیتا ہے اوراسلاف کی اندھی تقلید کو منکرین کا شیوہ بتاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ جب بھی کسی رسول نے خدا کی طرف دعوت دی تو یہ کہہ کراس کی مخالفت کی گئی کہ تمہاری یہ دعوت اُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثتاً آباو اجداد سے آرہا ہے۔قرآن کریم کی دعوت کے خلاف کوئی دلیل اور برہان نہیں لائی گئی۔محض یہ کہہ کراسے ٹھکرادیا گیا کہ یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے (2/170;5/104)۔قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ روش انسانی سطح زندگی کی نہیں،حیوانی سطح کی ہے۔لہٰذا جہنم کی زندگی (7/179)۔ اس میں انسان کی آنکھیں پیچھے کی طرف رہتی ہیں (33/66)۔وہ سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتا (36/8-9)۔یعنی اس مسلک کی رو سے اس قوم کو اپنا ماضی تو درخشندہ نظر آتا ہے لیکن مستقبل تاریک۔

غور کیجئے کہ کیا آج ہماری بھی بعینہٖ یہی حالت نہیں! کیا قرآن کریم کی دعوت کی ہرجگہ یہی کہہ کرمخالفت نہیں ہوتی کہ یہ آوازاُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثتاً چلا آرہا ہے اسے اٹھا کر پھینک دینا چاہیے۔مطلب یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ان سے ورثہ میں ملا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پرکَس کردیکھ لینا چاہیے۔جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھنا چاہیے، جواس کے خلاف ہواسے غلط۔یہ دلیل کہ اُن بزرگوں نے جو کچھ کہا تھا قرآن کوسمجھ کرہی کہا تھا، بڑی کمزور، بلکہ باطل ہے۔قرآن کریم کو قیامت تک کے لیے محفوظ اسی لیے رکھا گیا تھا اور ہرنسل کواس پرغور وتدبر کا حکم اسی لیے دیا گیا تھا کہ وہ ہر بات کوخود قرآن کریم کے آئینے میں دیکھے۔یادرکھئے ہم قرآن کریم پرایمان لانے کے مکلف ہیں، اس لیے ہمارے حق و باطل کی سند صرف خدا کی کتاب ہے۔اسلاف کا احترام بجااور درست،لیکن وہ ہمارے لیے سند نہیں قرار پاسکتے۔

قلم

الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (96/4)''اللہ وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کوسکھایا۔''اس میں ایک توتحریری علم کی اہمیت واضح ہے، دوسرے یہ کہ خدا انسان کو براہ راست قلم سے لکھنا نہیں سکھاتا۔اس لیے اس آیت (اوراس قسم کی دیگر آیات) سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے اندراس طرح علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔اس نقطہ کو

پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہوجائیں گے۔

ق م ر

ایامِ جاہلیت میں عربوں کا قومی نشان قمر تھا۔ جیسے ایرانیوں کا قومی نشان شمس تھا۔ اس اعتبار سے جہاں قرآن کریم نے کہا ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (54/1) تو اس میں بتایا گیا ہے کہ جماعت مومنین اور قریش میں آخری تصادم کا وقت قریب آرہا ہے۔ اس وقت عرب جاہلیت کا تمام اقتدار ختم ہوجائے گا اور اسلام کا پرچم بلند ہوجائے گا۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (75/9) میں عربوں اور ایرانیوں کے اکٹھے ہونے کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ایران فتح کر لینے کے بعد ہوا۔

لیکن اگر ان آیات میں شمس اور قمر کے حقیقی معنی سورج اور چاند کے لیے جائیں تو ان میں طبعی کائنات کے بعض ہونے والے تغیرات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہم اس وقت متعین طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ق م ص

قرآن کریم میں قصہ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں ہے: اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا (12/93) (حضرت یوسفؑ نے کہا) میرے اس کرتہ کو لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے رکھ دو، اس پر ساری بات کھل جائے گی۔ اس زمانے میں (اور آج بھی) ان لوگوں کا لباس امتیازی نشان رکھتا تھا جو بلند مناصب پر فائز ہوں۔ حضرت یوسفؑ کی قمیص ان کے جاہ ومرتبت کا نشان تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی قمیص کو باپ کے پاس بھیج دیا تا کہ وہ اس سے ان کے مقام بلند کا اندازہ کر کے سمجھ لیں کہ ان کا بیٹا (یوسف) کہاں پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی ہوسکتا ہے، اس سے پہلے (12/84 میں) کہا گیا ہے: وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ، یوسف کے غم سے یعقوب کی بینائی کم ہوگئی، غم وحزن کا یہ نتیجہ ہوجایا کرتا ہے کہ انسان کے اعصاب کمزور ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت یعقوبؑ کے سامنے حضرت یوسفؑ کی قمیص آئی تو فرطِ مسرت سے ایسا نفسیاتی اثر ہوا کہ ان کے اعصاب میں تقویت آگئی اور کمزور بینائی پھر سے اپنی اصل حالت پر آگئی۔ فوری خوشخبری سے ایسی کیفیت عام طور پر پیدا ہوجایا کرتی ہے۔

داستانِ حضرت یوسفؑ میں پہلے آپ کی قمیص کا ذکر اس وقت آتا ہے جب آپ کے بھائی اسے ''جھوٹے خون'' میں لت پت کر کے باپ کے پاس لے کر آئے تھے (12/18)۔ دوسری دفعہ آپ کی قمیص آپ کی پاک دامنی کی شہادت بن کر سامنے آتی ہے (12/26-27)۔ اور اب تیسری مرتبہ ان کی زندگی اور جاہ ومنصب کی خوش خبری بن کر۔

ق م ع

قرآن کریم میں اہلِ جہنم کے متعلق ہے: وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (22/20) ان کے لیے لوہے (حدید) کے گرز ہوں گے۔ یہ وہی حدید (فولاد) ہے جسے اللہ نے نظامِ عدل قائم رکھنے کے لیے پیدا کیا ہے (57/25)۔ یعنی قانون اور اس کے ساتھ تنفیذی قوت۔

مَّقَامِعُ (22/20) [1] اس قوت کا نام ہے جس سے کسی سرکش کو اس کی سرکشی سے روک دیا جائے۔ مستبد اور ظالم کو مغلوب کر کے اسے بے بس بنا دیا جائے اور اس طرح مظلوموں کو اس کے ظلم سے محفوظ کر دیا جائے۔

ق ن ت

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے: كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (2/116) ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرتی اور صرف قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرتی ہے۔ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ تمام کی تمام کائنات کو قائم رکھنے کے لیے کھڑی ہیں۔ یہی خصوصیات مومن مردوں اور عورتوں کی ہوتی ہیں۔ الْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ (33/35)۔

ق ن ط

سورۃ حم السجدہ میں يَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (41/49) اکٹھا آیا ہے۔ سورہ زمر میں ہے: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (39/53) ''(اے رسول) میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے کہہ دو کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ (کا یہ قانون کہ حسنات، سیئات کو بہا لے جاتی ہیں) تمہاری تمام لغزشوں کے تخریبی اثرات سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ یقیناً وہ حفاظت اور رحمت کا مالک ہے۔'' مسلمانوں نے اس آیت کو گناہوں کے لیے لائسنس سمجھ رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ کرو اور خوب گناہ کرو، خدا کی رحمت ان سب کو معاف کر دے گی، جو شخص گناہ کر کے سمجھتا ہے کہ خدا اسے معاف نہیں کرے گا وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

یہ تصور قرآن کریم کی کھلی ہوئی تعلیم اور دین کی اساس و بنیاد (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) کے جس قدر خلاف ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم نے اس آیت (39/53) میں عیسائیت کے اس غلط عقیدہ کی تردید کی ہے جس کی رو سے

---

[1] ہمارے ہاں بھی اُردو زبان میں ''قلع قمع'' کا استعمال ہوتا ہے جس کے معنی روک دینے اور ختم کرنے کے ہیں۔ (منظور الحسن)

سمجھا جاتا ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا تھا اس کی رو سے ہر انسانی بچہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ مٹ ہی نہیں سکتا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیح کے کفارہ پر ایمان رکھے۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھی یہ عقیدہ ہے کہ انسان سے جو گناہ ایک دفعہ سرزد ہو جائے، کوئی عمل اس کا ازالہ نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے انسان کو تناسخ کے چکر میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف نے (گوسالہ پرستی کا) جو گناہ کیا تھا اس کی پاداش میں انہیں کچھ دنوں کے لیے جہنم میں رہنا ہوگا۔ قرآن کریم نے پہلے تو اس غلط عقیدہ کی تردید کی کہ انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ یا سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس نے یہ کہا کہ اگر انسان سے کبھی لغزش ہو جائے تو اس سے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے بازآفرینی کے مواقع ساری عمر موجود رہتے ہیں۔ اس لیے جو خدا کی رحمت سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے اسے کبھی یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس پر رحمت کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رحمت کے دروازے کھلتے کس طرح ہیں؟ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (15/56) رحمت کے دروازے ان پر بند رہتے ہیں جو خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس کی رحمت کا مستحق وہ ہوگا جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ اس کے سوا رحمت خداوندی سے بہرہ یاب ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ جتنی اور صورتیں ہم نے اپنے ذہن میں تراش رکھی ہیں وہ فریب نفس کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11/115) برائیوں کے اثرات زائل کرنے کے لیے بھلائی کے کام کرو۔ بھلائیوں کا زندگی بخش نتیجہ، لغزشوں کے تخریبی اثر کو زائل کر دے گا۔

قھر

قرآن کریم میں خدا کی ایک صفت اَلْقَهَّارُ (12/39) بھی آتی ہے۔ اَلْقَهَّارُ کے معنی ہوں گے وہ جس کا قانون سب پر غالب ہو۔ جسے کوئی شکست نہ دے سکے۔ جسے کوئی مغلوب نہ کر سکے۔ سورہ انعام میں ہے: وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (6/18) وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ یہ قہاریت خدا کے تو شایان شان ہے کیونکہ ساری کائنات پر اسی کا غلبہ و اقتدار ہے۔ لیکن جب کوئی انسان اس قہاریت کا دعویٰ کرے تو اس کا نام فرعونیت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے فرعون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (7/127) ''اور ہم ان (بنی اسرائیل) پر غالب ہیں۔'' یہ خالص استبداد ہے جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے جب کہا ہے کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (93/9) جو معاشرہ میں اکیلا رہ جائے، اسے بے یار و مددگار سمجھ کر اس پر سختی نہ کرو، نہ ہی اسے ذلیل سمجھو۔ یتیموں پر سختی نہ کرو۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اشیائے کائنات کو اپنے تابع تسخیر کرنا تو بالکل ٹھیک ہے لیکن کسی انسان کا دوسرے انسان پر استبداد کرنا یا اسے ذلیل سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ مگر ظلم کی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان معنوں میں یہ صفت جماعت مومنین کے لیے محمود

صفت ہوگی اور صفت خداوندی کا عکس۔ یاد رکھیے! قوت فی ذاتہٖ شر نہیں ہے۔ خدا کی کوئی صفت بھی معاذ اللہ شر نہیں)۔ اس کا استعمال اس کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اسے کسی کمزور پر ظلم کرنے کے لیے استعمال کرو تو وہ شر ہے اور اگر اسے ظالم کا ظلم روکنے کے لیے صرف کرو تو عین خیر۔ خدا چونکہ خیر ہی خیر ہے، اس لیے اس کی ہر قوت حسن اور تعمیر کے لیے ہوتی ہے۔ یہی صورت جماعت مومنین کی ہوتی ہے۔

ق و ب

قرآن کریم میں مقامِ نبوت کے متعلق ہے: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى (53/9) ایام جاہلیت میں عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے سے محکم عہد باندھتے تو وہ دو کمانیں لیتے، ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے اور اس طرح دونوں کا قَابٌ ایک کر دیتے۔ پھر ان دونوں کمانوں کو اکٹھا کھینچ کر ایک تیر چلاتے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ہم ایک جان دو قالب ہیں۔ ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے۔ جو ایک چاہتا ہے وہی دوسرا چاہتا ہے۔ ہم دونوں ہم آہنگ زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے نبی کے متعلق بتایا کہ وہ احکامِ الٰہیہ کا اس قدر متبع ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو قوانین خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتا ہے کہ اس کا اور خدا کا تعلق گویا ان ساتھیوں کا سا تعلق ہو جاتا ہے جنہوں نے فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ والا عہد کیا ہو، أَوْ أَدْنٰى بلکہ ان سے بھی زیادہ قریب تر تعلق۔ یہی وجہ ہے کہ حق کا استحکام جو نبی کی قوتِ بازو سے ہوتا ہے اسے خود خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (8/17) (بدر کے میدان میں) مخالفین حق کو تم نے قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا۔ تم نے ان پر تیر نہیں چلائے تھے، اللہ نے چلائے تھے۔ نبی اور خدا کا تعلق اسی قسم کی رفاقت اور ہم آہنگی کا تعلق ہے۔

یہ مقام نبی کو حاصل ہوتا ہے اور نبی پھر اس مقصد کے لیے اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت تیار کرتا ہے۔ اس طرح انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام اس جماعت کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچتے ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کے لیے وجود میں آتی ہے۔ حق کا عَلَمْ۔ انہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو وحی خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ ان کے فیصلے اور عمل دنیا میں خیر و شر کا معیار بن جاتے ہیں، اور ان کی ''تیراندازی'' خود خدا کی تیرافگنی ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشادِ گرامی کے مطابق جو حضور ﷺ نے اپنی حیات ارضی کے آخری سانس میں فرمایا تھا، خدا رفیق اعلیٰ ہے۔ انسان کا فریضہ ہے کہ خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہے۔ خدا کے ساتھ اسی عہد کا نام ایمان اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ''خدا کا قرب اور رضا جوئی'' ہے۔ یعنی خدا کے پروگرام سے ہم آہنگ ہو جانا۔

قوم

قَوَّامٌ: سامان رزق مہیا کرنے والا، کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4/34) کے یہی معنی ہیں۔ یعنی تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اس کے معنی حاکم یا داروغہ نہیں ہیں۔

قَیُّوْمٌ کے معنی قائم بالذات بھی ہیں۔ یعنی جو اپنے قیام کے لیے کسی کا محتاج نہ ہو۔ لیکن اس کے بغیر کسی چیز کے قیام کا تصور بھی نہ کیا جا سکے (2/255؛ 20/111)۔ دِیْنٌ قَیِّمَةٌ ایسا دین جس میں ہر شے متوازن اور متناسب ہو۔ کُتُبٌ قَیِّمَةٌ وہ مستقیم و متوازن قوانین جو حق کو باطل سے واضح کر دیں۔ قرآن کریم کے متعلق ہے کہ وہ ایسی راہ بتاتا ہے جو اَقْوَمُ (17/9) ہے۔ یعنی سب سے زیادہ سیدھی اور معتدل۔ اور انسان کے متعلق ہے کہ اسے اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (95/4) میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی بہترین توازن کا حامل۔

قِیَامَةٌ کا لفظ قرآن کریم کی ان بنیادی اصطلاحات میں سے ہے جن کا مفہوم بڑا جامع ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم ہے ایسا قیام جو یکبارگی واقع ہو جائے۔ اس دنیا میں قِیَامَةٌ کسی قوم کی وہ نشاۃِ ثانیہ (حیاتِ جدید) ہے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے۔ یعنی وہ قوم یکبارگی اٹھ کھڑی ہو اور مرنے کے بعد دوسری زندگی تو ہے ہی ایک انقلابی ظہور۔ قیامت، آخرت، ساعت، بعث وغیرہ الفاظ کا مفہوم قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سامنے آجاتا ہے۔ ان مقامات میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ متن کے اعتبار سے متعلقہ لفظ کے معنی اس دنیا میں انقلاب اور نشاۃِ ثانیہ ہیں یا اخروی زندگی کا بعث و قیام۔

قوم، قومیت۔ جب انسان نے انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر تمدنی اور اجتماعی زندگی شروع کی تو اس کا آغاز لامحالہ خاندان اور قبیلہ سے ہونا تھا۔ چنانچہ ایک خاندان (اور خاندان سے آگے بڑھ کر ایک قبیلہ) کے افراد ایک وحدت قرار پا گئے جن میں وجہ جامعیت خون کا رشتہ (یا نسبی تعلق) تھا۔ جب مختلف گروہوں میں باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بن گیا۔ اس طرح ایک قبیلہ کے افراد میں باہمی عصبیت اور دوسرے قبیلہ کے افراد کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ اور یوں انسانی وحدت (مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر) پارہ پارہ ہو گئی۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اسے قومیت یا نیشنلزم کہتے ہیں، جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اس میں صرف اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ بعض ممالک میں (ایک نسل کے بجائے) ایک وطن کی چار دیواری میں رہنے والے افراد کو ایک قوم قرار دے دیا جاتا ہے۔

اسلام نے انسانوں کی تقسیم کا یہ اصول بدل دیا اور کہہ دیا کہ ایک نظریۂ زندگی کے ماننے والے انسان (بلا لحاظ نسل،

زبان، وطن) ایک برادری کے افراد ہیں اور اس کے برعکس نظریہ کے قائل، دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے ایمان اور کفر کی تفریق اور دورِ حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کی تمیز کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو قرآنی ضابطہ حیات کو صحیح مانتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے خلاف کسی اور مسلک حیات کے قائل ہیں (64/2)۔ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا تھا کہ خود تیرا بیٹا بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں (11/46) کیونکہ وہ ایمان نہیں لایا تھا، تو وہ اسی اصول کا اعلان تھا۔ اسی طرح جب حضرت لوطؑ سے کہا تھا کہ تیری بیوی بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں کیونکہ وہ ان کی جماعت میں داخل نہیں ہوئی تھی، تو وہ بھی اسی اصول کی بنا پر تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے باپ اور پھر ساری قوم سے کہہ دیا تھا کہ تم میرے اپنے نہیں ہو سکتے جب تک تم خدا پر ایمان نہ لاؤ، تو وہ بھی اسی حقیقت کا اظہار تھا (60/40)۔ اس کے برعکس انہوں نے اس اصل عظیم کا اعلان کیا تھا کہ میرے اپنے وہ ہیں جو میرا اتباع کرتے ہیں (14/36)۔ اسی معیار کے مطابق خدا کے آخری نبی ﷺ نے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کی جب کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (49/10) سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ خواہ ان کا رنگ، نسل، زبان، وطن، کوئی بھی ہو۔

یہ ہے صحیح قومیت کا معیار جس کی رو سے قرآن کریم انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ اب دنیا، قومیت کے غلط اصول سے تنگ آ کر خود اس حقیقت کی معترف ہو رہی ہے کہ انسانوں کے لیے صحیح وجہ جامعیت ہم آہنگی فکر و نظر (آئیڈیالوجی کی یکسانیت) ہے نہ کہ اشتراک رنگ و وطن۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا قرآنی اصول زندگی کو اختیار نہیں کرتی عالم انسانیت میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی سے وہ عالمگیر برادری وجود میں آ سکتی ہے جو انسانوں کی خود ساختہ حدود و قیود سے بلند ہو کر وحدت انسانیت کے اصول کی حامل ہو گی۔ یہی قرآنی معاشرہ کا مقصود و منتہیٰ ہے۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے مسلک اور روش زندگی کو ''صراطِ مستقیم'' سے تعبیر کیا ہے (1/5)۔ یعنی سیدھی اور توازن بدوش راہ۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ قرآن کریم سے پہلے اربابِ فکر اور اہل مذاہب زندگی کی حرکت کو دَوری (Cyclic) تسلیم کرتے تھے۔ حکمائے یونان نے جب دیکھا کہ آسمان کے مختلف کرے گول ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ مقصود فطرت ''دائرہ'' ہے، سیدھا چلنا نہیں۔ اس اعتبار سے انہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ کائنات کی حرکت دَوری ہے۔ یعنی وہ ایک متعین دائرے میں گردش کر رہی ہے، آگے نہیں بڑھ رہی۔ اسی سے فیثا غورث نے تناسخ کا نظریہ قائم کیا۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسانی روح، جُون بدل بدل کر، بار بار اس دنیا میں مختلف قالبوں میں آتی ہے۔ روح کو اس چکر سے نجات مل جانا، مقصودِ حیات ہے۔ یہی تصور ہندوؤں کے فلسفہ کی بنیاد ہے اور اسی پر ان کے تصوف (یوگ) کی عمارت بھی استوار ہوتی ہے۔ یعنی انسانی روح درحقیقت خدا کی روح (پرم آتما) کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر، زندگی کے چکر میں پھنس چکی ہے۔ اس کا ان چکروں سے آزادی حاصل کر لینا اور پھر سے اپنے کُل سے جا

ملنا، مقصودِ زندگی ہے۔ یہی تصور مجوسیوں کے ہاں پایا جاتا ہے اور اسی سے ''وحدت الوجود'' کا نظریہ مستعار لیا گیا ہے جو ہمارے تصوف کی بنیاد ہے۔ یہی ''چکر'' عیسائیت اور یہودیت میں ملتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم وحوا) کا گناہ، پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اگر وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آتا ہے تو وہ گناہ اس سے دھل جاتا ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف سے جو چند دنوں کے لیے (گوسالہ پرستی کی) غلطی ہوگئی تھی اس کی پاداش میں انہیں چند دنوں کے لیے جہنم میں جانا پڑے گا۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ اور مقصود وہ کچھ ہو جانا ہے جو وہ پہلے تھی۔ یعنی اس میں آگے بڑھنے یا ترقی کرنے کا سوال نہیں۔ (As you were) جیسا کہ تم تھے، ہو جانا مقصودِ حیات ہے۔ دَوری حرکت (Cyclic Movement) سے یہی مراد ہے۔ یعنی ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ جانا۔

قرآن کریم نے اربابِ فکر اور اہل مذاہب کے اس غلط نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ زندگی کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں گردش کرنے کا نام نہیں۔ آگے بڑھنے اور بلند ہونے کا نام ہے۔ خدا، کائنات کو صراطِ مستقیم پر لیے جا رہا ہے۔ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11/57) اس میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (35/1) اور انسان کو بھی صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں زندگی کی ممکنات (Possibilities) ودیعت کر دی گئی ہیں اور جدوجہد کا وسیع میدان دے دیا گیا ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، اس کی ممکنات، مشہود ہوتی جائیں گی اور وہ سفر زندگی میں آگے بڑھتا جائے گا۔ اس طرح اس کا سفر، ایک دائرے میں نہیں، بلکہ سیدھے اور متوازن راستے پر ہوگا۔ اس سے اس کی زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے گی اور وہ ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جائے گا۔ لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (84/20) ''تم ضرور منزل بہ منزل، درجہ بہ درجہ، بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔'' اس لیے خدا صرف صراطِ مستقیم (سیدھی اور توازن بدوش) راہ ہی کا مالک نہیں وہ ذِی الۡمَعَارِجِ (70/3) بھی ہے۔ یعنی ''سیڑھیوں والا''۔ بلندیوں کی طرف لے جانے والا۔ اس لیے قرآن کریم کی رو سے زندگی کا منتہیٰ جیسا کہ تم تھے (As you were) ہو جانا نہیں بلکہ ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ کائنات میں خدا کا قانونِ ارتقاء کارفرما ہے۔

زندگی کی دَوری حرکت کا تصور، عہد کہن کے انسانی ذہن ہی کا مغالطہ نہیں تھا۔ اس زمانے میں بھی جہاں انسانی فکر نے وحی کی روشنی نہیں لی، وہ اسی چکر میں پھنس گیا ہے۔ جرمنی کے مشہور فلاسفر نیٹشے کا ''تکرارِ ازلی'' (Eternal Recurrence) کا نظریہ اسی مغالطے کا رہین منت ہے۔ ہیگل کا نظریہ اضداد بھی اسی کا مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک تصور (Idea) پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، جب وہ اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو اس میں اس کی ضد دوسرا نظریہ پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظریہ کو

ختم کر دیتا ہے۔ پھر جب دوسرا نظریہ پروان چڑھتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ تصورات (Ideas) کا یہی چکر ہے جو کائنات میں کارفرما ہے۔ ہیگل (Hegel) کے متبع مارکس (Marx) نے کہا کہ یہ چکر تصورات میں نہیں بلکہ نظام ہائے زندگی (Social Orders) میں کارفرما ہے۔ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، پھر اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام پیدا ہوتا ہے جو پہلے نظام کے لیے پیغامِ مرگ بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے۔ پہلے نظام سرمایہ داری کا دور دَورہ تھا۔ جب وہ نظام شباب تک پہنچ گیا تو اس میں سے اس کی ضد، نظامِ اشتراکیت پیدا ہو گیا۔ اب اس کی باری ہے۔

آپ نے غور کیا کہ تنہا عقل انسانی نے جب بھی زندگی کے متعلق کوئی تصور قائم کرنا چاہا ہے تو اس نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ صرف وحی کی روشنی ہے جو انسان کو صحیح نظریہ زندگی عطا کر سکتی ہے اور وہ نظریۂ زندگی ہے ''صراطِ مستقیم'' پر چلنا۔ یعنی نہ ایک مقام پر کھڑے رہ کر جامد اور متصلب (Static) ہو جانا اور نہ ہی دائرے میں گردش کرتے رہنا۔ بلکہ زندگی کے سیدھے اور ہموار راستے پر چلتے جانا اور اس طرح آگے بڑھتے چلے جانا۔ ''حرکت اور ارتقاء'' یہ ہے قرآنی نظریۂ زندگی کا ماحصل جسے اس نے ''صراطِ مستقیم'' سے تعبیر کیا ہے۔

ق و ی

قرآن کریم نے زمین کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ وہ مَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ (56/73) ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ کے ان افراد کے لیے ہے جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو۔ یعنی زمین کی پیداوار انسانی پرورش کے لیے ہے نہ کہ ذاتی املاک بنا لینے کے لیے۔ صاحب محیط نے مُقۡوِيۡنَ کے معنی لکھے ہیں کہ وہ جن کے پیٹ یا توشہ دان کھانے سے خالی ہوں۔ یا وہ لوگ جو بے برگ و گیاہ میدان میں اتریں جہاں کھانے کو کچھ نہ ہو۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ یعنی معاشرہ کے ضرورت مند افراد۔ اسی کو دوسری جگہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ (41/10) کہا گیا ہے۔ یعنی زمین کو تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔

قُوَّةٌ کے لیے قرآن کریم میں ہے: خُذِ الۡكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (19/12) اس ضابطہ خداوندی کو نہایت مضبوطی سے پکڑو۔ پختہ عزم کرو کہ اس کی تعمیل کرو گے۔ ذُو الۡقُوَّةِ الۡمَتِيۡنُ (51/58) زبردست قوت والا، خدا۔ شَدِيۡدُ الۡقُوٰى (53/5)۔

لہٰذا مومن بھی (حد بشریت کے اندر) صاحب قوت ہوتا ہے۔ کمزور اور ناتواں نہیں ہوتا۔ جو قوم کمزور اور ناتواں ہو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قرآنی معیار کے مطابق جماعت مومنین نہیں ہے۔ لیکن ان کی قوت دنیا میں نظامِ عدل و مساوات قائم کرنے کے لیے ہوگی، نہ کہ کمزوروں کو لوٹنے کھسوٹنے اور ناتوانوں کا گلا گھونٹنے کے لیے۔ قوت جب ظالم کا ظلم روکنے کے لیے صرف کی جائے تو خیر ہوگی اور جب مظلوم کو لوٹنے کے لیے استعمال کی جائے تو شر ہو جائے گی۔

ک ب د

قرآن کریم میں ہے: لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ (90/4) ''ہم نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کی ذات کی نمود اور نشو ونما سختیوں سے تصادم [1] میں ہوتی ہے۔''

ک ب ر

کِبۡرِیَآءُ کے معنی حکومت اور مملکت کے ہیں۔ اس کا مفہوم آج کی اصطلاح میں، حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَلَهُ الۡكِبۡرِيَآءُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (45/37) ''ارض و سما (جملہ کائنات) میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کا ہے۔ وہ (بڑے) غلبہ والا، حکمت والا ہے۔'' وہ اَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ (95/8) ہے۔ یہی مفہوم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ہے۔ یعنی اقتدار خدا کے علاوہ کسی اور کا نہیں۔

جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو حق کی دعوت دی تو اس نے (اس کی قوم نے) کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا منشاء کیا ہے۔ تم (دونوں بھائی) چاہتے ہو کہ تَكُوۡنَ لَكُمَا الۡكِبۡرِيَآءُ فِى الۡاَرۡضِ (10/78) ''ملک میں اقتدارِ اعلیٰ تم دونوں کا ہو جائے۔''

الۡمُتَكَبِّرُ (59/23) خدا کی صفت ہے۔ تمام عظمتوں اور بڑائیوں کا مالک۔ اور چونکہ خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنا مومن کی اصل زندگی ہے اس لیے اس معنی میں متکبر ہونا مستحسن ہے (معیوب نہیں) یعنی

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرت او بر نتابد ہمسرے

اِسی کو قرآن کریم نے اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3/138) کہا ہے۔ تکبر وہ برا ہے جس کی رو سے انسان یہ چاہے کہ بغیر تعمیری نتائج پیدا کیے لوگوں سے اپنی بڑائی منوائے۔ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ (7/146) یہ استبداد ہے۔

لیکن اگر اس کا مفہوم اقتدارِ اعلیٰ لیا جائے تو پھر ''تکبر'' کسی انسان کے لیے جائز نہیں ہوگا۔ صرف خدا کے لیے مختص ہوگا۔ اس اعتبار سے آیت (7/146) کے معنی یہ ہوں گے کہ تکبر (اقتدار اعلیٰ) صرف الحق کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ یعنی اقتدار اعلیٰ صرف قوانین خداوندی کو حاصل ہوسکتا ہے، کسی انسان کو نہیں۔ کبر کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی کے نیچے نہ رہنا۔ یہ بھی انسان کے لیے جائز نہیں کیونکہ اسے قوانین خداوندی کے تابع رہنا چاہیے۔

سورہ مدثر میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ (74/2) اُٹھ اور لوگوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ اس کے بعد ہے: وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ (74/3) پہلا حصہ (یعنی لوگوں کو ان کی غلط روش سے باز

---

[1] جہاں میں تُو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارا یا کہ زجاج (علامہ اقبال)

رکھنا) تخریبی یا تمہیدی تھا۔ یہ دوسرا حصہ مثبت یا تعمیری ہے۔یعنی ایسا نظام قائم کردے، ایسی صورتِ حالات پیدا کردے، ایسا نقشہ جمادے، ایسا معاشرہ متشکل کردے کہ جس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ فی الحقیقت خدا کا قانون اور اس کا نظام تمام قوانین ونظام ہائے عالم سے بلند وبرتر ہے۔نظری اعتبار سے تو دنیا کی ہر قوم یہی کہتی ہے کہ ہمارا نظام (یا مذہب) سب سے اونچا ہے۔لیکن تم ایسا کرکے دکھادو جس سے ہر شخص بے ساختہ پکار اٹھے کہ بے شک ہر قسم کی عظمتیں اور بڑائیاں قانونِ خداوندی کے لیے ہیں۔

اذان اور صلوٰۃ میں اللہ اکبر اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ دنیا میں سب سے اونچا، بڑا اور غالب نظام صرف خدا کا نظام ہے جس کے قیام اور استحکام کے لیے ہم اٹھے ہیں۔یہی وہ اعلان (تکبیر) تھا جس سے نبی اکرمﷺ کی مدنی زندگی کے دس سالہ دور میں، اسلامی مملکت میں قریب پونے تین سو مربع میل یومیہ کے حساب سے وسعت ہوتی گئی تھی۔اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کا رقبہ بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گیا تھا۔اور قرآنی نظام، ایرانی اور رومی نظاموں پر غالب آگیا تھا۔غور کیجئے کہ کس قدر عظیم القدر تھا یہ اعلان اور عزم جو آج ایک بے روح رسم بن کر رہ گیا ہے۔اقبال نے کس قدر صحیح کہا ہے ؎

ملا کی اذاں اور [1] مجاہد کی اذاں اور

ک ت ب

قرآن کریم نے اپنے آپ کو کِتَابٌ کہا ہے تو قرآن کریم منتشر اوراق یا کھجوروں کے پتوں یا ہڈیوں کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا نہیں تھا، بلکہ ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب ومدون تھا۔منتشر حالت میں اسے کِتَابٌ کہا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

کِتَابٌ کے معنی فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ہیں۔قرآن کریم میں کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (2/178) یا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2/183) فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ہے۔یعنی جو کام قانوناً لازم قرار دیا جائے۔اسی لیے مجموعہ قوانین کو کتاب کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں گوناگوں احکام واوامر جمع ہوتے ہیں۔لہٰذا جب قرآن کریم کو کِتَابٌ کہا جائے تو اس کے معنی ضابطہ قوانین کے ہیں۔

سورہ یونس میں ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (10/49) ''ہر قوم کے لیے ایک میعاد ہے۔'' اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر قوم کے مقدر میں یہ پہلے سے لکھا جاچکا ہے کہ اس نے اتنی مدت تک عروج حاصل کرنا ہے اور اس کے بعد ختم ہوجانا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (13/38) ہر میعاد کے لیے خدا کا ایک قانون ہے۔یعنی قوموں کی موت اور حیات خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔جو قوم چاہے اس قانون کے مطابق اپنی میعاد کو بڑھالے، جو چاہے اسے گھٹالے۔خدا کی طرف سے صرف قانون مقرر ہے۔اس قانون کے مطابق اپنی مدتِ حیات کو گھٹانا، بڑھانا ہر قوم کے اپنے اختیار

---

[1] رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی (علامہ اقبال)

میں ہے۔

اسی طرح سورۂ آل عمران میں ہے: مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (3/144) کوئی شخص خدا کے قانون (طبعی) کے بغیر مر نہیں سکتا۔ یہی قانون اس کی معیاد کا تعین کرتا ہے۔ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (35/11) عمر کا گھٹنا، بڑھنا، خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون کا علم انسان کو دے دیا گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اسے گھٹا لے (انسان جب جی چاہے خودکشی کر کے مر سکتا ہے اور بد پرہیزی سے اپنی عمر کم کر سکتا ہے)۔ لیکن جب (اس قانون کے مطابق) کسی کی مدتِ عمر کا خاتمہ ہو جائے تو پھر اس کی موت میں تاخیر نہیں ہو سکتی (63/11)۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ (2/2) سے اشارہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف قرآن کریم ہی لکھنے کا حکم فرمایا تھا۔ قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا۔ لہٰذا مکتوب صورت میں صرف قرآن کریم ہی موجود تھا جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں کتاب کا لفظ قانونِ خداوندی یا ضابطۂ قوانین خداوندی کے لیے آیا ہے۔ اور چونکہ قرآن کریم خود ضابطۂ قوانین الٰہیہ ہے اس لیے یہ کتاب اللہ ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کا مجموعہ، مرتب اور محفوظ شکل میں۔

قرآن کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ یعنی یہ قانون کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم میں اس نکتہ کی وضاحت مختلف انداز سے کی گئی ہے۔ سورۂ انفطار میں ہے: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ (82/10-12) تم پر (خدا کی طرف سے) ایسی قوتیں مسلط ہیں جو تمہیں ہر طرح اپنی نگرانی میں لیے ہیں۔ وہ "معزز لکھنے والے" ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ کی تفسیر يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ نے کر دی۔ یعنی علم رکھنے والے، جاننے والے۔

قرآن کریم میں كِتَابٌ اور حِكْمَةٌ آیا ہے اور دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے۔ کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض، غایت، مقصد، نتیجہ، (The why of it)۔ مثلاً كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے بعد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2/183) تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں (یہ کتاب یا قانون ہے۔ اور) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ، اس قانون کی حکمت ہے۔ اس کی غایت یہ ہے، اس کی علت یہ ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ تم ایسے ہو سکو۔ قرآن کریم نے قانون کے ساتھ اس کی حکمت (یعنی نتیجہ) کو بھی خود ہی بیان کر دیا تاکہ ہم ہر وقت دیکھتے رہیں کہ قانون کا منشاء پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر قانون پر عمل پیرا ہونے سے وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ

اس قانون کی محض رسم پوری ہورہی ہے، فی الحقیقت اس پر عمل نہیں ہورہا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت تھی جسے قرآن کریم نے بیان کیا تھا۔ اسی کے نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہماری نمازیں اور روزے اس طرح بے نتیجہ رہ گئے ہیں اور ہم انہیں اسی طرح ادا کیے جارہے ہیں اور مطمئن ہیں کہ اگر ان کے نتائج یہاں مرتب نہیں ہوتے تو نہ سہی، ان کا پھل آخرت میں جا کر ملے گا۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے ان کے نتائج کو اس دنیا میں مرتب ہونے کا بھی کہا ہے اور آخرت میں بھی۔ اگر ان کے نتائج (قرآن کریم کے بیان کے مطابق) اس دنیا میں مرتب نہیں ہورہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہورہا۔ لہٰذا ان کے نتائج آخرت میں بھی مرتب نہیں ہوں گے۔

کِتَابٌ اور حِکْمَۃٌ (قانون اور اس کے نتائج) دین کا بنیادی نقطہ ہے۔ یعنی قرآن کریم اور اس پر عمل پیرا ہونے کے درخشندہ نتائج جو اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں اور جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس لیے جہاں قرآن کریم سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فلاں معاملہ میں خدا کا حکم (قانون) کیا ہے وہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس حکم (قانون) پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ اگر قرآن کریم سے یہی معلوم اور متعین کرلیا جائے اور پھر ہم اس کے مطابق اپنا (انفرادی اور اجتماعی) محاسبہ کرتے جائیں تو ہمیں ہر وقت معلوم ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم پر ٹھیک ٹھیک عمل ہورہا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نفس کا جھوٹا اطمینان غلط عمل کو بھی صحیح بنا کر دکھا سکتا ہے۔

ک ت م

سورہ آل عمران میں ہے: تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (3/70) تم حق کو باطل کے ساتھ ملاتے کیوں ہو اور حق کو چھپاتے کیوں ہو؟ یعنی حق کی باطل کے ساتھ آمیزش بھی جرم ہے اور حق کو چھپانا بھی جرم۔ حق کو ہمیشہ بلا آمیزش رکھنا چاہیے اور اسے ظاہر کرتے رہنا چاہیے۔ قرآن کریم حق بلا آمیزش ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کو نہیں ملانا چاہیے۔ اور اسے نکھار اور ابھار کر سامنے لانا چاہیے۔

ک ث ر

اَلْكَوْثَرُ: ہر چیز جو کثیر ہو، خیر کثیر۔ اَلْكَوْثَرُ سے مراد خود قرآن کریم ہے۔ کیونکہ حکمت کو خدا نے خیر کثیر کہا ہے اور قرآن سرتاپا حکمت ہے۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ اور آپ کی جماعت پر مخالفین کی طرف سے دنیا تنگ کی جارہی تھی اور حالات سخت نامساعد ہورہے تھے، حتیٰ کہ نظر آتا تھا کہ آپ کو اپنا وطن تک بھی چھوڑنا پڑے گا، تو عین اس عسرت کے زمانہ میں آپ سے کہا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں، نظامِ خداوندی کی تشکیل کا ابتدائی دور عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اس کے نتائج مرتب ہونے شروع ہوجائیں گے اور تمہیں زندگی کی خوشگواریاں بڑی افراط سے ملیں گی۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ

اَلْکَوْثَرَ (108/1) چنانچہ ہجرت کے بعد کی زندگی میں یہ وعدہ حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

قرآن کریم میں ہے: اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (102/1) ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس تمہیں زندگی کے مقصد سے غافل کر دیتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مال و دولت زندگی کی زینت کا باعث ہیں (3/13)۔ اس لیے ان کے حصول کی خواہش کوئی بری بات نہیں۔ لیکن زندگی کا مقصد یہ قرار دے لینا کہ ہم زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹتے چلے جائیں تاکہ ہم دوسروں سے بڑھ جائیں اور ان کے مقابلہ میں فخر کر سکیں (57/20) بڑی پست سطح کی ذہنیت ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان میں اس قسم کی خواہش پیدا ہو جائے تو کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچ کر اس کی ہوس کی تسکین ہو جائے۔ انسان ساری عمر اس میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102/2) حتیٰ کہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ بھی معیوب نہیں لیکن اس کا میدان اور ہے۔ تم ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہو تو ذاتی جوہر اور نوع انسان کی عالمگیر بھلائیوں کے کام میں بڑھنے کی کوشش کرو جس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے (83/26)۔ مال، مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ حتیٰ کہ انسان کی پوری طبیعی زندگی ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means) ہے۔ بجائے خویش مقصد (End) نہیں۔ مال (یا طبیعی زندگی) کو مقصود بالذات اور زندگی کا منتہیٰ سمجھ لینا بڑی غلطی ہے۔ مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے ہوتی ہے۔ مال کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ رہنا چاہیے۔

ک د ح

قرآن کریم میں ہے: یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ (84/6) اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ ''جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہو جائے گا اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف خوش وخرم واپس آ جائے گا۔ لیکن جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا وہ ہلاکت کو پکارے گا۔''

اس آیت کا مفہوم دو طرح پر لیا جا سکتا ہے۔ کَدَحَ لِنَفْسِہٖ کے معنی ہیں ''اس نے اپنے لیے اچھے یا برے کام کیے۔'' اس اعتبار سے آیہ زیر نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان خواہ اچھے کام کرے خواہ برے ان کے نتائج اس کے سامنے آ کر رہیں گے۔ ''خدا کی ملاقات'' کے معنی اس کے قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہیں۔

لیکن اگر آیت کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ''اے انسان! تجھے اپنے رب کی طرف جانے کے لیے مشقتیں اٹھانی ہوں گی۔ انہیں برداشت کر کے پھر اپنے رب کے سامنے جا سکے گا۔'' تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کو بہر حال اپنی منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے رب نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ لیکن اس کے لیے اسے مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ اگر اس نے وحی کا

اتباع کیا تو مخالفین کی طرف سے اسے تکلیفیں پہنچیں گی۔ اور اگر اس نے وحی کا اتباع نہ کیا اور عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کیا تو اس سے اسے بڑی جگر پاش مشقتوں اور زخموں اور جراحتوں کے بعد وہاں تک پہنچنا نصیب ہوگا۔ اس کی مفاد پرستیاں اس کا رخ پیچھے کی طرف موڑیں گی اور زمانے کے تقاضے اسے آگے کی طرف کھینچیں گے۔ انسانیت کی تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ انسان رفتہ رفتہ اسی منزل کی طرف آ رہا ہے لیکن چونکہ اس نے وحی کے بجائے عقل کا تجرباتی طریق اختیار کر رکھا ہے اس لیے اسے اس کے لیے خون کے دریا پیرنے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑ رہی ہیں۔ غور کیجئے! کس قدر کشت وخون کے بعد اس کا ایک قدم صحیح منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ اگر یہ وحی کی سمت اختیار کرتا تو اس کا راستہ مقابلۃً آسان ہو جاتا۔

ک ذ ب

قرآن کریم نے سورۃ منافقون میں کہا ہے کہ (اے رسول) جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے۔ اس کے بعد ہے کہ خدا کو اس کا علم ہے کہ تو واقعی اس کا رسول ہے۔ لیکن وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (63/1) یہ منافق یقیناً کاذب ہیں۔ یہاں سے کِذْبٌ کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی کسی کی کوئی بات اگرچہ خارجی واقعہ کے عین مطابق ہو لیکن اگر اس میں اس کے دل اور زبان کی ہم آہنگی نہیں تو وہ کِذْبٌ ہے۔ اور اگر کسی معاملہ میں دل اور زبان ہم آہنگ ہیں لیکن وہ بات واقعہ کے خلاف ہے تو اسے کِذْبٌ نہیں کہیں گے۔ وہ بات اس کے عدمِ علم پر محمول کی جائے گی۔ یعنی یہ کہیں گے کہ اسے صحیح واقعہ کا علم نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم نے اس کی بھی سخت تاکید کی ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو (17/36)۔ اس لیے وہی بات زبان سے نکالنی چاہیے جس کے متعلق تحقیق کر لی جائے۔

وحی (قرآن کریم) اپنے ہر دعویٰ کو علم وبصیرت کی بنیادوں پر پیش کرتا ہے اور دلیل وبرہان سے اس کی تائید کرتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل وبرہان پیش کرو (2/112)۔ یہ ہے حقیقت تک پہنچنے کا صحیح طریقہ۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لے کہ مجھے فریقِ مقابل کے دعویٰ کو بہر حال جھٹلانا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ہے وہ تَکْذِیْبٌ جسے قرآن کریم نے سخت جرم قرار دیا ہے۔ علم وبصیرت کی بارگاہ میں اس سے بڑا جرم اور کون سا ہوگا؟

نیز تَکْذِیْبٌ یہ بھی ہے کہ انسان جس بات کی صداقت کا قائل ہو اور اس پر ایمان کا مدعی، اس کا عمل اس کے اس ایمان کی شہادت نہ دے۔ سورۃ الماعون میں دیکھئے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَرَءَیْتَ

الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107/1) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ اس کے بعد بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ یہ وہ نمازی ہیں جو صلوٰۃ کی غرض و غایت کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ جو اس کے ظاہری ارکان و حرکات کو ہی اصلِ صلوٰۃ سمجھے ہوئے ہیں اور رزق کے سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لیے کھلا رہنا چاہیے تھا، بند لگا کر روک لیتے ہیں (107/2-7)۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے ''تکذیب دین'' کون کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہ خود ہمارا شمار کن لوگوں میں ہے؟

ک ر ر

قرآن کریم میں کفار کی اس حسرت کو متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے کہ لَوۡ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً (2/167) اگر ایک مرتبہ زندگی کو پیچھے کی طرف لوٹا کر پھر وہی حالات پیدا کر دیئے جائیں تو ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔

لیکن اس کی نفی کی گئی ہے (39/58-59)۔ اس لیے کہ زندگی جوئے رواں ہے۔ اس کا جو پانی ایک مرتبہ آگے نکل گیا وہ پھر واپس نہیں آ سکتا۔ اِسی طرح دنیا کی اس اسٹیج پر کوئی فرد دوبارہ نہیں آ سکے گا۔ اس لیے تناسخ (آواگون، دنیا میں بار بار آنے) کا تصور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قانونِ ارتقاء میں اعادہ اور تکرار نہیں۔ یا آگے بڑھنا ہے (جسے جنت کہتے ہیں) یا ایک مقام پر رک جانا (جسے جہنم کہتے ہیں)۔

ک ر س

قرآن کریم میں ہے: وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ (2/255) خدا کی ''کرسی'' تمام کائنات کو محیط ہے۔ اس میں کُرۡسِیُّہُ کے معنی باعتبارِ لغت علم خداوندی ہیں۔ اگرچہ اسی کے معنی حکومت و اقتدار بھی ہو سکتے ہیں۔ ''علم'' کا مفہوم اس لیے قابلِ ترجیح ہے کہ اس سے پہلے یہ آیا ہے: وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ '' وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے مگر اس کے قانونِ مشیت کے مطابق۔''

سورۃ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کے تخت حکومت کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے (38/34)۔ اس میں بھی کُرۡسِیِّہٖ کے معنی تخت یا ''بیٹھنے کی جگہ'' کے نہیں بلکہ اقتدارِ حکومت ہے۔ ''تخت''، ''کرسی'' وغیرہ الفاظ، اقتدار اور منصب کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

ک ر م

عربوں کے ہاں اَلۡکَرِیۡمُ ایک ایسی جامع صفت ہے جس میں ہر قسم کی بھلائیاں، فضیلتیں اور شرف شامل ہیں۔ چنانچہ یہ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی مذموم صفت نہ پائی جاتی ہو۔ نیز الکریم کے معنی ہیں آزاد اور

شریف، نجیب، سخی، خوش نہاد، جو اپنے آپ کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھے۔ نرم خو، خلیق، وسیع الظرف، عمدہ حسب ونسب والا، پسندیدہ صفات کا مالک، باعزت۔

کسی شخص کو اس وقت تک کَرِیْمٌ نہیں کہا جاسکتا جب تک اس سے کَرَمٌ کا ظہور نہ ہو چکا ہو۔ مومنین کی صفات میں ہے: اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (25/72) جب کسی لایعنی اور لغو بات سے ان کا گزر ہو جائے تو وہ نہایت شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔ سورۃ علق میں خدا کو الْاَکْرَمُ (96/3) کہا گیا ہے۔ اسی کو ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِکْرَامِ (55/27) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

رِزْقٌ کَرِیْمٌ (8/4) رزقِ باشرف، عزت کی روزی، جنتی معاشرہ کے خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہاں رزق کریم ملے گا۔ یعنی سامانِ زیست بکثرت اور فراواں بھی اور عزت وتوقیر کے ساتھ بھی۔ کیسی خوش بخت ہے وہ قوم جسے رزق کریم میسر ہو۔ لیکن یہ نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے ہی سے مل سکتا ہے۔ (اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی)۔

قرآن کریم میں ہے: وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (17/70) ہم نے تمام فرزندان آدم کو صاحب کرم بنایا ہے۔ یعنی خدا نے ہر فرزند آدم کو محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے۔ تکریم آدمیت کا یہ اعلان عظیم سب سے پہلے قرآن کریم ہی کی طرف سے ہوا۔ یعنی ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے قابل احترام ہے۔ ہر فرد کو عزت وشرف کا یہ بنیادی حق (Fundamental Right) قرآن کریم کی بارگاہ سے عطا ہوا۔ یہ انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس کے بعد اس عزت وتکریم کے مدارج، جوہر ذاتی اور اعمال کریمانہ کے اعتبار سے قائم ہوتے ہیں۔ جو جتنا زیادہ قوانین الٰہیہ کی نگہداشت کرتا ہے اتنا ہی زیادہ واجب التکریم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (49/13) جو سب سے زیادہ ان قوانین کی نگہداشت کرتا ہے وہ سب سے زیادہ عزت وتکریم کا مستحق ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے! قرآن کریم نے جس طرح عزت وشرف کے پرانے معیاروں (حسب ونسب، مال ودولت وغیرہ) کو بدل کر ان کی جگہ احترام وتکریم کے نئے پیمانے دے دیئے جن کی رو سے ہر انسان بحیثیت انسان ہونے کے واجب الاحترام ہے اور جو جس قدر زیادہ قانونِ خداوندی کی پابندی کرتا ہے وہ اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوتا جاتا ہے، یعنی عزت کا معیار جوہر ذاتی قرار پا گیا نہ کہ اضافی نسبتیں۔ اسی ایک معیار سے بادشاہت، برہمنیت، پیشوائیت، سرمایہ داری کے تمام نظام کہن حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ یعنی ہر انسانی بچہ، خواہ وہ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو یا فقیر کے، برہمن کا بیٹا ہو یا چمار کا۔ انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔ اور باپ کی وجاہت یا عزت اسے دوسرے بچوں سے ممتاز نہیں کر سکتی۔ دوسروں کے مقابلہ میں اس کا زیادہ باعزت ہونا اس کے ذاتی جوہر اور عمل کی بنا پر ہوگا۔

کـره

قرآن کریم جس جماعت کے ہاتھوں آسمانی انقلاب کو لاتا ہے اس کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس انقلاب اور نظام کو اپنے دل کی مرضی سے (بلا جبر واکراہ) اپنی زندگی کا نصب العین بناتی ہے۔ لہٰذا اس کا اعلان یہ ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2/256) اس سوسائٹی کا ممبر بطیب خاطر بنا جاسکتا ہے، کسی قسم کے جبر واکراہ سے نہیں۔ رسول اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (10/99) کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں؟ اکراہ، طبعی (Physical) بھی ہوتا ہے۔ جیسے کسی کے گلے پر تلوار رکھ کر اس سے بات منوالی جائے۔ اور ذہنی بھی۔ جیسے کسی کو شعبدہ دکھا کر اس سے اپنی بات منوالی جائے۔

تیسری قسم کا اکراہ یہ ہے کہ معاشرہ میں جو روایات چلی آتی ہیں اور جو تصورات اور نظریات، معتقدات اور خیالات ہمیں اسلاف سے وراثتاً ملتے ہیں، انہیں ہماری تعلیم وتربیت کا جزو بنا کر دلوں میں راسخ کر دیا جائے، عام اس کے کہ انہیں خدا کی کتاب کی سند حاصل ہے یا نہیں۔ یا وہ علم وبصیرت اور عقل وفکر کے معیار پر بھی پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ یہ اکراہ کی سنگین ترین شکل ہے۔ غلط تعلیم وتربیت سے بڑھ کر شدید اکراہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ قرآنی جماعت میں داخل کرنے کے لیے کسی قسم کے اکراہ کی بھی اجازت نہیں۔ وہ ہر بات کو دلائل وبراہین سے پیش کرتا ہے اور دل ودماغ کے کامل اطمینان کے بعد منواتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس جماعت میں داخل ہونے پر کسی قسم کا جور واکراہ روا نہیں رکھا جاسکتا، اس میں سے نکلنے کے لیے بھی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگر آپ اس سے نکلنے کی راہ بند کر دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو جور واکراہ سے اس کے اندر رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ہاں جو سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے تو یہ چیز قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے اور نہ ہی اس شخص کو مسلمان رہنے پر مجبور کرتا ہے جس کا دِل اسلام پر مطمئن نہ ہو۔ ایمان نام ہی دل ودماغ کے کامل اطمینان اور رضامندی کا ہے۔

سورہ نحل میں ہے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (16/106) جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے انکار کرتا ہے تو یہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ لیکن ان میں وہ شخص شامل نہیں جس کا دل اطمینان پر مطمئن ہو لیکن اسے کفر (انکار) پر مجبور کر دیا جائے۔ کفر اُس کا کفر ہے جو اپنے سینے کی کشاد (دل کی پوری رضامندی) سے کفر اختیار کرے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر جور واکراہ سے کسی سے کفر کا اقرار کرا لینا اُسے کافر نہیں بنا دیتا، تو جور واکراہ سے کسی سے ایمان کا اقرار لے لینا، یا اسے اس مسلک پر رہنے پر مجبور کر دینا، اُسے کس طرح مومن بنا سکتا ہے۔ مومن وہی ہے جو بطیب خاطر قرآن کریم کی صداقتوں کا اقرار کرے اور پھر دل کی پوری رضامندی سے اس مسلک پر قائم

رہے۔ جہاں ذرا سا بھی جور واکراہ آیا، وہاں ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔قرآن کریم تو ان لوگوں کو بھی مومن قرار نہیں دیتا جو اسلامی مملکت کی شان وشوکت کو دیکھ کر (خود عہد نبویؐ میں) اسلام لائے تھے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم یوں کہو کہ ہم اس جدید نظام کے تابع فرمان ہوگئے ہیں (اَسْلَمْنَا)۔ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، کیونکہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوا (49/14)۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ جب ان کے سامنے (اورتو اور) خودآیاتِ خداوندی پیش کی جاتی ہیں، لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (25/73) تو ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ یعنی انہیں بھی آنکھیں کھول کر قبول کرتے ہیں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی شخص کو اسلامی نظام میں مجبوراً داخل نہیں کیا جاسکتا۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اس نظام میں بطیب خاطر داخل ہوگیا ہے تو اس کے بعد اسے اس کے احکام وقوانین کی اطاعت لازمی کرنا ہوگی۔ وہ جب تک اس نظام کا ممبر رہے گا اس کے قواعد وضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہوگی۔ اگر وہ ان کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو وہ اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائے گا۔لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کسی نظام یا سوسائٹی کا ممبر بھی رہے اور اس کے قواعد وضوابط میں سے جسے چاہے تسلیم کرے اور جسے چاہے مسترد کردے۔

ک س ل

اَلْكَسَلُ کسی ایسے کام میں واماندگی اور گرانباری کا اظہار کرنا جس میں گرانباری اور تکان کا اظہار کرنا نہیں چاہیے۔ اَلْكَسَلُ: روئی دھننے کی کمان کی تانت جو کمان سے الگ کردی گئی ہو۔ظاہر ہے کہ اُس وقت کمان اور تانت دونوں موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں باہمی رابطہ نہ رہنے سے روئی نہیں دھنی جاسکتی۔ دونوں بےکار ہوتی ہیں۔

اس مفہوم کو سامنے رکھیے اور پھر اس آیت پر غور کیجئے جس میں منافقت برتنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (4/142) نیز (9/54)۔ یہ نظامِ صلوٰۃ میں شریک تو ہوتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کمان الگ ہے اور تانت الگ۔یعنی ظاہری طور پر سب کچھ ہو رہا ہے لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا۔ یہ نقشہ، جسے ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ یہ ''رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے منافقین'' کی حالت کا بیان ہے، درحقیقت ہماری ہی حالت کا نقشہ ہے۔غور کیجئے کہ کیا ہماری نمازیں بے تانت کی کمان نہیں۔

ک ش ف

ہمارے ہاں جو کشف والہام کا عقیدہ ہے اس کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ختم نبوت کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی شخص خدا سے براہ راست ہمکلام ہوسکتا ہے اور براہ راست حقائق کا علم حاصل کرسکتا ہے، ختم نبوت کی مہر کو توڑ دینا ہے۔

اب انسانوں کے لیے علم کے سرچشمے صرف دو ہیں۔قرآن کریم (جو وحی پر مشتمل ہے) اور عقل انسانی۔

ک ظ م

سورہ آل عمران میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے: کٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ (3/133) عام طور پر اس کے معنی کیے جاتے ہیں غصہ کو دبانے والے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں۔قرآن کریم غصے کو دبانے (Suppression) کی تلقین نہیں کرتا۔اس کے صحیح مفہوم کے لیے کِظَامَۃٌ کے معنی سمجھ لینے ضروری ہیں۔جن زمینوں میں پانی کم ہو (جیسا کہ عرب کی سرزمین) وہاں ایک کنویں کے قریب ہی دوسرا کنواں کھود دیتے ہیں اور ان کنوؤں کے نیچے زمین دوز راستہ (Subterranean Channel) بنا دیتے ہیں جس سے ایک کنواں دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے۔اگر ایک کنویں میں پانی کم رہ جاتا ہے اور دوسرے میں زیادہ ہوتا ہے تو اس کا زائد پانی اس دوسرے کنویں کی طرف آ جاتا ہے۔اس زمین دوز نالی کو کِظَامَۃٌ کہتے ہیں۔لہٰذا الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی وجہ سے ان (مومنین) کی مشتعل ہونے والی قوتیں بڑھ جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان قوتوں کو وحشیوں کی طرف یونہی تخریب میں صرف کر دیں وہ انہیں دوسری طرف منتقل کر دیتے ہیں اور اس طرح ان سے تعمیری کام لیتے ہیں۔ اسے کِظَامَۃٌ کہا جائے گا۔ اسی کو دورِ حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) کی اصطلاح میں (Sublimation) کہتے ہیں۔یعنی زائد قوتوں کا دوسری طرف منتقل کر کے توازن قائم رکھنا۔توازن کے اعتبار سے ترازو کے اس حلقے کو بھی کِظَامَۃٌ کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کر کے باندھی جاتی ہیں۔نیز اس میخ کو بھی جس کے ساتھ ترازو کی زبان گھومتی ہے اور بتاتی ہے کہ دونوں پلڑوں میں سے کون سا بھاری ہے اور کون سا ہلکا ہے۔جب ان کا وزن برابر ہو جاتا ہے تو یہ زبان درمیان میں ٹھہر جاتی ہے۔نیز اَلۡکَظِیۡمَۃٌ توشہ دان کو کہتے ہیں جس میں زائد کھانا رکھ لیا جاتا ہے۔ لہٰذا الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ کے معنی ہیں زائد توانائیوں کو اس طرف منتقل کر کے جہاں ان کی ضرورت ہو، اپنی ذات اور معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے۔قرآنی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف افراد کی توانائیوں کا جائزہ لیتا رہے۔جہاں جہاں ان کی ضرورت ہے انہیں اس طرف منتقل کر کے، کظامت کے ذریعے معاشرہ کا توازن قائم رکھے اور معاملات میں درستگی پیدا کرتا رہے۔اس طرح ایک فرد کی ذات میں بھی توازن قائم رہے گا اور سارے معاشرے میں بھی۔ یوں جماعت مومنین الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ ہو جائے گی۔ واضح رہے کہ جس چیز کو معقول (Rational) کہا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صحیح معقولیت (Ratio) ہوتی ہے۔ جماعت مومنین چونکہ اپنی ذات اور معاشرہ میں صحیح صحیح توازن رکھتی ہے اس لیے اس کی ہر بات معقول (Rational) ہوتی ہے اور یہ معقولیت (Ratio) کظامت کے ذریعے برقرار رکھی جاتی ہے۔توازن یا تناسب معقولیت (Ratio) کے صحیح ہونے کا نام حسن ہے۔اسی سے قرآن کریم نے ''نیکیوں اور بھلائیوں'' کے لیے حسنات کا لفظ استعمال کیا ہے اور صفات خداوندی کو الاسماء الحسنٰی سے تعبیر کیا ہے۔

ک ف أ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے: وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (112/4) اس کے برابر، ہمسر، ہم پلہ کوئی نہیں۔ یہ چیز ذات (Personality) یعنی وجود کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ ہر شخصیت (Personality) منفرد (Individual) اور یگانہ (Unique) ہوتی ہے اور خدا کی ذات چونکہ مطلق اور مکمل ہے اس لیے اس کی انفرادیت بھی یکسر مکمل اور بے نظیر ہے۔ ''سورۃ اخلاص'' بالخصوص ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات (Characteristics) کی شارح ہے۔ اس میں احدیت، ذات کی یگانگت (Uniqueness) پر دلالت کرتی ہے۔ صمدیت اس کی آزادی (Freedom) کی شہادت دیتی ہے۔ عدم تولّد یہ بتاتا ہے کہ ذات، انسانی جسم کی طرح سلسلۂ تولّد و تناسل کی رو سے وجود میں نہیں آتی۔ اور کفواً اس کی انفرادیت (Individuality) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ک ف ر

قرآن کریم میں کُفۡرٌ بمقابلہ اِیۡمَانٌ متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً 2/4؛ 2/6 میں)۔ اور شُکۡرٌ کے مقابل بھی (14/7)۔ سورہ انبیاء میں مومن کے متعلق کہا ہے کہ فَلَا كُفۡرَانَ لِسَعۡيِهٖ (21/94) یعنی اس کی کوششوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وہ بے نتیجہ نہیں رہیں گی (اس لیے کہ شُکۡرٌ کے معنی ہیں کوششوں کے بھرپور نتائج مل جانا)۔ اسی طرح وَمَا يَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلَنۡ يُّكۡفَرُوۡهُ (3/114) کے بھی یہی معنی ہیں۔ یعنی ان کا ہر عمل خیر پورا پورا نتیجہ مرتب کرے گا۔

سورۂ بقرہ میں اِیۡمَانٌ بِاللّٰهِ کے مقابلہ میں كُفۡرٌ بِالطَّاغُوۡتِ کی تاکید آئی ہے (2/256)۔ اس کفر بالطاغوت کی تشریح دوسرے مقام پر وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ (16/36) کہہ کر کردی ہے۔ یعنی غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کرو۔ اس کی تفسیر سورۂ نساء میں ان الفاظ سے کردی کہ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَى الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِهٖ (4/60) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین سے کرائیں حالانکہ ان سے کہہ دیا گیا ہے وہ غیر خدائی قانون سے اجتناب کریں۔ ان سے انکار کردیں۔ کہہ دیں کہ ہم انہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

لہٰذا اِیۡمَانٌ بِاللّٰهِ (یا اللہ کی عبادت) کے معنی ہیں خدا کے قانون کے مطابق معاملات کے فیصلے کرنا اور كُفۡرٌ بِالطَّاغُوۡتِ کے معنی ہیں غیر خدائی قانون سے اجتناب کرنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور کفر محض اعتقادی چیزیں نہیں جو انسان کے ذہن تک محدود ہوں۔ ان کا تعلق زندگی کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ہے۔ قرآن کریم کے قانونِ صداقت کو تسلیم کرنا اور پھر اس کے مطابق زندگی کے معاملات کا فیصلہ کرنا ایمان ہے اور اس کے خلاف فیصلہ کرنا کفر ہے۔

سورۂ دہر میں ''جنت کی شراب'' کا مزاج كَافُوۡرًا بتایا گیا ہے (76/5)۔ یعنی جلد مشتعل ہوجانے والے جذبات میں

سکون پیدا کرنے والی۔ لیکن یہ انسانی ذات کی اصلاح کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ وہ ہے جس میں اس ''شراب'' کا مزاج زَنْجَبِيْلًا (76/17) بتایا گیا ہے۔ یعنی مناسب قوت اور حدت پیدا کرنے والی۔ برودت اور حدت (ٹھنڈک اور گرمی) کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے، سیرتِ مومن۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان علامہ اقبال

قرآن کریم کی رو سے کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں بلکہ ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان (Statement of Fact) ہے۔ آپ ایک پارٹی بناتے ہیں۔ جو لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں انہیں اس کا ممبر کہا جاتا ہے جو اس میں شامل نہیں ہوتے وہ غیر ممبر (Non-Members) کہلاتے ہیں۔ یہی فرق مومن اور کافر کا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ممبروں کو مومن کہا جاتا ہے اور جو اس معاشرہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیتے ہیں وہ ''نان ممبرز'' (کافر) ہوتے ہیں۔

ان ''غیر ممبروں'' (کافروں) کے متعلق جس جس عذاب (تباہیوں) کا ذکر آیا ہے وہ ان کے غلط روش کے نتائج ہوتے ہیں جسے وہ صحیح راستہ کے انکار سے اختیار کرتے ہیں۔ یعنی صحیح راستہ کی پیروی چھوڑ کر (2/38) غلط راستہ اختیار کر لینا (2/39) اور اس طرح تباہیوں میں گر جانا (2/39)۔ اس حقیقت کو ایک بار پھر سامنے لے آیئے کہ قرآن کریم نے کفر کا لفظ عملِ صالح کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے (30/44)۔ لہٰذا ایمان اور کفر صرف نظری (Theoretical) اعتقاد نہیں بلکہ عمل اور بے عملی (یا صحیح عمل اور غلط عمل) کا نام ہے۔ یہیں سے سورۃ البقرہ کی اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس کی مروّجہ ترجمہ اور غلط مفہوم سے طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی خواہش رکھتے ہیں، انہیں قرآن کریم صحیح روش کی طرف راہ نمائی دیتا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2/6) اس کا عام طور پر ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لیے برابر ہے چاہے تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔'' ''کافروں'' سے مراد لیے جاتے ہیں ''غیر مسلم''۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے، مسلمان نہیں ہوتے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلموں (کافروں) کو رسول کا انذار کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تو پھر رسالت اور تبلیغ ہے کن لوگوں کے لیے؟ مومنین کو اس کی ضرورت نہیں رہتی اور کافروں کو یہ کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ نیز جب نبی اکرم ﷺ نے انذار شروع کیا ہے تو اس وقت ساری دنیا ''کافر'' ہی تھی۔ اگر حضور ﷺ کا انذار کفار کے لیے بے سود تھا تو حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی (معاذ اللہ) کچھ نہیں تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں کفار سے مطلب سب غیر مسلم نہیں۔ یہ غیر مسلموں کے ایک مخصوص گروہ

کا نام ہے۔ جہاں تک ''غیر مسلموں'' کا تعلق ہے، افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم قبائلی باشندے، یا قطب شمالی کے اسکیمو، جنہوں نے ابھی تک اسلام یا قرآن کریم کا نام بھی نہیں سنا، وہ بھی غیر مسلم ہیں۔ لیکن ان کا شمار کفار کے زمرے میں نہیں ہوگا۔ کفر ایمان کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ایک شخص کے سامنے قرآن کریم کی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں، اسے ان کا مفہوم اور مطلب سمجھایا جاتا ہے۔ وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے اور اس کے بعد برضا و رغبت انہیں تسلیم کر لیتا ہے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا شخص ہے۔ اس کے سامنے بھی اسی طرح قرآنی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں لیکن وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے، اسے کافر کہیں گے۔ ان لوگوں کے انکار کی کئی وجوہات اور متعدد محرکات ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت پر اتر آتے ہیں، اس سے سرکشی برتتے ہیں۔ خود بھی اس راستے سے رُکتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہر غیر مسلم کافر نہیں ہوتا۔ کافر وہی ہوتا ہے جس کے سامنے حق کو پیش کیا جائے لیکن وہ تمام دلائل و براہین کے باوجود اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور پھر لاکھ کوشش کرو، وہ اپنی ضد پر اڑا رہے۔ کفار کی اس ذہنیت اور اس کے بعد حق کی مخالفت میں ان کی تگ و تاز کا ذکر، قرآن کریم نے متعدد مقامات میں کیا ہے۔

① حق اور صداقت (ہدایت) کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اس سے انکار کیے جانا کفر کہلاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے کفر اور ایمان کے امتیاز کا ذکر ہی حق کے سامنے آجانے کے بعد کیا ہے۔ سورہ کہف میں ہے: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18/29) ''اور (ان سے کہو کہ) حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کر لے۔'' سورہ دھر میں ہے: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76/3) ''ہم نے (انسان کو) راستہ دکھا دیا ہے۔ اب اس کا جی چاہے تو اس کا قدردان بن جائے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے۔'' سورۃ زخرف میں ہے: وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (43/30) ''اور جب حق ان کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ جھوٹ ہے اور ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔''

ان مقامات سے واضح ہے کہ حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اس سے انکار کرنا، کفر کہلاتا ہے۔ جن لوگوں کے سامنے حق آیا ہی نہیں وہ غلط راستے (ضلالت) پر تو ہیں لیکن انہیں کافر نہیں کہا جائے گا۔ ان کا شمار ضَآلِّيْنَ میں ہوگا۔ یعنی راہ گم کردہ، غلط راستے پر چلنے والے۔

② سورہ توبہ میں ایمان والوں سے کہا گیا ہے کہ کہ تم اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (9/23) اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں۔ اس سے واضح ہے کہ کفر اس انکار کی راہ کا نام ہے جسے انسان اپنی پسندیدگی سے اختیار کرے۔ اسی طرح سورہ النحل میں ہے کہ کفر اس کا ہے: مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ

صَدْرًا (16/106) ''جس کا سینہ کفر کے لیے کھل جائے۔'' لہٰذا کفر وہ ہے جسے انسان اپنے اختیار وارادہ (Choice) سے پسند کرے۔

③ اس قسم کے انکار کے کئی محرکات ہوتے ہیں۔ مثلاً اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ بَغْيًا ایسا کرتے ہیں (2/90)۔ یعنی ضد اور سرکشی کی بنا پر یا حَسَدًا ایسا کرتے ہیں (2/109)۔ عام مخالفین عرب کے متعلق ہے کہ وہ اس دعوت سے انکار کرتے تھے: اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ (35/42) ''تکبر کرتے ہوئے اور بری تدبیریں کرتے ہوئے۔'' یعنی انہوں نے ظلم اور استبداد اور دجل وفریب سے جو قوت اور دولت حاصل کر رکھی تھی وہ اس کے نشے میں بدمست ہو کر اسلام کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی۔ سورہ نمل میں ہے کہ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (27/14) ''انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی بنا پر ہمای آیات سے انکار کر دیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔''

④ بعض اوقات انسان محض بات کی پیچ میں حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک دفعہ منہ سے نہ نکل گئی تو پھر (محض اپنی بات پر جمے رہنے کی خاطر) نہ کرتے چلے گئے۔ سورہ اعراف میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ (7/101) ''اور یقیناً ان کے پاس رسول واضح دلائل لے کر آئے۔ مگر وہ ایسے نہ تھے کہ جس بات کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا، اس پر ایمان لے آتے۔'' اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (7/101)۔

⑤ یہ لوگ ضد، حسد، ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے بعد دوسروں کو بھی روکتے ہیں کہ وہ اسے تسلیم نہ کر لیں۔ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ (6/26) ''وہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں۔'' دوسری جگہ ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (47/32) ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔'' (وہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے)۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ''وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ'' وہ لوگوں کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ اس قرآن کریم کو مت سنو۔ وَالْغَوْا فِيْهِ اور (جہاں کہیں اس کا چرچا ہوتا ہو) اس میں شور مچاؤ، لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (41/26) شاید تم (اس طریق سے ان پر) غالب آسکو۔

یہی ہیں وہ لوگ کہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2/6) چاہے تو انہیں (ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کرے یا نہ کرے، ان کے لیے برابر ہے۔ یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لیے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سمجھنے، سوچنے، دیکھنے، سننے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی (2/7)۔ یہی وہ لوگ ہیں جن

کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7/179) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (7/179) ''ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اوران کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں اوران کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (یونہی شکل و صورت سے انسان نظر آتے ہیں ورنہ درحقیقت) حیوانات کی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ'' (کیونکہ وہ کم ازکم اپنی جبلت پر تو قائم رہتے ہیں)۔

سوال یہ ہے کہ یہ کفر کی زندگی ہے کیا؟ یہ حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جاچکی ہے کہ ایک تصور زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔کھایا، پیا، زندہ رہے، بچے پیدا کیے اور مر گئے۔اس کے بعد ختم۔دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسان، اسی طبیعی جسم کا نام نہیں جو موت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات (Personality) کہا جاتا ہے۔اس ذات کی نشوونما سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کرسکتا ہے۔موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔حیوانات کو ''ذات'' نہیں دی گئی۔یہ صرف انسانوں کا خاصہ ہے۔

پہلا تصور زندگی کفر ہے۔اس میں انسان حیوانات کی سطح پر رہتا ہے۔وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (47/12) ''جو لوگ کفر کی روش اختیار کرتے ہیں، وہ سامانِ زیست سے متمتع ہوتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھا پی کر (مرجاتے ہیں)، جہنم ان کا ٹھکانہ ہے۔'' یہ زندگی کی بلند اقدار پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ ان کی ضرورت تو صرف ذات کی نشوونما کے لیے ہوتی ہے)۔وہ اپنی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں، اوران جذبات میں ایسے ڈوبتے ہیں کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔سورہ الجاثیہ میں ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ''کیا تو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنالیا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ خدا کا قانون، اس کے علم کے باوجود، زندگی کی صحیح راہ اس کے سامنے نہیں لاتا۔وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (جذبات میں بہ جانے سے اس کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ) اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ۔اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے قانون کے علاوہ کوئی اور قانون صحیح راستے کی طرف راہ نمائی نہیں کرسکتا۔اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (45/23) کیا یہ لوگ اس سے نصیحت نہیں پکڑتے؟

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اس طرح جذبات کے پیچھے کیوں بہہ جاتے ہیں اور زندگی کی بلند اقدار کا اتباع کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا، اور کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔نَمُوْتُ وَنَحْيَا، ہم (طبیعی قوانین کے ماتحت) مرتے اور جیتے ہیں۔وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ، وقت گزرنے سے ہمارے قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں اور ہم مرجاتے ہیں۔یہ ہے ان کا تصور زندگی۔قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا

يَظُنُّوْنَ (45/24) انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں۔ یونہی اپنے قیاسات سے باتیں کرتے ہیں۔ اسی کا نام کفر ہے۔ یعنی انسان کا اپنی ذات سے انکار۔ اس انکار کے بعد نہ خدا پر ایمان کی ضرورت رہتی ہے نہ وحی اور رسالت پر۔ اور آخرت کی زندگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا کفر درحقیقت مادی تصورِ حیات کا دوسرا نام ہے۔ یعنی (Materialistic Concpet of Life)۔ اسی تصورِ زندگی کے ماتحت اپنے جذبات کی تسکین، اانسان کا منتہائے زندگی قرار پاجاتا ہے اور زندگی کی بلند اقدار یا غیر متبدل اصولوں کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جب انسان اس تصورِ زندگی کو عین حقیقت سمجھ لے تو جن امور سے بلند انسانی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے، اسے ان سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے۔ حیوان کو آپ کیا سمجھا سکتے ہیں کہ دیانتداری کی زندگی بہت بلند ہوتی ہے اور بددیانتی سے شرفِ انسانیت کا زیاں ہوجاتا ہے!

ک ف ی

قرآن کریم میں ہے: اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ (15/95) یہ لوگ جو تیرے خلاف شرارتیں کر کے خوش ہوتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں ہم ان کی مخالفت سے تیری مدافعت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ہمارا قانون جس پر تو چل رہا ہے ان کے مقابلہ میں تیری حفاظت بھی کرے گا اور تیرا مقصود بھی حاصل ہوجائے گا۔ انہی معنی میں ہے: فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ (2/137)۔ سورہ زمر میں ہے: اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (39/36) خدا کے احکام کی اطاعت کرنے والے (عبد) کو خدا کا قانون مکافات تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور اسے اس کی منزلِ مقصود تک بھی پہنچا دیتا ہے۔ اس کی تشریح اس سے اگلے ٹکڑے نے یہ کہہ کر کردی کہ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (39/36)۔ یہ لوگ تجھے غیر خدائی قوتوں سے ڈراتے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

یہ ہے قوانین خداوندی کے اتباع کی بنیادی خصوصیت۔ سورہ رعد میں ہے: كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (13/43) شہادت (یا نگرانی) کے لیے خدا کافی ہے۔ انسان کے لیے کس قدر اطمینان اور سکون کا موجب ہے یہ بات کہ اسے ایسا ضابطۂ زندگی [1] مل جائے جو اسے تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھے اور اسے اس کی منزل مقصود تک بھی پہنچا دے۔ اور اس طرح سے دنیا کی ہر آستاں سے مستغنی کر دے۔

ک ل ب

سورہ المائدہ میں ہے: وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (5/4) اور (تمہارے لیے

---

[1] مراد ہے قرآنِ حکیم۔ (منظور الحسن مرتب ومہذب)

حلال کیا گیا ہے) جوتم شکاری جانوروں کوشکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ۔تم ان کوسکھاتے ہواس (علم) کی رو سے جوتمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔

(ضمناً)اس آیت میں ایک چیز اور بھی غور طلب ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ تم شکاری جانوروں کو جو شکار کرنا سکھاتے ہوتو یہ اس علم کی رو سے ہے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔اب ظاہر ہے کہ اللہ نے یہ علم، شکاریوں کو خود نہیں سکھایا۔اس نے اس کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے۔اب جو انسان چاہے اس علم کو سیکھ لے۔اللہ نے اس کی نسبت اپنی طرف اس لیے کی ہے کہ اس علم کی تحصیل کی استعداد انسان کو اس نے دی ہے۔لہٰذا انسان جو کچھ اللہ کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کی رو سے کرتا ہے، اسے اللہ اپنی طرف بھی منسوب کر لیتا ہے۔اس نکتہ کے سمجھ لینے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جاتے ہیں۔

ک ل ف

قرآن کریم میں کئی ایک مقامات میں آیا ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2/286) اس کے عام معنی یہ ہیں کہ اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ پابند نہیں کرتا۔اس میں یہ سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ ایک فرد کی وسعت کی حد وہ ہوگی جس تک وہ اپنی انتہائی کوشش اور محنت کے بعد پہنچے۔یہ نہیں کہ انسان کسی حکم کی تعمیل میں پوری پوری کوشش نہ کرے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لے کہ مجھے اللہ اس سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا۔خدا انسان پر جو پابندیاں عائد کرتا ہے تو وہ اس لیے ہوتی ہیں کہ ان سے انسانی ذات میں وسعت اور کشاد پیدا ہو۔یعنی وہ پابندیاں اس کی آزادی سلب کرنے کے لیے نہیں ہوتیں، بلکہ اس کی ذات کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعتیں پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہیں، جس طرح نہر کی ٹھوکر (Fall) اس کے پانی کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

ک ل ل

اَلْكَلَالَةُ۔قرآن کریم میں احکامِ وراثت کے ضمن میں اَلْكَلَالَةُ کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ایک (4/12) میں اور دوسرا (4/12) میں۔مفسرین نے اس باب میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ کلالہ کسے کہتے ہیں۔(چونکہ احکامِ وراثت ایک فنی موضوع ہے اور ہم اس مقام پر اس کے متعلق تفصیلی گفتگو نہیں کر رہے اس لیے ہم ان بحثوں کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔مختصراً یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان میں سے) ایک گروہ کا خیال ہے (اور اکثریت اسی خیال کی حامل ہے) کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد۔باپ اور اولاد آدمی کی دونوں طرفین ہوتی ہیں۔جب آدمی مر جائے اور نہ باپ چھوڑے اور نہ اولاد تو وہ اس طرح مر گیا کہ اس کی دونوں طرفیں چلی گئیں، اسے کلالہ کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے چار لفظوں میں اس کی وضاحت کردی ہے کہ کَلَالَۃٌ کسے کہتے ہیں۔ سورہ نساء میں ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا... (4/176) ''اگر کوئی شخص مرجائے اس کی اولاد کوئی نہ ہو اور اس کی بہن ہو تو (اس کا حصہ یوں ہوگا)۔ اسی سورت کے شروع میں ہے۔ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ (4/12) ''اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو۔'' یعنی کلالہ ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی اولاد نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اس کا بھائی یا بہن ہو۔ والدین کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ اگر اس کے ماں باپ ہوں گے تو (4/12) کے مطابق ترکہ کی تقسیم اور طرح ہوگی اور اگر وہ نہ ہوں گے تو (4/178) کے مطابق تقسیم اور ہوگی۔

ک ل م

آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو نظریہ زندگی، تصور حیات یا آئیڈیالوجی (Ideology) کہا جاتا ہے اسے کلمۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے سورہ ابراہیم میں ہے: مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14/24) خوشگوار اور ثمر بار نظریہ زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سرسبز وشاداب درخت جس کی جڑیں مستحکم ہوں اور جس کی شاخیں فضا کی پنہائیوں میں جھوم رہی ہوں۔

عیسائیت میں كَلِمَةٌ (Word) یا (Logos) ایک خاص اصطلاح ہے جس کے گرد (حضرت) عیسیٰؑ کی ابنیت اور الوہیت کا تمام فلسفہ گردش کرتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی دوراز کار فلسفیانہ بحثوں میں نہیں الجھتا۔

سورہ یونس میں ہے: كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (10/33) اس طرح تیرے رب کی بات ان پر صادق آ گئی۔ ان مقامات میں خدا کے كَلِمَةً سے سیدھے سادے معنی ''خدا کی بات'' ہی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا کی بات سے مراد خدا کا قانون ہے۔ چنانچہ یہ لفظ قانونِ خداوندی' کے معنوں میں عام طور پر استعمال ہوا ہے۔ قوانین خداوندی کا ایک حصہ خارجی کائنات میں نافذ العمل ہے۔ انہیں (Laws of Nature) کہا جاتا ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6/116) قوانین خداوندی صدق وعدل کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گئے۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6/116)۔ اس سے ختم نبوت لازم آتی ہے۔ یعنی جب ضابطہ خداوندی کی تکمیل ہوگئی اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تو کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ مومن فرد یا جماعت جن حدود وقیود (خدا کے قوانین واصول) کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے پر مکلف ہے، ان حدود کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہی حدود اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی بھی متعین کرتی ہیں۔ انہیں مملکت بھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے وہ آزاد ہوتی ہے کہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنے معاملات باہمی مشاورت

سے طے کرے۔

ک ھ ل

سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے: وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا (3/45) کم عمری میں بھی اور پوری عمر کو پہنچ کر لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ابتدائی عمر ہی سے معاشرہ کی خرابیوں کے خلاف باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ ویسے بھی (تاریخ بتاتی ہے کہ) انہیں نبوت مقابلۃً کم عمر میں مل گئی تھی (یعنی قریب تیس سال کی عمر میں) لیکن قرآن کریم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ كَهْلًا کہہ کر قرآن کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ انہیں اکتیس یا بتیس برس کی عمر میں صلیب دی گئی اور وہ (یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق) صلیب پر وفات پا گئے یا (عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق) آسمان پر چلے گئے، تو یہ صحیح نہیں۔ وہ ادھیڑ عمر [1] تک لوگوں کے درمیان رہے اور ان سے باتیں کرتے رہے۔

ک ھ ن

چونکہ عرب مقام نبوت کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ رسول اکرم ﷺ کو کاہن، شاعر اور مجنون کہا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے اور کہا کہ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (52/29) تو خدا کے فضل و احسان سے کاہن اور مجنون نہیں (نبی کے معنی بھی پیش گوئیاں کرنے والا نہیں بلکہ ایسا شخص ہے جو مقامِ بلند پر کھڑا ہو)۔ لیکن اب ہمارے ہاں پیشگوئیاں کرنے والوں کو مقربین بارگاہِ خداوندی سمجھا جاتا ہے۔ کس قدر غیر قرآنی ہیں ہمارے نظریات و معتقدات؟

ک و د

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے اور اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا تو اس سلسلہ میں فرمایا: اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (20/15)۔ اس میں اَكَادُ اُخْفِيْهَا کا ٹکڑا غور طلب ہے۔ کاد کے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اسے مخفی رکھنا چاہا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ظہورِ نتائج کے وقت (اَلسَّاعَةُ) کو اس انداز سے رکھا ہے کہ وہ عام طور پر اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہتا

---

[1] (Age of Superannuation) پیرانہ سالی یعنی کہولت کی عمر۔

ہے۔لیکن جولوگ [1] علم وبصیرت سے کام لیں وہ اس آنے والی گھڑی کا پہلے سے اندازہ کرسکتے ہیں۔ نیز خدا کے کائناتی قانون کی رو سے ایسے حالات بھی پیدا ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ گھڑی بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ اَکَادُ اُخْفِیْھَا کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اسے اس انداز سے رکھا ہے کہ مخفی بھی ہے اور مشہود بھی ہے۔

ل أ ل أ

سورہ حج میں جنتی معاشرہ کے اسبابِ زینت میں لُؤْلُؤًا (22/23) بھی آیا ہے۔ سونے کے کڑے، موتی، ریشم کا لباس، یعنی سرداریوں اور سرفرازیوں کے تمام نشان وسامان۔ یہ ہے جنتی معاشرہ کے سامانِ زینت واسبابِ آرائش وزیبائش۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں قوت وسطوت اور آسائش وآرائش کے تمام سامان بافراط موجود ہوں اور ان کی تقسیم اور استعمال قوانین خداوندی کے مطابق ہو۔

ل ب ب

لَبَّیْكَ۔ میں آپ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہوں۔ میں آپ کی اطاعت پر قائم ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دَارِیْ تَلُبُّ دَارَہٗ سے ماخوذ ہے۔ یعنی میرا گھر اس کے گھر کے سامنے ہے۔ لہٰذا لَبَّیْكَ کے معنی ہیں میرا رخ آپ کی طرف ہے۔ لُبّ تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو آمیزش سے پاک ہو۔ (یعنی جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو، جو جذبات کے تابع نہ چلے)۔

قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ (3/189)۔ کو خاص امتیاز کا حامل قرار دیا ہے اور ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ وہ صاحبانِ عقل وبصیرت ہیں جو عقل کو جذبات کی لونڈی بنانے کے بجائے اُس سے وحی کی روشنی میں کام لیتے ہیں۔ اس طرح یہ عقل، عقل خود بیں کے بجائے عقلِ جہاں بین بن جاتی ہے۔ عقلِ خود بیں انسان کو صرف اس کے انفرادی مفاد کے حصول کی راہیں بتاتی ہے اور عقلِ جہاں بیں اُسے نوع انسانی کی ربوبیت عامہ پر آمادہ کرتی ہے۔ اِسی لیے قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ کے بعد کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ۔۔۔ (3/189-90) یعنی وہ صاحبانِ عقل بصیرت جو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا، یہ ہے مومن کا شعارِ زندگی ان میں سے اگر ایک چیز کی بھی کمی ہوتو وہ مومن نہیں کہلاسکتا۔

ل ب ث

مخالفین عرب، نبی اکرم ﷺ سے آپ کے دعوائے نبوت کی دلیل مانگتے۔ یعنی وہ کہتے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ

---

[1] حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اِس کا مرے آئینۂ ادارک میں ہے (علامہ اقبالؒ)

آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں اس کے جواب میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10/16)۔ میں نے (دعوائے نبوت سے) قبل، تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی زندگی ایک سچے انسان کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟ تم اگر عقل وخرد سے کام لو تو میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت بن کر تمہارے سامنے آجائے۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔

غور کیجئے کہ کس قدر زبردست ہے یہ شہادت جسے نبی اکرم ﷺ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ ایسی شہادت کہ اس کے خلاف کوئی ایک حرف نہیں کہہ سکتا۔ سچے کی نشانی یہ ہے کہ وہ (دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ) مخالفین کے بھرے مجمع میں پوری جرأت سے کہہ سکے کہ میری زندگی میری صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ل ح د

سورۃ الاعراف میں ہے: الَّذِيۡنَ يُلۡحِدُوۡنَ فِىۡۤ اَسۡمَآٮِٕهٖ (7/180) جو لوگ صفاتِ خداوندی کے بارے میں اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف کو جھک جاتے ہیں (جیسے عیسائی کہ انہوں نے خدا کو صرف رحم کا پیکر تصور کر لیا اور اس کے قانونِ مکافات سے الگ ہٹ گئے) اسی کا نام غلو فی الدین ہے (4/171)۔ سورہ الاعراف کی یہ آیت ایک عظیم حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے۔ یعنی تمام صفات پورے اعتدال اور تناسب کے ساتھ، اللہ کے لیے ہیں، اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو اور جو لوگ اس کی صفات میں (اعتدال سے ہٹ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، انہیں چھوڑ دو، انہیں ان کی غلط روش کا نتیجہ بہت جلد مل جائے گا۔

خدا کی ذات تمام صفات کی حامل ہے، اور وہ صفات انتہائی اعتدال اور تناسب کے ساتھ اس میں جمع ہیں۔ تم ان صفات کو خود اپنی ذات میں اجاگر کرتے جاؤ لیکن اس اعتدال وتناسب کے ساتھ۔ جو لوگ صفاتِ خداوندی کے تو قائل ہیں لیکن ان میں اعتدال اور تناسب کو ملحوظ نہیں رکھتے، وہ ملحد ہیں۔ تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی اس غلط روش کا نتیجہ ان کے سامنے آجائے گا۔ تم ان کی پیروی نہ کرنا۔

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سامنے لایا گیا ہے۔ مُلحد وہ نہیں جو خدا کی ذات یا اس کی صفات کا منکر ہے۔ مُلحد وہ ہے جو انہیں مانتا ہے لیکن کسی ایک صفت میں افراط سے کام لیکر تناسب کو بگاڑ دیتا ہے۔ یہ غلط روش ہے۔ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ صفات ہوں یا قوانین (41/40)۔ دونوں میں پورے پورے تناسب کو قائم رکھا جائے۔

لَدُنۡ (لَدَىٰ)

ہمارے ہاں (تصوف میں) ''علمِ لدنی'' کی ایک اصطلاح رائج ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ علم جو کوئی شخص براہ

راست خدا سے حاصل کرے مفہوم اس سے کشف یا الہام ہوتا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد الہام یا کشف کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اب انسان جو علم خدا سے براہ راست حاصل کرتا ہے وہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا۔ خدا سے براہ راست علم کا نام وحی ہے جس کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ پر ختم ہو گیا۔

ل س ن

قرآن کریم نے اختلافِ الوان والسنہ کو خدا کی نشانیاں قرار دیا ہے (30/22)۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ تو ایک مدت سے جاری تھا لیکن ہمارے زمانہ میں (Language) نے زبان سے آگے بڑھ کر فلسفہ کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے، جسے (Ernst Cassirer) کے الفاظ میں (The Philosophy of Symbolic Forms) کہا جاتا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے ''زبان'' کے متعلق عجیب وغریب حقائق منکشف ہو رہے ہیں۔ علاوہ بریں، ڈاکٹر بک (Bucke) نے اپنی کتاب (The Cosmic Consciousness) میں زبانوں کے تجزیہ سے قوموں کی تہذیب وثقافت کے متعلق جو اصول بیان کئے ہیں ان سے بھی یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اختلافِ السنہ کسی طرح اٰيَةٌ مِنۡ اٰيَاتِ اللّٰهِ ہے۔ ابھی ان علوم کی ابتدا ہے۔ جب ان کی تحقیقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو پھر قرآن کریم کے یہ حقائق اور بھی اُبھر کر سامنے آجائیں گے۔

ل ع ب

لَعِبَ بِنَا الْمَوْجُ اس وقت کہتے ہیں جب موجیں کشتی کو منزلِ مقصود کی طرف نہ لے جائیں۔ اس بنا پر لَعِبٌ کے معنی یہ ہوں گے کہ حرکت تو ہو لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ قدم تو اٹھیں لیکن منزل قریب نہ آئے۔ بلا مقصد کام، بلا نتیجہ عمل۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کو هُزُوًا وَّلَعِبًا (5/57) لیتے ہیں انہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ یعنی جو اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لیتے۔ سورہ انعام میں ہے ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ (6/92) ''تو انہیں چھوڑ دے کہ یہ اپنی بیہودہ باتوں سے (زندگی سے) کھیلتے رہیں''۔ یہ ان لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ اسے مذاق قرار دے رکھا ہے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ انسان ہمیشہ مستقبل پر نگاہ رکھے۔ مستقبل کے اندر بہت سی باتیں آجاتی ہیں۔ اس زندگی میں عیشِ امروز کی بجائے فکرِ فردا، آنے والی نسلوں کے مفاد کا خیال، پوری نوعِ انسانی کی بہبود کی فکر اور اس زندگی کے بعد مستقبل کی زندگی کا خیال۔ طبیعی زندگی کے مفادِ عاجلہ کے مقابلہ میں بلند اقدار کا تحفظ۔ اس کے برعکس دوسری روش یہ ہے کہ انسان مستقبل کی کچھ پروا نہ کرے اور اپنی ساری توجہ طبیعی زندگی کے پیش پا اُفتادہ مفاد اور عیشِ امروز پر رکھے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ روش زندگی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ

وَّلَهۡوٌ (6/32)۔اپنی تمام تگ وتاز کوطبیعی زندگی کی آسائشوں کی نذر کر دینا، بے مقصد زندگی ہے وَلَلدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ (6/32)۔ جولوگ تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ مستقبل کی زندگی کا مفاد ہی اس قابل ہے کہ اس کے حصول کے لیے کوشش کی جائے۔لَهۡوٌ اس بات کو کہتے ہیں کہ جوانسان کی توجہ کواس چیز کی طرف سے ہٹا کر جو اس کے لیے ضروری ہے اُس چیز کی طرف منعطف کرا دے جو غیر ضروری اور بے مقصد ہے۔ ان آیات سے (جن میں اَلۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَآ کولہو ولعب کہا گیا ہے) یہ مرادنہیں کہ قرآن کریم دنیاوی زندگی کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کی خوشگواریوں کے حصول اور کائناتی قوتوں کی تسخیر کومومن کی زندگی کی خصوصیت قرار دیتا ہے ان آیات کا مفہوم وہی ہے جواوپر بیان ہوا ہے۔یعنی اپنی نگاہ کومستقبل کے مفاد سے ہٹا کر مفاد عاجلہ اورفوری عیش پر مبذول کر لینا۔ زندگی کومحض طبیعی زندگی سمجھنااور حیوانی سطح پر جینا۔ جب طبعی زندگی کے کسی مفاد اور بلند انسانی قدر میں تصادم ہوتو بلند قدر کوطبیعی مفاد پرقربان کر دینا۔ یہ روش غلط ہے۔ جوقومیں مستقبل کی پرواہ نہیں کرتیں وہ برباد ہوجاتی ہیں۔ یہی حالت افراد کی ہے۔قرآن کریم ہمیشہ مستقبل کے مفاد کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیاوی مفاد ضرور حاصل کرو۔طبیعی زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع ہو۔لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ اس قسم کی خوشگواریوں میں اور کسی بلند انسانی قدر میں (جووحی کے ذریعے ملتی ہے)(Tie) پڑ جائے تصادم ہوجائے۔تو اس وقت بلند قدر کے تحفظ کی خاطر طبیعی زندگی کے مفاد کوقربان کر دینا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کرو گےتو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم انسانی زندگی کومحض مذاق سمجھ رہے ہو۔

لہٰذا کائنات اور انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کو ہمیشہ (Seriously) سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ مذاق نہیں سمجھنا چاہیے۔اور اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے۔قرآن کریم نے انسانی زندگی اور کائنات کوحقیقت (Reality) قرار دے کر انسان کے سامنے ایک عظیم پروگرام رکھ دیا ہے۔ اس سے افلاطون (Plato) کا وہ طلسم بھی یکسر ٹوٹ گیا جس کی رو سے اس کائنات کومحض فریب سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے ٹوٹنے سے ویدانت (ہندی تصوف) خانقاہیت اور تصوف کی عمارت بھی نیچے آگری۔ دوسری طرف مغرب کے نظریہ مادیت (Materialism) کا بھی بطلان کر دیا جس کی رو سے زندگی محض طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور بس۔

ل ع ن

لَعَنَ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا۔ خدا کی طرف سے لعنت سے مراد یہ ہوگی کہ انسان زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگیا۔ظاہر ہے کہ یہ محرومی قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہوگی۔ اس لیے لَعۡنَتٌ کے معنی ہوں گے قانونِ مکافات کی رو سے زندگی کی شادابیوں سے محروم ہوجانا۔

دور رکھنے کے اعتبار سے اَللّٰعِنُوْنَ (Scare - Crow) کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ لکڑیاں سی جنہیں انسانی لباس پہنا کر کھیتوں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ پرندے فصل سے دور رہیں اور اسے خراب نہ کریں۔ قرآن کریم نے ابلیس کے متعلق پہلے کہا ہے: فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (15/34) اور اس کے بعد ہے: اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ (15/35)۔ رَجْمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو دور پھینک دینا۔ اس سے بھی لعنت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم قرآنی تعلیم سے کبھی اثر پذیر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں۔ قرآن کریم نے کہا کہ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (2/88)۔ نہیں! بات یہ نہیں جو وہ کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنے انکار و سرکشی کی وجہ سے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوا ہے۔ لہٰذا جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں خدا کافروں پر ''لعنتیں'' برساتا ہے تو انہوں نے لَعْنَتٌ کے قرآنی مفہوم کو نہیں سمجھا۔ خدا (معاذ اللہ) گالیاں نہیں دیا کرتا۔ اس سے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا بیان مقصود ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص غلط راہوں پر چلتا ہے وہ زندگی کی انسانیت ساز خوشگواریوں سے دور ہٹ جاتا ہے۔ ان سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس کے غلط اعمال کے اس نتیجہ کو لعنت کہتے ہیں اور ایسے شخص (یا قوم) کو ملعون۔

ل غ و

قرآن کریم میں ایک جگہ کفار کے متعلق ہے کہ وہ اپنے ہم مشربوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ۔ اس قرآن کریم کو مت مانو۔ وَ الْغَوْا فِيْهِ: جہاں قرآن کریم کی آواز بلند ہو تم شور مچا دو۔ بے معنی باتیں کرنے لگ جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (41/26)۔ شاید اس طرح تم قرآن والوں پر غالب آ جاؤ۔ حیرت ہے کہ جو مسلک کفار کا تھا مسلمانوں کو بھی آج کل اس کی تلقین کی جاتی ہے ان سے کہا جاتا ہے کہ جہاں سے تمہیں یہ آواز سنائی دے کہ قرآن کریم کی طرف آؤ۔ تم اس کی بات مت سنو، بلکہ شور مچا دو کہ کوئی اور بھی یہ آواز نہ سننے پائے۔ یہ طریقہ ہے جس سے تم لوگوں پر غالب آ جاؤ گے۔ اس لیے کہ اگر لوگوں نے قرآن کریم کی آواز سن لی تو وہ پھر تمہارے خود ساختہ مذہب سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکیں گے۔

لہٰذا ہر وہ بات، وہ عمل، وہ تصور، وہ نظریہ، وہ عقیدہ جو انسان کو قرآن کریم سے دور رکھے لَغْوٌ ہے۔ یہی وہ لغویات ہیں جن میں ہم صدیوں سے الجھے آ رہے ہیں۔ جب تک ہم اپنے دل و دماغ کو ان لغویات سے پاک اور صاف نہیں کر لیں گے، دینِ خالص تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

ل ف ظ

لَفْظٌ منہ سے نکلی ہوئی آواز۔ چونکہ اس میں آواز کا ہونا ضروری ہے اس لیے لَفْظُ اللّٰهِ نہیں کہتے بلکہ كَلِمَةُ اللّٰهِ کہتے

ہیں۔

ل ق ب

قرآن کریم میں ہے: وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (49/11) ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھا کرو۔

ل ق ف

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے ''عصا'' کے متعلق ہے: فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ (7/117) وہ فریق مقابل کے باطل (دلائل) کو یونہی نگل گیا۔ وہ دلیلیں اس کے سامنے نہ ٹھہر سکیں۔ اس نے انہیں ہاتھ بڑھ کر اُچک لیا۔ ساحرین نے جو کچھ جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا (ڈھونگ رچا رکھا تھا) اس نے اسے تیزی سے اُچک لیا۔ ساحرین کے جھوٹ موٹ کے ''سانپوں'' کو موسیٰؑ کا ''اژدھا'' جھٹ سے نگل گیا۔

ل ق ی

يَوْمَ التَّلَاقِ (40/15) کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنے کا دن۔ یعنی جب اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجائیں۔ سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ہرکارے کو اپنا خط دیا اور کہا: فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ (27/28) ''یہ خط ان کے سامنے ڈال دے۔'' یعنی (Deliver) کردے۔ اس کے بعد ملکۂ سبا کا قول ہے: اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (27/29) ''میری طرف ایک باعزت خط [1] بھیجا گیا ہے۔''

سورۃ کہف میں ہے کہ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18/110)۔ اس کے معنی ہیں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا کا (قانون یا) نظام ربوبیت، محسوس شکل میں اس کے سامنے آجائے تو اسے چاہیے کہ وہ (قانون خداوندی کے متعین کردہ) صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس قانون کے مطابق صرف میں لائے اور اس میں کسی اور جذبہ یا مفاد پرستی کی کشش کو شریک نہ ہونے دے۔ لہٰذا لِقَاءِ رَبِّ کے معنی ہیں خدا کے نظام ربوبیت کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ یا قانونِ خداوندی کی رُو سے انسانی اعمال کے نتائج کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ نیز انسان کا ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے خدا کے قانونِ مکافات کے سامنے جواب دہ ہے۔ لِقَاءِ رَبِّ سے انکار (کفر) کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے عملی پہلوؤں میں قانونِ خداوندی کا سامنا کرنے سے گریز کی راہیں نکالے۔ اس کا سامنا کرنے سے کترائے اور قانون مکافات کے سامنے

---

[1] اس آیت سے یہ مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا طرزِ تحریر انتہائی باوقار اور شائستہ ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص ہمارے حسنِ رقم سے متاثر ہو، جیسا کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو خط لکھا تو وہ مطالعہ کرنے کے بعد اثر پذیر ہوئیں۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

جواب دہی سے انکار کرے۔ واضح رہے کہ قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اوراس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس لیے ان معانی میں لِقَاءِ رَبِّ یہاں بھی ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ جہاں تک اُس لِقَاءِ رَبِّ کا تعلق ہے جس میں خدا کے قانون ربوبیت کومشہود طور پر دیکھا جاتا ہے، اس کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم نظام کائنات پر غور کرو، اس میں ریسرچ کرو، اس کے نظم ونسق کوسمجھو۔ اس سے یہ قانون اور نظام تمہارے سامنے آجائے گا (دیکھئے 13/2)۔ لیکن ایسا وہی کر سکے گا جو پیش پا اُفتادہ مفاد ہی کومقصودِ زندگی نہ سمجھ لے (10/6-7)۔ ایسے لوگ خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے محروم رہ جاتے ہیں (29/23)۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا چاہیے کہ لِقَاءِ رَبِّ سے مراد نظام کائنات میں خدا کے قانون ربوبیت کو بے نقاب دیکھنا ہے۔ یا اس کے قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج کو اپنے سامنے دیکھنا (خواہ اس زندگی میں ہو یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ بعض لوگ ''لِقَاءِ رَبِّ'' سے متعلق آیات سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ آخرت میں اِنسان کو خدا کا دیدار ہوگا۔ یعنی وہ اور خدا ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں گے۔ ہم اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ نہ تو خدا کی ذات مادی ہے اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ حیات اُخروی میں انسانی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس لیے یہ تصور کرنا کہ اُس زندگی میں انسان اور خدا اس طرح آمنے سامنے ہوں گے جس طرح یہاں دو انسان ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں، غلط ہوگا۔ اگر وہاں ''لِقَاءِ رَبِّ'' ہوگا تو ہم نہیں کہ سکتے کہ اس کی کیفیت کیا ہوگا۔

ہمارے ہاں عام طور پر ''بزرگوں'' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فلاں بات کو خدا نے ان کی طرف ''اِلقا کیا'' اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس بات کا علم انہیں خدا کی طرف سے بذریعہ الہام ہوا۔ یعنی انہوں نے اپنے علم وعقل سے اسے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ علم انہیں براہ راست خدا کی طرف سے عطا ہوا اسی کو الہام یا کشف کہا جاتا ہے جس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ خدا کی طرف سے براہ راست علم صرف وحی کے ذریعے ملتا تھا جس کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اب وہ علم قرآن کریم کے اندر ہے۔ اب یہ کہنا کہ کسی کو خدا کی طرف سے الہام یا القا ہوتا ہے مہر نبوت کو توڑنا ہے۔

واضح رہے کہ یہ جو ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ فلاں کام کرو، تو اس کا تعلق وحی، الہام، القا وغیرہ سے کچھ نہیں۔ یہ انسان کے نفس لاشعور (Un Conscious Mind) کا عمل ہوتا ہے جس کے متعلق ہمارے زمانے میں تحقیقات کے نئے باب کھل رہے ہیں۔ وحی کی نوعیت اِس سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ وہ ایک یقینی علم ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے نبی کو براہ راست ملتا تھا۔

ل م ز

سورہ حجرات میں ہے: لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (49/11) آپس میں ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو، مذاق نہ اڑاوَ۔

سورہ ہمزہ میں وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (104/1) آیا ہے۔ کچوکے لگانے والے، عیب تراشنے والے (تاکہ جماعت میں انتشار پیدا ہو)۔

ل م م

سورہ فجر میں ہے: التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (89/19)۔ تم اس مال کو جو تمہیں میراث میں ملتا ہے سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے ہو؟ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی نظامِ معیشت میں میراث انفرادی چیز نہیں رہتی۔ قرآن کریم میں وراثت کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جن میں نظام قرآنی ابھی مکمل طور پر قائم نہ ہوا ہو۔ اس نظام کی تشکیل کے بعد فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی اس لیے ترکہ میں مال اور جائداد چھوڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ترکہ سے مختلف وارثوں کا حق نہیں دیتے۔ سارے کا سارا خود ہی کھا جاتے ہو۔ اس صورت میں یہ آیات اس دور سے متعلق ہوگی جس میں میراث اور اس کی تقسیم کا ہنوز عمل جاری ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اسلامی نظام بھی بعض حالات میں اس عمل کو جاری رکھے نیز مال و دولت اور جائداد کے علاوہ عام مستعملہ اشیاء بھی تو ترکہ میں آسکتی ہیں۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے: اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (53/32)۔ وہ لوگ بڑی بڑی لغزشوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں، بجز اُن غلطیوں کے جو انسان سے کبھی کبھار بلا ارادہ سرزد ہو جائیں۔ ایسی غلطیاں معصیت نہیں ہوتیں لیکن معصیت کے قریب ضرور لے جاتی ہیں۔ اس لیے ان کی بابت بھی احتیاط برتنی چاہیے کہ بار بار ایسا نہ ہو غور کیجئے قرآن، نفسیاتی اصلاح کے لیے کس قدر تدریجی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ ایک دم سختی نہیں کر دیتا۔

ل ھ م

قرآن کریم میں نفس انسانی کے متعلق ہے: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (91/8)۔ اس کے عام طور پر یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ اللہ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی بدی، خیر اور شر، حق اور باطل کی تمیز کی استعداد رکھ دی ہے۔ یہ معنی بوجوہ غلط ہیں۔ کائنات میں انسان کے علاوہ، ہر شے کو بطور جبلت (Instinct) اس راستے کی راہنمائی عطا کر دی گئی ہے جس پر اسے چلنا ہے۔ پانی کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ بکری کی جبلّت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت سے پرہیز کرے۔ اگر اسی طرح انسان کے اندر بھی خیر و شر کی تمیز رکھ دی جاتی تو ہر انسان ایک ہی راستے پر چلتا۔ (جس طرح ہر بکری گھاس ہی کھاتی ہے۔ اور اس میں اس کے اختیار اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صورتِ حال ایسی نہیں۔ ہر انسان ایک ہی راستہ پر نہیں چلتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کی تمیز انسان کی فطرت کے

اندر داخل نہیں کی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تمیز انسان کی فطرت کے اندر تو ہے لیکن ماحول اور تعلیم کا اثر اس کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور انسان وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ اسے اس کے ماں باپ یا معاشرہ بنا دے۔ اگر انسان پر یہ خارجی اثرات نہ ہوتے تو ہر بچہ حق کے راستے پر از خود چلتا۔ یہ بھی غلط ہے۔ ایسے بچے پائے گئے ہیں جو پیدائش کے ساتھ ہی (کسی حادثے کی وجہ سے) انسانوں کی بستیوں سے الگ ہو کر جنگل میں چلے گئے اور وہاں ان کی پرورش انسانی اثرات سے یکسر دور رہ کر ہوئی۔ لیکن جب وہ بڑے ہوئے تو بالکل جانور تھے۔ حق اور باطل کی تمیز تو ایک طرف، ان میں کھانے پینے کے معاملہ میں بھی انسانی بچوں کی سی تمیز نہ تھی۔ لہٰذا یہ تصور صحیح نہیں کہ خیر وشر کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر رکھ دی گئی ہے۔

اس آیت (91/8) کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس کے اندر وہ قوتیں بھی رکھ دی گئی ہے ہیں جن سے انسانی ذات (Personality) ٹکڑے ٹکڑے (Disintegrate) ہو جاتی ہے۔ اور وہ قوتیں بھی جن کی رو سے یہ انتشار (Disintegrate) سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا کی ''ھا'' خود اس کی دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں ''نفس'' کی کیفیات ہیں۔ اس لیے اس کے معنی یہی ہیں کہ نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ ہر دو ممکنات رکھ دیئے گئے ہیں اس کے بعد، یہ انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمر قوتوں (Latent Faculties) کو نشوونما دیکر انہیں کس راستے میں صرف کرتا ہے۔ وہ ان سے اپنی ذات کی نشوونما کا کام لیتا ہے یا اس کی تخریب اور تدسیہ کا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (91/9-10)۔

باقی رہا یہ تصور کہ فلاں بزرگ کو خدا کی طرف سے اِلْهَام ہوتا ہے تو اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم کی رو سے، علم کے سرچشمے دو ہی ہیں ایک وحی۔ یعنی خدا کی طرف سے براہ راست علم کا ملنا یہ حضرات انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھا اور ختم نبوت کے ساتھ اس کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ دوسرا، عقلِ انسانی (Human Intellect) اس میں ہر انسان شریک ہوتا ہے۔ لہٰذا، ختم نبوت کے بعد، اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئیں۔ ایک تو وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم، جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ اور دوسرے عقل انسانی۔ اب صحیح راستہ یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں انسانی عقل وبصیرت کے رو سے کیا جائے۔ بنا بریں، یہ تصور کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد، کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست کوئی علم عطا ہوتا ہے۔ (جسے کشف یا الہام کہتے ہیں) ایسا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ نہ ہی کشف، الہام، وحی خفی، وغیرہ اصطلاحات کا کوئی ذکر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ملتا ہے۔ یہ سب اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں اور دوسروں سے مستعار لی ہوئی۔

انسان اگر اپنی قوت خیال یا قوت ارادی کو ایک خاص طریق سے (Develop) کر لے تو اس سے بعض ایسی باتیں

سرزد ہونے لگتی ہیں جو عقلِ عامہ کی رو سے مستبعد ہوتی ہیں لوگ انہیں خوارقِ عادات یا کرامات سمجھنے لگ جاتے ہیں، اور جس سے ایسی باتیں سرزد ہوں، اسے صاحبِ کشف والہام قرار دیتے ہیں، اور ''روحانی قوتوں'' کا مالک۔ لیکن ان باتوں کو ''روحانیت'' (یادین) سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض قوتِ ارادی کی نشوونما (Development) کے کرشمے ہیں جسے ہر انسان (بلاتمیز مذہب وملت) خاص مشق کے ذریعے حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ اب مغرب (بالخصوص امریکہ) میں، اسے بطورِ فن کے حاصل کرنے کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں اور اس سے اعصابی بیماریوں کے علاج میں مدد لی جاتی ہے۔ اسے پھر سے اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ خدا سے براہِ راست علم، صرف وحی کے ذریعے مل سکتا ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ سے مخصوص تھا۔ اور چونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لیے اب کسی شخص کو خدا سے راہِ راست علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ وحی کو الہام بھی نہیں کہنا چاہیے اور نہ ہی یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اب کسی شخص کو خدا بذریعہ الہام براہ راست علم عطا کرتا ہے۔

ل ھ و

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی زندگی ایک عظیم مقصد لیے ہوئے ہے اس لیے اسے بڑی سنجیدگی سے (Seriously) لینا چاہیے۔ لہٰذا ہر وہ کام جس سے یونہی پیش پا اُفتادہ مفاد یا ناپائدار مسرت تو حاصل ہوجائے لیکن زندگی کا اصل مقصود نگاہوں سے گم ہوجائے، لَهْوٌ اور لَعِبٌ میں داخل ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ یعنی فوری عیش اور مفادات عاجلہ کی زندگی (یا محض حیوانی سطح پر طبعی زندگی) کو لَعِبٌ وَلَهْوٌ کہا ہے (47/36)۔ واضح رہے کہ قرآن کریم اس دنیا کی زندگی کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ جس بات کو لَهْوٌ وَلَعِبٌ قرار دیتا ہے وہ یہ نظریہ ہے کہ انسان زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر عارضی طرب انگیزیوں کے پیچھے پڑ جائے۔ یعنی زندگی کو حیوانی سطح پر رکھے۔ اسے بلند انسانی سطح پر نہ لے جائے۔ انہی باتوں کو اس نے لَهْوَ الْحَدِيْثِ (31/6)۔ کہا ہے لیکن اگر اس آیت میں اَلْحَدِيْثِ [1] کے معنی قرآن کریم لیے جائیں تو لَهْوَ الْحَدِيْثِ کے معنی ہوں گے ایسی باتیں جو انسان کو قرآن کریم سے غافل کر دیں۔

قرآن کریم میں ہے: اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102/1-2)۔ ''تکاثر'' نے زندگی کے اہم مقاصد کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر کے تمہیں اور ہی طرف لگا رکھا ہے اور تم اسی روش پر چلے جاتے ہو تا آنکہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو۔ تَكَاثُرٌ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے مال ودولت میں بڑھ جانے کی ہوس۔ غور کیجئے قرآن کریم نے کس طرح دو لفظوں میں انسان کی پوری تگ وتاز اور نوع انسانی کی تاریخ کی داستان کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ آپ ان لوگوں کو دیکھئے جن کے پاس اتنا کچھ جمع ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر کے لیے ان کی اور ان کی اولاد کی ضروریات زندگی کے لیے کافی سے بھی زیادہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ وہ دولت سمیٹنے کے لیے دیوانہ وار مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ وہ ایسا

---

[1] سیاق وسباق کے لحاظ سے ''الحدیث'' کے معنی ''قرآن حکیم'' ہی قرین قیاس ہیں۔ (منظور الحسن)

کیوں کرتے ہیں؟ محض دوسروں سے آگے بڑھ جانے کے لیے۔ یہی جذبہ دنیا میں ساری تباہیوں کا موجب ہے۔ افراد کے لیے بھی اور اقوام کے لیے بھی۔ مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھ جانے) کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ قرآن کریم بھی اس جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن اس کے لیے میدان دوسرا تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (2/148)۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے تو ان کاموں میں بڑھو جن میں نوع انسانی کی وسعتوں اور بھلائیوں کا راز پوشیدہ ہو۔

لوح

قرآن کریم کے متعلق ہے: فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (85/22)۔ اسی کو دوسری جگہ کِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (56/78) کہا گیا ہے۔ اس سے مراد ہے علم خداوندی جو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ اور فنا اور تغیر سے مصوٴن ہے۔ یہ کتاب (قرآن) علم خداوندی ہی میں محفوظ نہیں بلکہ ہمارے پاس (کتابی شکل میں) بھی محفوظ ہے۔ ہر آسمانی کتاب میں روشنی اور چمک ہوتی ہے۔ قرآن کریم کو (4/175) اور تورات کو (6/96) میں نور [1] کہا گیا ہے۔

لوط علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے برادر زادہ، حضرت لوطؑ، اول الذکر کے ساتھ ہجرت کر کے فلسطین کی طرف تشریف لے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی شرف نبوت سے سرفراز فرمایا اور سدوم کی طرف جانے کے لیے حکم دیا۔ یمن سے بحر احمر (Red Sea) کے کنارے کنارے قدیمی تجارتی قافلوں کی ایک سڑک حجاز اور مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی۔ قیاس ہے کہ یہ علاقہ بحر میّت (Dead Sea) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آ گیا۔ جس قوم کی طرف حضرت لوطؑ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے وہ اس علاقہ میں آباد تھی۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قوم میں آپ سے پہلے اور رسول بھی آ چکے تھے اور حضرت لوطؑ ان میں اتنا لمبا عرصہ رہے کہ انہیں ان کا بھائی بند (اَخُوْهُمْ) کہہ کر پکارا گیا ہے (26/160)۔ یہ قوم (لواطت کی) شرمناک فحاشی میں مبتلا تھی (26/165)۔ اس کے علاوہ وہ ''قطع السبیل'' رہزنی اور قزاقی کے جرائم کی بھی مرتکب ہوتی تھیں (29/29)۔ آپ نے انہیں ان اعمال شنیعہ سے رکنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور وہ تباہ ہو گئی۔

لوم

قرآن کریم میں بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (75/2) انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے از خود یہ بتا دے کہ فلاں بات

---

① مراد ہے ایسی کتاب جس پر عمل کرنے سے زندگی کا ہر پہلو روشن ہو جائے۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

حق اور فلاں باطل ہے۔ اس کی راہ نمائی ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہے۔ البتہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت ہے کہ جس بات کو وہ غلط سمجھتا ہے اس کے ارتکاب پر وہ اسے ملامت کرتی ہے۔ اسی کو ضمیر یا (Conscience) کہا جاتا ہے لہٰذا ضمیر کی آواز حق اور باطل میں تمیز نہیں کر سکتی۔ وہ اس بات کی تائید کرے گی جسے آپ اچھا سمجھتے ہیں اور اس پر ملامت کرے گی جسے آپ برا سمجھتے ہیں۔ وہ جینی کے بچے کو گوشت کھانے کے ارادہ پر ملامت کرے گی لیکن مسلمان کے بچے کو گوشت کھانے پر آمادہ کرے گی۔ اس لیے ضمیر کی آواز حق اور باطل کا معیار نہیں قرار پا سکے گی۔ ''فتویٰ'' ہمیشہ وحی سے لینا چاہیے، نہ کہ اپنے دل سے ٹھگوں کا دل انہیں کبھی مسافر کُشی پر ملامت نہیں کرتا۔ ڈاکو کا دل اسے رہزنی پر کبھی نہیں ٹوکتا۔ عصر حاضر کے مہذب ٹھگوں اور ڈاکوؤں (بالا دست اقوام کے ''محب الوطنوں''[1]) کا دل انہیں کبھی اس پر ملامت نہیں کرتا کہ وہ کمزور اقوام کے خون کو اپنی قوم کے محلات کی آرائش کا موجب نہ بنائیں لہٰذا غلط اور صحیح کا فیصلہ خدا کی وحی کر سکتی ہے، انسان کا دل نہیں۔

ل و ن

قرآن کریم میں اختلاف السنہ (زبانوں) اور اَلْوَان (رنگوں) کو صاحبانِ علم و بصیرت کے لیے ادراک حقیقت کی نشانیاں قرار دیا ہے (30/22)۔ اس میں رنگ (اَلْوَانٌ) سے مراد نسلیں (Races) ہیں جن سے متعلق تحقیق، علم الانسان کا بہت بڑا شعبہ ہے۔ لیکن اگر اَلْوَانٌ کے معنی عام رنگ (Colours) لیے جائیں تو بھی اس آیت میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ دور حاضر کی تحقیق یہ ہے کہ انسانیت کے ارتقائی مراحل میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کی ذہنی سطح کیا تھی تو اس کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس دور میں وہ قوم کتنے مختلف رنگوں (Colours) کو پہچانتی تھی۔ وہ قوم جتنے زیادہ رنگوں سے متعارف ہو، اتنی ہی بلند اس کی ذہنی سطح ہوگی۔ یعنی رنگوں کی تمیز کا انسان کی ذہنی نشو و نما سے خاص تعلق ہے۔

ل ی ل

سورۃ ابراہیم میں نزول قرآن کریم کا مقصد بتایا گیا ہے: لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14/1)۔ تاکہ تو نوع انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ یعنی نزولِ قرآن کے وقت نوع انسانی تاریکی میں تھی، قرآن کریم کی راہ نمائی انہیں روشنی میں لے آئی اس جہت سے، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو جس میں قرآن کریم دنیا کو ملا، لَیْلٌ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ زمانہ جس میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ روشنی کا کہیں نشان تک نہیں تھا۔ اس دور میں قرآن کریم نازل

---

[1] غالباً اٹلی یا کسی مغربی مفکر نے کہا ہے کہ ''جو کچھ ہم اپنے ملک اور قوم کے لیے کرتے ہیں اگر ہم اپنی ذات کے لیے کریں تو چور اور ڈاکو کہلائیں۔'' (منظور الحسن صاحب کتاب)

ہوا جس نے دنیا کو نئی اقدار سے روشناس کرایا۔ تاریکی میں انسان کے لیے (حقیقی یا محض خیالی) خطرات بھی ہوتے ہیں۔ روشنی کی وجہ سے یہ خطرات سلامتی میں تبدیل ہو گئے۔ پھر، اس روشنی کی تکمیل اس طرح سے ہوئی کہ رات کا کوئی حصہ باقی نہ رہا۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (97/5)۔ ساری دنیا خدا کے نور سے جگمگا اٹھی۔ اس طرح یہ تاریک دور، قرآن کریم کی روشنی کی وجہ سے نوع انسان کے لیے سلامتی اور برکات کا دور بن گیا (44/3)۔

ل ی ن

قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے لِنْتَ لَهُمْ (3/158) تو ان کے لیے نرم واقع ہوا ہے۔ یعنی فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ (3/158) نہیں۔ لیکن یہ لینت ان کے لیے تھی جو حق وصداقت کے سامنے جھک کر حضور ﷺ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ جو لوگ حق کی مخالفت میں نبرد آزما تھے ان کے مقابلہ میں حضور ﷺ اور آپ کے ساتھی ''اشداء'' [1] تھے (48/29)۔

حضرت داوٗدؑ کے متعلق ہے: وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (34/10) ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ یعنی اسے لوہا گلا کر یا تپا کر، اسلحہ سازی وغیرہ کی صنعت کا علم دے دیا۔ سورہ طٰہٰ میں ہے: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (20/44) تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا۔

م ت ع

قرآن کریم میں اَرْضٌ (زمین) کو جو مَتَاعٌ کہا ہے (2/36) تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لیے سامان پرورش مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس پر قابض نہیں ہوسکتا۔ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41/10) ہے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں (طور پر کھلی)۔

م ت ن

قرآن کریم میں ہے: اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (7/183) میری تدبیر بڑی محکم، مضبوط اور شدید ہوا کرتی ہے۔ کوئی اسے توڑ نہیں سکتا۔ اسی اعتبار سے خدا کو اَلْمَتِيْنُ کہتے ہیں (51/58)۔ یعنی وہ جس کے محکم قوانین کے سہارے کائنات کے خیمے ایستادہ ہیں۔ یعنی خود بھی محکم اور دوسروں کو بھی قوت اور استحکام عطا کرنے والا۔ ذُوالْقُوَّةِ وہ ہوتا ہے جس کی قوت دوسروں پر بھی اثر انداز ہو۔ اور مَتِيْنُ اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات میں محکم اور مضبوط ہو۔ مَتِيْنُ میں دونوں باتیں آسکتی ہیں۔

---

[1] ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم   رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن   (علامہ اقبالؒ)

م ث ل

تاریخ کے وہ واقعات جو شاہراہ زمانہ پر اس طرح کھڑے ہوں کہ ان سے ہر رہرو عبرت حاصل کرے (13/6)۔

سورہ مریم میں جہاں ہے: فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (19/17) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت مریمؑ کی نگاہ میں ایک متوازن انسان کی شکل میں سامنے آیا۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے۔ یعنی حضرت مریمؑ نے یہ کچھ اپنے خواب میں دیکھا۔

قرآن کریم میں ہے: وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (2/23)۔ ''جو کچھ ہم نے اپنے بندے کی طرف نازل کیا ہے اگر تم اس کی بابت شک میں ہو (کہ یہ منجانب اللہ نہیں ہے) تو تم اس کی مثل ایک سورت (بنا کر) لاؤ'' اس کے بعد خود ہی کہہ دیا کہ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (2/24)۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کرو۔ اور تم ہرگز ہرگز نہیں کرسکو گے۔ تو۔۔۔ (اس چیلنج کو دیگر مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے۔ دیکھو (10/38 و 11/13)۔

یہ قرآن کریم کا چیلنج ہے جو اس نے اپنے زمانہ نزول کے (عرب) مخاطبین کو بھی دیا اور اس کے بعد ساری دنیا کو دیتا چلا آرہا ہے، لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ نہ تو اس زمانے کے عربوں نے (جو اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے) اسے قبول کیا اور نہ ہی اس کے بعد آج تک کسی میں اس کی ہمت پڑی ہے کہ اس کی مثل ایک سورت بنا کر دکھائے۔ یہ چیلنج لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ہے۔ معنوی حیثیت سے قرآنی حقائق ان بلندیوں پر ہیں جن کا تصور بھی فکر انسانی نہیں کرسکتا۔ جہاں تک اس کے اسلوب بیان کا تعلق ہے، اس کی مثل ونظیر تو ایک طرف پروفیسر گب (H.A.R. Gibb)[1] کے بیان کے مطابق اس کا ترجمہ بھی دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بالکل نرالا ہے۔ یہ نہ نثر ہے نہ نظم نہ ہی اس اسلوب کی عربی لٹریچر میں کوئی مثال ملتی ہے (نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد) اس لیے قرآن اپنے لفظوں اور معنوں، دونوں کے ساتھ خدا کا کلام اور بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس کی مثل کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

م ج د

عربوں میں چونکہ سخاوت (کسی کو دینا) بہت بڑا اشرف تھا اس لیے ان کے ہاں اَلْمَجْدُ بلند ترین شرف کو کہتے تھے۔ اہل لغت نے مجد اور شرف کو ہم معنی لکھا ہے اور دونوں کے متعلق کہا ہے کہ ان میں آبائی شرف بھی شامل ہے۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لیے مَجِيدٌ آیا ہے، شَرِيفٌ کہیں نہیں آیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مجد جوہر ذاتی ہے جس میں آبائی

---

[1] Modern Trends in Islam, p. 4

شرف کو دخل نہیں۔

قرآن کریم نے خدا کی صفت مَجِیْدٌ بتائی ہے (11/73 و 85/15)۔ یعنی سامانِ ربوبیت (خواہ وہ طبعی زندگی سے متعلق ہو یا انسانیت کی راہ نمائی کے متعلق) کو نہایت کثرت اور فراوانی سے دینے والا، وسعت اور فراخیاں پیدا کرنے والا، انتہا تک پہنچا دینے والا۔ اور اسی بناء پر وہ حَمِیْدٌ ہے۔ یعنی تعریف اور ستائش کا مالک۔

م ج س

اَلْمَجُوْسِیَّۃُ۔ ایک قدیم مذہب جس کی تجدید جناب زرتشت نے کی تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں کو مجوس کہتے ہیں۔ زرتشت کے بعد جب اس مذہب کی شکل بگڑی تو اس میں خیر و شر کے لیے اہرمن و یزداں کی دو مستقل قوتوں کو تسلیم کیا گیا۔ قرآن کریم میں اَلْمَجُوْسَ (22/17) کا ذکر یہودیوں، نصرانیوں اور صابیوں کے ساتھ آیا ہے۔ قرآن کریم نے ان کا تفصیلی تعارف نہیں کرایا۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں اس مذہب کے پیرو موجود تھے جس سے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ اب اس سے عام طور پر پارسی مراد لیے جاتے ہیں جو جناب زرتشت کے متبعین ہیں۔ یہ لفظ فارسی زبان کا ہے۔

م ح ن

امتحان کے معنی کسی کے اندرونی حالات معلوم کرنے یا آزمانے کے ہیں۔ سورۃ الممتحنہ میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ (60/10) اے جماعت مومنین! جب مومن عورتیں تمہارے پاس ہجرت [1] کر کے آئیں تو ان کے اندرونی حالات معلوم کر لیا کرو۔

م ح و

قرآن کریم میں ہے: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ (13/39)۔ خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق (نہ رکھنے کے قابل چیز کو) مٹا دیتا ہے اور رکھنے والی چیز کو قائم رکھتا ہے۔ مٹاتا اسے ہے جو تخریبی نتائج پیدا کرے اور باقی اسے رکھتا ہے جو تعمیری نتائج کی حامل ہو (42/24)۔ یعنی جو نوع انسان کے لیے منفعت بخش ہو (13/17)۔ محو و اثبات کا یہ اٹل قانون، کارگہ فطرت کے ہر گوشے میں کارفرما ہے اور اسی قانون کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے بھی فیصلے ہوتے ہیں۔ یعنی بقائے نافع (13/17)۔ بقا اس کے لیے ہے جو نوع انسان کے لیے نفع رساں ہو۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے

---

[1] دنیا میں جب بھی قرآنی معاشرہ (نظام حکومت) متشکل ہوا تو اس میں باہر سے آنے والوں کے لیے یہی کسوٹی ہو گی یعنی ان کے اندرونی (اصلی) حالات اچھی طرح معلوم کر کے انہیں اپنے حلقے میں رہنے کی اجازت دی جائے گی۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

گی کہ ''بقائے نافع'' کا اصول ''بقائے اصلح'' (Survival of the Fittest) کے اس اصول سے بہت بلند ہے جسے ڈارون (اور اس کے متبعین نے) طبیعیاتی قانون ارتقا میں دیکھا تھا۔ انسانی دنیا کے لیے صحیح اصول یہی ہے کہ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13/17)۔ زمین میں وہی چیز، وہی نظریہ، وہی نظام ٹھہرتا ہے جو نوع انسانی کے لیے نفع بخش ہو'۔ یعنی وہ نظریہ زندگی اور نظام حیات جو نفع بخش ہو اور اس کی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، پارٹی، قوم، یا ملک تک محدود نہ ہوں، پوری کی پوری انسانی دنیا کو محیط ہوں۔ دنیا کے تمام انسان ان سے متمتع ① ہوں۔

م ر ح

قرآن کریم میں ہے: وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا (17/37) زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ اس کی تفسیر دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی: بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ (40/75) یعنی یہ لوگ بغیر ایسے کام کیے جو تعمیری نتائج مرتب کریں، یونہی اکڑتے رہتے ہیں۔ انہی کے متعلق دوسری جگہ ہے: وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3/187) چاہتے ہیں کہ ان کاموں کی بنا پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے کیے نہیں۔

م ر ر

سورۃ بقرہ میں ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ... (2/229)۔ طلاق دو ہی بار ہو سکتی ہے۔ اس کا عام طور پر مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی آدمی دو مرتبہ طلاق، طلاق کہہ دے (ایک ایک مہینہ کے وقفہ کے بعد دو بار طلاق کا اعلان کر دے) تو اس سے طلاق نہیں پڑتی (واپسی ہو سکتی ہے) لیکن اگر تین مرتبہ کہہ دے تو پھر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ (سابقہ میاں بیوی) پھر باہمی نکاح کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس سے ہم بستر ہو (اسے حلالہ یا تحلیل کہتے ہیں)۔ یہ خیال اور طلاق کا طریق قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کی رو سے طلاق کے لیے ایک خاص طریقہ مقرر ہے۔ یعنی پہلے باہمی افہام و تفہیم۔ پھر ثالثوں کے ذریعے مصالحت کی کوشش۔ پھر عدالت کے ذریعے فیصلہ۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ جائے اور باہمی نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو میاں بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر یہی مرد اور عورت چاہیں تو باہمی نکاح کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا، اس جوڑے کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ ہو سکتا ہے اگر تیسری مرتبہ بھی طلاق کی نوبت آ گئی تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے کے بعد مطلقہ یا بیوہ ہو جائے تو پھر وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ ہے قرآن کریم کا مطلب اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ سے۔ جب تک طلاق (قید نکاح سے آزادی) عمل میں

---

① قرآنِ حکیم ہی اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

نہ آجائے اسے طلاق کہا ہی نہیں جا سکتا۔اس لیے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے معنی واضح ہیں۔یعنی قیدِ نکاح سے ایسی آزادی دومرتبہ ہوسکتی ہے جس میں لوٹ آنے کی اجازت ہو۔تیسری مرتبہ کی آزادی کے بعد اس کی اجازت نہیں۔

م ر ض

قرآن کریم میں مَرَضٌ بمقابلہ شِفَآءٌ آیا ہے (26/80)۔جہاں اس کے معنی جسمانی مرض کے ہیں۔اور فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (2/10) جہاں اس کے معنی قلب ونگاہ کے توازن کے بگاڑ اور نفسیاتی الجھاؤ کے ہیں۔لہٰذا جسمانی بیماری ہو یا ذہنی اور قلبی فتور، دونوں کے لیے مَرَضٌ کا لفظ آتا ہے۔سورۃ بقرہ میں سطحی جذبات پرستوں یا مفاد پرستوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (2/10)۔اس قسم کی ذہنیت یا سیرت کو، قلب (Psyche) یا (Mind) کا کہنا ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہے جس سے (بیسویں صدی سے پہلے) انسانی علم بالعموم بے بہرہ تھا۔اسی جہت سے قرآن کریم نے اپنے متعلق کہا ہے: شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (10/57)۔اس میں ''قلب کے امراض'' کا علاج اور شفاء ہے۔

اگر اس کا علاج وحی کی رو سے نہ کیا جائے تو یہ مرض اپنے زوردروں سے ازخود بڑھتا رہتا ہے (2/10)۔

م س ح

اَلْمَسِیْحُ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت چلنے والا (سیر وسیاحت کرنے والا) ہو۔حضرت عیسیٰ کو مَسِیْحٌ بھی کہتے ہیں (3/44)۔چونکہ آپ بہت چلنے والے تھے اس لیے آپ کو مَسِیْحٌ کہا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب صلوٰۃ کے لیے اٹھو تو فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (5/6)۔یہاں چونکہ وَامْسَحُوْا، فَاغْسِلُوْا سے الگ آیا ہے اس لیے اس کے معنی دھونے کے نہیں ہوں گے۔صرف پونچھ لینے کے ہوں گے۔ اس سے آگے ہے کہ اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے، یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (4/43)۔تو پاکیزہ مٹی کا قصد کرو۔فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ (4/43)۔''پاکیزہ مٹی کا قصد کرو''۔بات تو قرآن کریم نے اتنی ہی کہی ہے لیکن اس اشارہ سے مقصود یہ ہے کہ بدن کی آلائش کو پاکیزہ مٹی سے صاف کرلیا کرو۔اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرلیا کرو''۔یعنی پونچھ لیا کرو۔

اصل یہ ہے کہ صلوٰۃ سے پہلے وضو جہاں مقصود ہاتھ پاؤں کو پاک اور صاف کرنا ہے وہاں اس سے مراد ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا بھی ہے جو کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے تمہیداً ضروری ہوتی ہے۔پانی نہ ملنے (یا اس سے پرہیز) کی صورت میں ہاتھ پاؤں دھونے کا مقصد حل نہیں ہوسکتا، لیکن ''تیمم'' سے صلوٰۃ کی تیاری کا نفسیاتی پہلو ضرور سامنے آجاتا ہے۔یعنی اس سے انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔

م س س

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جس سامری نے بنی اسرائیل کے لیے بچھڑا بنایا تھا اسے سزا یہ دی گئی تھی: اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ (20/97) مطلب یہ ہے کہ اسے برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اور اس طرح وہ ''اچھوت'' (Un-Touchable) بن گیا تھا۔ یعنی اس سے سب نے معاشرتی تعلقات منقطع کر لیے تھے۔

قرآن کریم میں ہے: لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ (56/79)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ جو پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ خیال ہوں دوسرے لوگ قرآنی حقائق پر مطلع نہیں ہو سکتے۔ یعنی یہاں قرآن کریم کو مس کرنے کے معنی اسے چھونا نہیں، اس کے حقائق سے باخبر ہونا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے فکر ونظر کی تطہیر اور قلب ودماغ کی پاکیزگی اولین شرط ہے۔ جو شخص غیر قرآنی خیالات اور نظریات کو لے کر قرآن کریم کی طرف آئے گا، قرآنی حقائق اس پر کبھی بے نقاب نہیں ہوں گے۔ فکر وادراک کی پاکیزگی کے ساتھ ہی قلب ونگاہ کی عفت وتطہیر بھی ضروری ہے۔ جو قلب انسانیت سوز خیالات کی آماجگاہ ہو وہ قرآن کریم کی روشنی سے منور نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم سے راہ نمائی وہی حاصل کر سکتا ہے جو خالی الذہن [1] ہو کر اس کی طرف آئے اور اس کے دل میں تلاش حقیقت کی سچی تڑپ ہو پاکبازوں کے سوا کسی کو قرآن کریم سے مس نہیں ہوسکتا۔

م ک ث

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم بقا چاہتے ہو۔ تمہاری آرزو یہ ہے کہ جریدہ عالم پر تمہارا دوام ثبت ہو جائے۔ تم زندہ جاوید ہو جاؤ۔ تمہارے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں۔ تو اس کے لیے اس بنیادی اصول کو سمجھ لو کہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13/17)۔ جو چیز تمام نوع انسانی کے لیے نفع رساں ہوگی وہی دنیا میں باقی رہے گی۔ طبعی دنیا میں بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا قانون کارفرما ہے۔ لیکن دنیائے انسانیت میں ''بقائے نافع'' کا قانون نافذ پذیر ہے۔ لہٰذا باقی رہنا چاہتے ہو تو وہ کچھ کرو جو انسانیت کے لیے منفعت بخش ہو۔ جس سے ربوبیتِ عامہ ہو جائے۔ اس کی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، خاص قوم، خاص ملک تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر کھلی ہوں۔ یہی اسلام کا مقصود اور قرآنی نظام ربوبیت کا مطلوب ہے۔ کیونکہ اس کا خدا ''رب العالمین'' ہے۔

---

[1] اسی ضمن میں علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎
بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے (ضربِ کلیم)

م ک ک

مَكَّةُ پورے حرم کو کہتے ہیں اور بَكَّةُ شہر مکہ کو کہتے ہیں۔ مَكَّةُ کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ مثلاً ① اسے اس لیے مَكَّةُ کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کو کم کر دیتا یا فنا کر دیتا ہے۔ ② چونکہ اس شہر میں پانی بہت کم تھا اس لیے یہاں کے باشندے یہاں کا پانی گویا چوس ڈالتے تھے یا سب کا سب نکال لیتے تھے۔ ③ مَكٌّ کے معنی جذب کرنے اور کھینچنے کے بھی آتے ہیں۔ یہ شہر چونکہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا اور جذب کرتا ہے اس لیے اسے مَكَّةُ کہتے ہیں۔ ④ بَكٌّ کی طرح مَكٌّ بھی اژدہام کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس شہر میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اس لیے اسے مَكَّةُ یا بَكَّةُ کہتے ہیں۔ ⑤ مُكَاكٌ اور مُكَاكَةٌ ہڈی سے نکالے ہوئے مغز اور گودے کو کہتے ہیں جو ہڈی کے وسط میں ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شہر دنیا کے شہروں کا مغز ہے اس لیے اسے مَكَّةُ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں مَكَّةُ اس شہر کے لیے آیا ہے جس میں مسجد حرام ہے (48/24)۔ اسی کو بَكَّةُ بھی کہا گیا ہے (3/95)۔

م ک ن

قرآن کریم نے اپنی صداقت کے پرکھنے کے لیے تین معیار بتائے ہیں۔ یا تو اپنے دور کے علمی دلائل سے اس پر غور کرو۔ یا تاریخی شواہد سے دیکھو کہ سابقہ اقوام نے جب غلط روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور یا استناجی طریق (Pragmatic Test) کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کو قائم ہو کر اپنے نتائج پیدا کرنے دو۔ نتائج سے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے یا نہیں۔ اسے اپنے دعویٰ کی صداقت پر اس قدر محکم یقین ہے کہ اس استناجی طریق پر بڑا زور دیتا ہے چنانچہ نبی اکرم ﷺ اپنے مخالفین سے بار بار کہتے ہیں کہ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ (39/39)۔ تم اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اپنی جگہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (6/135)۔ عنقریب (نتائج سے) معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار اس گھر (دنیا) کی کامیابی و کامرانی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6/35)۔ تم دیکھ لوگے کہ خدا کا یہ قانون کس قدر سچا ہے کہ جو قوم نوع انسانی کے حقوق میں کمی کرتی ہے اور خدا کے قوانین سے سرکشی برتتی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اسلام کو سچا ثابت کرنے کا یہ طریقہ تھا۔ یعنی اس کے عملی نظام کے نتائج سے دنیا پر واضح کر دینا کہ یہ نظام کس طرح بے مثل و بے نظیر ہے۔ یہ تھا اسلام کا دعویٰ۔ اور اب حالت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے نظری دلائل سے کچھ متاثر بھی ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کی عملی حالت [1] دیکھ کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں کہ جس ''مذہب'' پر چلنے والوں کی یہ حالت ہو وہ کس طرح نوع انسانی کی

---

① کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ (منظور الحسن)

فلاح وفوز کا ضامن بن سکتا ہے؟ اور اس پر بھی جب مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ تم جس ''مذہب'' پر چل رہے ہو یہ خدا کا وہ دین نہیں جو اس نے رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے بھیجا تھا تو انہیں اس قدر غصہ آجاتا ہے کہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اعمال کو ان کے نتائج سے پرکھنے کے قرآنی معیار کو نظرانداز کر رکھا ہے۔ اب ان کے پاس کوئی کسوٹی ہی نہیں جس سے اس کا فیصلہ کیا جا سکے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا غلط۔ اس کی کسوٹی صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اعمال کے جو نتائج قرآن کریم نے بتائے ہیں اگر ہمارے اعمال سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام پا رہے ہیں۔ اگر وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے، تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام نہیں پا رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اعمال کے نتائج مرنے کے بعد مرتب ہوں گے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ تمام اعمال کے نتائج مرنے کے بعد ہی مرتب ہوں گے اور اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ سامنے نہیں آئے گا۔ قرآن کریم کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور یہی وہ نتائج ہیں جن سے اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کی ذلت وخواری خدا کا عذاب ہے اور قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتی۔

م ک و

قرآن کریم میں عہد جاہلیہ کے عربوں کے متعلق ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً (8/35)۔ خانہ کعبہ کے قریب ان کی صلوٰۃ بے معنی آوازوں اور بے مطلب حرکتوں کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی ایسی نماز جس میں محض چند الفاظ (بلا سمجھے) دہرائے جائیں اور چند حرکات ادا کر دی جائیں۔ سوچئے کہ کیا آج ہماری نمازیں بھی بالعموم یہی کچھ بن کر نہیں رہ گئیں؟ چند الفاظ کا دہرانا جن کا مفہوم نہ سمجھا جائے۔ اور چند حرکات جن کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے جس صلوٰۃ کا حکم دیا تھا وہ قلب ودماغ کی تطہیر اور معاشرہ میں صالح انقلاب لانے کا ذریعہ تھی۔ اس میں ہر شخص کو معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کیوں ایسا کر رہا ہوں۔ اور اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا۔ دین (نظام خداوندی) کے پروگرام کی ہر کڑی ایک غایت لیے ہوتی ہے اور انسانیت کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن جب دین کا مقصود نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اس کے پروگرام کی یہ حیات بخش کڑیاں، محض رسم بن کر رہ جاتی ہیں جن کی ادائیگی مقصود بالذات سمجھ لی جاتی ہے۔ اس مقام پر دین، ''مذہب'' بن کر رہ جاتا ہے۔

م ل أ

قرآن کریم میں ہے کہ جس قوم میں بھی کوئی رسول آیا سب سے پہلے اس قوم کے دولت مند طبقہ نے اس کی مخالفت کی: وَمَآ أَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (34/34)۔ اس سے ظاہر ہے کہ

حضرات انبیاء کرامؑ ایسا پیغام لاتے تھے جس کی سب سے بڑی زد دولت مند طبقہ پر پڑتی تھی۔ اس لیے وہ بڑھ چڑھ کر ان کے پیغام کی مخالفت کرتے تھے۔ اگر محض ''پوجا پاٹ'' کا سوال ہوتا تو دولتمندوں کا اس سے کیا بگڑتا تھا جو وہ اس کی مخالفت کرتے۔ دولت مند تو بلکہ ایسے کاموں میں بیش از بیش حصہ لیتے ہیں اور چندے دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تصریحات اس پر شاھد ہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ جس انقلاب آفریں پروگرام کو لے کر آتے تھے اس میں رزق کے سرچشمے دولت مندوں کے ہاتھوں سے چھن کر خدا کے قانونِ ربوبیت کے ہاتھوں میں آجاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ یہ طبقہ ہمیشہ اس انقلاب کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔

یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ آج بھی جہاں قرآنی انقلاب کی آواز اٹھے گی سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا اور مذہبی پیشوائیت اس مخالفت میں ان کے ساتھ ہوگی۔

م ل ک

خدا کے مَالِكٌ ہونے میں جہاں اس کے کامل اختیار و اقتدار کا تصور ہے اس کے ساتھ ہی یہ تصور بھی ہے کہ اس کی یہ مالکیت استبداد کے لیے نہیں بلکہ کائنات کی اصلاح اور درستگی کے لیے ہے تاکہ اس کا نظم و نسق ٹھیک ٹھیک قاعدے اور قانون کے مطابق چلتا رہے اور ہر شے کو اس کی زندگی کی بنیادی ضرورت بہم پہنچتی رہیں۔

قرآن کریم میں ایک اصطلاح آتی ہے: ''مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' اس کے لفظی معنی ہیں ''جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہوئے۔'' یہ اصطلاح متعدد معانی میں استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً:

① ان لوگوں کے لیے جو کسی کی ماتحتی میں کام کر رہے ہوں (Subordinates)۔ جو کسی کی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے اس کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔ گھر کے ملازمین وغیرہ بھی اسی ضمن میں آجاتے ہیں۔

② ان عورتوں کے لیے جو نکاح میں آچکی ہوں (33/52)۔ اسی طرح سورہ نساء میں جہاں محرمات کی فہرست کے بعد کہا ہے کہ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4/24) تو اس میں اگر مُحْصَنٰتُ کے معنی ''پاک دامن عورتیں'' لیے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام پاک دامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں آجائیں۔ اور اگر ''مُحْصَنٰتُ'' کے معنی شوہر دار عورتیں ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام شوہر دار عورتیں حرام ہیں بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہارے ہاں آچکی ہوں اگرچہ ان کے پہلے شوہر کہیں موجود ہوں۔

لیکن سورہ ممتحنہ میں ہے کہ اگر کفار کی مومن عورتیں تمہاری طرف آجائیں تو انہیں کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ۔ صرف ان کا خرچ کیا ہوا مال انہیں دے دو اور ان سے نکاح کر لو (60/10)۔ یہ وہ ''شوہر دار عورتیں'' ہیں جن سے (اُن کے شوہروں کے ہوتے ہوئے) نکاح کی اجازت دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے (4/24) میں ''اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' سے

مراد یہ عورتیں بھی ہوسکتی ہیں جن سے اس طرح نکاح کیا گیا تھا۔

③ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4/3)۔ لونڈیوں کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً (33/50؛70/30؛23/6)۔ لونڈیوں کے ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام میں پہلے عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیوں کا رواج عام تھا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو وہ لونڈیاں جوان کے معاشرہ کے رواج کے مطابق ان کے گھروں میں موجود تھیں اُسی طرح ان کے گھروں میں رہیں۔ اگر ان لونڈیوں کو گھروں سے نکال دیا جاتا تو اس سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتیں۔ اس لیے انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا قرآن کریم نے ان لونڈیوں کے لیے بھی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

یہ غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدی ہوتے تھے۔ سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق واضح حکم آ گیا کہ انہیں احساناً یا فدیہ لے کر رہا کرنا ہوگا (47/4)۔ اس حکم کے بعد جنگ کے قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ختم ہو گیا اور اس طرح اسلام نے غلامی کے دروازے کو یکسر مسدود کر دیا۔ کسی انسان کو خرید کر غلام بنانے کا تصور ہی اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے جو شرف و تکریم آدمیت کا علمبردار ہے (17/70)۔ اور جو کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے (3/78)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے الفاظ لونڈیوں کے لیے آئے ہیں وہ اُنہی لونڈیوں کے لیے ہیں جو نزول قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ ان لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد معاشرہ کا جزو بنا لیا گیا، اور نئی لونڈیاں بنانے کا سلسلہ از روئے قرآن ختم ہو گیا۔ لہٰذا اب مسلمانوں کے ہاں لونڈیوں کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔ اب جو لوگ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے لونڈیوں کے جواز کی سند لاتے ہیں وہ قرآن کریم پر ظلم کرتے ہیں اب قرآن کریم میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے متعلق ہدایات کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی قوم حلقۂ اسلام میں داخل ہو جس کے ہاں لونڈیاں موجود ہوں تو قرآن کی یہ ہدایات ان کے لیے خضر راہ بنیں گی۔

م ن ن

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ان پر مَنّ نازل ہوتا تھا (2/57)۔ یہ شیر خشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی گوند تھی جو درختوں پر جم جاتی تھی۔ (یہ اب بھی ہوتی ہے اور لذیذ ہوتی ہے)۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی سے خدا کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ مَنّ: احسان اور سَلْوٰی: تسلی کا سامان۔

منی

سورۃ حج میں ہے: وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ ‌ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (22/52)۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا تو اس کے ساتھ یہی ہوا کہ (اس کے جانے کے بعد) شیطان (دین سے منحرف کرنے والے لوگ) اس کی کتاب میں (یعنی جس کی وہ تلاوت کرتا تھا، اس وحی میں) اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے۔ اس کے لیے اللہ پھر ایک رسول بھیجتا جو اس غیر خدائی تبدیلیوں اور اضافوں کو مٹاتا اور اس طرح وحی کو پھر اس کی منزہ شکل میں پیش کر دیتا۔ اس آیت میں اللہ نے بتایا ہے کہ کس طرح مفاد پرست اور سرکش لوگ وحی میں ردوبدل کر دیتے تھے اور کس طرح دوسرا رسول آکر ان تبدیلیوں کو مٹاتا تھا۔ یہ سلسلہ جاری تھا تا آنکہ قرآن کریم آیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی۔ اب اس میں کوئی ردّوبدل نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم۔ لیکن بہت سے مفسرین نے پہلے، اُمۡنِيَّتِهٖ کے معنی ''آرزو'' کر کے خود ہی ایک مشکل پیدا کر لی اور پھر اس مشکل سے نکلنے کے لیے اس قسم کا قصہ وضع کیا جس کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے۔ چونکہ اس قصہ سے حضور رسالت مآب ﷺ کی شان اقدس پر طعن پڑتا ہے اس لیے ہم اسے یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔

موت

دراصل حیات کے مقابلہ میں موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً ① قوتِ نامیہ (بڑھنے پھولنے کی قوت) کا زائل ہوجانا۔ جیسے وَيُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا (30/19) اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ ② محسوس کرنے کی قوت کا زائل ہوجانا۔ جیسے قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا (19/23) مریم نے کہا کہ اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور بھولی بسری ہوجاتی اور اس دردوکرب کو محسوس نہ کرسکتی۔ ③ عقل وشعور کا زوال۔ جیسے اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى (27/80) تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔ یعنی ان لوگوں کو جو عقل وشعور سے کام نہیں لیتے۔ ④ حزن اور خوف جو زندگی کو مکدر کردے۔ یعنی پُر مشقت حالات، افلاس، ذلت، محکومی کی زندگی وغیرہ۔ جیسے وَيَاۡتِيۡهِ الۡمَوۡتُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (14/17) یعنی چاروں طرف سے ذلت وافلاس اور تباہیاں اور بربادیاں امنڈ امنڈ کر آرہی ہوں گی لیکن موت نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ بھیک کے ٹکڑوں سے اتنا کچھ مل جائے گا جس سے طبعی زندگی باقی رہے (یہ جہنم کی زندگی کا نقشہ ہے)۔

قرآن کریم میں موت کا لفظ حیات (زندگی) کے مقابلہ میں آیا ہے (2/28)۔ جس طرح حیات صرف سانس لینے کا نام نہیں بلکہ اس کے گوناگوں پہلو ہیں اسی طرح موت بھی صرف سانس بند ہوجانے کا نام نہیں۔ اس کے بھی مختلف پہلو

ہیں۔اور بدترین موت ہے،قوموں کی اجتماعی زندگی کی موت جس میں وہ نہ زندہ ہوتی ہیں اور نہ مرتی ہی ہیں۔ یہ زندگی جہنم کی زندگی ہے ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (87/13)۔قرآن کریم کا پیغامِ حیات اورانہی اقوام کے لیے ہے جن میں زندگی کی صلاحیت باقی ہو،لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا (36/70)۔

قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آئے۔اس کے سیاق وسباق سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ وہاں اس کے کون سے معانی مراد ہیں۔ ہرمقام پرموت کے معنی طبیعی موت (Physical Death) نہیں ہوں گے۔

م و ل

نظام خداوندی کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے میں جماعت مومنین کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ (2/155)۔بھی ہے۔یعنی مال ودولت میں کمی ہوجانا۔لیکن اس کے بعد اس جماعت کو، ان کے مخالفین کے اَمْوَالٌ کا مالک بنادیا جاتا ہے اورانہیں ہرطرح کی فروانی حاصل ہوجاتی ہے (33/27)۔لہٰذا مال کی فروانی، نظام خدا وندی کا لازمی نتیجہ اورخدا کی رحمت ہے۔لیکن وہی مال جونظام ربوبیت کی اجتماعی تحویل میں ہو(9/111)۔اگر ہرفرد اپنا اپنا مال اپنے ہی مفاد کی خاطر جمع کرے تو اس مال سے وہ جہنم تیار ہوتی رہتی ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں (104/2-7)۔اسی کا نام سرمایہ داری ہے جسے مٹانے کے لیے قرآن کریم آیا تھا(9/34-35)۔

م ھ د

سورۃ مریم میں ہے کہ حضرت مریمؑ اپنے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کو ساتھ لے کر ہیکل کے پجاریوں کے پاس آئیں تو وہ (احبار ورھبان) ان کے پیچھے پڑ گئے (کہ انہوں نے ہیکل کی راہبہ کی زندگی چھوڑ کر آئین خانقاہیت کے خلاف متاہل زندگی کیوں اختیار کر لی تھی) انہوں نے خود جواب دینے کی بجائے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کر دیا کہ تمہارے اعتراضات کا یہ جواب دیں گے۔اس پر ہیکل کے شیوخ نے نہایت طنزآمیز لہجے میں کہا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (19/29)۔ہم اس سے کس طرح بات کریں جو ابھی کل کا بچہ ہے'' یہ ہمارے شایانِ شان نہیں کہ اس سے (جو ہماری سِن رسیدگی کے مقابلہ میں یوں ہے جیسے گود میں کھیل رہا ہو) جو کل ابھی ہمارے سامنے بچہ تھا۔ جو ہمارے ہاتھوں کا کھلایا ہوا ہے) اس سے ہم مناظرہ شروع کردیں۔اس سے ''فِی الْمَهْدِ'' (جھولے میں) کے معنی واضح ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں ''ابھی تو اس کے دودھ کے دانت ہیں''۔ یا ''جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش''۔خود صَبِیًّا کے معنی بھی دودھ پیتا بچہ نہیں۔

یہی ''تکلم فی المہد'' ہے (یعنی کم عمری میں لوگوں سے اہم حقائق پر گفتگو کرنا) جس کی طرف (5/110 و 3/45 میں) اشارہ کیا گیا ہے۔احبار ورہبان کے سوال کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ کہا وہ خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ

یہ باتیں سچ مچ گہوارے میں لیٹے ہوئے نہیں کی گئی تھیں۔ آپ نے فرمایا: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا (19/30) میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حضرت عیسیٰؑ کو نبوت مل چکی تھی۔

م ی د

اَلْمَآئِدَۃُ کھانا۔ خواہ اس کے ساتھ خوان ہو یا نہ ہو۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اَلْمَآئِدَۃُ اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا ہو۔ اگر اس پر کھانا نہ ہو تو اسے مائدۃ نہیں بلکہ خِوَانٌ کہیں گے۔ اسے مَآئِدَۃٌ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ میزبان کی طرف سے عطا اور تفضّل کے طور پر مہمان کو دیا جاتا ہے۔

اَلْمَآئِدَۃُ کے ان معانی کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (5/112) ''وہ ہم پر آسمان سے مائدہ نازل کرے۔'' ہر نبی کی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی اپنی جماعت سے کہہ رہے تھے کہ اگر وہ وحی کا اتباع کرتے رہے تو خدا انہیں رزق کریم دے گا، دنیا کی سرفرازیاں عطا کرے گا۔ لیکن وہ جماعت جس قسم کے نامساعد حالات کا شکار ہو رہی تھی ان کے پیش نظر یہ بعید دکھائی دیتا تھا کہ انہیں اس کشائش سے سامان زیست مل سکے گا۔ چنانچہ اس احساس کے ماتحت انہوں نے کہا کہ کیا ایسے حالات میں بھی یہ ممکن ہے کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں ان سب کو سامان نشوونما انسانوں کی طرف سے نہ ملے بلکہ نظامِ خداوندی کی طرف سے ملے تاکہ انہیں روٹی کے بدلے انسانوں کی غلامی اختیار نہ کرنی پڑے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہ کہ تم مومن ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اتَّقُوا اللّٰهَ (5/112)۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ خدا نے کہا وہ یقیناً ایسا انتظام کر دے گا۔ (یعنی تقویٰ کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا) لیکن فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (5/115)۔ جو ہمارے اس طرح کے دیئے ہوئے رزق پر پردہ پوشی کرنے لگے گا اور اس نظام سے سرکشی برتے گا، تو اسے سخت عذاب دیا جائے گا۔ لہٰذا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ، نظامِ ربوبیت کا دوسرا نام ہے اور تقویٰ کا لازمی نتیجہ۔

ویسے ان آیات کے جو عام معنی لیے جاتے ہیں انہیں قرآن کریم کے کسی اور ترجمہ سے دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔

ن ب أ (ن ب و)

قرآن کریم میں اَلنَّبِیُّ کا لفظ رسول کے لیے آیا ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ نَبَاءٌ سے مشتق ہے اور اس لیے اس کے معنی ہیں خبریں دینے والا۔ لیکن یہ تورات کا دیا ہوا تصور ہے۔ یہودیوں میں نَبِیٌّ ہیکل کے ایک خاص منصب دار کا لقب تھا جو

پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔اس لیے انگریزی میں نبی کو(Prophet) کہتے ہیں۔یعنی پیشگوئیاں (Prophecies) کرنے والا۔ لیکن قرآن کریم نے نبوت کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بلند مقام۔لہٰذا نبیؐ کے معنے ہیں مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔

نبی اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں سے اسے عالم الغیب والشھادۃ (دنیائے محسوس وغیر محسوس) دونوں کا مشاہد کرا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف (وحی کے ذریعے) کائنات کے بنیادی حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف ان حقائق کو دنیائے محسوسات تک پہنچاتا اور انہیں انسان کی تمدنی زندگی پر منطبق کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی نبوت کا اعلان قریش کے سامنے کیا تو اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔آپ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو گئے اور قوم سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری طرف ایک دشمن کا لشکر جرار تم پر حملہ آور ہونے کے لیے چلا آرہا ہے تو تم میری بات کا یقین کرو گے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ضرور کریں گے۔(ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ ایسے مقام پر کھڑے ہیں کہ جہاں سے آپ پہاڑ کی دوسری جانب دیکھ سکتے ہیں اور ہم دامن کوہ سے اس کی دوسری سمت نہیں دیکھ سکتے)۔اور دوسرے اس لیے کہ آپ نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔آپ نے فرمایا کہ پھر اسی طرح اس حقیقت کو بھی مان لو کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش زندگی کے نتائج، ہلاکتوں اور بربادیوں کا ایک لشکر جرار اپنے ساتھ لیے تمہاری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔لہٰذا تم اس روش کو چھوڑ کر زندگی کی صحیح روش اختیار کرو۔

اس سے مقامِ نبوت کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔یعنی نبی، علم کے اس مقامِ بلند پر ہوتا ہے جہاں وہ (وحی کے ذریعے) حقائق کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یہ مقام نبوت ہے۔ پھر وہ اس علم (وحی) کو لے کر انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تا کہ ان تک حقائق کو پہنچائے۔اور عملاً متشکل کر کے دکھائے۔ یہ منصب رسالت ہے (یعنی وحی کا دوسروں تک پہنچانا) نبوت، رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو گئی اب کوئی انسان خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔(اس لیے کہ جس قدر وحی کی ضرورت تھی وہ دے دی گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا) باقی رہا فریضہ رسالت۔یعنی اس وحی کو عملاً متشکل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا، تو یہ ہمیشہ اس امت کے سپرد ہو گیا۔ جسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا ہے۔(اسے تبلیغ اور اقامت دین کہا جائے گا۔''رسالت'' کہنے سے غلط فہمی کا امکان ہوتا ہے)۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔رسول میں نبوت اور رسالت میں ایک ہی ذات کے اندر مجتمع ہوتی ہے اس لیے قرآن کریم کی رو سے ہر نبی رسول ہوتا ہے اور ہر رسول نبی۔ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ختم نبوت کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔نہ ہی اس معنی میں رسول۔لیکن تبلیغ (یعنی وحی کو دوسروں تک پہنچانے) کا فریضہ اُمت کے سپرد ہے۔لہٰذا امت اپنے نظام کی وساطت سے ''فریضہ رسالت'' کی ادائیگی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی جانشین ہے۔قرآن کریم میں حضور ﷺ خاتم النبین کی نبوت محفوظ ہے اور اُمت کے قرآنی نظام

کے ذریعے "فریضہ رسالت" قیامت تک مسلسل آگے جاسکتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب بھی لائے اور نبی وہ ہے جو کتاب نہ لائے۔ یہ خیال قرآن کریم سے بے خبری پر مبنی ہے۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اللہ نے تمام انبیاء کو کتاب دی تھی۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ... (2/213)۔ یہی الفاظ رسولوں کے لیے آئے ہیں (57/25)۔ انبیاء کی انہی کتابوں کو مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (2/136)۔ کہا گیا ہے کہ اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا: اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا (19/30)۔ اللہ نے مجھے الکتاب دی ہے اور (اس طرح) مجھے نبی بنایا ہے"۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ ہر نبی صاحب کتاب ہوتا ہے۔ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اس لیے حضرات انبیاء کرامؑ کو (مثلاً خود نبی اکرم ﷺ کو) کہیں نبی کہا گیا ہے (65/1) اور کہیں رسول (48/29)۔ حتیٰ کہ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19/54)۔ "ایک پیغامبر (رسول) جسے نبوت عطا کی گئی تھی۔ ختم نبوت (33/40)۔ کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم حاصل کرے۔ علم جس قدر وحی کے ذریعے دیا جانا مقصود تھا، وہ سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا الہام [1] یا کشف وغیرہ کے ذریعے خدا سے براہ راست علم پانے کا عقیدہ ختم نبوت کے عقیدہ کے منافی ہے۔

نَبِیٌّ کا لفظ نَبَاوَةٌ سے مشتق ہے۔ لیکن اگر اسے نَبَأٌ سے مشتق مانا جائے تو اس میں بھی بلندیِ مقام اور اِخبار عن الغیب (غیب کی باتوں سے باخبر کرنے) کے دونوں مفہوم آ جائیں گے۔ اس "غیب" کے معنی وحی ہوں گے جو نبی کو خدا کی طرف سے ملتی ہے نہ کہ پیشگوئیاں جن کے مدعی (مسلم اور غیر مسلم) ہر جگہ ملتے ہیں۔

ن ب ت

سورہ آل عمران میں حضرت مریمؑ کے متعلق ہے: وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (3/36) (اس کے رب نے) اُسے عمدہ پرورش سے پروان چڑھایا۔ یہاں جسمانی پرورش اور اخلاقی تربیت دونوں مقصود ہیں۔

نوع انسان کے متعلق ہے: وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (71/17) اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تمہیں نباتات کی طرح نشو ونما دیتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ نے نوع انسان کو تمام کرۂ ارض پر درخت کی شاخوں کی طرح پھیلا دیا ہے جس کی جڑ اور تنا ایک ہی ہوتا ہے۔ نیز اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو زمین سے اسی طرح اُگایا ہے جس طرح

---

[1] کشف والہام کے ذریعے خدا سے ہم کلامی کا عقیدہ تو یکسر غیر قرآنی ہے، لیکن اس عقیدے میں ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ اب اگر کوئی بھی (چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) خدا سے براہِ راست بات کرنا چاہتا ہے تو وہ صرف قرانِ حکیم کے ذریعے کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ ملاحظہ ہو: 7-1/5؛ 192،146،3/7؛ 57-7/55؛ 27/62؛ 65،40/60؛ 42/26۔ (منظور الحسن)

نباتات [1] اُگتے ہیں۔ قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں ہے کہ تخلیق انسانی کی ابتداء مٹی سے ہوئی اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھا۔

ن ب ذ

سورہ انفال میں قوم مخالفت سے معاہدات کے ضمن میں ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡہِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ (8/58) اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا خدشہ ہوتو ان سے برابری کی حالت میں معاہدہ کو ان کی طرف پھینک دو۔ یعنی خیانت کے خدشے سے تم بلا تنبیہ، یونہی معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنے لگ جاؤ۔ نہ ہی انہیں نقصان پہنچانے کی فکر کرو۔ بلکہ جس برابری کی حیثیت سے تم نے ان سے معاہدہ کیا تھا، اسی حیثیت سے ان سے کہہ دو کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں رہا اس لیے تمہارا اور ہمارا معاہدہ کالعدم سمجھا جائے۔ یعنی انہیں برابری کی حیثیت دو یا یکبارگی معاہدے کو کالعدم قرار دینے سے انہیں عَلٰی سَوَآءٍ (یعنی انہیں اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو از روئے عدل و انصاف انہیں اس نقصان سے بچاؤ) کی شرط جس اصولِ عدل کی گواہی دیتی ہے وہ قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس غیر مسلموں (زمانہ نبویؐ کے اہل کتاب) کی حالت یہ تھی کہ اَوَ کُلَّمَا عٰھَدُوۡا عَھۡدًا نَّبَذَہٗ فَرِیۡقٌ مِّنۡھُمۡ (2/100) ''جب کبھی وہ کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ اس معاہدہ کو (ردی کی ٹوکری میں) پھینک دیتا ہے۔''

ن ب ز

قرآن کریم میں ہے: وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ (49/11)۔ آپس میں ایک دوسرے کے طنز و تحقیر آمیز نام نہ رکھا کرو۔

ن ج و

دوسرے مذاہب میں انسان کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کے جیل خانے میں بری طرح قید ہے۔ اسے اس قید سے رہائی مل جانے کا نام نجات ہے۔ ہندو دھرم کا عقیدہ ہے کہ انسان دنیا میں، اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے آتا ہے۔ اس سزا سے خلاصی مل جانے کا نام نجات ہے۔

ہر انسانی بچہ ایک سادہ لوح (Clean Slate) لے کر دنیا میں آتا ہے اسے فطرت کی طرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی ہیں۔ اس میں ''کچھ بننے'' کی امکانی وسعتیں (Realiseable Possibilities) ہوتی ہیں۔ ان (Potentialities) کو مشہود بنانا (Actualised کرنا) مقصود حیات ہے تاکہ انسان اس زندگی سے بلند تر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ مقصودِ زیست جیسا

---

[1] اس آیت سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پودوں کی طرح اُگایا یعنی جس طرح پودے زمین کے مختلف حصوں پر پھیلے ہوتے ہیں اور ان کی شکلیں بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہونے کے باوجود علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں۔ انسان بھی اسی طرح پیدا کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کی شکل وصورت ایک ہونے پر بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ (منظور الحسن)

کہ تم تھے (As You Were) ہونا نہیں۔ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ہے۔زمین کی زندگی انسان کی تربیت گاہ ہے۔اس میں اس کی ذات کی نشوونما (Development) ہوتی ہے جس سے یہ اس دنیا کی تمام خوشگواریاں اور شادکامیاں حاصل کر لیتا ہے اور اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔لہٰذا دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لینا مقصودِ حیات نہیں اس دنیا کو مسخر کر کے اس کی نعمتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما اور انسانیت کی فوز وفلاح حاصل کرنا مقصودِ حیات ہے۔

دنیا میں باطل کی قوتوں کے ساتھ کشمکش لازمی ہے اور اس کشمکش ہی سے انسانی ذات کا استحکام ہوتا ہے جو جماعت، قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے ان سے مستبد قوتوں کی گرفت سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور تباہی اور بربادی سے مصئون۔اس کے لیے قرآن کریم نے نجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی غلط روش کی وجہ سے مستبد قوتوں کے فولادی پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد پھر قوانین خداوندی کی طرف رجوع کر لیتی ہے تو اسے ان سرکش قوتوں کے دامِ بلا سے رہائی مل جاتی ہے۔اس کے لیے بھی نجات کا لفظ آیا ہے۔(جیسے بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے رستگاری نصیب ہو جانا ان کی نجات تھی)۔

اس طرح کے تصورات قرآن کریم کے خلاف ہیں۔قرآن کریم کی رو سے انسان جہنم میں نہ تو ایک قیدی کی طرح ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لیے جاتا ہے اور نہ ہی جہنم دھوبی کی بھٹی ہے جس میں گناہوں کی کثافتیں صاف ہوتی ہیں تاکہ انسان پاک وصاف ہو کر جنت میں جائے۔قرآن کریم کا تصور یہ ہے کہ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کی مضمر صلاحیتوں (ذات) کی اتنی نشوونما ہو جائے کہ وہ زندگی کی اگلی منزل (یعنی سلسلہ ارتقاء کی اگلی کڑی) تک پہنچنے کے قابل ہو جائے تو اسے جنت کی زندگی کہتے ہیں جس میں اس کی نشوونما مزید ترقی حاصل کرتی رہتی ہے۔لیکن اگر وہ غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے تو اس کی نشوونما رُک جاتی ہے۔اسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں [1]۔جس کی نشوونما رک جاتی ہے وہ زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتا۔وہ اسی مقام پر رہتا ہے۔اس لیے کسی کے ''جہنم'' سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس اعتبار سے نجات کا وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے جس کی رو سے (یہودیوں کی طرح) سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے (یا پاک وصاف ہونے) کے لیے کچھ وقت کے لیے جہنم میں جائے گا۔اور پھر وہاں سے چھٹکارا پا کر جنت میں چلا جائے گا۔

سورہ یونس میں فرعون کی غرقابی کے سلسلہ میں ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (10/92)۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ فرعون غرق ہو گیا تھا لیکن اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا تھا تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کے

---

[1] واضح رہے کہ جنت اور جہنم کی زندگی اس دنیا میں بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی (آخرت) میں بھی۔اس مقام پر جس جنت اور جہنم کی زندگی کا ذکر ہے اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے۔

لیے آیہ عبرت بن سکے۔مصر کے تہ خانوں سے،فراعنہ کی جو لاشیں ملی ہیں اس میں فرعون کی لاش بھی موجود ہے۔ چونکہ یہ انکشاف حال ہی کا ہے اور ہمارے قدیم مفسرین کو اس کا علم نہیں تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔لیکن مذکورہ الصدر انکشاف نے حقیقت حال کو بے نقاب کر دیا ہے کہ بَدَن سے مراد فرعون کی لاش ہی ہے۔

قرآن کریم نے اپنے حقائق کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق میں خدا کی نشانیاں بے نقاب ہوتی جائیں گی،قرآنی حقائق کی وضاحت ہوتی جائے گی (41/53)۔ان ''نشانیوں'' کے بے نقاب ہونے کا ایک طریق تاریخی شواہد کا سامنے آنا بھی ہے،جیسا کہ فرعون کی لاش کے سلسلہ میں ہوا۔

ن ح ر

قرآن کریم میں ہے:فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (108/2)اس میں وَانْحَرْ کی بہت سی تفاسیر صاحب تاج نے لکھی ہیں۔مثلاً ① نماز میں کھڑا ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا۔② نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا۔③ قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کو ذبح کرنا۔④ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا۔⑤ نماز میں (نحر تک) ہاتھ اٹھانا۔⑥ اپنے سینہ کو قبلہ رخ رکھ کر کھڑے ہونا۔⑦ خواہشات کا قلع قمع کرنا۔⑧ دن کے ابتدائی حصہ میں (قبلہ رخ) کھڑے ہونا۔لیکن نحر کے معنی ہیں دسترس پیدا کرنا، کسی بات پر حاوی ہو جانا، اسے اچھی طرح حاصل کر لینا۔

وَانْحَرْ (108/2) کے معنی ہوں گے، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری پوری طرح حاوی ہو کر، ان پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا رہو۔

لیکن اگر اس آیت میں وَانْحَرْ سے مراد ''اونٹ'' کا ذبح کرنا'' لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ہجرت کے بعد جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا۔ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈ ہتی ہیں اور اس کے لیے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں۔یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ہاں حلال۔وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے۔وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے۔قرآن کریم نے عین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں ''اونٹ ذبح کرو''۔یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو۔چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی قوت پیدا کر لی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ [اس ضمن میں بعض نے کہا ہے کہ عبرانی زبان میں ''کوثر'' حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں۔اَلْكَوْثَرَ (108/1)۔اِسی سے مُعرّب ہے اس اعتبار سے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (108/1) کے معنی ہوں گے ''ہم نے تجھے (اونٹ) بطورِ حلال ذبیحے کے عطا کیا''، لیکن

ہم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی۔

ن ح ل

سورہ نساء میں ہے: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (4/4) عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ، بلا بدل دے دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر وہ عطیہ (Gift) ہے جو مرد کی طرف سے عورت کو کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر تحفۃً دیا جاتا ہے۔

جس طرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے شہد جیسی مفید چیز عطا کر دیتی ہے، اسی طرح نِحْلَةٌ وہ شیریں تحفہ ہے جو عورت کو بطیب خاطر اور بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے دیا جاتا ہے۔ یہ ہے مہر کی حقیقت۔ (قرآن کریم میں مہر کا لفظ نہیں آیا) یعنی یہ کوئی معین رقم نہیں جو بطور معاوضہ دی جائے۔ بلکہ تحفہ ہے جو کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، مؤدت اور محبت کے اظہار کے لیے دیا جائے۔ اور جس پر دونوں فریق رضا مند ہو جائیں۔ مقصود اس سے عورت کا وزن بڑھانا، اس کے وقار میں اضافہ کرنا ہے۔

ن د و (ی)

اَلنَّدْوَةُ جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ دَارُ النَّدْوَةِ مکہ میں ایک مکان تھا جس میں قریش مشورہ کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ سورۃ المؤمن میں يَوْمَ التَّنَادِ (40/32) آیا ہے جس کے معنی یہ کہہ کر بتا دیئے گئے ہیں کہ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ (40/33) جس دن تم منہ پھیر کر بھاگ رہے ہوں گے۔ یعنی جس دن تم ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکارو گے لیکن کوئی کسی دوسرے کی مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ سب، دہشت اور خوف کے مارے منہ پھیرے، اُلٹے پاؤں بھاگ رہے ہوں گے۔ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ (40/33)۔ اس دن) ''تمہیں خدا کی گرفت سے (مکافاتِ عمل سے) بچانے والا کوئی نہیں ہوگا''۔ یہ ہے يَوْمَ التَّنَادِ۔ جس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو اور کوئی کسی کو لاکھ آوازیں دے، اس کی مدد کے لیے پہنچنا تو درکنار، وہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔

ن ز ع

سورۃ الطور میں جنت کی زندگی کے ضمن میں فرمایا: يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا (52/23)۔ ''وہ اس میں ایک دوسرے سے پیالہ لیں گے''۔ اگر اس کے عام معنی لیے جائیں تو یہ نقشہ ہے ان دوستانہ صحبتوں کا جس میں پورے خلوص و محبت کے ساتھ بے تکلفی سے چھین جھپٹ ہوتی ہے اور لطف صحبت دوبالا ہو جاتا ہے (لیکن اس میں لغویت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اس سے اگلی آیت سے ظاہر ہے) علاوہ ازیں، تَنَازُعٌ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ''لو۔ یہ پیالہ تم پیو''۔ وہ جواب میں کہتا

ہے ''نہیں ۔تم پیؤ''۔ یہ باہمی پیش کش اور اصرار و انکار ایسا حسین تنازع ہے جس کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ یہ ہے جنتی معاشرہ میں اربابِ ذوق و محبت کی مخلصانہ محفلوں کا رنگ۔

اور اگر اس سے ذرا بلند ہو کر دیکھا جائے تو یَتَنَازَعُوْنَ فِیْهَا كَاْسًا کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ (جماعتِ مؤمنین کے افراد) ایک دوسرے سے زندگی کی مئے حیات بخش کا پیالہ لیں گے۔جنتی زندگی، اِنفرادی زندگی نہیں جس میں ہر ایک کو نفسانفسی پڑی ہوتی ہے۔ وہاں تمام افراد ایک دوسرے سے وہ سامان لیتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو برومندی عطا کرتا ہے۔لیکن اگر ہر شخص خودغرض بن جائے اور ہر ایک کی نیت یہ ہو کہ دوسرے سے سب کچھ چھین کر خود ہی رکھ لے، تو یہ تَنَازُعٌ وہ ہے جس سے سختی سے روکا گیا ہے (8/46)۔یعنی جنتی معاشرہ میں یہ سب کچھ بطیبِ خاطر ہوگا، اور ایک دوسرے کی نشوونما کی خاطر۔لیکن غلط معاشرہ میں ہر فرد کی نیت یہ ہوگی کہ میں دوسرے سے سب کچھ چھین جھپٹ لوں اسلامی معاشرہ میں ٹکراؤ نہیں ہوتا (8/46)۔ بلکہ باہمی ہم آہنگی اور وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (8/63) کی زندگی ہوتی ہے۔

نزل

سورۃ حجر میں ہے کہ ہمارے پاس مختلف چیزوں کے خزانوں کے خزانے رکھے ہیں وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (15/21)۔لیکن ہم انہیں ایک مناسب اندازے کے مطابق برآمد کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں کائنات میں موجود نہیں ان کے نازل کرنے کے معنے یہ ہوں گے کہ انسان اپنی تحقیقات اور سعی و کاوش کے ذریعے انہیں حاصل کرتا ہے لہٰذا ان مقامات پر اِنْزَالٌ کے معنی ان اسباب کا بہم پہنچانا ہے جن سے انسان ان چیزوں کو حاصل کرسکتا ہے۔ان چیزوں کے ذخیرے کائنات میں موجود ہیں۔ان کا حصول، انسان کی محنت پر منحصر ہے۔

قرآن کریم کے لیے تَنْزِیْلٌ (نازل کرنے) کا جو لفظ آیا ہے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ وحی، رسول کے اپنے ذہن کی پیدا کردہ (Subjectiv) چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اسے خارج سے (Objectively) ملتی ہے۔ وحی ایک خارجی حقیقت ہے، انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔اس لیے وحی کسب و ہنر سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف منزّل من اللہ (خدا کی طرف سے عطا کردہ) ہوتی ہے مادی کائنات میں انسان اپنی سعی و کاوش سے چیزوں کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتا ہے۔ اسے (Discovery) کہتے ہیں۔لیکن وحی میں حقیقت خود اپنے آپ کو نبی پر منکشف (Reveal) کرتی ہے۔اس لیے اس کے لیے اِنْزَالٌ کا لفظ آیا ہے۔یعنی انسان خود بلند ہوتا ہوا حقیقت کے چہرے سے پردہ کشائی نہیں کرتا بلکہ حقیقت خود نیچے اتر کر اس کے سامنے بے نقاب ہوجاتی ہے۔ یہ چیز وحی کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔اور چونکہ وحی کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ختم ہوگیا، اس لیے اب انسانوں کے پاس علم کے دو ہی ذریعے رہ گئے۔ایک قرآن کریم کے اندر محفوظ حقائق اور دوسرے خارجی کائنات میں انسانی علم و عقل کی رو سے منکشف کردہ حقائق۔ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعہ علم انسان کے پاس نہیں۔

باطنی کشف کا دعویٰ درحقیقت وحی کا دعویٰ ہے، فرق صرف الفاظ کا ہے۔ قرآن کریم میں ''کشف والہام'' کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے اس قسم کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ انسان میں بعض قوتیں ایسی ہیں (مثلاً قوتِ خیالی یا قوت ارادی) کہ اگر خاص مشقوں کے ذریعے ان کی نشوونما (Development) کر لی جائے تو ان میں ایسی خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ اسے لوگ کشف وکرامات سمجھنے لگتے اور ''روحانی قوت'' کا مظاہر قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ''روحانیت'' سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ نہ ہی دین سے کوئی واسطہ۔ اس لیے کہ جو انسان بھی چاہے وہ ان مشقوں کے ذریعے ایسی قوت حاصل کر سکتا ہے، خواہ مشرک، کافر اور دہریہ بھی کیوں نہ ہو۔ دین کا مقصود اس قسم کی قوتیں پیدا کرنا نہیں۔ آدمی کو انسان بنانا ہے۔

نسخ

نَسْخٌ کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لیے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم۔ اس لیے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے۔

ناسخ ومنسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض ''ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دیئے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ (مثلاً آیۂ رجم۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت)۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ۔

① قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے اور

② ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ دوسری قسم کی آیات کے لیے تو دلیل صرف روایات کی ہے لیکن پہلی قسم کی آیات کے لیے خود قرآن کریم کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے اور وہ آیت یہ ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2/106)۔ اس کا

ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: ''ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔''

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہیے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس لیے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اُسی طرح موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رُو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رُو سے کیا گیا۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

باقی رہا ''فراموش کرا دینے'' کا سوال۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں۔ یہ مراد ہے اَوۡ نُنۡسِهَا سے۔ اس کی دلیل میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے: سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى ○ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا يَخۡفٰى ○ (87/6-7)۔ جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا، ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا، قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لیے وہ قرآن کریم کے اُس حکم کو منسوخ کر کے اُس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کون سی آیت منسوخ ہے اور کون سی اس کی ناسخ۔ اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ تصور کہ حضور ﷺ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔ یاللعجب!

اب دیکھئے اس آیت (مَا نَنۡسَخۡ) کا صحیح مفہوم۔ پیچھے سے سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہ ﷺ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے) اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسیٰؑ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دیئے تھے، اور وہ احکام توریت وغیرہ میں موجود ہیں تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس آیت میں اِسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا

کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت حضرت نوحؑ کے زمانے سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اُسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف سے وہ احکام بھیجے جاتے تھے اور اُنہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آ جاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا۔ اس طرح یہ جدید وحی اُس سابقہ وحی کی قائمقام (ناسخ) بن جاتی۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ توریت کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسیٰؑ نے آ کر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اس کی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اُوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اس لیے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دیئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لیے جاتے تھے۔ تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی۔ تو وہ ''روکے ہوئے'' احکام و قوانین اُس وقت نازل کر دیئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔ نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد اس کی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی، بعض کو فراموش کر دیتی۔ اس لیے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے ازسرنو تازہ کر دیا جاتا۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ اب وہ دور آ گیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کر لے گا۔ لہٰذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ

① سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو اِن کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کر کے ان کی جگہ، دوسرے احکام و قوانین بھیج دیئے جائیں۔ اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو رہا ہے اس لیے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہوں گے۔ اس لیے یہ احکام و قوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے۔

② وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے، اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے، کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا۔

③ اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام و قوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کر دی گئی ہے (ان کی مثل احکام دے دیئے گئے ہیں)۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لیے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے۔ اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اِسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اِس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں۔ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ (2/137)۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پا سکیں گے۔ اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے۔

یہ ہے صحیح مفہوم مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا کا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں۔

نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا۔ آیتؐ کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیَاتُ اللّٰہِ کہا ہے۔ مثلاً اسی سورۃ میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا: فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2/38)۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ اور اس سے آگے ہے: وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ (2/39)۔ ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے۔۔۔ یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ (2/106) میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے۔ جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (16/101)۔ ''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں''۔

اس کے بعد لفظ نُنۡسِهَا ہے۔ یہ لفظ نَسِیَ سے ہے۔ نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا، یا فراموش کر دینا آتے ہیں۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آجاتی ہے کہ سابقہ کتب آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سرِ نو محکم کر دیتا (22/52)۔ یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کر دیتے تھے۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کر دیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔

نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے آیت نُنۡسِهَا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ

احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے، انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مُهَيْمِنٌ ہے (5/48)۔ یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہو گئے ہیں۔ اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لیے دینے تھے ان سب کی تکمیل ہو گئی ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6/115)۔ اور اب اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6/115)۔ نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ ہی انسانوں میں سے کوئی اس میں ردّ و بدل کر سکے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (15/9)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے وحی کا سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ کہہ کر دے دیا جاتا ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2/106)۔ خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دَور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے۔ یہ سب کچھ اُن اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اُسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے۔

یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔ البتہ ہر حکم خاص حالت کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اس کی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ کے لیے وضو کرنے کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے تو یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے (5/6)۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آ جائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آ جائے گا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لیے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس، محتاج، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

مَا نَنْسَخْ والی آیت (2/106) یا سورۃ النحل کی آیت وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (16/101) میں اگر اٰيَةً سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لیے جائیں (جنہیں قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارا ہے) تو ''نسخ

آیت'' سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آ جانا۔ ارباب علم وتحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کس طرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق وسباق کا تعلق وحی سے ہے اس لیے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اوّل الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر، یہ حقیقت ہے کہ اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو۔ اس غیر متبدّل صحیفۂ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ شَهِيْد۔

ن س ک

سورۃ انعام میں ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (6/162)۔ ان سے کہو کہ میری صلوٰۃ اور میرے نُسُكُ۔ میری زندگی اور میری موت۔ سب خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے لیے وقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلوٰۃ سے مراد جملہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے اور نُسُكُ سے مراد زندگی کا طور طریقہ۔

سورۃ حج میں ایک جامع آیت ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ (22/67)۔ ''ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر انہیں چلنا تھا۔ سو یہ لوگ تم سے امر کے معاملہ میں جھگڑا نہ کریں۔ تو انہیں اپنے رب کی طرف دعوت دیتا رہ'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر تو اصل قانون ہے جو ہمیشہ غیر مبدّل رہا ہے۔ اور مَنَاسِكُ اس کی وہ جزئیات وفروعات (طور طریقے) ہیں جو زمان اور مکان کے تقاضوں کے مطابق اس امر کو نافذ کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں۔ مَنَاسِكُ تو مختلف رہے ہیں، لیکن امر متنازعہ فیہ نہیں ہوسکتا۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر اس امر کی طرف تھی جسے اہل مذاہب نے چھوڑ کر صرف مَنَاسِكُ کو دین بنا لیا تھا۔ اصل دین کی یہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (22/67)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اس اصل کو تسلیم کر لے تو پھر اُسے اس نظام (دین) کی جزئیات پر بھی عمل پیرا ہونا ہوگا۔ کیونکہ جب دین، اجتماعی نظام کا نام ٹھہرا تو یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی فرد اس اجتماعی نظام کا رکن ہو لیکن اس کی جزئیات میں اختلاف کرے۔ اس سے نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کہ جب مناسک مختلف اقوام میں بدلتے رہے ہیں تو امت کے مختلف ادوار میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان مناسک میں تبدیلی ہوسکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین نہ کیا ہو بلکہ وہ کسی زمانے میں باہمی مشاورت سے متعین کئے گئے ہوں۔ یہ تبدیلی قرآنی نظام کی طرف سے ہوگی۔ افراد کو اس کا حق نہیں ہوگا۔

ن ص ب

سورۃ غاشیہ میں ہے: عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (88/3)۔ وہ لوگ جو محنت و مشقت کر کے تھک جائیں۔ محنت اور مشقت ہر کام میں کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ محنت صحیح راستے پر کی جائے تو اس کام کا نتیجہ حسب منشا مرتّب ہوجاتا ہے۔ اس محنت سے انسان میں تکان پیدا نہیں ہوتی۔ اگر وہی محنت غلط طریق پر کی جائے تو اس کا صحیح نتیجہ مرتّب نہیں ہوتا اور اس طرح وہ محنت انسان کو بری طرح تھکا دیتی ہے اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے: فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (18/105)۔ ان کے اعمال رائگاں گئے، انہوں نے صحیح نتیجہ پیدا نہ کیا۔ یہ ہیں عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (88/3)۔ وہ لوگ جنہوں نے قوانین خداوندی کے مطابق کام نہ کیا اس لیے ان کے حصے میں تکان اور ماندگی کے علاوہ کچھ نہ آیا۔

سورہ انشراح میں ہے: فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (94/7) اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو مخالفتوں کے بادل چھٹ چکے ہیں تو تمہارے پروگرام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے لیے تم مزید جدوجہد شروع کرو۔ عام طور پر جب مخالفت ختم ہوجائے تو پروگرام مکمل ہوجاتا ہے، لیکن اقامت نظام خداوندی کے پروگرام کا دوسرا حصہ مخالفت ختم ہونے بعد شروع ہوتا ہے۔ مخالفت کا ختم ہونا گویا حصہ لَا ہے اس کے بعد حصہ اِلَّا (یعنی مثبت پروگرام) شروع ہوتا ہے۔ یوں اس جماعت کی ساری زندگی جدوجہد میں گزرتی ہے۔

ن ص ح

رسول ﷺ اپنی قوم سے یہی کہتے تھے کہ وَاَنْصَحُ لَكُمْ (7/62)۔ میں تمہاری چارہ سازی اور سازگاری کے لیے آیا ہوں۔ میں نہایت خلوص سے تمہارے پیرہن انسانیت کی رفوگری کی کوشش کر رہا ہوں تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (66/8)۔ تم خدا کی راہ کی طرف اس طرح واپس آؤ کہ اس سے ہٹ کر پھر کسی اور راستے کو اختیار نہ کرو۔ اپنے آپ کو اس راستے کے ساتھ نہایت اخلاص کے ساتھ متمسک کرلو۔ اس سے پیوست ہوجاؤ۔

ن ص ر

خدا کی نصرت ان ثمرات کو کہتے ہیں جو اس کے قانون کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا کی نصرت (یا تائید غیبی) یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی۔ خدا کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (47/7)۔ اے ایمان والو۔ اگر تم نے خدا کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ خدا کی مدد کرنے کے معنی ہیں کہ اس کے متعین کردہ نظام کو دنیا میں قائم کرو، اس کے قوانین کے مطابق عمل کرو۔ اگر تم نے یہ کردیا تو اس نظام اور قانون کی برکات تمہارے شامل حال ہوجائے گی اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (47/7) وہ تمہارے پاؤں جما دے گا، تمہیں ثابت قدمی عطا کر

دے گا۔اس کے برعکس، جولوگ اس قانون کے مطابق چلنے سے انکار کریں اَضَلَّ اَعۡمَالَهُمۡ (47/8) ان کے اعمال بے نتیجہ رہ جائیں گے۔

ن ض خ

قرآن کریم نے ''جنتی باغات'' کے متعلق کہا ہے کہ ان میں عَيۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (55/66) ہیں۔ جوش مار کر ابلنے والے چشمے۔ وہ قوتیں جو فوارہ ① کی طرح اپنے زورِدروں سے بلندیوں کی طرف لے جائیں۔

ن ط ق

اہل جہنم اپنے جسموں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کس طرح شہادت دی۔ وہ کہیں گے کہ اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَیۡءٍ (41/21)۔ ہمیں اُس خدا نے بولنے کی قوت دی جس نے تمام اشیاء کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نُطۡقٌ ② سے مراد زبان سے باتیں کرنا نہیں بلکہ کسی طرح حقیقت کو واضح کرنا ہیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ تمہاری ہر نقل وحرکت اس کی شہادت دیتی ہے کہ۔۔۔۔

سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو مَنۡطِقَ الطَّیۡرِ (27/16) سکھائی گئی تھی۔ اگر اس سے مفہوم ''پرندوں کی بولی'' لیا جائے تو اس سے مراد ہوگی وہ علم جس سے انسان، پرندوں کی نقل وحرکت اور آوازوں سے ان کی کیفیات کا اندازہ کرسکتا ہے۔ یہ چیز پرندوں کے احوال وکوائف کے مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔

ن ظ ر

سورۃ بقرہ میں ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ (2/280) ''اسے فراخی تک مہلت دے دینا چاہیے۔''

ن ع ق

سورہ بقرہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کیے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ مَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً (2/171) ''حقائق سے انکار کرنے

---

① علامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں ایک قطعہ جس کا عنوان ''فوارہ'' رکھا ہے، فرماتے ہیں:

یہ آبجو کی روانی، یہ ہمکناریٔ خاک — مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ

اُدھر نہ دیکھ اِدھر دیکھ اے جوانِ عزیز — بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

② اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (Video) متحرک تصاویر کے ذریعے وہ تمام احوال وکوائف دکھا دیئے ہوں۔

والوں کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو اسے آواز دے رہا ہو جو بجز پکارنے اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔'' (یعنی صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَھُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ، بہرے، گونگے، اندھے جو عقل سے کام نہیں لیتے)۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے ہمارے مروجہ مذہب کی کیسی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ عوام بھیڑ بکریاں ہیں اور ان کے پیشوا چرواہے جنہوں نے اپنے آباء سے چند الفاظ سن رکھے ہیں جنہیں وہ بلا سمجھے بوجھے دہراتے رہتے ہیں اور عوام ان کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے رہتے ہیں۔

ن ع م

معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، بلند اور اذیت و تکلیف سے دور ہو جانا نِعۡمَتٌ ہے۔ قرآن کریم نے اس قوم کو جو زندگی کے بہترین اور بلند ترین مقام پر ہو مَنۡعَمٌ عَلَیۡہِ سے تعبیر کیا ہے اور انہی کے راستے پر چلنے کی دعائیں سکھائی گئی ہیں (1/6)۔ انہی لوگوں کو قرآن کریم مومن کہتا ہے۔ لہٰذا جنہیں یہ کچھ حاصل نہیں یا جو اس کے حصول کی جدوجہد نہیں کرتے، سمجھ لیجئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مومن نہیں۔

ن ف ث

قرآن کریم میں مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ (113/4) آیا ہے۔ عُقَدٌ کے معنی ہیں پختہ گرہیں۔ لہٰذا نَفّٰثٰتٌ کے معنی ہوئے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی سے ان کے عزم راسخ کو کمزور کر دیں۔ جو محکم ارادوں میں پھونک مار دیں۔ اس سے مراد وہ قومیں یا جماعتیں ہیں جو اپنے جھوٹے پراپیگنڈہ سے انسانوں کی فطری ترقی کو روک دیتی ہیں۔ اس قسم کے عمل کو جس سے دوسرا کمزور پڑ جائے عرب ''سحر'' یا ''جادو'' کہتے تھے۔

ن ف خ

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں متعدد مقامات پر نَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ (32/9) یا نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ (15/29) کے الفاظ آئے ہیں۔ رُوۡحٌ سے مراد الوہیاتی توانائی (اختیار و ارادہ وغیرہ کی قوت، انسانی ذات یا Personality) ہے جو تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ملی ہے۔ اس لیے نَفۡخِ رَوۡح سے مراد ہوا کی طرح کچھ پھونکنا نہیں بلکہ انسانی قوتوں اور توانائیوں کا عطا کرنا ہے جس سے بلندیاں نصیب ہو جائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف سورۃ آل عمران میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کروں گا جس سے تمہارے اندر زندگی کی تازگی اور توانائی پیدا ہو جائے گی۔ جس سے تمہیں دنیا میں بلندیاں نصیب ہو جائیں گی اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَھَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ (3/49)۔ میں تمہیں ایسی نئی زندگی عطا کروں گا جس

سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی کی پستی سے ابھر کر فضا میں اُڑنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ میں تم میں ایسی روح پھونکوں گا جس سے تمہیں قانون خداوندی کی رو سے، بے انتہا بلندیاں نصیب ہو جائیں گی۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را

ن ف ذ

قرآن کریم میں ایک عظیم آیت ہے جس سے انسانی اِرتقاء کے ممکنات پر روشنی پڑتی ہے۔ سورۃ رحمٰن میں ہے یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (6/130)۔ اے گروہ جن وانس! (یعنی وہ انسان جو شہروں کے رہنے والے ہوں یا صحرا نشین: اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا (55/33)۔ اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو کہ آسمان وزمین (یعنی اس مادی کائنات) کے کناروں کو چیر کر آگے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (55/33)۔ تم سُلْطَانٌ (قدرت وغلبہ) کے بغیر نہیں نکل سکو گے۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسان کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس مادی کائنات کے حدود سے باہر چلا جائے۔ لیکن اس کے لیے اسے ایک خاص قوت کی ضرورت ہوگی جو مادی موانعات پر غالب آسکے۔ یہ قوت وحی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے (اس لیے قرآن کریم نے خود وحی کو سُلْطَانٌ کہا ہے)۔ یعنی وحی کے اتباع سے انسانی ذات میں ایسی نشوونما آسکتی ہے کہ وہ مادی چار دیواری سے آگے نکل کر زندگی کے دیگر مراحل طے کرنے اور حیاتِ جاوید حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ حیوانی سطح پر زندگی محض آب وگل کی طبعی زندگی ہوتی ہے لیکن انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس میں حیات جاوید کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نام وہ سُلْطَانٌ ہے جس سے زندگی آب وگل کی چار دیواری سے نکل کر آگے جاسکتی ہے۔ یاد رکھئے! مادی کائنات سے باہر نکلنے سے مراد انسان کے جسم کی پرواز نہیں۔ اس سے مراد اس کی ذات (Personality) کا ارتقاء ہے۔ جسمانی پرواز سے انسان جتنا اونچا جی چاہے اُڑ جائے، وہ بہر حال مادی کائنات کی چار دیواری کے اندر ہی رہے گا۔ مادی کائنات سے سے آگے نکل جانا انسانی ذات ہی کے لیے ممکن ہے یعنی موت کے بعد حیات جاوداں حاصل کرنا۔ اس زندگی میں انسان کے لیے مادی کائنات کے حدود سے باہر نکل جانا ناممکن ہے۔ یہ چیز مرنے کے بعد، اگلی زندگی میں ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اسی دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی اپنی ''روحانی قوت'' سے مادی کائنات کے حدود سے باہر چلے جاتے ہیں، وہ محض اپنے خیالات کی رو سے ایسا سمجھتے ہیں۔ اپنے تخیل میں آپ جہاں جی چاہے چلے جائیے اس کے لیے کسی قوت (سلطان) کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم کی رو سے انسان مادی کائنات سے باہر مرنے کے بعد ہی جاسکتا

ہے۔ اُسی زندگی میں پہنچ کر اسے حیاتِ جاوید حاصل ہو سکتی ہے۔

نفس

قرآن کریم میں ہے: يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (3/27) اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ اَنْفُسٌ کے معنی بھائی بند بھی ہیں (2/84) اور خود اپنا آپ بھی (2/44)۔ اس قسم کے مقامات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (Myself) یا (Yourself) یا (Himself) وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں اس لفظ (نَفْسٌ) کو قرآن کریم نے اس ''شئے'' کے لیے بھی استعمال کیا ہے جسے ہم انسانی ذات (Human Personality) یا (اقبال کی اصطلاح میں) خودی (Self) یا انا (I am ness) کہتے ہیں۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پر استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصوراتِ حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (Physical Life) ہے۔ انسانی طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رو سے یہ آخر الامر مَر جاتا ہے۔ اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریہ حیات (Materialistic Concept of Life) کہتے ہیں۔ جسے عام طور پر ''مغربی تہذیب'' کہا جاتا ہے وہ اِسی نظریہ حیات کی مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے، نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کریں گے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آ گئی ہے، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس قسم کے ایمان کو ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔ (دیکھئے مثلاً: 29/61-64؛ 23/84-88؛ 31/25؛ 39/38؛ 43/9)۔ اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اسی طبیعی زندگی کا نام ہے، موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے، تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے یا زیادہ سے زیادہ، جسے معاشرہ (سوسائٹی) اچھا کہہ دے۔ اور شر وہ جس سے اسے نقصان پہنچے یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں

ہوسکتا۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے، اور بس۔ قرآن کریم اسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں ہے: ''اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ'' کیا تم نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنالیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ'' وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنے علم کے باوجود غلط روش زندگی پر چلتا ہے۔ ''وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً'' اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (45/23) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے اس کی صحیح راستے کی طرف، بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کرسکتا ہے؟ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں ''وَ قَالُوۡا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا يُهۡلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهۡرُ'' جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم (قوانین طبیعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ اور مرورِ زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کردیتا ہے۔ وَمَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ‌ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ (45/24) انہیں حقیقت حال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لے کر اس قسم کا تصور قائم کرلیتے ہیں۔

قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَتَمَتَّعُوۡنَ وَيَاۡكُلُوۡنَ كَمَا تَاۡكُلُ الۡاَنۡعَامُ (47/12) جو لوگ (بلند سطح زندگی سے) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں اور سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے (اور پھر مر جاتے) ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور ''شے'' بھی ہے جسے اس کی ذات، یا نَفۡسٌ کہتے ہیں۔ یہ قوانین طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی، نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور مرنے کے بعد وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کی رو سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں (اور جو اَب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات پر ''ایمان'' اور خدا، وحی، نبوت اور آخرت پر ایمان کس طرح لازم و ملزوم ہیں۔

''انسانی ذات کیا ہے؟'' یہ نہ بتایا جاسکتا ہے نہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی ''شے'' ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے۔ اختیار و اردہ (بصورت مطلق اور کلی طور پر) خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ، (محدود شکل میں)

انسان کو حاصل ہے۔اس کے سوا کائنات میں کسی اور کو اختیار وارادہ حاصل نہیں۔اسی لیے اسے خدا نے ''روحنا'' کہہ کر پکارا ہے۔یعنی الوہیاتی توانائی (Divine Energy)۔اگر نسان قوانین خداوندی کا اتباع کرے تو اس کی ذات میں (حد بشریت کے اندر) صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی جاتی ہیں۔اسی کو اس کی ذات کا نشوونما کہتے ہیں۔واضح رہے کہ انسانی ذات، ذات خداوندی کا جز نہیں۔ذات (وہ خدا کی ہو یا انسان کی) ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible whole) ہوتی ہے جس کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔

چونکہ انسان کے ہر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ہوتی ہے، اس لیے اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی (40/19)۔یہی اس کا ''اعمال نامہ'' ہے جو اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے (17/13)۔اسی کو وہ ظہور نتائج کے وقت پڑھے گا۔اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17/14) ''تو آج اپنی کتاب پڑھ۔آج تیرا نفس خود تیرا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔'' (نیز 75/14-15)۔اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (Individuality) ثابت ہوتی ہے۔(19/95؛6/95)۔یعنی ہر انسانی ذات منفرد (Unique) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6/165)۔ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔جب اتباع قوانین خداوندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو اس میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں۔لیکن جس ذات کی نشوونما نہیں ہوتی، وہ آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے۔یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے۔

یوں تو انسانی ذات کی نشوونما کے لیے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بن کر ہی کیا جاسکتا ہے) لیکن قرآن کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد خود کھاتا (یا لیتا) ہے۔یہ نہیں ہوسکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے۔اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دیں۔وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ○ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92/16-17) جہنم سے اسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے اسے) اپنی نشوونما کے لیے دیتا ہے۔تقویٰ شعار بھی وہی ہوا ہے جو ''دیتا ہے''۔فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (92/6) ''جو دیتا ہے اور (اس طرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے۔''

یاد رہے کہ انسانی ذات، ایک ملکہ، ایک صلاحیت، استعداد یا امکانی قوت ہے جو بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر۔ دوسری ہر قوت کی طرح، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے۔جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (Higher

Values) کے تحفظ اور استحکام کے لیے عمل میں لاتا ہے تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے (اسی سے اس کی نشوونما ہوتی ہے)۔ اور جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو پست مفادِ خویش کے خاطر استعمال کرتا ہے (جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایغو (Ego) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایغو حیوانی سطح زندگی پر ہوتا ہے اور ذات، انسانی سطح زندگی پر۔ جب انسانی جذبات (Emotions) ایغو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں ''ہویٰ'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اس مادے میں پستی کا مفہوم ہوتا ہے۔ اور جب عقل (Intellect) ایغو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر وفن کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس جب جذبات انسانی ذات کے ماتحت رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل، انسانی ذات کے تابعِ فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بداماں ہوجاتا ہے۔ (اقبال اول الذکر عقل کو، عقلِ خود بیں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں بیں یا خرد ''ادب خوردہ دل'' کہہ کر پکارتا ہے)۔

جب ایغو کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر پست مفاد کی طرف جاتا ہے تو اسے عام طور پر ''نفس امارہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے جس میں اس نے عزیز مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (12/53) یقیناً نفس، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفس انسانی، ہے ہی برائی کا حکم دینے والا۔ بالکل نہیں۔ یہ ایغو کے متعلق کہا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہے: اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (12/53) بجز اس کے جس پر خدا کی رحمت ہو۔ یہ نفس کی وہ سطح ہے جسے ہم نے ''انسانی ذات'' سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات نفس انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہوجائے تو اس کے بعد اس میں احساس ندامت بیدار ہوجاتا ہے۔ یہ درحقیقت، ایغو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش کی حالت ہوتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے نفس لوامہ کہا ہے (75/2)۔ یعنی ''ملامت کرنے والا نفس۔'' اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر و شر میں خود تمیز کرسکے۔ خیر و شر کی تمیز صرف وحی کی رو سے ہوسکتی ہے۔ نفس لوامہ اُسی بات پر ملامت کرے گا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے وہ درحقیقت معیوب ہو، اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے وہ درحقیقت ممدوح ہو۔

جب انسان خالص قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہے تو ایغو اور ذات کی کشمکش ختم ہوجاتی ہے۔ ذات، پست جاذبیتوں پر غالب آجاتی ہے (39/29)۔ اسے قرآن کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے (89/27)۔ جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے (89/29)۔ اسے، عصر حاضر کی علم النفس کی زبان میں (Integrated Personality) کہا جائے گا۔ اس کے برعکس (Disintegrated Personality) ہوگی۔ قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (91/8-9) سے

تعبیر کیا ہے۔اور ذات کی نشوونما (Development) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے (91/10)۔

چونکہ انسانی ذات، امکانی شکل (Realisable Form) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے، اس لیے اس کی بنا پر ہر فرزند آدم، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17/70) ''ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔'' ذات کی تکریم کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے۔ انسانی اختیار وارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لیے کسی کے اختیار وارادہ کو سلب کر لینا، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکومی کہتے ہیں) اُسے شرف انسانیت سے محروم کر دینا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اطاعت یا محکومی، صرف قوانین خداوندی کی ہوسکتی ہے۔ یہ اطاعت، کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا۔ انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ (اطاعت کے معنی ہی بطیب خاطر، برضا ورغبت، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لیے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2/286) سے یہی مراد ہے۔ یعنی قوانین خداوندی انسان پر جو پابندیاں عائد کرتے ہیں تو اس سے مقصد، خود انسانی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا۔ قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اس طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہوجاتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔ خانقاہیت کی تجردگاہوں میں انسانی ذات کی نشوونما کبھی نہیں ہوسکتی۔ جنت کے لیے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ (89/29) پہلی شرط ہے۔

سورۃ زمر میں ایک آیت ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (39/42) ''اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا حکم ہوجاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیج دیتا ہے۔'' سوال یہ ہے کہ اس آیت میں ''نفس'' سے کیا مطلب ہے جسے موت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف کر دیا جاتا ہے اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اسے واپس کر دیا جاتا ہے، لیکن بصورتِ موت اسے واپس نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک نیند کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے، بجز شعور (Consciousness) کے۔ (حتیٰ کہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے)۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس آیت میں ''نفس'' سے مراد اس کی شعوری حالت ہے۔ یعنی نیند اور موت دونوں حالتوں میں انسان کا شعور باقی نہیں رہتا۔ سونے والا جب جاگ اٹھتا ہے تو اس کا شعور پھر روبہ عمل ہوجاتا ہے، لیکن موت کی صورت میں شعور کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ موت کے بعد، شعور کے روبہ عمل ہونے کو حیات بعد الممات کہتے ہیں۔ اس زندگی میں شعور (یا نفس) کس طور پر روبہ عمل ہوتا ہے،

ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے۔اس لیے کہ اس وقت ہمارے شعور کے روبہ عمل ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔اور وہ ہے ہمارا مادی جسم۔ہم اس وقت،جسم کے توسط کے بغیر،شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا۔نہ ہی اس کے بتانے سے کوئی فائدہ تھا۔اس لیے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے اس کے بتانے سے حاصل کیا ہوسکتا ہے۔لیکن مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے۔اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے۔

ن ف ق

مُنَافِقٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی نظام (یا سوسائٹی) میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس سے باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے۔اِنْفَاقٌ کے معنی ہیں اپنی دولت کو کھلا رکھنا، عام کر دینا، باقی نہ رکھنا،ختم کر دینا۔قرآن کریم نے اس کے مقابل میں اِمْسَاكٌ (روک رکھنے) کا لفظ لا کر اس کے معانی کو واضح کر دیا ہے(17/100)۔

قرآن کریم میں انفاق کے بنیادی معنی اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عالمین کے لیے کھلا رکھنا ہیں۔وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (2/219) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت (ربوبیت عامہ کے لیے) کھلا رکھیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔یعنی فاضلہ دولت (Surplus Money) جو سرمایہ داری کی بنیاد ہے،سب کی سب ربوبیت عامہ کے لیے وقف ہونی چاہیے۔یہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتی۔

یہ قرآنی نظام کا بنیادی نقطہ ہے۔مومن کی ہمیانی[1] کے دونوں سرے کھلے رہتے ہیں اور یہ ہمیانی نظام کے ہاتھ میں رہتی ہے۔اس میں ہر فرد اپنی محنت کا ماحصل ڈالتا جاتا ہے اور نظام ربوبیت اسے نوع انسانی کی نشوونما کے لیے صرف کرتا جاتا ہے۔چونکہ اس نظام میں ہر فرد کو کچھ بچا کر رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، نہ ہی اسے اپنے یا اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق کوئی خدشہ یا اندیشہ رہتا ہے۔یہ تمام ذمہ داریاں نظام کے سر ہوتی ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے۔

بناء بریں ان مقامات میں انفاق کے معنی خرچ کرنے کی بجائے کھلا رکھنا زیادہ مناسب ہیں۔''کھلا رکھنے'' کا مطلب ہوگا نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لیے نظام خداوندی کی تحویل میں رکھنا۔نَفَقَةً (9/121) ہر وہ چیز جسے اس طرح کھلا رکھا جائے۔بعض مقامات میں اس کے معنی خرچ کرنے کے بھی آئیں گے۔

---

① ہمیانی یعنی کپڑے کی تھیلی جس میں پرانے زمانے میں دولت رکھی جاتی تھی۔(منظور الحسن)

معاشرہ میں منافق سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں،۔ایک تو وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ نظام خداوندی سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ یہ مومن ہیں۔دوسرے وہ ہیں جو کھلے بندوں اس نظام سے باہر رہتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔انہیں کافر کہیئے۔تیسرے وہ ہیں جو محض اپنی مطلب براری کے لیے جماعت مومنین کے ساتھ شامل ہوجاتے ہیں۔منافع میں ان کے برابر شریک رہتے ہیں اور جہاں کسی مشکل کا سامنا ہوا،تو یا جماعت کا ساتھ چھوڑ کر صاف نکل گئے اور یا اس میں بددلی پھیلانے اور فتنہ پردازی کرنے لگ گئے۔ یہ منافق ہیں اور بدترین خلائق۔اسی لیے قرآن کریم نے ان کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ (4/145) بتایا ہے۔قرآن کریم نے (سورۃ فاتحہ کے بعد) سب سے پہلے انہی تینوں جماعتوں (مومن،کافر،منافق) کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے۔اس کے بعد،سارے قرآن کریم میں ان تین جماعتوں کا ذکر ہے۔یہ جماعتیں زمانہ نزول قرآن تک محدود نہ تھیں۔یہ ہمیشہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ان کی خصوصیات اس قدر طول طویل ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔

ن ف ی

قرآن کریم میں ان لوگوں کے متعلق جو نظام خداوندی (اسلامی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں اور نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں کہا گیا ہے کہ انہیں قتل کردو یا سولی چڑھادو یا ''قطع ید و رجل'' کردو۔اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (5/33) نفی کے معنی ہوں گے ملک سے الگ کردینا،جلاوطن کردینا۔لیکن مندرجہ بالا آیت میں من الارض کے اضافہ سے ظاہر ہے کہ اس کے معنی ملک بدر کردینے کے ہوں گے یا یہ کہ اسے آزادی اور دیگر مراعات سے محروم کردیا جائے۔(اس طرح زمین سے الگ کردینے کا مفہوم ہوگا اسے باقی آبادی[1] سے الگ کردینا)۔

ن ق ص

قرآن کریم میں ہے: نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ (2/155) مال میں کمی آجانا۔نظامِ خداوندی کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے میں اس جماعت کو جس مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں اموال کا نقصان بھی ہے۔لیکن اس نظام کے قیام کے بعد انہیں ہر طرح کی فراوانیاں حاصل ہوجاتی ہیں۔اگر کسی نظام کا نتیجہ لوگوں کے لیے رزق کی کمی ہو تو وہ نظام فرعونی ہے اور رزق کی کمی خدا کا عذاب۔کسی نظام کے قیام میں مشکلات اور مصائب کا سامنے آنا اور بات ہے اور اس کے نتائج کا نقصان دہ اور ضرر رساں ہونا اور بات۔قرآنی نظام کے نتائج نہایت خوش گوار ہوتے ہیں اگرچہ اس کے قیام میں مخالفین کی طرف سے پیش کردہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ان میں نقصِ مال بھی شامل ہے۔

---

[1] آج کی اصطلاح میں اس کے معنی ''نظر بند'' کردینا بھی ہوسکتے ہیں۔(منظور الحسن صاحب کتاب)

ن ق م

اللہ تعالیٰ کو ذُو انۡتِقَامٍ (3/4) کہا گیا ہے۔یعنی وہ جس کے قانون کے مطابق اعمال اپنے نتائج برآمد کرتے ہیں اور مجرموں کو سزا ملتی ہے۔ ہمارے ہاں انتقام کا لفظ اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس لیے جب یہ لفظ اللہ کے لیے بولا جائے تو اس کا وہ مفہوم نہیں لینا چاہیے جو ہم اپنے ہاں لیتے ہیں۔اس کا مفہوم مکافاتِ عمل ہے۔

ن ک ح

نِکَاحٌ کے معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں۔لیکن اس طرح ملانا جس طرح نیند آنکھوں میں گھل مل جاتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں نَکَحَ النُّعَاسُ: نینداس کی آنکھوں میں گھل گئی۔ یا جس طرح بارش کے قطرے زمین کے اندر جذب ہوجاتے ہیں۔نَکَحَ الْمَطْرُ الْاَرْضَ: بارش کا پانی زمین میں خوب جذب ہوگیا۔یہ اس وقت بولتے ہیں جب بارش کا پانی زمین کی بالائی خشک سطح سے نیچے گزر کر زمین کی نمی تک جا پہنچے۔

قرآن کریم نے مرد وعورت کی عائلی زندگی کا جونقشہ پیش کیا ہے اس میں نِکَاحٌ سے مراد کیا ہے؟ اس سے مراد ہے میاں بیوی کا ایسا تعلق جیسا آنکھ اور نیند کا ہوتا ہے۔ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہوجانا جس طرح آنکھوں میں نیند گھل جاتی ہے۔جس طرح بارش زمین میں جذب ہوجاتی ہے۔ایسا تعلق (اور وہ عمر بھر کے لیے) اسی صورت میں پیدا ہوسکتا (اور قائم رہ سکتا) ہے جب میاں بیوی میں فکر ونظر کی کامل آہنگی اور ذوق اور مزاج،خیالات وتصورات اورنظریات و معتقدات کی یک جہتی ہو۔یہ نکاح کی بنیادی شرط اور خصوصیت ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ایسے تعلق کے لیے باہمی رضامندی اولین اور بنیادی شرط ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود اس کی تصریح کردی ہے کہ اس میں تراضی مابین ضروری ہے (4/3و4/19)۔اور رضامندی اسی وقت ہوسکتی ہے جب لڑکی اور لڑکا خود فیصلہ کرنے کے قابل (یعنی بالغ) ہو چکے ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم نے بلوغت کے لیے ترکیب ہی بَلَغُوا النِّکَاحَ (4/6) کی استعمال کی ہے۔ دوسری جگہ اس کی تشریح یہ کہہ کر کردی ہے: حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ (17/35 و6/153) اور اَشُدَّہٗ کے معنی دوسری جگہ یہ کہہ کر بیان کردیئے کہ وہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر ہے (40/67)۔لہٰذا نابالغ کے نکاح کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے کسی دوسرے کی رضامندی،خود ان کی رضامندی تصور کی جاسکتی ہے۔

سورہ نور میں لَا یَجِدُوۡنَ نِکَاحًا (24/33) آیا ہے۔جس کے معنی شادی کا انتظام ہیں یا نکاح کا سامان۔اس کے معنی رشتہ بھی ہوسکتے ہیں اور وہ اخراجات بھی جو ایک میاں بیوی کے لیے گھریلو زندگی میں ضروری ہوتے ہیں نیز بیوی کا مہر۔ (باقی رہا نکاح کی تقریب پر خرچ اخراجات تو یہ محض معاشرتی رسم ہے۔قرآن کریم کی رو سے بالغ (صاحب عقل وہوش)

لڑکے اورلڑکی کا یہ معاہدہ ہے کہ وہ ان تمام حقوق وفرائض کے ساتھ جو اس باب میں خدا نے عائد کیے ہیں، ازدواجی زندگی بسر کریں گے، نکاح کہلائے گا۔ اس کے لیے قرآن کریم نے نہ کوئی تقریب مقرر کی ہے نہ رسم۔ رسوم وتقاریب معاشرتی چیزیں ہیں۔ البتہ بعد کی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس معاہدہ کی شہادت بھی ہو اور اسے کہیں منضبط (درج) بھی کرلیا جائے۔

ن ک ر

مُنْکَرٌ کے معنی ہیں عقل خودبیں کی فریب کاریاں جن سے وہ انسان کو ہمیشہ یہ سکھاتی رہتی ہے کہ تجھے صرف اپنے مفاد کی حفاظت کرنی چاہیے، دوسرے اپنی فکر آپ کریں۔ ان معانی کی وضاحت (70/22-25) سے ہوجاتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کو اگر تنہا (اس کی عقل اور مرضی پر) چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب اسے خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو اپنا ہاتھ روک لیتا ہے۔ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (70/22-25) ''لیکن مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ یعنی ان لوگوں کی جو نظامِ صلوٰۃ کے ہمیشہ پابند رہتے ہیں اور ان کے اموال میں ضرورت مندوں اور محروموں کا حق ہوتا ہے جس کا سب کو علم ہوتا ہے۔''

قرآن کریم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اکثر مقامات میں آیا ہے (مثلاً: 3/103)۔ قرآنی معاشرہ اپنی زندگی کے معمولات کے لیے قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں آئین وقوانین اور قواعد وضوابط مرتب کرتا ہے۔ جو باتیں اس طرح سے قابل قبول ٹھہرائی جاتی ہیں انہیں معروف کہا جاتا ہے۔ یعنی (Recognised by the Society) اور جن باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے انہیں مُنْکَرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ان ہر دو جامع اصطلاحات (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود ونامحمود، معقول ونامعقول، مقبول ونامقبول، پسندیدہ اور غیر پسندیدہ امور آجاتے ہیں۔ اور اس تقسیم وتفریق کا معیار ہوتا ہے قرآن کریم کا غیر متبدل ضابطہ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مَعْرُوْفٌ وہ ہیں جنہیں انسان کی ''فطرت'' پہچان لے کہ وہ صحیح ہیں اور مُنْکَرٌ وہ ہیں جن سے اس کی ''فطرت'' اِبا (یا نفرت) کرے۔ تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کرسکے۔ اگر اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہوتی (جیسے حیوانات میں جبلت ہوتی ہے) تو اس کے لیے وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مَعْرُوْفٌ وہ ہے جسے وحی قابل قبول قرار دے دے اور مُنْکَرٌ وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرا دے۔ ان میں مملکت کے قوانین وآئین سے لے کر معاشرہ کے عام قواعد وضوابط اور رسوم ورواج سب آجاتے ہیں۔ وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کرکے نہیں دیں۔ اس نے عام اصول دے دیئے ہیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے۔

لٰہذا مَعْرُوْفٌ وہ جسے قرآنی معاشرہ (Recognise) کرے اور مُنْکَرٌ وہ جسے وہ (Recognise) نہ کرے۔ چنانچہ وہ جو سورۃ ممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ معروف میں رسول کی معصیت (نافرمانی) نہیں کی جائے گی (60/12) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ہر اُس بات میں اطاعت کی جائے گی جسے قرآنی نظام قانونی حیثیت دے دے۔ اور قرآنی نظام صرف انہی باتوں کو قانونی حیثیت دے سکتا ہے جو قرآنی اصول وقوانین واحکام کے مطابق ہوں۔ جو بات قرآن کریم کے خلاف ہوگی وہ معروف نہیں بلکہ منکر ہوگی۔ یہی معروف ومنکر کا اٹل معیار ہے۔

ن ک س

سورہ یٰسین میں ہے: وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (36/68) جو بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جاتا ہے وہ (قویٰ وغیرہ کے لحاظ سے جوانی کی) بلندیوں سے پھر پستیوں کی طرف آجاتا ہے۔ جن باتوں کا پہلے علم ہوتا ہے انہیں بھی بھول جاتا ہے (22/5;16/70)۔ یہ بڑھاپے کی وجہ سے قویٰ کے مضمحل ہوجانے کا عام بیان ہے۔

ن ک ف

قرآن کریم میں ہے: لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ (4/172) مسیح (کہ جسے تم اے نصاریٰ، خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہو) اسے اس سے قطعاً عار وانقباض نہیں کہ وہ خدا کا عبد ہو۔ لٰہذا یہ مدعی سست اور گواہ چست کا عجیب معاملہ ہے کہ وہ تو خدا کا عبد بننے میں فخر محسوس کرے اور تم اسے خدا بنالو۔

ن ک ل

نَكَالٌ میں ہر وہ تدبیر شامل ہوگی جس سے کسی کو اس کی غلط روش سے روک دیا جائے اور عبرتناک سزا دی جائے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے کہ یہودیوں میں سے جن لوگوں نے احکام سبت کی خلاف ورزی کی تھی انہیں ایسی ذلت آمیز سزا دی گئی کہ وہ دوسروں کے لیے نَكَالًا بن گئی (2/66)۔ یعنی موجب عبرت۔ اسی طرح چوری (سرقہ) کی سزا کے متعلق ہے نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (5/38) یہ خدا کی تجویز کردہ ایسی سزا ہے جس سے وہ مجرم آئندہ ارتکاب جرم سے رک جائے۔ یہ اس قسم کے جرائم کے لیے روک کا کام دے گی۔ یعنی مقصد اس جرم کی روک تھام، انسداد ہے۔ ارتکاب جرم کے بعد عبرتناک سزا بھی انسداد جرم کا ایک طریق ہوتا ہے اور مناسب حالات میں (احساسِ ندامت رکھنے والے) مجرم کو معاف کرکے اس کی اصلاح کردینا بھی ایک طریقہ۔ (5/38-39) میں یہ دونوں باتیں آگئی ہیں۔

ن م ل

وادی النمل، جبرین اور عسقلان کے درمیان ہے۔ بعض کا قول ہے کہ وہ ارض شام میں ہے۔ لیکن اگر یہ وادی اُس راہ گزر پر واقع تھی جو ملکہ سبا کے ملک کی طرف جاتی تھی تو اس کا محل وقوع یمن کے نواح میں ہوگا۔ بہر حال وادی نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں بلکہ ایک قبیلہ کے مسکن کا نام ہے اور اَلنَّمْلُ اس قبیلہ کا نام۔ نَمْلَةٌ اس قبیلہ کی ایک عورت۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عام طور پر عورتیں قبائل کی رئیس ہوتی تھیں جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ یعنی ان قبائل کا تمدن (Matriarchal) یعنی مادرانہ تھا۔

ن و ب

انابت الی اللہ۔ قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ اَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ (39/54)، مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ (30/31) وغیرہ۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے شہد کی مکھی (نُوْبٌ) کی مثال سامنے لائیے۔ وہ فضا کی پہنائیوں میں سینکڑوں میل ادھر اُدھر نکل جاتی ہیں۔ مختلف وادیوں میں پھرتی اور مختلف باغات میں گھومتی ہے۔ لیکن اپنی محنت کے ماحصل کو لے کر ہر بار اپنے چھتہ (مرکز) کی طرف لوٹتی ہے۔ وہ کہیں ہو اس کا چھتہ اس کی نگاہوں کا مرکز اور اس کی گردش کا محور ہوتا ہے۔ وہ اس کی نظروں سے ایک ثانیہ کے لیے بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اس کی تمام توجہات کا قبلہ ہوتا ہے۔ یہی کیفیت سفر زندگی میں ایک مردِ مومن کی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اس کی توجہات کا مرکز اور گردشوں کا محور خدا کا قانون (اور اسے نافذ کرنے والا نظام) ہوتا ہے۔ وہ ہر فیصلہ کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی متاع حیات اور حاصل تگ و تاز کو لے کر اس کی طرف لوٹتا ہے۔ وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ (2/150) ''اور جہاں کہیں تم ہو اپنی توجہات کو اسی طرف مرکوز رکھو۔'' مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پرد دِرِ وسعت گردوں یگانہ
نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

ایک مومن دنیا بھر کے علوم وفنون کا اکتساب کرتا ہے لیکن ان کے ماحصل کا مرکز قرآنی نظام کو بناتا ہے۔ قرآنی نظام اسے پھر تمام بنی نوع انسانی کی منفعت کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ یہ ہے انابت الی اللہ کا صحیح مفہوم۔ زندگی کے ہر دوراہے پر فیصلہ کے لیے اسی کی طرف رجوع کرنا، وہیں سے راہ نمائی لینا اور اپنی محنتوں کے ماحصل کو لے کر اسی کی طرف لوٹنا۔ توبہ، لغزش کے بعد ندامت کے لیے آتا ہے اور انابت، مستقبل میں لغزشوں سے محفوظ رہنے کے لیے۔ یعنی توبہ میں انسان، غلط قدم اٹھ جانے کے بعد واپس آ کر صحیح راستے پر گامزن ہوتا ہے اور انابت میں قدم اٹھانے سے پہلے ہی سوچ لیتا

ہے کہ صحیح راستہ کون سا ہے اور پھر اسی راستے پر چلتا ہے۔ یہ حفظ ما تقدم (Preventive) ہے، وہ تدبیر بعد مرض (Curative)۔

نوح

نُوۡحٌ۔حضرت نوح (7/59)۔ یہ غیر عربی لفظ ہے۔ اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کا لقب ہے کیونکہ وہ بہت روتے اور گڑگڑاتے رہتے تھے۔لیکن زیادہ صحیح یہی نظر آتا ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے۔

قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز بالعموم حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے۔ مثلاً سورہ نساء میں ہے: اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡكَ كَمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلٰی نُوۡحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۔۔ (4/163) ''بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی جس طرح نوح کی طرف اور اس کے بعد دیگر انبیاء کی طرف وحی کی تھی۔''۔(البتہ قرآن کریم میں ایک مقام پر حضرت نوحؑ کے ساتھ آدم کا بھی نام آیا ہے)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتداء قوم نوح سے ہوئی۔

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطۂ زمین اور کون سی نسل سے ہوئی، یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے۔لیکن اب فیصلہ کا رخ اس طرف ہے کہ اس کی ابتدا عرب [1] کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل انسان کی تمدنی زندگی کی مؤسس تھی۔اسی قوم میں دجلہ اور فرات کی وادیوں میں آج سے قریب چھ سات ہزار سال قبل حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ یہ تحقیق صرف تاریخی ہے۔قرآن کریم (ان معاملات میں) نہ زمان سے بحث کرتا ہے نہ مکان سے۔ وہ قوموں کی زندگی اور موت کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔تاریخی جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد تھے۔اسی لیے قرآن کریم نے انہیں ان کے مخاطبین کا بھائی کہہ کر پکارتا ہے۔اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ نُوۡحٌ ۔۔ (26/106) ''جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا۔''

اگرچہ قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی اس قوم میں خدا کے رسول آچکے تھے۔قرآن کریم میں ہے: وَ قَوۡمَ نُوۡحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغۡرَقۡنٰهُمۡ ۔۔۔ (25/37) ''قوم نوح نے جب رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں غرق کر دیا۔'' ایسا نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں ذہن انسانی ہنوز اپنے عالم طفولیت میں تھا اور وہ لوگ تمدنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات بھی اپنی عقل سے پوری نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ کشتی کس طرح بنائیں۔۔۔وَاصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا (11/37) ''ہم نے نوح کی طرف وحی کی کہ۔۔۔۔۔۔وہ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے۔''

---

[1] قرآن کریم نے مکہ کو ''ام القریٰ'' کہا ہے یعنی (انسانی) بستیوں کی ماں۔

حضرت نوحؑ کا پیغام وہی تھا جو تعلیم ربانی کا اصل الاصول ہے۔ یعنی یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ (7/59) ''اے میری قوم! تم خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لیے کوئی الٰہ نہیں۔'' قوم مختلف بتوں کی پرستش کرتی تھی (71/23)۔ اگر دعوت حضرت نوحؑ کا مقصد صرف اتنا ہوتا کہ وہ لوگ بتوں کی پرستش چھوڑ کر ''خدا کی پرستش'' میں لگ جائیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کی مخالفت ساری قوم کی طرف سے ہونی چاہیے تھی لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ قوم کے نچلے طبقے نے اس دعوت پر لبیک کہا (26/111) اور ارباب دولت وحشمت (سردارانِ قوم) کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی (11/27)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس میں مترفین (آسودہ حال سرمایہ داروں) کا طبقہ اپنی ہلاکت دیکھتا تھا اور غریبوں کا طبقہ اپنے لیے زندگی کے آثار پاتا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو اعلیٰ طبقہ کے نزدیک قابل نفرت شمار ہوتا تھا کیونکہ وہ انہیں اراذل (کمینے) کہتے تھے (11/27;26/111)۔

کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ''غیر'' جو حضرت نوحؑ کی دعوت پر ایمان لائے تھے ان کا شمار ''اپنوں'' میں ہو گیا تھا اور خود حضرت نوحؑ کا بیٹا اور آپ کی بیوی (جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے) ان کے متعلق کہہ دیا کہ وہ آپ کے اہل میں سے نہیں (11/46;66/10)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی نے پہلے دن اس حقیقت کا اعلان کر دیا تھا کہ ملت کی تشکیل آئیڈیالوجی ① کے اشتراک سے ہوتی ہے، وطن اور خون کے رشتوں سے نہیں ہوتی۔ حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے: فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا (29/14) ''وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار برس رہا۔'' اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں ''بادشاہوں کی عمر'' ② سے مراد ہوتا تھا وہ زمانہ جس میں حکومت ان کے خاندان میں رہتی۔ اس اعتبار سے ساڑھے نو سو برس کا زمانہ وہ مدت ہے جس میں شریعت حضرت نوحؑ کا دور دورہ رہا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سَنَۃٌ کے معنی سال کی چار فصلوں میں سے ایک فصل (چوتھائی سال) کے بھی ہیں۔ لہٰذا ''اَلۡفَ سَنَۃٍ'' کے معنی ہوئے اڑھائی سو برس۔ اس میں سے پچاس سال نکال دینے سے باقی عمر دوسو سال رہ جاتی ہے جو مستبعد نہیں۔

ن و ر

اَلنُّوۡرُ: روشنی۔ جس قسم کی بھی ہو۔ یا روشنی کی شعاع۔ ضِیَاءٌ میں نور سے زیادہ زور اور شدت ہوتی ہے۔ ضِیَاءٌ ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُوۡرٌ اس روشنی کو جو ذاتی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورج کے لیے ضِیَاءٌ اور چاند کے لیے نُوۡرٌ کا لفظ

① آئیڈیالوجی (Idealogy) سے مراد ہے ''ایمان''۔

② جیسے ہمارے زمانے میں کہا جاتا ہے کہ ''یہ مغلیہ دور کی بات ہے۔'' (منظور الحسن)

استعمال ہوا ہے۔ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِیَآءً وَّالۡقَمَرَ نُوۡرًا (10/5) ''اللہ نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو نورانی بنایا۔'' واضح رہے کہ ضیاء اور نور کا یہ فرق وہاں ہی ہوگا جہاں ان الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لایا جائے گا۔ ورنہ نور کے معنی روشنی ہوں گے۔ نُوۡرٌ اسے کہتے ہیں جو خود واضح اور ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو روشن اور واضح کر دے۔

اللہ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو نُوۡرٌ کہا ہے سورہ مائدہ میں ہے: قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ (5/15) ''یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی یعنی واضح کتاب آ گئی۔'' روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لیے قرآنِ کریم اپنی دلیل آپ ہے اور اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اسے اپنی وضاحت کے لیے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں۔ روشنی کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے اصلی مقام کو متعین کر دیتی ہے اور اس کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر دیتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم، انسانی زندگی میں ہر شے کے متعلق بتا دیتا ہے کہ اُس کا صحیح مقام کیا ہے اور قیمت کیا۔ اِسی کا نام ہدایت یا راہنمائی ہے۔ یعنی غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینا۔ لہٰذا جہاں اللہ نے قرآن کریم کو نور کہا ہے تو اس کے ساتھ ہی بتا دیا کہ اس نور (روشنی) سے مقصود کیا ہے۔ یَّهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَیَهۡدِیۡهِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (5/16) ''اللہ اس روشنی کے ذریعے ہر اس شخص کو جو اس کے قانون سے ہم آہنگ ہوتا ہے سلامتی اور تکمیلِ ذات کے راستوں کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نکال کر (زندگی کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے۔'' یعنی انہیں زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اسی مشعل[1] ہدایت کو لے کر دنیا میں چلتے پھرتے ہیں۔ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ (6/123)۔

عَذَابَ النَّارِ سے مراد ہے انسانی اعمال کے وہ تباہ کن نتائج جن سے متاعِ حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے۔ (بمقابلہ جنت کے جس کے نیچے پانی کی نہریں ہیں۔ پانی اور آگ کا تقابل مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔) اس میں اس دنیا کی زندگی کی تباہی و بربادی بھی شامل ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی ہلاکت سامانی بھی۔ اَصۡحٰبُ النَّارِ وہ ہیں جو خوف وحزن کے عذاب میں مبتلا ہوں (2/38-39)۔ یہ آگ دلوں کو محیط ہوتی ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ○ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَةِ○ (104/6-7) ''قانونِ خداوندی کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں۔''

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ابلیس کی تخلیق نَارٌ سے ہوئی ہے (38/76)۔ اس لیے جہاں نَارٌ سے بچنے کی تاکید ہے تو اس کے معنی ابلیسی روش سے بچنا ہے۔ ابلیس تخریبی قوت کا مظہر ہے۔ اسی لیے عَذَابُ النَّارِ تخریبی اعمال کے تباہ کن نتائج کا نام ہے جس سے انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ بھی بگڑ جاتا ہے اور خود اس کی اپنی ذات کی صلاحیتیں بھی جھلس جاتی

[1] حضور نبی کریم ﷺ کا لایا ہوا ''قرآن'' مراد ہے۔ (منظور الحسن)

ہیں۔اس طرح اس کی دنیااور آخرت دونوں تباہ ہوجاتی ہیں۔

سورۃ الحجر میں ہے: وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ (15/27) جَآنٌّ سے مراد وہ تمام چیزیں یا قوتیں ہیں جو انسان کی نگاہ سے پوشیدہ (Invisible) ہیں۔اس آیت میں نَارِ سَمُوۡم (سخت تیز آگ) سے مراد وہ حرارت ہوسکتی ہے جو مادہ کی اس حالت میں ہوتی ہے جب اس نے ہنوز کوئی متشکل صورت اختیار نہ کی ہو۔ایٹم وغیرہ کی حرارتیں اسی قبیل سے ہیں۔نیز جان سے مراد وہ مخلوق بھی ہوسکتی ہے جو انسان سے پہلے اس دنیا میں آباد تھی اور جو اَب نابود (Extinct) ہوچکی ہے۔انسان اس مخلوق کا جانشین ہے۔چونکہ اس زمانے میں زمین کی سطح نسبتاً زیادہ گرم تھی اس لیے اس مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوگی۔ہوسکتا ہے کہ اس اعتبار سے بھی یہ کہا گیا ہو کہ اس کی تخلیق نار سے تھی، جس طرح انسان کی تخلیق کے متعلق کہا کہ اس کی ابتدا مٹی سے کی گئی ہے۔

سورہ نور میں ہے: اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ... (24/35) اس سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ نے اس مثال سے اپنی ذات کو سمجھایا ہے۔لیکن یہ صحیح نہیں۔ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن کچھ تصور نہیں کرسکتا۔یہاں خدا نے مَثَلُ نُوۡرِهٖ کہا ہے۔یعنی اس کے نور کی مثال ایسی ہے (جیسے آگے بیان کی گئی ہے)۔نورِ خداوندی بڑا جامع لفظ ہے اور قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اس کا استعمال آیا ہے۔اس کی جامعیت کے اعتبار سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی ''روشنی'' ہے اس کا سرچشمہ خدا ہے۔عقل کی روشنی، علم کی روشنی، وحی کی روشنی وغیرہ یہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں۔اس ''روشنی'' میں خدا کی کتاب (قرآن کریم) بھی شامل ہے۔اس مثال میں قرآن کی ہی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔خود مثال کے مختلف حصے اور تشبیہات اس کی تائید کرتی ہیں۔

ن و ق

قوم ثمود کے ہاں پانی کی قلت تھی۔جتنا کچھ پانی جمع ہوتا قوم کے بڑے بڑے لوگ اسے اپنے مویشیوں کے لیے مخصوص کرلیتے اور غریبوں کے جانور پیاسے مرجاتے۔حضرت صالح نے ان لوگوں سے کہا کہ جو چارہ اور پانی خدا نے تمام مخلوق کے فائدے کے لیے بلا قیمت دیا ہے اسے کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص کرلینا ظلم ہے۔تم اس روش سے باز آجاؤ ورنہ تباہ ہوجاؤ گے۔چنانچہ بہت سی حیل و حجت کے بعد وہ لوگ اس پر آمادہ ہوگئے کہ پانی میں سب کی باری مقرر کردی جائے۔اس کے لیے حضرت صالح نے کہا کہ بہت اچھا۔یہ ایک اونٹنی ہے۔میں اسے چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اسے اس کی باری پر پانی پینے دیتے ہو یا نہیں۔اگر تم نے اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے عہد پر قائم ہو اور اگر تم نے اسے روک دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے یہ عہد محض زبان سے کرلیا ہے، دل سے اسے نہیں مانتے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے اس اونٹنی کو بے دردی سے قتل کردیا۔

اسے قرآن کریم میں نَاقَةُ اللّٰہِ (7/43) کہا گیا ہے۔ خدا کی مخلوق میں سے وہ اونٹنی جو اس بات کی علامت تھی (لَكُمْ اٰيَةً) کہ وہ لوگ اپنے اس معاہدہ پر جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کاربند رہتے ہیں یا نہیں۔ جس طرح کعبہ کو خدا نے بَيْتِيَ (میرا گھر) کہا ہے اسی طرح اس اونٹنی کو نَاقَةُ اللّٰہِ کہہ کر پکارا گیا ہے۔

ن و ن

قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کو ذَا النُّوْنِ (21/87) بھی کہا گیا ہے۔ اور صَاحِبِ الْحُوْتِ (68/49) بھی۔ یعنی مچھلی والا۔ سورہ الصافات میں انہیں یونس کے نام سے پکارا گیا ہے (37/139)۔

تعریفات میں ہے کہ نُوْنٌ علم اجمالی کو کہتے ہیں جس سے مراد دوات ہے، کیونکہ وہ حروف جو علم کی صورت اختیار کرتے ہیں اجمالی طور پر اس کی روشنائی میں موجود ہوتے ہیں۔ یعنی معنی اس کے دوات ہیں اور مراد اس سے اجمالی علم ہے۔ سورۃ القلم میں ہے: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (68/1) ''دوات اور قلم اور جو کچھ لوگ ان سے لکھتے ہیں (یعنی علم) اس پر شاہد ہے کہ۔۔۔'' (ہوسکتا ہے کہ یہاں نٓ مقطعات میں سے ہو)۔ تاج اور اقرب الموارد میں ہے کہ نُوْنٌ کے معنی تلوار کے پھل (یا دھار) کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ کے معنی یہ ہوں گے کہ سیف (تلوار) اور قلم یعنی جو کچھ اس سے لکھتے ہیں اس حقیت پر شاہد ہیں کہ۔۔۔ (دین خداوندی کی بالآخر کامیابی ہوگی)۔ تلوار سے مراد قوتِ نافذہ اور قلم سے مراد قانونِ خداوندی ہے۔ ''قرآن کریم اور تلوار'' وہ محکم شہادات ہیں جن کی موجودگی میں اسلام کا کوئی دعویٰ بلا دلیل نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ

در کمر تیغ دو رُو قرآن بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
ایں دو قوت حافظہ یک دیگر اند — کائنات زندگی را محور اند

سورۃ حدید میں اسی ضمن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے رسولوں کو بھیجا، ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین نازل کیا اور فولاد (شمشیر) بھی۔ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57/25) جس میں سخت قوت ہے اور نوع انسان کے لیے فوائد کثیر۔ واضح رہے کہ قرآن کریم اور شمشیر کے ساتھ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم کو شمشیر کے زور سے منوایا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے گا جس میں قرآنی اصول وقوانین نافذ کیے جائیں گے۔ اسی قوتِ نافذہ کو شمشیر [1] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ قوت جو دنیا میں عدل قائم رکھنے کا موجب بنتی ہے اور جس سے مجرمین کو تباہ کاریوں سے

---

[1] حضور نبی کریم ﷺ کا مقصدِ زندگی قرآنی مملکت کا قیام تھا اور اگر کوئی اِس پروگرام میں رکاوٹ بنے تو اُسی کو ہٹانے کا حکم ہے۔ اگر کوئی مزاحمت نہیں کرتا اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جیسا کہ قرآنی نظامِ حکومت میں غیر مسلم بھی امن وامان سے رہ سکتے ہیں۔ (منظور الحسن صاحب کتاب)

روکا جاتا ہے۔

ن ھ ر

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (93/10) کے معنی ہیں صاحب احتیاج کو ذلیل وحقیر نہ سمجھ۔اور (17/23) میں والدین کے متعلق جو کہا ہے ''فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا'' تو وہاں بھی لَا تَنْهَر کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔یعنی انہیں جھڑکو نہیں، ان کی تحقیر مت کرو اور ان سے شرافت سے بات کرو۔قرآن کریم میں جنت کے متعلق بار بار آتا ہے: تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (2/25) ان باغات کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔پہلی چیز تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے ہاں نہر کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن عربی زبان میں نَهْرٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو دو ساحلوں کے درمیان بہ رہا ہو۔اس میں دریا، ندی، نہر سب ہی آ جاتے ہیں، جن سے کھیت یا باغات سیراب ہوتے ہیں۔

قرآن کریم کے ان مقامات میں جہاں جہاں جنت سے مراد دنیوی زندگی میں جنتی معاشرہ ہے، اس کہ انہار سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سرسبز وشاداب رہے گا۔اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (13/35)۔اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار ہوں گی۔تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ (14/25)۔وہ اپنے پھل ہمیشہ دیتا رہتا ہے۔اور جہاں جنت سے مراد اخروی جنت ہے، تو اس کی تمام تفاصیل تمثیلی ہیں (13/35، 47/15)۔لہٰذا وہاں بھی اَنْهَارٌ سے مراد اس قسم کی نہریں نہیں جو ہمارے ذہن میں ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے پانی کو زندگی کہا ہے (21/30) اور اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے۔اس لیے جس معاشرہ میں آبِ رواں کی فراوانی ہو اس میں زندگی کی فراوانی ہوگی۔''باغات میں نہریں رواں ہونے'' سے مراد زندگی کی شادابیاں اور سرسبزیاں ہیں۔

و أ د

عرب جاہلیت میں قبیلۂ کندہ کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔اس لڑکی کو جسے اس طرح زندہ دفن کر دیا جاتا، قرآن کریم میں ہے: وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ (81/8-9) ''جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم کی سزا میں یوں مار دیا گیا تھا۔'' رسول اللہ ﷺ عورتوں سے عہد لیا کرتے تھے کہ وہ اولاد کو قتل نہیں کریں گی (60/12)۔اس سے (غالباً) یہی لڑکیاں مراد ہیں، بجز اس کے کہ یہاں قَتْلٌ سے مراد اولاد کو تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا ہو۔

اس سے مراد صرف عرب جاہلیت کے زمانہ کی لڑکیاں ہی نہیں بلکہ وہ تمام لڑکیاں ہیں جنہیں ہمارے معاشرہ میں ''زندہ درگور'' کر دیا جاتا ہے۔جو اپنی ساری عمر اسی طرح بسر کر دیتی ہیں کہ نہ مردہ ہیں نہ زندہ۔وہ گھروں میں نہیں ہوتیں،

قبروں میں دفن شدہ ہوتی ہیں۔ جہاں سے ان کی نجات کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ جب تک ہمارے معاشرہ میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین قرآن کریم کے مطابق نہیں ہوتے، بے چاری بے زبان لڑکیوں کی حالت ایسی ہی رہے گی۔ اوران کی نشوونما کی صلاحیتیں دفن ہی رہیں گی۔

و ت د

قرآن کریم نے فرعون کو ذُو الۡاَوۡتَادِ (38/12) کہا ہے۔ اس کے معنی ہیں بڑی محکم قوتوں کا مالک۔ جیسے کے کھونٹے دور دور تک گڑے ہوئے تھے۔ اور پہاڑوں کو بھی اَوۡتَادًا (78/7) کہا ہے کیونکہ وہ بھی کھونٹوں کی طرف زمین میں گڑے ہوتے ہیں۔ (اہل تصوف کے ہاں جو ابدال اور اوتاد کی اصطلاحات ہیں وہ قرآنی نہیں)۔

و ث ن

وَثَنٌ چھوٹے صَنَم (بت) کو کہتے ہیں۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَثَنٌ ہے۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں بدترین قسم کا وَثَنٌ ہے جس کی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے۔

قرآن کریم تمام نوعِ انسان کے لیے مستقل ضابطہ حیات ہے جسے جب عملی شکل دی جائے تو ایک متحرک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ ''متحرک'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتا ہوا زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا رہتا ہے اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے، تو یہ ''وثنیت'' ہو گی۔ یہ وثن (بت) جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ بدقسمتی سے ہم پتھر کے بتوں کو تو دیکھتے ہیں اور انہیں معیوب سمجھتے ہیں لیکن اپنے قلب و دماغ میں رکھے ہوئے بتوں [1] پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتے!

و ج د

اَلۡوَاجِدُ: غنی، تونگر، دولت مند۔ وُجۡدٌ: استطاعت، مقدرت (65/6)۔ قرآن کریم میں ہے: وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ (2/96) تو انہیں سب سے زیادہ حریص پائے گا۔ یہ لفظ زیادہ تر انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ وجود یا موجود وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں نہیں آئے۔ یہ متکلمین کی اصطلاحات ہیں۔

---

[1] انہی تصورات کو علامہ اقبالؒ نے یوں بیان فرمایا ہے:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے — ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

وجل

قرآن کریم میں مومنین کی صفت یہ لکھی ہے کہ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ (8/2) جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل میں خوف کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا کے خوف سے مراد یہ ہے کہ اگر اس کے قوانین کے خلاف روش اختیار کی جائے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اس تباہی اور بربادی کے احساس سے انسان کے دل میں خوف اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اسی کو خدا کا خوف کہتے ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے نتائج وعواقب کا احساس۔

وجہ

قرآن کریم نے انسانی اعمال کی غایت یہ بتائی ہے: اَبۡتِغَآءَ وَجۡہِ اللّٰہِ (2/272) عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے خدا کی رضا جوئی یا خوشنودی کے لیے۔ اس سے ذہن انسانوں کی خوشی یا ناراضگی کے جذبات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے بلند وبالا ہے۔ وَجۡہِ اللّٰہِ کا صحیح مفہوم ہے وہ مقصود جو اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ وہ منزل جس کی طرف قوانین خداوندی لے جاتے ہیں۔ یعنی انسان کا ہر عمل اس مقصد کے حصول کے لیے ہونا چاہیے جو اس کے لیے خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ اس کا ہر کام اس منزل تک پہنچنے کے لیے ہونا چاہیے جو قوانین خداوندی نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔

سورہ روم میں ہے: وَمَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ (30/39) جو کچھ تم نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے کرتے ہو، اس مقصد کے پیش نظر کہ تم اس منزل مقصود تک پہنچ جاؤ جو قوانین خداوندی نے مقرر کر رکھی ہے۔ یعنی اس سے خود تمہاری اپنی ذات کی نشوونما اور صلاحیتوں کی نمود ہو جائے۔ اسی سے اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ (28/88) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ تغیر پذیر ہوتا ہے (ہَلَکَ کے یہی معنی ہیں) بلکہ استمرار اور دوام ان اعمال کو حاصل ہوتا ہے جو اس منزل کے حصول کے لیے سرزد ہوں جو خدا نے مقرر کر رکھی ہے۔ یا یہ کہ دنیا کا ہر راستہ تغیر پذیر ہوتا ہے، بجز اس راہ کے جو خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جاتی ہے۔ یہی مفہوم سورۃ رحمٰن کی ان آیات کا ہے: کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ ○ وَّیَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ ○ (55/25-26) دنیا کا ہر نظام اور ہر راستہ تغیر پذیر ہے بجز اس راستے کے جو خدائے ذوالجلال والاکرام کی ربوبیت اعلیٰ کی طرف لے جائے۔

دنیا میں ہر شخص کا اپنا اپنا مقصود ومطلوب ہے اور ہر قوم کی اپنی اپنی منزل ہے۔ وَلِکُلٍّ وِّجۡہَۃٌ ہُوَ مُوَلِّیۡہَا (2/148) جماعت مومنین وہ ہے کہ وہ زندگی کے جس گوشے اور کاروبارِ حیات کے جس شعبے میں بھی ہو اس کے سامنے ہمیشہ وہ منزل مقصود رہتی ہے جو قوانینِ خداوندی نے متعین کر دی ہے۔ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ (2/115)۔

وحد

قرآن کریم میں اللہ کے لیے وَاحِدٌ بھی آیا ہے (12/39) اور اَحَدٌ بھی (112/1)۔ احد وہ ہے جس کی ذات میں کوئی اور شریک نہ ہو اور وَاحِدٌ اسے کہتے ہیں جس کی صفات میں کوئی اور شریک نہ ہو۔ چنانچہ اَحَدٌ کے معنی ہوں گے وہ ذات جو بے مثل و بے نظیر ہو، جو یگانہ ہو۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت (Basic Characteristic) یہ ہے کہ وہ یگانہ (Unique) ہو۔ قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (112/1) میں ذاتِ خداوندی کی اس بنیادی خصوصیت، یعنی اس کی یگانگت (Uniqueness) کا ذکر ہے۔

قرآنی تعلیم کی بنیاد خدا کی وحدت پر ہے، یعنی اس حقیقت کے اعتراف اور یقین پر کہ کائنات میں صرف ایک قوت ہے جس کا اقتدار و اختیار ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی اور قوت کا آئین و قانون نہیں چلتا۔ لہٰذا انسانوں کی دنیا میں بھی اُسی کا قانون و آئین چلنا چاہیے۔ لَا يُشۡرِكُ فِيۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18/26) وہ اپنے حکم اور قانون میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اس لیے مومن وہ ہے جو لَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا (18/110)۔ جو اپنے رب کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ جو خدا کے قوانین کے علاوہ (جنہیں اس نے قرآن کریم میں بیان کر دیا ہے) اور کسی کے قانون کے سامنے نہیں جھکتا۔

وحی

سورہ حم السجدہ میں ہے: وَ اَوۡحٰى فِيۡ كُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا (41/12) ''اس نے ہر سماء میں اس کا امر وحی کر دیا۔'' اس میں امر وحی (یا وحی امر) کے معنی مامور کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ قانون خداوندی جس کی رو سے خارجی کائنات کی ہر شے اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ اسی کو سورۃ النور میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسۡبِيۡحَهٗ (24/41) کائنات کی ہر شے جانتی ہے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور وہ مقصد کیا ہے جس کے حصول کے لیے انہیں سرگرم عمل رہنا ہے۔ یہی وہ وحی ہے جو ان میں جاری و ساری ہے۔ یعنی امر خداوندی، خدا کا قانون۔ اس کے متعلق سورہ الزلزال میں ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا (99/5) یعنی اس مقصد کے لیے خدا نے زمین کی طرف وحی کی ہے۔ زمین کو اس کا حکم دے رکھا ہے۔ زمین کے متعلق خدا کا قانون یہ ہے۔ اسی طرح سورہ النحل میں ہے: وَ اَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ (16/68) شہد کی مکھی کی طرف خدا نے وحی کر رکھی ہے۔ یعنی اس کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ یہ کچھ کرے۔

کائنات میں ہر شے خدا کے امر (حکم) کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ یہ خدا کی وہ وحی ہے جو ہر شے میں از خود ودیعت کر دی گئی ہے۔ اسی کو قانونِ فطرت کہتے ہیں۔ یا جانداروں کے لیے جبلت (Instinct)۔ یہ قانون ان چیزوں کا خود پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ہے۔ انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کے لیے بھی

ضروری ہے کہ یہ ایک ایسے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کا خود پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اسے خارج سے ملے۔ جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے اس پر وہی قانون فطرت عائد ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر ہوتا ہے۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، افزائش نسل، بیماری، موت، سب اسی قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ یہ قانون انسان کا اپنا وضع کردہ نہیں۔

لیکن انسان کی زندگی طبیعی زندگی (Physical Life) ہی نہیں بلکہ اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی بھی ہے۔ نیز اس کی ذات (Personality) بھی ہے۔ اس کے لیے بھی اسے قانون کی ضرورت ہے اور وہ قانون ایسا ہونا چاہیے جو اس کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ قانون فطرت کی طرح اسے خارج سے ملا ہو۔ اس قانون کا نام بھی وحی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ:

① یہ وحی ہر فرد کو الگ الگ نہیں ملتی۔ اس کے لیے خدا کی طرف سے قاعدہ یہ مقرر ہوا تھا کہ یہ وحی کسی ایک انسان کو دی جائے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ اُس انسان کو نبی اور رسول کہتے ہیں۔ یہ وحی انہی حضرات سے مخصوص تھی۔

② کائنات کی کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لیے وحی کیا گیا ہے اور چاہے تو اس کے خلاف کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرے۔ یہ اس لیے کہ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا اختیار وارادہ استعمال کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے لیے یہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کو براہ راست نہ ملے بلکہ رسول کی معرفت دوسرے انسانوں تک پہنچے تو اس میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ انسان وحی کے راستے پر اپنے اختیار وارادہ سے چلے۔ اس لیے کہ اشیائے کائنات کو جو وحی براہ راست دے دی جاتی ہے، تو انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے سرکشی برتیں۔ انہیں بہر حال اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔

③ انسان کو یہ تو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف روش اختیار کرے، لیکن یہ اس کے بس میں نہیں کہ وہ وحی کے خلاف زندگی بسر کر کے وہ نتائج حاصل کر لے جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی نگل جائے یا اسے اٹھا کر پھینک دے، لیکن اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھا کر اس کا اثر مصری کی ڈلی کا سا پیدا کر لے۔

خدا کا قانون جو حضرات انبیاءؑ کرام کی وساطت سے انسانوں کو ملتا ہے اَلْوَحْیُ کہلاتا ہے۔ اس کے خدا سے پانے میں نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا۔ یعنی انبیاء کے سوا کسی اور کو وحی نہیں مل سکتی، اور اس وحی کو انبیاء کرامؑ اپنے کسب و ہنر سے حاصل نہیں کرتے بلکہ یہ انہیں خارج سے اسی طرح ملتی ہے جس طرح اشیائے کائنات کو از خود خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ وحی منزل من اللہ ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے نازل شدہ۔ یعنی یہ شخص اپنی کوشش سے

وحی کے مقام تک نہیں پہنچتا بلکہ وحی خود اتر کر اس تک پہنچتی ہے۔ بالالفاظ دیگر، اس میں انسان کی داخلیت (Subjectivity) کو دخل نہیں ہوتا۔ اس میں یکسر خارجیت (Objectivity) ہوتی ہے۔ منزل من اللہ کہنے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان اپنی کوشش سے طبعی دنیا کے پوشیدہ حقائق کو منکشف (Discover) کر سکتا ہے لیکن جو حقائق اسے وحی کے ذریعے ملتے ہیں وہ صاحب وحی پر (Revealed) ہوتے ہیں۔ یعنی وحی کے ذریعے حقیقت خود اپنے آپ کو صاحب وحی پر منکشف کرتی ہے۔ یہ اپنا ہاتھ بڑھا کر عروسِ حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسی کو نزولِ وحی کہتے ہیں۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (2/97) ''اسے جبریل نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے۔'' چونکہ وحی صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی ہے اس لیے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوتی ہے، وہ کس طرح ملتی ہے۔ ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا ہوتا ہے کہ وہ نبی کو منجانب اللہ ملتی ہے۔ (البتہ ہم علم وبصیرت، دلائل وبراہین نیز وحی کے نتائج سے (Pragmatically) اس کی صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ سکتے ہیں)۔ انبیاء کو یہ وحی کبھی ''اشارۂ سریعہ'' کے ذریعے ملتی تھی، کبھی ''من وراء حجاب''۔ لیکن ہمیں یہ وحی صرف رسول کی وساطت سے مل سکتی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (42/51)۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بشر (انسانوں) کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے۔ بشر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء۔ پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتے) کے ذریعے پہنچتا ہے (جیسے رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا) اور یا براہِ راست پردے کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے (جیسے حضرت موسیٰؑ کی صورت میں ہوا)۔ باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعے سے خدا کا کلام پہنچتا ہے۔ یہ کلام اب قرآن کریم کے اندر ہے، اس کے باہر اور کہیں نہیں۔ اس اعتبار سے یہی قرآن کریم [1] ہم پر بھی نازل ہوا ہے (يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ: 2/105 و 3/71)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہماری طرف نازل ہوا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا اس لیے اب کسی انسان کو براہِ راست وحی نہیں مل سکتی۔ اب انسان کے پاس علم کے دو ہی سرچشمے رہ گئے۔ ایک اس کی اپنی عقل اور دوسری خدا کی وحی جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ اس کے علاوہ کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم نہیں ملتا۔ الہام، کشف وغیرہ کے تصورات کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔

قرآن کریم اور عقل کے ملنے سے انسانی علم مکمل ہو جاتا ہے۔ نیز یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو جو وحی ملی تھی اس کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کریم سے باہر

---

[1] اسی جہت سے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب   گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف   (بالِ جبریل)

(روایات کے اندر) ہے۔قرآن کریم میں وحی کی اس تقسیم کا کوئی ذکر نہیں۔اس کی رو سے صرف قرآن کریم وحی کے ذریعے ملا ہے (6/19)۔ یہ تصور یہودیوں کے ہاں رائج تھا، اور وہیں سے مسلمانوں کے ہاں آ گیا۔رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وحی متلو اور وحی غیر متلو کی اصطلاحات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق ہے کہ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی(28/7، 20/38) ہم نے اُمّ موسیٰ کی طرف وحی کی ''کہ اس بچے کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کے متعلق کوئی خطرہ لاحق ہو تو اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دینا۔'' وَحۡیٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف بھیجی جائے اور اس طرح اسے اس کا علم کرا دیا جائے، یا اس کی طرف حکم بھیجا جائے خواہ اس کی کیفیت یا طریق کچھ ہی ہو۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے کے معنی ہیں، حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے حکم بھیجنا۔اسی طرح والدہ موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجنے کے معنی ہوں گے ان کی طرف کسی کی وساطت سے حکم بھیجنا یا باخبر کر دینا۔جس انداز سے انبیاء کی طرف وحی ہوتی تھی وہ انہی سے مخصوص تھی۔محض اَوۡحَیۡنَاۤ کے لفظ سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ غیر نبی کی طرف بھی (اسی قسم کی) وحی ہو سکتی ہے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

یاد رکھئے وحی، جس کے معنی خدا کی طرف سے براہِ راست راہ نمائی حاصل ہونے کے ہیں وہ آخری مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو مل گئی اور اب وہ قرآن کریم کے اندر کتابت شدہ شکل میں محفوظ ہے۔اس کے بعد انسانوں کو ان کی راہ نمائی کے لیے خدا کی طرف سے کچھ اور نہیں ملا، نہ ملے گا۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو خود فریب خوردہ ہے یا دانستہ لوگوں کو فریب دیتا ہے۔

چونکہ وحی میں کسی انسانی خیال یا آرزو کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لیے قرآن کریم نے اسے ایسا اَلۡعِلۡمُ کہا ہے جو انسانی خیالات اور خواہشات سے یکسر متمیّز ہوتا ہے (2/120)۔اس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ رسول کی وحی میں اس کے اپنے خیالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ○ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ○ عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ○ (53/3-5) وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتا بلکہ یہ وہ وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی گئی ہے۔ بڑی قوتوں والے (خدا) نے اسے اس کا علم دیا ہے۔'' نبی کے علاوہ اور کسی کو یہ علم نہیں مل سکتا۔اس لیے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (7/63) ''میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' لہٰذا جو حقائق وحی کی رو سے ملتے ہیں عقلِ انسانی انہیں دریافت نہیں کر سکتی۔عقلِ انسانی کو وحی کی روشنی کی اِسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔عقل کے لیے قابلِ اعتماد راستہ وہی ہے جو وحی نے متعین کر دیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ انبیاء کرامؑ کو وحی بالالفاظ ملتی تھی۔یعنی وحی کے الفاظ[1] بھی خدا کی طرف سے ہوتے تھے۔

---

[1] بعض راہِ حق سے بھٹکے ہوئے انسان بھی اسی قسم کے خیالات کے حامل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کو خدا کا پیغام الفاظ میں نہیں ملتا تھا بلکہ الفاظ نبی ﷺ کے ہوتے تھے۔حوالے کے لیے دیکھئے کتاب من و یزداں از قلم فتح نیاز پوری، شائع کردہ فکشن ہاؤس، 18۔مزنگ روڈ لاہور۔فون: 042-37249218; 37237430

ودع

جاندار اشیاء کے سلسلۂ ارتقاء (Organic Evolution) کا اصول یہ ہے کہ ہر شے کچھ وقت کے لیے ایک خاص مقام میں، ایک خاص حالت میں، ٹھہرتی ہے۔ پھر وہاں سے نشوونما پاتی ہوئی اگلی منزل میں پہنچتی ہے۔ اور اس طرح منزل بہ منزل آگے بڑھتی ہوئی اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے۔ یہ راستے میں رکنے کے مقامات اس کے مُسْتَقَرٌّ ہیں اور آخری منزل اس کی مُسْتَوْدَعٌ۔ جسے ہم ''راستے کے رکنے کا مقام'' (مستقر) کہتے ہیں اس میں بھی وہ شے جمود کی حالت میں نہیں ہوتی۔ وہاں بھی اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ تبدیلی ایسی غیر مرئی ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ تبدیلی نمایاں شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے ہم اس کی اگلی منزل کہتے ہیں۔

ورث

حضرت زکریاؑ نے جب خدا سے دعا کی تھی کہ میرے ہاں بیٹا عطا کر دے تا کہ وہ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ (19/6) تو وراثت سے ان کی مراد اس خاندان کے علم و فضل کی وراثت تھی، نہ کہ نبوت کی۔ کیونکہ نبوت کسی کو ورثہ میں نہیں مل سکتی تھی۔ یعنی جس طرح بیٹا باپ کی جائداد کا وارث ہو جاتا ہے محض بیٹا ہونے کی جہت سے، اسی طرح نبی کا بیٹا محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے نبی نہیں ہو سکتا تھا۔ نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسے شخص کو بھی خدا نبوت کے لیے منتخب کر لیتا تھا جس کا باپ [1] نبی تھا۔ اسے یہ منصب باپ سے وراثت میں نہیں ملتا تھا۔ خدا سے وہبی طور پر ملتا تھا۔

سورۃ اعراف میں ہے: تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (7/43) یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں، تمہارے اپنے اعمال کے بدلے میں وارث بنایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وارث کے معنی صرف کسی کے ترکہ کا وارث نہیں بلکہ اپنی محنت کے ماحصل کے مالک کو بھی وارث کہا گیا ہے۔ وراثت ارض کے بھی یہی معنی ہیں، جس کے لیے صلاحیت شرط ہے (21/105)۔

ورد

سورۃ مریم میں جہنم کے متعلق ہے: وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (19/71) تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر وارد نہ ہو۔ اس

[1] جیسا کہ قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ہے کہ وہ خدا کے نبی/ رسول تھے اِسی طرح اُن کے دونوں بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ خدا کے بھیجے ہوئے نبی/ رسول تھے۔ اس کے بعد حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ اپنی قوم کی طرف نبی/ رسول بنا کر بھیجے گئے اور حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ بھی اللہ کے رسول/ نبی تھے۔ گویا کہ حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے کو پیغمبرانِ کرام کا گھرانہ کہا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ (منظور الحسن)

آیت سے عام طور پر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ تمام انسان (مومن وکافر سب) جہنم میں داخل ہوں گے۔ پھر مومنوں کو اس سے نکال لیا جائے گا اور کافر اس میں رہیں گے۔ (اس کی تائید کے لیے اس سے اگلی آیت (19/72) پیش کی جاتی ہے)۔ لیکن یہ خیال بوجوہ غلط ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم سے جہنم سے نکلنے کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ جہنم ایسی ''جگہ'' نہیں جہاں سے سزا بھگتنے کے بعد نکل آنا ہوگا۔ جہنم درحقیقت سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے کی کیفیت (State) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ○ لَا يَسۡمَعُوۡنَ حَسِيۡسَهَا (21/101-102) وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ اتنی دور کہ اس کی آہٹ تک بھی نہ سن سکیں گے۔ اس اعتبار سے آیت (19/71) میں مِّنۡكُمۡ سے مراد تمام نوع انسانی نہیں بلکہ اس سے مراد وہی کفار اور سرکش مجرم ہیں جو حیات بعد الممات جیسی اہم حقیقت کے منکر تھے۔

جنت خواہ دنیوی ہو خواہ اُخروی، اس تک پہنچنے کے لیے تکلیفوں اور مصیبتوں کی بھٹی سے گزرنا پڑے گا۔ آگ اور خون میں کھیلنا ہوگا۔ یہ ''پل صراط'' دنیا میں ایک ایک قدم پر موجود ہے جس سے گزر کر جنت کا دروازہ ملتا ہے۔ جو شخص ان پُر خار وادیوں میں ذرا غیر محتاط (غیر متقی) ہوا یا مشکلات ومصائب سے گھبرا کر بھاگ اٹھا وہ تباہیوں کے جہنم میں گر جائے گا۔ جو احتیاط برتے گا اور مصائب میں ثابت قدم رہے گا وہ اس سے محفوظ رکھا جائے گا۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے سخت دشوار گزار مراحل سے گزرنا ہوگا۔ (مثلاً 2/214، 3/141 و 16/9، 33/10)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مرنے کے بعد زندگی میں پہلے مشقتوں اور تکلیفوں سے گزرا جائے گا اور اس کے بعد جنت میں پہنچا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دنیا میں حق وصداقت کے پیامبروں کو مخالفین کی طرف سے تکالیف پہنچائی جائیں گی۔ جو ان تکالیف کو برداشت کرکے جادۂ حق وصداقت پر قائم رہے گا وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا۔ وہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں چلا جائے گا جنت اور جہنم کا فیصلہ انسان کے اس دنیا کے اعمال کرتے ہیں۔

جو حقیقت اوپر بیان ہوئی ہے اسے فلسفہ کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ تخلیق (Creation) کا طریق (Process) یہ ہے کہ ہر تخلیقی تصور (Creative Ideas) کے مشہود (Manifest) ہونے سے پہلے ایک داخلی ہیجان اور خلجان ہوتا ہے (اسے Labour Pain کہیے) ایک کامیاب نابغہ (Genius) اس فکری خلجان اور ہیجان سے کامیاب باہر نکل آتا ہے۔ خام اور ناکام اس کشمکش میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تاریخ پر نگاہ ڈالیے! کتنے ہی خام کار مفکر اس گرداب میں پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نبوت اس طریق (Process) سے ماورا ہوتی ہے کیونکہ وہ صاحب وحی کی خود پیدا کردہ فکر نہیں ہوتی۔

وزر

قرآن کریم میں ہے: كَلَّا لَا وَزَرَ (75/11) کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بھاگ کر پناہ لی جائے۔

قرآن کریم میں ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (6/165) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

ہر ایک کو اپنی ذمہ داری خود پوری کرنی ہوگی۔ اور کسی کو کسی دوسرے کے اعمال کی سزا نہیں ملے گی۔ نہ ہی کوئی دوسرے کے اعمال کی جزا اور سزا میں حصہ دار ہوگا۔ قانون مکافات کا یہ عظیم الشان اصول ہے جس کا قرآن کریم نے اس طرح اعلان کیا ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داری اور اپنے اپنے کیے کا پھل۔ آج کے جہنمی معاشرہ کا سا حال نہیں۔ محنت کوئی کرے، عیش کوئی اُڑائے۔ جرم کوئی کرے، سزا کوئی بھگتے۔ غلطیاں کسی سے ہوں، اس کے نتائج کوئی اور برداشت کرے۔ تنخواہ کوئی پائے، ذمہ داریاں کوئی اٹھائے۔ قرآنی معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوگا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وہاں کا غیر متبدل اصول ہوگا۔

اَوْزَارُ الْحَرْبِ جنگ کے ہتھیار (47/4)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جماعت مومنین ضرورۃً جنگ اس لیے کرتی ہے کہ ''خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔'' یعنی جنگ کا امکان نہ رہے۔ دنیا میں امن وسلامتی ہو جائے حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (47/4) ''تا آنکہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔''

وزع

قرآن کریم میں حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا مذکور ہے کہ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (27/19) اس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے نشوونما دینے والے مجھے ایسی تمام چیزوں سے روک دے جو تیرے شکر کے راستے میں حائل ہوتی ہوں۔ مجھے اتنا ضبط عطا کر دے کہ میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف تیرے متعین کردہ راستے میں صرف کروں۔ جب کسی کو غلط راستے پر چلنے سے روک دیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے صحیح راستے پر لگ جانے کی توفیق دے دی۔

وزن

قرآن کریم نے وزن کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے خاص اصولی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ نظامِ کائنات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ سارا سلسلہ توازن کی رو سے قائم ہے۔ اگر مختلف اشیاء کا باہمی توازن بگڑ جائے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس کے لیے فرمایا: وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (55/7) خدا نے اس سلسلۂ کائنات کو ان بلندیوں پر قائم کیا اور تمام اشیاء میں ایک توازن رکھ دیا۔ مختلف فضائی کروں اور اجرامِ فلکی کی باہمی جذب و کشش اس عظیم المثال توازن کی زندہ شہادت ہے۔ چونکہ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی دنیا میں بھی یہی توازن (Equilibrium) قائم رہے۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (55/8) لہٰذا تم اپنی تمدنی، معاشرتی اور معاشی دنیا میں ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھو۔ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (55/9) معاشرتی اور معاشی توازن کو عدل و انصاف کے ساتھ برقرار رکھو اور معاشرہ کا توازن کبھی بگڑنے نہ دو۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کا یہ توازن صرف قانون کے الفاظ سے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک عملی نظام قائم کیا جائے جو اس توازن کے

قیام کا ذمہ دار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے صرف ضابطۂ قوانین ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اَلْمِیْزَانُ بھی نازل کی ہے۔ یعنی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذمہ دار عملی نظام۔ وہی نظام وہ معیار بنتا ہے جس سے ہر شے کا صحیح صحیح ''وزن'' متعین ہوتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (57/25) لیکن دنیا میں کوئی نظام قوت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اس لیے کہا کہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (57/25) اس کے لیے ہم نے فولاد (شمشیر) بھی نازل کی۔ یہ ہے قرآنی نظام کا صحیح نقشہ۔ ① یعنی خدا کی طرف سے ابدی قوانین کا ضابطہ (اَلْكِتَابُ)۔ اس ضابطہ کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لیے نظام (اَلْمِيْزَانُ)۔ اور اس نظام کے قیام واستحکام کے لیے قوت (اَلْحَدِيْدُ)۔

حدید کے متعلق فرمایا: فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57/25) اس کی شدت اور سختی، فتنہ وفساد برپا کرنے والے عناصر کے لیے روک تھام کا کام دیتی ہے۔ اور یوں یہ قوت نوع انسانی کے لیے فی الجملہ باعث منفعت بن جاتی ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ملتا ہے سعی و عمل کے مطابق ملتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ (101/9-6) جس کی سعی و عمل کا پلڑا بھاری ہوگا اسے عیش فراواں کی زندگی نصیب ہوگی۔ جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ ذلت ورسوائی کے آغوش میں چلا جائے گا۔ (مَوَازِيْنٌ۔ مِيْزَانٌ کی جمع ہے)۔ اس نظام میں ہر چیز کا وزن ٹھیک ٹھیک، یعنی ہر عمل کا نتیجہ صحیح صحیح مرتب ہوگا۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ (7/8)۔ اور تمام وہ کوششیں جو خدا کے نظام ربوبیت عامہ کے خلاف ہوں گی بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18/105) اس طرح یہ معاشی اور معاشرتی نظام، کائناتی نظام سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے جس میں ہر شے موزوں ہے۔ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (15/19) یعنی ایک خاص تناسب (Proportion) کو لیے ہوئے۔

وسط

قرآن کریم میں امت مسلمہ کے متعلق ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2/143)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو اور وہ ہر قوم سے برابر فاصلے پر (Equidistant) ہو۔ یعنی نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی اور نہ کسی کی طرف کھنچی ہوئی۔ اس کی نگاہوں میں سب برابر ہوں، جس طرح دائرے کے مرکز سے محیط کا ہر نقطہ برابر فاصلے پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پوزیشن اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہے جو عدل اور انصاف کے راستے سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹے۔ اس قسم کی قومیں صحیح معنوں میں اقوامِ عالم کے اعمال وافعال کی نگران

---

① گویا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی معاشرہ ایک مثلث ہے جس کے حسب ذیل تین زاویئے ہیں۔ پہلا زاویہ الکتاب، دوسرا زاویہ المیزان (نظام) اور تیسرا زاویہ الحدید (قوت)۔ منظور الحسن

اور محتسب ہوسکتی ہیں۔لہٰذا امت وسط سے مراد ایسی قوم ہے جسے بین الاقوامی اور مرکزی پوزیشن حاصل ہو۔ جو تمام اقوام کے افعال وحرکات کی نگران ہو اور بین الاقوامی معاملات کو پورے پورے عدل وانصاف سے سلجھائے۔قرآن کریم نے یہ مقام متعین کیا تھا جماعت مومنین کا۔

یہ نقطہ بھی غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے اس قسم کا بین الاقوامی نظام اور اقوامِ عالم کے متنازعہ فیہ امور کے تصفیہ کے لیے اس قسم کا انتظام اس زمانے میں تجویز کیا تھا جب دنیا ہنوز ''بین الاقوامی'' تصور تک سے ناآشنا تھی۔

وس ع

سورہ بقرہ میں ہے: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (2/255) اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔علم ہی نہیں بلکہ رحمت (سامانِ ربوبیت) بھی (40/7)۔

قرآن کریم میں ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2/286 و6/153 و7/42 و23/62)۔اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا جو اپنے احکام وقوانین کی اطاعت چاہتا ہے تو اس سے اس کا اپنا کوئی فائدہ مطلوب نہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ انسانی ذات میں وسعت پیدا ہوجائے۔ اس کی قدرت و اختیارات کا دائرہ وسیع ہوجائے۔ اسے کشادگی اور فراخی نصیب ہوجائے۔سورۃ اعراف میں اس کے ساتھ کہا گیا ہے: اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (7/42)۔ان وسعتوں اور فراخیوں کا نام جنت کی زندگی ہے۔یعنی اس دنیا میں رزق اور زندگی کی خوشگواریوں کی وسعت اور کشاد، اور خود انسانی ذات (Personality) کے اختیارات وممکنات کے دائرے کی وسعت، جس سے انسان اُخروی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ یہ وہ جنت ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے۔ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (57/21)۔

قرآنی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ انسانی ذات کی نشوونما ہے جس سے اس کی صلاحیتوں اور ممکنات کا دائرہ بڑا وسیع ہوجاتا ہے۔

وس ل

سورہ مائدہ میں ایک آیت ہے جس کے غلط (مروجہ) مفہوم نے اسلام جیسے حیات بخش دین (نظامِ زندگی) کو اشخاص پرستی کا طلسم بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (5/35)۔اس کا سیدھے سادے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی طرف ''وسیلہ'' طلب کرو اور اس کی راہ میں جہاد کروتا کہ تم کامیاب ہوجاؤ۔'' ہم نے اس میں لفظ ''وسیلہ'' کو

علیٰ حالہٖ رہنے دیا ہے کیونکہ اسی کے غلط مفہوم پر اشخاص پرستی کی وہ عمارت قائم کی جاتی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب، منزلت طلب کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہوجاؤ گے۔ یعنی خدا کے ہاں قدر ومنزلت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرتے رہو۔

اور اگر لفظ ''وسیلہ'' کا ترجمہ ''ذریعہ'' کیا جائے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ کے ہاں عزت ومنزلت، درجہ اور مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ طلب کرو۔ یعنی اس کے راستے میں جہاد کرو۔ دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ وہ عمل صالح ہے جو خدا کے ہاں درجہ اور مرتبہ ملنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طریق سے تم خدا کے مقرب بن سکتے ہو۔ لیکن ہمارے ہاں اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے ''وسیلے'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ وسیلہ ہے ''پیرو مرشد''۔ لہٰذا مرشد (پیر طریقت) کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

اور جب ''وسیلہ'' کے معنی ''پیر پکڑنے'' کے کر لیے تو ''جَاهِدُوْا'' کے معنی ہو گئے ''اپنے نفس سے جہاد کرنا۔'' جسے جہاد اکبر قرار دیا جاتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ، انسانوں کو قرار دینے والے اس دین (اسلام) کے نام لیوا ہیں جو دنیا سے شخصیت پرستی کو مٹا کر خدا اور بندے کا براہِ راست (قرآن کریم کے ذریعے) تعلق پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس دین کے عطا کرنے والے خدا کا اعلان یہ تھا کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ''جب میرے بندے تجھ سے (اے رسول) میری بابت پوچھیں تو (کہہ دو کہ) میں ان سے قریب ہوں۔'' اتنا قریب کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ''میں ہر شخص کی پکار کا جو مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (2/186) ''انہیں چاہیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ انہیں رشد وہدایت مل جائے۔'' بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لیے دوسرے لوگ ''مرشد'' تلاش کرتے رہتے ہیں۔ (يَرْشُدُوْنَ کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے)۔ خدا کے علاوہ کوئی ''مرشد'' (راہ بتانے والا) نہیں (دیکھیے 18/17)۔ خدا کے قوانین کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) ''خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور طاقت حائل نہیں رہتی۔'' یہی وہ صحیح آزادی ہے جسے عطا کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تھے (7/157)۔ لیکن ہم نے اس آزادی کی جگہ انسان پرستی کی مقدس زنجیروں سے اپنے آپ کو اس طرح جکڑ لیا کہ ہمارے فکر وعمل کا کوئی گوشہ بھی آزاد نہ رہ سکا۔ یاد رکھیے! مسلمان دنیا میں سر

اٹھا کر چلنے کے قابل صرف اس وقت ہو سکے گا جب اس نے انسانوں کی چوکھٹوں سے سر اٹھا کر صرف اللہ کے سامنے جھکنے کا مسلک اختیار کر لیا۔

و س ن

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے: لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (2/255) بے خبر ہونا تو ایک طرف وہ کسی شے سے غافل تک بھی نہیں ہوتا۔

و س و س

قرآن کریم میں ہے: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (7/20) ''پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا'' اس سے مراد وہ خیالات ہیں جو خودغرضی کے جذبات انسان کے دل میں پیدا کرتے ہیں یا جنہیں شر پسند لوگ کسی کے دل میں پیدا کریں۔ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ○ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○ (114/4-5) وہ جو دبے پاؤں آ کر چپکے سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال دیتا ہے۔ ایسے لوگ اسلامی معاشرہ میں فتنہ و فساد پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ ان سے محتاط اور محفوظ رہنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔

و ص ب

قرآن کریم میں ہے: وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (16/52) کائنات کی ہر شے خدا کی فرمان پذیری کر رہی ہے اور ایسا مداومت سے ہو رہا ہے۔ مسلسل و پیہم ایسا ہو رہا ہے۔ (انسان کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے)۔

و ص ف

خدا کو دنیا میں قریب قریب ہر شخص مانتا ہے۔ لیکن جس جگہ پہنچ کر اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہے کیسا؟ کوئی انسان اپنی عقل کی رو سے یہ نہیں جان سکتا کہ خدا کیسا ہے۔ اس لیے کہ خدا انسانی عقل کی حد سے ماوراء ہے۔ لہٰذا خدا کے متعلق صرف وہی بات یقینی طور پر صحیح ہو سکتی ہے جسے خود خدا بتائے، اور اس کا ذریعہ وحی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور وحی اب آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر ہے۔ لہٰذا خدا کا صحیح تصور وہی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ جو تصور اس تصور کے خلاف ہو گا وہ غلط ہو گا، اور خدا کی طرف اس کا انتساب باطل۔ چنانچہ اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) تصورات کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم کہہ دیتا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (6/101) خدا کے متعلق جو تصور یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ اس سے بہت دور اور بلند ہے۔ وہ اس سے مبرّا اور منزّہ ہے۔

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں کو بھی ''خدا پر ایمان'' لانے کی دعوت دیتا ہے جو خدا کو مانتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے متعلق صحیح تصور رکھو۔ اور یہ تصور وہی ہوسکتا ہے جسے خدا نے خود قرآن کریم میں پیش کیا ہے۔ یہ اس کی صفات یا اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ہیں۔ بالالفاظ دیگر، خدا کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ کوئی محدود (Finite) لامحدود (Infinite) کو حیطہ ادراک میں لا نہیں سکتا۔ اسی لیے خدا نے صرف اپنی صفات بیان کی ہیں اور انہی صفات سے ہم اس کے متعلق اندازہ کرسکتے ہیں۔ خدا علیم ہے، خبیر ہے، بصیر ہے (وغیرہ) لیکن خود خدا جو علیم و خبیر و بصیر ہے، ہے کیا؟ ہم اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں۔

وصل

ہمارے ہاں کسی بزرگ کی وفات پر عام طور پر کہتے ہیں کہ ان کا ''وصال'' ہوگیا۔ یہ ہندوؤں کے تصوف (ویدانت) سے آیا ہے جس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح خدا کی روح کا ایک جزو ہے جو بدقسمتی سے مادی جسم کے جیل خانے میں محبوس ہوگئی ہے۔ اس جسم سے علیحدگی کے بعد یہ جزو اپنے کل سے جا کر مل جائے گا۔ اس ملاپ کے لیے وصال کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یعنی فلاں واصل بالحق ہوگیا، خدا کے ساتھ مل گیا۔ وحدت الوجود کے مسلک کی یہی تعلیم ہے۔ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ اسی طرح ''عرس'' کا تصور ہے جو عیسائیوں کے مسلک خانقاہیت سے آیا ہے۔ اس کے معنی شادی کرنے کے ہوتے ہیں۔ عیسائیوں میں راہبہ عورتوں (Nuns) کے متعلق یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان کی شادی ان کے خدا (یسوع مسیح) سے ہوچکی ہوتی ہے اور وہ گویا خدا کی عروس (دلہن) ہیں۔ یہی تصور ہمارے تصوف میں آگیا جہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ ''اللہ والے'' کی وفات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کی شادی (عرس) خدا سے ہوگئی۔ یعنی خدا سے اس کا وصال ہوگیا۔ یہ سب تصورات غیر قرآنی ہیں۔

وصی

سورۃ العصر میں جماعت مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (103/3) اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین و تاکید کرتے ہیں۔ لیکن اس مادہ کے بنیادی معانی کے لحاظ سے اس میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ وہ حق و استقامت کی بنا پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے رہتے ہیں۔ ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ حق و استقامت ہے۔ ان کی وجہ جامعیت قوانین خداوندی کی رو سے تعمیری نظام پر ثابت قدم رہنا ہے۔

قرآن کریم میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2/180) ''تم میں سے جس کے سامنے موت آموجود ہو اور وہ مال چھوڑے، اس پر فرض

قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور دیگر اقربا کے لیے قاعدے کے مطابق وصیت کرے ایسا کرنا متقیوں کے لیے لازم ہے۔'' اس سے واضح ہے کہ ترکہ کے لیے ماں باپ اور دیگر اقرباء کے لیے وصیت کرنا خدا کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے۔لیکن اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ کوئی وصیت نہ کر سکے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (نہ کرے) تو پھر اللہ تعالٰی نے وارثین کے لیے خود حصے مقرر کر دیئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان حصوں کو بیان کرتے وقت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے کہ مِّنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ (4/11-12) ''وصیت جو اس نے کی ہو اس کے بعد یا قرضے کی ادائیگی کے بعد۔'' یہ حکم اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل وتفسیر کی گنجائش نہیں۔لیکن ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی (1/3) مال میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لیے نہیں۔اس کی سند میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی،اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد قرآن کریم کے خلاف ہو نہیں سکتا۔لیکن اس روایت کو صحیح قرار دینے کے لیے کہا جاتا ہے کہ حدیث قرآن کریم کو منسوخ کرسکتی ہے۔اس لیے اس حدیث نے قرآن کریم کی اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔اس قسم کے عقیدے کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ خدا ہماری حالت پر رحم کرے۔یاد رکھیے قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔اس کی کسی آیت کو نہ کوئی دوسری آیت منسوخ کرتی ہے نہ قرآن کریم سے باہر کوئی اور چیز منسوخ کرسکتی ہے۔خدا کے کلام کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر محکم ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ وصیت اور وراثت کے احکام اسی وقت نافذ العمل ہوں گے جب افراد کے پاس فاضلہ دولت ہوگی۔جب معاشرہ ایسا قائم ہوجائے جس میں ہر فرد اپنی فاضلہ دولت کو قرآن حکیم کے مطابق قرآنی نظام کے حوالے کر دے تو اس وقت ترکہ کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔نہ حضور ﷺ نے زائد از ضرورت دولت اپنے پاس رکھی، نہ ترکہ چھوڑا، نہ جائیداد بنائی، نہ وہ وراثت میں کسی کی طرف منتقل ہوئی۔اس طرح آپ ﷺ پر ترکہ اور وراثت کے احکام عائد نہیں ہوئے۔یہی کیفیت تمام مومنین کی اس وقت ہوگی جب قرآنی نظام ربوبیت قائم ہوگا۔اس وقت تک قرآن کریم کی رو سے ہر مومن پر جو کچھ مال چھوڑے وصیت کرنا فرض ہے۔اور وصیت کے معاملہ میں اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اپنے معاملات کو فردِ متعلقہ سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی، ولایت بھیجا، بیرسٹر کرایا۔وہ اب بڑا امیر اور خوش حال ہے۔دوسرا بیٹا حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔اس کی پرورش، تعلیم، تربیت وغیرہ کے تمام اخراجات باقی ہیں۔یہ شخص اپنی وصیت کی رو سے اپنا پورا ترکہ اس نوزائیدہ بچے کو دے سکتا ہے۔لیکن اگر حق وصیت نہ دیا جائے تو اس کے ترکہ کا آدھا حصہ بڑا بیٹا لے جائے گا۔ وصیت کے متعلق اس انفرادی حق کے بعد، قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں یکسر ظلم اور جانبداری سے کام لے تو معاشرہ (عدالت) کو اختیار ہے کہ عدل وانصاف کے مطابق وارثین میں مصالحت کی صورت پیدا

کر دے (2/182)۔ وصیت کو قرآن کریم نے اتنی اہمیت دی ہے کہ سورۃ المائدہ میں اس کے لیے شہادت کا تفصیلی طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے (5/106)۔

وطأ

سورۃ مزمل میں ہے: نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً (73/5) رات کے وقت اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے اٹھنا، سرکش جذبات کو بہت زیادہ مغلوب کر دیتا ہے۔ یا انسان کی قوتِ عمل اس کے ارادوں اور فیصلوں کا مَرْکَبْ بن جاتی ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی اس جدوجہد کا بیان ہے جب حضور ﷺ (نظامِ خداوندی کے ابتدائی مراحل میں) دن رات مصروفِ کار رہتے تھے۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے رات کا آرام بھی قربان کر دینا، انسانی جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی واضح شہادت ہے۔ بالخصوص جب یہ قربانی اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہ ہو، بلکہ نوع انسان کی نجات وسعادت اور فلاح و بہبود کے لیے ہو۔

وعد

خدا کے وعدوں سے مراد ہیں وہ نتائج جو اس کے قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں اور جن میں کبھی خطا نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان قوانین سے سرکشی برتنے کے نتائج وعید ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ آئے گا کہ خدا تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے یا خدا نے اس کا وعدہ کیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کے قانون پر عمل کرنے کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہوگا۔ گویا ''اپنے وعدہ'' سے خدا، اپنے قانون اور اس قانون کے فطری اور حتمی نتیجہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ جس طرح ہم ایک دوسرے سے کسی بات کا وعدہ کرتے ہیں اسی طرح خدا بھی انسانوں سے وعدہ کرتا ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ ''خدا کے وعدے سچے ہیں'' تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ قوانین خداوندی اپنے ٹھیک ٹھیک نتائج پیدا کر کے رہتے ہیں۔ ان میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔

وعظ

مومنین کے لیے خدا کا امر اور وعظ ایک ہی بات ہے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ خدا کا حکم، کسی ڈکٹیٹر کا مستبدانہ حکم نہیں ہوتا۔ وہ حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی حکمت، علت غائی، مقصد، فائدہ بھی بتاتا ہے۔ حکم اور حکمت کے اس مجموعہ کا نام وعظ ہے چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے: مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (2/231) خدا نے

جو کتاب وحکمت (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے جس کے ذریعے وہ تمہیں غلط کاموں کے انجام سے ڈراتا ہے۔ یہ متقین کے لیے مَوْعِظَةٌ ہے (2/66)۔ ویسے اس کے ذریعے متنبہ ہر ایک کو کیا جائے گا۔ چنانچہ منافقین کے متعلق ہے: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (4/63) ان سے اعراض کر اور انہیں ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتا رہ، بڑے دلنشین انداز سے (4/63)۔ لہٰذا غیر مسلموں کے لیے دین کی طرف دعوت کے سلسلے میں ''وعظ'' پند ونصائح کے مرادف ہوگا اور مسلمانوں کے لیے قرآنی احکام اور ان کے نظام کی طرف جاری کردہ ہدایات ① جن کے مقاصد وفوائد کو اس انداز سے سمجھایا گیا ہو کہ اس سے دل میں لینت ورقت پیدا ہو جائے اور وہ اس طرح ان پر عمل پیرا رہیں۔

و ع ی

سورہ معارج میں سرمایہ دارانہ ذہنیت والے کے متعلق ہے: وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70/19) وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے بند کر کے رکھ لیتا ہے۔ سورہ انشقاق میں ہے: وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ (84/22) اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ اس طرح جمع کر کے بند رکھتے ہیں۔

و ف د

سورہ مریم میں ہے: یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا (19/85) جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کے پاس بطور وَفْدٌ اکٹھا کریں گے۔ معانی کے لحاظ سے وَفْدًا کے اندر بلندی اور عظمت، قرب اور مسابقت، عزت اور برگزیدگی، حصول عطایا و نوازشات اور وصول سامانِ نشوونما سب کچھ آجاتا ہے۔ یہ ہے متقین کے اعمال حیات کا نتیجہ اور ان کا مقام۔ اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ متقین کو سب سے آگے رکھا جائے گا۔ اس میں بھی عزت اور برگزیدگی کا پہلو موجود ہے۔

و ف ق

سورہ نساء میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں کشیدگی ہو جائے تو ان میں اصلاح کی کوشش کرو یُوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَهُمَا (4/35) اللہ ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اعمال کے نتائج کو (سورہ النبا میں)۔ کہا گیا ہے جَزَآءً وِّفَاقًا (78/26)۔ یعنی عمل اور اس کے نتیجہ میں پوری پوری موافقت۔ (قرآن کریم کی رو سے جزا یا سزا خود عمل کے نتیجہ کا نام ہے)۔ سورہ ہود

---

① قرآن کریم پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جب معاشرے کو قرآن حکیم کے بتائے ہوئے اصول وضوابط پر متشکل کیا جائے گا تو اس وقت ہمارے دفاتر (سرکاری محکمے) میں جب کسی معاملے میں کوئی ہدایت نامہ، حکم نامہ نہیں (Directive) جاری کیا جائے گا تو اس کا انداز تحریر ایسا دلنشین ہوگا کہ ماتحت عملے کے عقل وجذبات اس پر دل وجان سے عمل کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ہماری آرزو ہے کہ خدا کرے وہ وقت جلد آئے۔ آمین (منظور الحسن مرتب کتاب ہذا)

میں ہے: وَمَا تَوۡفِيۡقِيۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ (11/88) میرے پیش نظر مقصد کے مطابق اسباب کا مِل جانا، یا ان میں صحیح موافقت پیدا ہو جانا، قانون خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی صورت نہیں۔

و ف ی

قرآن کریم میں ایفائے عہد، نقض عہد کے مقابلہ میں آیا ہے (16/91)۔ اور (3/24) میں وُفِّيَتۡ کے معنی لَا يُظۡلَمُوۡنَ نے کر دیئے ہیں۔ یعنی کمی نہ ہونا، پورا پورا مل جانا۔ سورہ ہود میں ہے: وَاِنَّا لَمُوَفُّوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ غَيۡرَ مَنۡقُوۡصٍ (11/109) اس سے تَوۡفِيَةٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی بلا کسی قسم کی کمی کئے پورا پورا دینا۔ سورہ نحل میں ہے: ثُمَّ يَتَوَفّٰٮكُمۡ وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ (16/70) اس کے معنی ہیں اللہ تمہیں پیدا کرتا ہے پھر تمہاری جسمانی ساخت کو تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی بھر پور جوانی تک پہنچا دیتا ہے جس میں تمام قویٰ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی عمر تک پہنچا دیتا ہے جس میں قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آ جاتا ہے۔ یہ معانی انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کی ترتیب کے اعتبار سے ہیں۔ یعنی پہلے پیدائش، پھر جوانی، پھر بڑھاپا۔ لیکن اگر يَتَوَفّٰٮكُمۡ کے معنی ''وفات دیتا ہے'' کیے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ بعض لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی عمر تک پہنچتے ہیں۔

وفات کے معنوں میں سورہ انعام میں ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا (6/61) یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اسے وفات دے دیتے ہیں۔ خدا کے قانون طبعی کے مطابق اس کی زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں ہے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے: فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِىۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ (5/117) پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو ان پر تو ہی نگہبان تھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ یہ (مخالفین) اس قسم کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ تجھے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیں۔ لیکن ان کے خلاف ہم بھی ایک تدبیر کر رہے ہیں اور ہماری تدبیر ان کی تدبیروں سے یقیناً بہتر ہے۔ وَمَكَرُوۡا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ (3/53)۔ میری (یعنی اللہ کی) تدبیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ تمہیں نہ گرفتار کر سکیں گے نہ صلیب دے سکیں گے بلکہ تم اپنی طبعی موت مرو گے (اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ)۔ یہ لوگ تمہیں صلیب دے کر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ ہم تیرے مدارج کو بلند کریں گے (وَرَافِعُكَ اِلَىَّ) اور یہ اس طرح ہوگا کہ ہم تجھے ان مخالفین کی دستبرد سے دور لے جائیں گے۔ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا (3/53) چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ قبل اس کے کہ یہودی حضرت مسیح پر ہاتھ ڈالتے، آپ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق وہاں سے ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تھی خدا کی تدبیر جو کامیاب ہوئی۔

وقب

قرآن کریم میں ہے: وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (113/3) جب چاروں طرف سے تاریکیاں چھا جائیں۔ جب رات کی تاریکی میں آنے والی مصیبتیں گھیر لیں۔ وہ تمام چیزیں جن کے نہ ہونے سے نشوونما رک جائے، جیسے چاند جب ڈوبتا ہے تو نباتات کو ضرر پہنچتا ہے۔ ہماری ضروریاتِ زندگی کے نہ ہونے سے جس قدر نقصانات ہمیں پہنچ سکتے ہیں، ہم ان سے محفوظ رہنے کے لیے قانونِ خداوندی کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان نقصانات سے بچائے اور ہمیں سامانِ نشوونما مہیا کر دے۔

وقت

سورہ نساء میں صلوٰۃ کے متعلق کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (4/103) کہا گیا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ''خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ'' اور دوسرے معنی ہیں ایسا فریضہ جس کا وقت متعین کر دیا گیا ہو۔ سورہ بقرہ میں نئے چاند کے متعلق ہے: هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ (2/189) یہ لوگوں کے لیے اوقات معین کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سورہ نبا میں یَوْمَ الْفَصْلِ کے متعلق ہے: كَانَ مِيْقَاتًا (78/18) یعنی قانونِ مکافات کی رو سے ظہورِ نتائج کا وقت متعین ہوتا ہے۔

وقذ

قرآن کریم میں اَلْمَيْتَةُ (مردار) کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی ہے کہ مردار میں صرف وہی جانور شامل نہیں جو طبعی موت مر جائیں۔ اس میں وہ جانور بھی شامل ہے جو گلا گھٹ کر مر جائے، جو چوٹ کھا کر مر جائے (اَلْمَوْقُوْذَةُ)۔ جو اوپر سے گر کر مر جائے، جو سینگ لگ کر مر جائے یا جسے درندوں نے کھایا ہو۔ ہاں، اگر ان میں سے کسی کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا (5/3)۔

وقر

قرآن کریم میں ہے: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (71/13) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا سے وقار کے امیدوار (طلبگار) نہیں ہوتے۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان ذرا ذرا سی بات سے گھبرا نہ جائے اور انسانی ذات کی ایسی کیفیت کہ موت کے دھچکے سے بھی اس کا کچھ نہ بگڑے۔ لیکن یہ مفہوم اس صورت میں درست ہوگا جب لِلّٰهِ کے معنی مِنَ اللہ (اللہ سے) لیے جائیں۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم اللہ کے لیے بزرگی اور عظمت کا یقین کیوں نہیں رکھتے۔

سورۃ احزاب میں ازواجِ مطہرات سے کہا گیا ہے: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (33/33) اپنے گھروں میں نہایت سنجیدگی

اور وقار سے رہو۔ تم سے ذرا بھی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہ ہو۔

وقی

وَاتَّقُوا اللّٰہَ (جو قرآن کریم میں بار بار آتا ہے) کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ احکامِ خداوندی کا اتباع کرنا، ان کے مطابق زندگی بسر کرنا، ان سے ہم آہنگ رہنا۔

متقی وہ ہے جو اس ضابطہ کے ساتھ متمسک رہے، اس کے ساتھ چمٹا رہے، اس سے ہم آہنگ رہے۔ پھٹ کر الگ الگ ہوجانے (Disintegration) اور ہم آہنگ رہنے (Integration) کے مفہوم کے اعتبار سے سورہ الشّمس میں ہے کہ خدا نے نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ دونوں صلاحیتیں رکھ دی ہیں۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (91/8) چاہے تو انسان ضابطہ خداوندی سے ہم آہنگ رہ کر اپنی ذات میں ارتکاز (Crystallisation) پیدا کرتا جائے اور چاہے اس سے الگ ہٹ کر اپنی ذات میں تشتت وانتشار پیدا کرلے۔ انہی دونوں گروہوں کے متعلق سورہ محمدؐ میں ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنے ہی خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتے ہیں (47/12) لیکن دوسرا گروہ ان کا ہے جو قوانین خداوندی کی راہ نمائی میں چلتے ہیں۔ اس دوسرے گروہ کو ان کا تقویٰ مل جاتا ہے (اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ :47/17) لیکن یہ اسی کو ملتا ہے الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی (92/18-17) جو اپنا مال (یا جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد (2/219) اس کے پاس ہے وہ نوع انسانی کی ربوبیت کے لیے) دے دیتا ہے اور اس طرح خود اپنی ذات کی نشوونما (Development) کا سامان بہم پہنچا لیتا ہے۔

لہٰذا مُتَّقِیْنَ وہ ہیں جو غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کر کے اپنی ذات کی نشوونما کریں۔ تخریبی قوتوں کے تباہ کن اثرات سے حفاظت (تُقَاةٌ) کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرے (تَقْوٰی)، ان کا ہر وقت خیال رکھے (تَقْوَی الْقُلُوْبِ)، اور اپنا ہر قدم ان کے مطابق اٹھائے۔ اسی کا نام ان سے متمسک یا ہم آہنگ رہنا ہے۔

قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں یہ کہہ دیا ہے کہ یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2/2) ہے۔ یعنی یہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے لیکن صرف ان کی جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خاردار وادیوں سے محفوظ رہ کر چلنا چاہیں۔ جو شخص تباہ ہونا چاہے اسے صحیح اور غلط راستے کے امتیاز سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ خودکشی کرنے والے سے یہ کہنا کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے، اس سے بچنا بے سود ہوتا ہے۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2/6) ''ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے وہ صحیح بات کو مانیں گے ہی نہیں۔'' وَاتَّقُوا اللّٰہَ (89/18) کے معنی یہ نہیں کہ اللہ سے بچو۔ اس کے معنی ہیں قوانین خداوندی کو توڑنے یا ان سے سرکشی برتنے سے بچو۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ اور جو اَتْقٰی (سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو وہ خدا

کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے (49/13)۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور اس لفظ کو اس نے اس قدر اہمیت دی ہے کہ یہ بجائے خویش گویا ایک مادہ بن گیا ہے جس سے قرآن کریم مختلف الفاظ لایا ہے۔ اس کے معنی ''پرہیزگاری'' نہیں۔ ''پرہیزگاری'' محض سلبی صفت (Negative Virtue) ہے لیکن تقویٰ میں زندگی کی تباہیوں سے بچ کر چلنے کے ساتھ ساتھ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ہے اور ایجابی پہلو غالب ہے۔ لفظ ''تقویٰ'' اس قدر جامع ہے کہ اس کا ترجمہ کسی ایک لفظ میں ہو نہیں سکتا۔ جس چیز کو عام طور پر کیریکٹر (سیرت اور کردار کی بلندی) کہا جاتا ہے، وہ اس کے اندر آ جاتی ہے۔ ''کیریکٹر'' کی تعریف (Definition) بڑی مشکل ہے اور خود مغرب کے علمائے اخلاقیات بھی اس باب میں باہمدگر متفق نہیں۔ لیکن قرآن کریم اس مشکل عقدہ کو بڑی آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے انسان کی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک حیوانی سطح زندگی جس کے تقاضے وہی ہیں جو دوسرے حیوانات کے ہیں۔ تحفظ خویش (Self-Preservation)، تغلب (Self-Assertion) اور افزائش نسل (Procreation)۔ تحفظ خویش کا جذبہ اس قدر قوی ہے اور شدید ہے کہ کوئی فرد اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی سے تمام کشمکش پیدا ہوتی ہے۔

دوسری سطح زندگی وہ ہے جسے ''انسانی زندگی'' کہہ لیجئے۔ اس زندگی میں مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ نشوونما ان بلند اور مستقل اقدار (Permanent Values) کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہے اور جو اَب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ضروری ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ حیوانی سطح زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی زندگی کے تقاضے (یعنی کسی بلند قدر) میں تصادم ہو جائے، ان میں (Tie) پڑ جائے، تو حیوانی زندگی کے تقاضے کو بلند قدر کی خاطر قربان کر دینا چاہیے۔ یہ ''تقویٰ'' ہے۔ اس کو کیریکٹر کہتے ہیں۔ (نیشنل کیریکٹر نہیں بلکہ انسانی کیریکٹر)۔ حتیٰ کہ اگر کوئی وقت ایسا آ جائے کہ بلند قدر کی حفاظت کے لیے جان تک بھی دینی پڑ جائے تو جان دے دے اور انسانی قدر کو بچا لے۔ اس لیے کہ جان کا تحفظ بہر حال حیوانی سطح زندگی کا تقاضہ ہے اور بلند قدر کی قیمت اس سے زیادہ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ زندگی کو محض حیوانی زندگی (Physical Life) سمجھتے ہیں اور انسانی سطح زندگی (انسانی ذات) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ کافر ہیں (47/13؛45/24) انسانی ذات پر ایمان رکھنا مومن کی خصوصیت ہے۔

قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ اپنے نفع کا خیال رکھنا اور نقصان سے بچنا عقل کا تقاضا ہے۔ جو اپنا نفع نقصان نہ پہچانے اسے پاگل کہتے ہیں۔ چونکہ مومن کے نزدیک انسانی ذات کا تحفظ حیوانی زندگی کے تحفظ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لیے جب ان دونوں تقاضوں میں تصادم ہو جائے تو اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی قیمت کی شے (انسانی ذات) کی حفاظت کے لیے چھوٹی قیمت کی شے (حیوانی تقاضے) کو قربان کر دے۔ لہٰذا صحیح عقل و فکر کے مالک مومن ہی ہوتے ہیں (3/189)۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (65/10) ''اے عقل والو جو ایمان لائے

ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''، یعنی بلند اقدار کی خاطر پست اقدار کو قربان کر دینا تقاضائے عقل و ایمان ہے۔قرآن کریم انسان میں کیریکٹر پیدا کرنے کے لیے خالی جذبات سے اپیل نہیں کرتا۔ وہ علم وبصیرت (Reason) سے اپیل کرتا ہے اور عقل کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کرنا خود اس کے لیے کس قدر مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہے (12/108)۔اور مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اور تو اور، قوانین خداوندی کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے (25/73)۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقویٰ اور انہیں کہتے ہیں مُتَّقِیْنَ۔

وکأ

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا: هِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْهَا (20/18) یہ میرا عصا ہے جس پر میں سہارا لیتا ہوں۔ (اس کے مجازی معنی لیے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ احکام وضوابط مجھے ملے ہیں وہ میرے لیے عصائے زندگی ہیں جن کے سہارے میں سفر حیات طے کروں گا)۔

وکل

ہمارے ہاں توکّل علی اللہ کے معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ انسان خود کچھ نہ کرے اور اس انتظار میں رہے کہ خدا اس کے لیے از خود سب کچھ کر دے گا۔توکّل کا یہ مفہوم قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے جو ہر قدم پر سعی وعمل اور جدوجہد کی تاکید کرتا ہے۔آپ ایک آدمی کو سمندر میں پھینک دیجئے۔ وہ تیرنا نہ جانتا ہو تو ڈوب کر مر جائے گا۔آپ لوہے کے ایک ٹکڑے کو پانی میں ڈال دیجئے، وہ جھٹ پانی کے نیچے چلا جائے گا۔لیکن اگر آپ اسی لوہے کی چادروں سے ایک خاص قاعدے کے مطابق ایک عظیم القدر جہاز بنالیں تو وہ سینۂ بحر پر بط کی طرح تیرتا چلا جائے گا۔اور اس میں اگر ہزار آدمی بھی سوار کر لیں تو بھی نہیں ڈوبے گا (بشرطیکہ یہ وزن اس کی حد کے اندر ہو جسے وہ قاعدے کے مطابق اٹھا سکتا ہے)۔

آپ جہاز کو سمندر میں کس اطمینان سے چلاتے رہتے ہیں اور کس اطمینان سے اس میں سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ اطمینان کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟ اس ''ایمان'' سے کہ یہ جو قانونِ خداوندی ہے کہ اتنی جسامت کا جہاز اگر پانی میں چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قدر وزن لے کر تیرتا رہے گا، یہ قانون کبھی دھوکا نہیں دے گا۔اس قانون پر پورا پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے، اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، یہ راستے میں دھوکا نہیں دے گا، یہ آسرا ٹوٹے گا نہیں، یہ سہارا دغا نہیں دے گا۔اسی کو توکّل کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانین خداوندی جاری وساری ہیں جن پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح انسانوں کی تمدنی زندگی کے لیے جو قانون خدا نے عطا کیا ہے (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اس

کی نتیجہ خیزی پر بھی اسی طرح سے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر تم اس کے مطابق چلو گے تو جس نتیجہ کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے وہ یقیناً برآمد ہو کر رہے گا۔ اس کا نام تَوَکُّلٌ عَلَی اللّٰہِ ہے۔ اور انہی معنوں میں خدا اَلْوَکِیْلُ ہے۔ یعنی جس کے قانون پر پورا پورا بھروسہ کیا جائے۔ عزم (کسی کام کے کرنے کا محکم ارادہ) اس توکل کی لازمی شرط ہے (3/158)۔ جماعت مومنین وہ ہے جو اپنے عزم و ارادہ کے ساتھ قانونِ خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کرے۔ انہی کو اَلْمُتَوَکِّلِیْنَ کہا گیا ہے (3/158)۔ جو اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون پر بھروسہ کرے وہ مشرک ہے (16/99-100)۔

ولد

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لیے متعدد مقامات پر ہے کہ اس کا وَلَدٌ نہیں (4/171)۔ اس سے صرف عیسائیوں کے اس عقیدہ ہی کی تردید مقصود نہیں جس کی رو سے وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ کہنا بھی ہے کہ خدا نے کائنات کو تَوْلِیْدٌ کے سلسلہ سے پیدا نہیں کیا (جس طرح ماں باپ سے اولاد پیدا ہوتی ہے) بلکہ اس نے اسے تخلیقاً پیدا کیا۔ تولید (Procreation) میں پیدا کرنے والے (وَالِدٌ) کا ایک جزو، مَوْلُوْدٌ (جو جنا گیا ہو اس) میں شامل ہوتا ہے۔ اور والد میں اتنے حصے کی کمی آ جاتی ہے۔ لیکن تخلیق (Creation) میں پیدا کرنے والے (خالق) کی ذات کا کوئی جزو اس کی مخلوق میں نہیں آتا۔ اس لیے عملِ تخلیق سے اس کی ذات میں کوئی کمی (Deficiency) واقع نہیں ہوتی۔ خدا خالق ہے اور وہ انسانوں سے بھی تخلیق چاہتا ہے۔ باقی رہا عملِ تولید، سو یہ ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوان اور انسان دونوں شامل ہیں۔ آدمی، انسانیت کی سطح پر عملِ تخلیق سے آتا ہے اور صرف تولید (اولاد پیدا کرنے) سے وہ حیوانی سطح پر رہتا ہے (اگرچہ افزائشِ نسل کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔ جس طرح تحفظ خویش کے لیے کھانا، پینا ضروری ہے)۔ لہٰذا انسان کو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس نے ''تخلیق'' کس قدر کی ہے۔ نہ یہ کہ اس نے ''تولید'' کتنی کی ہے۔ کتنے بچے پیدا کیے ہیں۔ تخلیق فریضۂ انسانیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اللہ کے علاوہ اور خالقین کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ وہ خدا کو اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (23/14) کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی تمام خالقین میں سب سے بہترین خالق۔ وہ جس کی تخلیق حسن کی انتہائی شکل لیے ہو۔

قرآن کریم نے احکامِ وراثت کے ضمن میں کہا ہے: یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْۤ اَوْلَادِکُمْ (4/11)۔ اَوْلَادٌ: وَلَدٌ کی جمع ہے۔ لہٰذا اس سے مراد صرف اپنے بیٹے اور بیٹیاں ہی نہیں بلکہ بیٹوں اور بیٹیوں کے بیٹے بیٹیاں بھی ہیں۔ اگر کسی متوفیٰ کا بیٹا زندہ ہے تو وہ اس کا ولد ہوگا۔ اور اگر بیٹا پہلے مر چکا ہے لیکن اس کا پوتا (بیٹے کا بیٹا) زندہ ہے تو وہ بھی اس کا ولدٌ ہوگا اور اور وہ دادا کی وراثت سے حصہ پائے گا۔ اسی طرح بیٹی کی اولاد بھی اَوْلَادٌ میں شامل ہوگی۔ اسی طرح والدین سے مراد صرف ماں باپ وغیرہ نہیں ہوں گے بلکہ یہ سلسلہ اوپر تک چلا جائے گا۔ یعنی داد، نانی وغیرہ۔

سورہ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں۔اس کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر آرہا ہے۔ اس ضمن میں کہا ہے کہ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ (2/233) مطلب یہ ہے کہ بچے کی ماں کے کھانے پینے کی ذمہ داری بچے کے باپ پر ہے۔اس کے لیے قرآن کریم نے مَوْلُوْدٌ لَهٗ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔یعنی وہ جس کے لیے اس عورت نے بچہ جنا تھا۔اگر بچے کا باپ موجود ہے تو یہ الفاظ اس کے لیے ہوں گے۔اگر وہ نہیں تو اس کی جگہ جو اس کا (مذکر) وارث ہوگا یہ الفاظ اس کی طرف رجوع کر جائیں گے۔

و ل ی

قرآن مجید میں یہ مادہ ان تمام مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔کسی کی طرف رخ کر لینا (2/115) اور روگردانی کرنا (2/142)۔حاکم بن جانا (2/205) وَلَايَةٌ بمعنی غلبہ واقتدار (18/45)۔وَلِيٌّ: مددگار، حمایتی (7/111)۔وَلِيٌّ بمعنی وارث (19/5؛17/33)۔اَلْمَوَالِيْ (دور کے) رشتہ دار (19/5؛4/33)۔

ایک راہ تو یہ ہے کہ انسان جس نظریہ یا تصور کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے (اسے ایمان کہتے ہیں) اس کے سامنے بطیب خاطر جھک جائے اور اس کی پوری پوری اطاعت کرے (اسے اسلام کہتے ہیں)۔لیکن دوسری راہ یہ ہے کہ انسان اس سے گریز کی راہیں تلاش کرے۔یہ اعراض ہے۔اس کو تَوَلّٰی کہتے ہیں۔تَوَلّٰی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایک مذہب (یا نظام) کو چھوڑ کر دوسرا مذہب (یا نظام) اختیار کر لے۔اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کی پوری پوی اطاعت نہ کرے بلکہ گریز کی راہیں نکالتا رہے۔اسی لیے تَوَلّٰی بمقابلہ صَلّٰی آیا ہے (75/31-32)۔صَلّٰی کے معنی پوری پوری اطاعت کرنا، کسی کے پیچھے پیچھے چلے جانا ہیں۔صَلّٰی کے مقابل میں تَوَلّٰی کی عام صورت یہ ہے کہ خدا کے دیئے ہوئے دین (یا نظام اطاعت) کی جگہ انسان کی خود ساختہ شریعت کو دین قرار دے دیا جائے اور اس کی اتباع کو دین کی اطاعت بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے خدا اور انسان کا تعلق اس قسم کا قرار دیا ہے جسے ہم عام الفاظ میں رفاقت کا تعلق کہتے ہیں۔اگر انسان قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے تو خدا خود اس کا رفیق (ولی) بن جاتا ہے اور اس کے قانون کے حیات بخش نتائج اس کے شامل حال ہوتے ہیں۔دوسری طرف ان قوانین کی اطاعت سے انسان کے ہاتھوں خدا کے کائناتی پروگرام کی تکمیل ہوتی جاتی ہے (یعنی کائنات میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے)۔اس طرح انسان خدا کا وَلِیٌّ بن جاتا ہے۔چنانچہ قرآن کریم نے ایک طرف خدا کو مومنین کا ولی کہا ہے (2/257) اور دوسری طرف مومنین کو اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ کہا ہے (10/62)۔اولیاء وَلِیٌّ کی جمع ہے یاد رہے کہ اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ کا کوئی خاص گروہ نہیں۔قرآن کریم کی رو سے ہر مومن وَلِيُّ اللّٰهِ ہے اور تمام مومنین اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ ہیں۔اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ وہ ہیں الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ

(10/63) جولوگ قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ان کی ''پہچان'' یہ بتادی کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ(10/64) انہیں اس دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔آخرت کی زندگی کو تو یہاں دیکھا نہیں جاسکتا لیکن یہاں کی زندگی تو ہر ایک کے سامنے ہوتی ہے۔لہٰذا اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ (جماعت مومنین) وہ ہیں جنہیں زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں اور وہ دنیا میں نظامِ خداوندی کو قائم کریں (کیونکہ دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں صرف اسی نظام کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہیں)۔انہی کو قرآن کریم نے حِزْبُ اللّٰهِ (58/22) کہا ہے۔اور ان کے مقابلہ میں غیر خدائی نظام کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کو حِزْبُ الشَّيْطٰنِ (58/19)۔اس تصور کے علاوہ اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ کا جو تصور بھی ہے وہ غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا ہوا۔

سورہ محمد میں سلسلہ کلام یوں چلا آرہا ہے کہ تم اقوام سابقہ کے احوال وکوائف پر غور کرو اور دیکھو کہ جن لوگوں نے وحی کے بتائے ہوئے راستے سے سرکشی برتی ان کا انجام کیا ہوا؟ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام دورِ حاضر کے مخالفین کا بھی ہوگا۔اس کے بعد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (47/11) ''یہ اس لیے کہ جو لوگ وحی کے بتائے ہوئے راستے پر ایمان رکھتے ہیں ان کا مولیٰ (دوست، رفیق، کارساز) اللہ ہے۔اور جو اس راستے کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہوسکتا۔''یعنی جو شخص یا قوم قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرے اسے اس کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ظاہر ہے کہ ان معنوں میں اللہ کے سوا کوئی کسی کا مولیٰ نہیں ہوسکتا۔یہی وہ مفہوم ہے جس کی رو سے جماعت مومنین کا اعلان ہوتا ہے کہ اَنْتَ مَوْلٰىنَا (2/286) ''تو ہی ہمارا مولیٰ ہے۔''لیکن اس کے ساتھ سورہ تحریم میں (نبی اکرم ﷺ کے سلسلہ میں) فرمایا کہ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (66/4) ''اس کا مولیٰ اللہ ہے اور جبریل اور صالح مومنین ہیں۔ظاہر ہے کہ جس مفہوم میں اللہ مولیٰ ہوسکتا ہے اس میں اللہ کے سوا اور کوئی مولیٰ نہیں ہوسکتا۔لہٰذا اللہ، جبریل اور مومنین کی ''مولائیت'' کی نوعیت الگ الگ ہے۔انہیں ایک سطح کا مولیٰ سمجھنا غلط ہے۔قوانین خداوندی کے خلاف کسی کی مولائیت کام نہیں آسکتی۔يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا (44/41) ''جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہیں آسکے گا۔''اس پر شاہد ہے۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو بتاکید دہرایا اور بار بار دہرایا ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے اولیاء ہوسکتے ہیں اور مومن کسی غیر مومن (کافر) کا ولی نہیں ہوسکتا۔بات بالکل واضح ہے۔دنیا میں ایک دوسرے کے دوست، رفیق، ہم راز، ہم نوا وہی ہوسکتے ہیں جن کی منزلِ مقصود اور اس تک پہنچنے کا راستہ ایک ہو۔جن کی منزلیں مختلف اور راستے الگ الگ ہوں، وہ ایک دوسرے کے دم ساز اور ہم راز کیسے ہوسکتے ہیں؟ غیر مومنین سے اچھے کاموں میں تعاون کیا جاسکتا ہے۔انہیں اپنا ہمراز اور دم ساز نہیں بنایا جاسکتا۔

وھب

نبوت ایک ایسا علم ہے جو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتا ہے۔کسب و ہنر سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔خدا کی صفت اَلْوَهَّابُ ہے(3/7)۔یعنی بلا مزد و معاوضہ بہت زیادہ عطا کرنے والا۔

وھن

سورۃ انفال میں ہے:اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (8/18)اللہ مخالفین،کفار کے منصوبوں کو کمزور(ناکام) بنادے گا۔مسلمانوں سے کہا گیا ہے:وَلَا تَهِنُوْا (3/138)۔اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میں کسی قسم کی بھی کمزوری نہیں ہونی چاہیے۔نہ جسمانی کمزوری(جس میں مادی اسباب بھی شامل ہیں)اور نہ ہی عقل وفکر اور علم وبصیرت کی کمزوری۔کیونکہ قرآن کریم نے قیادت کے لیے جسمانی اور علمی دونوں صلاحیتوں کو ضروری قرار دیا ہے (2/247)۔نہ ہی سیرت و کردار میں کسی قسم کی کمزوری۔اس طرح ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ(3/138)تم سب سے بلند ہو جاؤ گے۔

ھارُوت

هَارُوْتُ۔افسانہ طرازوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق جو طرح طرح کی چیستانیں مشہور کر رکھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ بابل میں دو فرشتے تھے ہاروت اور ماروت۔وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔قرآن کریم نے ان مزخرفات کی تردید کر دی(2/102)۔

ھارون

حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام۔بعض لوگ اپنے اس (غلط) عقیدہ کی دلیل میں کہ نبی بغیر کتاب بھی آتے ہیں،حضرت ہارونؑ کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو کتاب ملی تھی اور حضرت ہارونؑ ان کے ساتھ بغیر کتاب کے تھے۔قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ کتاب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو ملی تھی۔وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (37/117)''اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی۔''

ھامان

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا تھا(40/24)۔اور یہ تینوں ہلاک ہونے والوں میں سے تھے(29/39)۔

تاریخ انسانیت کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالیے ہر جگہ بادشاہت کے غلبہ و استیلاء سے کہیں زیادہ عمیق و شدید ''پیشوائیت''(Priesthood) کا تسلط نظر آئے گا۔ بادشاہ تو خیر بادشاہی کرتا تھا، برہمن (مذہبی پیشوا) خدائی کرتا تھا۔ ایسی خدائی جس میں سچ پوچھئے تو بادشاہ بھی اس کی رعایا میں سے ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمانی انقلاب کی آواز جب بھی اٹھی ہے اس کے مقابلہ میں ملوکیت کبھی براہِ راست سامنے نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ ''پیشوائیت'' کو آگے بڑھاتی ہے اور خود اس کی سپر میں محفوظ رہتی ہے۔ یہی فرعون نے کیا۔ خود پیچھے رہا اور حضرت موسیٰ کے مقابلہ کے لیے ہامان اور اس کے ساحرین کو آگے بڑھایا۔ لیکن عصائے موسیٰ نے ان سب کی دسیسہ کاریوں کو نیست و نابود کر دیا۔ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ (7/117)۔

ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری تینوں بلائیں انسانیت کے لیے ہلاکت آفرین ہیں۔ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں ان تینوں بلاؤں کا ذکر شرح و بسط سے کیا ہے۔ فرعون استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ، ہامان پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ اور قارون سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا پیکر۔ آسمانی انقلاب انسانیت کو ان تینوں بلاؤں سے نجات دلانے کے لیے آتا ہے۔ اس کا علاج قرآنی نظام حکومت و معیشت میں ہے جس میں نہ کوئی کسی انسان کا بندہ اور غلام ہوتا ہے نہ محکوم اور محتاج۔

ھ ب ط

قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ اگر انسان وحی کی راہ نمائی میں امۃ واحدہ بن کر رہیں تو یہ زندگی شرفِ انسانیت کی زندگی ہے لیکن اگر وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں تو یہ اُس مقام سے پستی کی طرف تبدیلی (ہبوط) ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (2/36) ''ہم نے کہا کہ تم (اس) مقام بلند سے پستی کی طرف جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔'' اس ہبوط سے بلند مقام آدمیت کی طرف تبدیلی اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب انسان وحی کے مطابق زندگی بسر کریں (2/38)۔

ھ ج ر

قرآن کریم میں ہے: وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (73/10) نہایت خوبصورتی سے ان سے الگ ہٹ کر (اپنی جماعت کی تنظیم میں مشغول ہوجا)۔

اس شخص کو جو اپنے مقام رہائش کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے مُهَاجِرٌ کہتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اسے اپنے خاص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ایک رسول یا مردِ مومن کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظامِ

خداوندی کے قیام کے لیے کوشش کرے۔ وہ جس مقام میں رہتا ہے سب سے پہلے اپنی اس کوشش کو وہیں سے شروع کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ وہاں کی فضا اس نظامِ نو کے لیے سازگار نہیں تو اسے اپنے پاؤں توڑ کر وہیں نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ اسے اس زمین کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جانا چاہیے جہاں کی فضا اس کے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ سازگار ہو۔ مومن کسی خاص خطۂ زمین سے پابستہ نہیں رہ سکتا۔ مومن کا جہاں ① ہر کہیں ہے۔ وہ کسی خاص زمین سے زندگی بسر کر کے وہیں مرجانے کے لیے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اسے جو کچھ چھوڑنا پڑے بلا توقف چھوڑ دینا چاہیے۔ مال و دولت، جھوٹی عزت اور قوت، رشتہ دار، وطن، سب کچھ۔ اس ''چھوڑ دینے'' کا نام ''هِجْرَةٌ'' ہے۔ اور ایسا کرنے والے کو ''مہاجر'' کہتے ہیں۔ لیکن صرف ''چھوڑ دینا'' ہی نہیں بلکہ اس کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا بھی۔ اسی لیے قرآن کریم میں اکثر هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ (2/218) اکٹھا آیا ہے۔ هَاجَرُوْا والا حصہ لَا ہے اور اس کے بعد جٰهَدُوْا حصہ اِلَّا اگرچہ وہ چھوڑ دینا بھی درحقیقت اسی جدوجہد ہی کا ایک پہلو ہے۔ ہجرت مشکلات سے فرار کا نام نہیں۔ یہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ مساعد ماحول کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے۔

مَهْجُوْرٌ۔ قرآن کریم میں ہے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (25/30) اور رسول خدا کے حضور میں کہے گا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میری قوم نے اس قرآن کریم کو مَهْجُوْر بنا دیا تھا۔ اس کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مَهْجُوْرٌ کے معنی اس سے کہیں گہرے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو گائے یا بھینس دوڑ جاتی ہو اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ہیں اور رسی کا دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیا جاتا ہے۔ لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے۔ وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ہے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنے خودساختہ اعتقادات، خیالات، رسومات، روایات، قوانین، تفاسیر وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر مَهْجُوْرٌ بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑا نہیں تھا، سینوں سے لگا رکھا تھا۔ لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اسے اتنا ہی چلنے کی اجازت دے دی جاتی تھی جتنی ان کے خودساختہ ''مذہب و شریعت'' کی رسی مناسب سمجھتی تھی۔ یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں تھے، قرآن کریم ان کے تابع تھا۔ یہ ہے مطلب قرآن کریم کو مَهْجُوْرٌ بنا دینے کا۔

ابن قتیبہ نے هُجْرٌ کے معنی ہذیان بکنے کے بھی لکھے ہیں۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ

① علامہ اقبال کا پورا شعر یوں ہے: مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا جہاں ہر کہیں ہے (بالِ جبریل)

انہوں نے قرآن کریم کو محض منتر[1] بنا رکھا تھا۔

ھ ج ع

قرآن کریم میں ہے: كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (51/17) وہ رات کو بہت کم سوتے تھے (جس انقلاب عظیم کی وہ تیاریاں کر رہے تھے اور جو کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے، ان کی تکمیل میں وہ دن رات مصروف رہتے تھے اور رات کا بہت کم حصہ سونے میں گزارتے تھے (73/2-4)۔

ھ د د

قصۂ حضرت سلیمانؑ میں جس هُدْهُدْ (27/20) کا ذکر ہے وہ ان کی فوج کے ایک افسر کا نام تھا۔ اس زمانے میں پرندوں ور جانوروں کے ناموں پر قبائل اور افراد کے نام عام طور پر رکھتے تھے۔ (انگریزوں کے ہاں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ وہاں لوگوں کے نام (Fox) اور (Lamb) عام طور پر ملتے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی طوطا رام اور چوھامل جیسے نام پائے جاتے ہیں)۔ هَدَاهِدُ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ قرآن کریم میں الهُدهُد (ال کے ساتھ) آیا ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کا نام نہیں تھا بلکہ اپنے قبیلہ یا فوج کی نمائندگی کی جہت سے اسے اس طرح پکارا گیا ہے۔

ھ د ی

دین کا مدار اس بنیادی حقیقت پر ہے کہ عقل انسانی اُن مستقل اقدار کو نہ وضع کر سکتی ہے اور نہ ہی از خود ان کا انکشاف کر سکتی ہے جن کے مطابق انسانی زندگی اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ اقدار خدا کی طرف سے ملتی ہیں۔ اسے وحی کہا جاتا ہے جو آخری بار نبی اکرم ﷺ کو ملی اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ عقل انسانی کو اس وحی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو (سورج کی) روشنی کی۔ جب انسانی عقل وحی کی راہنمائی میں چلے گی تو یہ دنیا جنت بن جائے گی

---

[1] علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

خوار از مہجوریٔ قرآن شدی   شکوۂ سنج گردشِ دوراں شدی

یعنی تو قرآن کو چھوڑ کر ذلیل و خوار ہوا اور اس کے علی الرغم زمانے کو برا بھلا کہنے لگا۔ (کشاف کلیاتِ فارسی، صفحہ 211، مرتب و مہذب احمد رضا، ادارۂ اہل قلم، 3/10 ہما بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور، طبع اول 2014ء)

جس طرح ہمارے ہاں کا معمول ہے کہ چند دعائیہ کلمات پڑھ کر دوسرے کے چہرے پر پھونک مارتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب مقصد حل ہو گیا۔ (منظور الحسن)

ورنہ فساد اور خون ریزیوں کا جہنم بنی رہے گی۔ وحی کی اسی راہنمائی کو ہدایت خداوندی کہتے ہیں جو انسان کو زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف لے جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ہدایت (راہنمائی) صرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (2/120)۔ اس کے مقابلہ میں انسانوں کی تجویز کردہ راہنمائی، ہدایت نہیں ضلالت ہے (2/16)۔ یہی راہ سیدھی ہے۔ اس کے علاوہ ہر راستہ ٹیڑھا ہے (3/7)۔ رسول اسی ہدایت خداوندی کو لے کر آتے تھے۔ لیکن ان کے ذمے اس ہدایت کو لوگوں تک پہنچا دینا تھا۔ انہیں اس راستہ پر چلا دینا نہیں تھا (2/272 و 28/56)۔ سیدھے راستہ پر انسان خود اپنی رضا و رغبت سے چل سکتا ہے، زبردستی کسی کے چلائے نہیں چل سکتا۔ اس لیے کہ دین میں اکراہ نہیں (2/256)۔ خود خدا نے بھی انسانوں کے لیے زندگی کی راہوں کو روشن اور واضح کیا ہے۔ انہیں ان راہوں پر چلنے کے لیے مجبور پیدا نہیں کیا۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (72/3)۔ ''ہم نے اس کے لیے راستہ واضح کر دیا ہے۔ اب وہ چاہے تو اسے اختیار کر لے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔'' حقیقت یہ ہے کہ خود لفظ ''ہدایت'' اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں۔ راستہ اسی کو بتایا جاتا ہے جو منزل تک پہنچنے کے لیے سفر اختیار کرنا چاہے اور بھٹک جانے کی مصیبتوں سے بچنا چاہے۔ انہی کو مُتَّقِيْنَ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انہی معنوں میں اپنے آپ کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2/2) کہا ہے۔ یعنی جو لوگ غلط راستے کے خطرات سے محفوظ رہنا چاہیں ان کے لیے صحیح راستہ کی طرف راہنمائی۔

ھزء

منافقین اپنی پارٹی کے سرغنوں سے خلوت میں جا کر کہتے تھے کہ ہم جو جماعت مومنین سے جا کر ملتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ہم تو صرف مذاق کرتے ہیں۔ نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (2/14) قرآن کریم نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ کیا مذاق کریں گے۔ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے خود ان کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ یہ سراب کو حقیقت سمجھ کر اس کے حصول میں پوری جدوجہد کرتے ہیں اور بالآخر دیکھتے ہیں کہ ان کی ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ان کا خود اپنی نفسیاتی فریب انگیزیوں میں اس طرح مارے مارے پھرنا ان کے ساتھ عملی مذاق ہے۔ خدا کا مہلت کا قانون ان کی جلدی گرفت نہیں کرتا بلکہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے جس سے یہ اپنی بے راہ روی میں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں اور حقیقت کی دنیا میں اپنا مذاق آپ اُڑواتے ہیں۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (2/15)۔

سورہ حجر میں ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ کسی اور کا اقتدار و اختیار بھی ہے، یہاں قانونِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کا قانون بھی کارفرما ہے تو یہ لوگ درحقیقت خدا کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا (15/95-96) ''ہم ان مذاق کرنے والوں کے لیے تیری طرف سے کافی

ہیں۔ یہ جو اللہ کے ساتھ اور معبود اختیار کرتے ہیں۔'' اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ مذاق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو مقام خدا کا ہے اس میں کسی اور کو شریک سمجھ لیا جائے۔ یا خدا کے متعلق عقیدہ وتصور کو یونہی (Lightly) لیا جائے اور زندگی کے حقائق پر (Seriously) غور نہ کیا جائے۔

ھ ز ل

قرآن کریم میں خود قرآن کریم کے متعلق ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ○ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ○ (86/13-14) یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ یونہی مذاق کی بات نہیں۔ یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف بحث کرتا ہے، سطحی جذبات کی تسکین کے لیے سرسری گفتگو نہیں کرتا۔ یہ ''شاعری'' نہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ پر بڑی سنجیدگی سے (Most Seriously) غور کرنا چاہیے۔ یونہی (Lightly) نہیں لینا چاہیے۔ نہ ہی اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں خالی پند و نصائح کے طور پر باتیں کہہ دی گئی ہیں۔ قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بطور حقیقت کہا گیا ہے نہ محض جھوٹ موٹ ڈرانے دھمکانے کی خاطر۔

ھ ش ش

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو وحی کی راہنمائی عطا ہوئی اور اللہ نے ان سے پوچھا کہ اس ضابطہ ہدایت کے متعلق ان کا کیا خیال ہے کہ اس سے کیا کام لیا جائے گا تو آپ نے کہا کہ یہ میرے لیے عمر بھر کا سہارا ہوگا اور اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِىْ (20/18) میں اس سے اپنی بھیڑوں (بنی اسرائیل) کے لیے غذائے نفس پیدا کروں گا۔ آیت کے لفظی معنی ہیں ''میں اس (عصا) سے اپنی بھیڑوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔''

ھ ل ک

قرآن میں قوموں کی ہلاکت کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زمانۂ قدیم میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ کوئی بستی کسی طبعی حادثہ (مثلاً زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کے پھٹنے) کی وجہ سے بالکل تباہ ہوجائے۔ لیکن عام طور پر قوموں کی ہلاکت سے مراد ان کی ذلت ورسوائی اور کمزوی ومحکومی ہوتی ہے۔ یعنی اگر کسی قوم سے سروری وسرفرازی چھن جائے تو وہ اس کی ہلاکت ہے۔ یہی وہ ہلاکت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ اَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (2/195) نظامِ خداوندی کے قیام کے لیے اپنے اموال کو کھلا رکھو۔ ایسا نہ کرو گے تو تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لو گے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہنگامی حادثہ یا عارضی سبب سے کوئی قوم وقتی طور پر گر جاتی ہے لیکن حالات کے سدھرنے پر وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے (یہ اس کی حیاتِ نو یا نشاۃِ ثانیہ کہلاتی ہے)۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے قصہ میں کہا گیا ہے کہ ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ (2/56) ''ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں پھر اُٹھا کھڑا کیا۔'' لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ تباہی عارضی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوم ہمیشہ کے لیے تباہ ہوجاتی ہے۔

سورۃ قصص میں ہے: کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ (28/88) اس کے معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ تمام کائنات فنا ہوجائے گی اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔ اس کی تائید میں سورۃ رحمٰن کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے: کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ○ وَّیَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَ الۡاِکۡرَامِ○ (55/26-27)۔ لیکن ان آیات کا صحیح مفہوم یہ نہیں۔ پہلی آیت میں ہَالِکٌ اور دوسری میں فَانٍ دونوں اسم فاعل ہیں اور اسم فاعل کو جب تک خصوصیت سے مستقبل کے ساتھ مشروط نہ کردیا جائے اس کے معنی زمانہ حال کے ہوتے ہیں۔ مثلاً اِنِّیۡ جَاعِلٌ کے معنی یہ نہیں کہ کہ میں بناؤں گا۔ اس کے معنی ہیں میں بنارہا ہوں۔ لہٰذا ہَالِکٌ اور فَانٍ کے معنی یہ نہیں کہ یہ کائنات ایک دن فنا ہوجائے گی۔ [1] اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز (فنا اور ہلاکت) اب ہورہی ہے۔ کائنات کی ہر شے حالتِ فنا اور ہلاکت سے گزر رہی ہے۔ فنا کے معنی معدوم ہوجانا نہیں۔ اس کے معنی ہیں تغیر پذیر ہوجانا۔ ایک حال پر نہ رہنا۔ اور ہلاکت کے معنی بھی قوت کے کم ہوجانے کے ہیں۔ لہٰذا ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے مستقل طور پر ایک حالت میں نہیں رہتی۔ ہر شے میں ہر آن تغیر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی قوت میں کمزوری آتی رہتی ہے۔ لیکن خدا کا وہ قانون (یا وہ راستہ) جو عالمگیر نشوونما کی طرف لے جاتا ہے تغیر نا آشنا ہے۔ وہ تغیرات کے اثر سے مامون رہتا ہے۔ اسی کو مستقل قدر کہتے ہیں۔ لہٰذا ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر یا روبہ انحطاط ہے، بجز مستقل اقدار کے جو قوانین خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ خدا کی ربوبیت کبریٰ (عالمگیر نشوونما) ہے۔ لہٰذا وہی نظریہ زندگی، وہی نظامِ حیات، وہی قوم، تغیرات اور انحطاط سے محفوظ رہ سکتی ہے جو اپنا دامن ان مستقل اقدار کے ساتھ باندھ لے۔ جو قوم ایسا نہیں کرتی اس کا غلبہ و تسلط اور قوت واثر آہستہ آہستہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور ایک دن ختم ہوجاتا ہے۔

ھ ل ل

اِھۡلَالٌ کے اصلی معنی ہوتے ہیں آواز بلند کرنا۔ رویت ہلال کے موقع پر اونچی آواز سے بولا جاتا ہے، بعدازاں ہر

[1] کائنات کا انجام کیا ہوگا؟ یہ بھی اس قسم کا راز ہے جس قسم کا راز کائنات کا آغاز ہے۔ یہ امور انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتے۔ بہرحال کائنات خدا کی پیدا کردہ ہے۔ اسی کے قانون کے مطابق قائم ہے اور اسی کے مطابق اس کا انجام ہوگا۔ ابدی تو یہ بہرحال نہیں۔ یعنی ان معنوں میں ابدی جن معنوں میں خدا ابدی ہے۔ ہمارے لیے یہ سوال بھی بے کار ہے کہ کائنات کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے تو بہرحال ایک دن موجودہ ارضی زندگی کو چھوڑنا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ جب تک اس میں رہیں اس کے حسن میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔

آواز کے لیے بولا جانے لگا۔ اَلْھِلَالُ: مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کا چاند۔ اسی طرح قمری مہینے کی چھبیس، ستائیس تاریخ کے چاند کو بھی کہتے ہیں۔ ھِلَالٌ کو ھِلَالٌ اس لیے کہتے ہیں کہ لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دے کر بتاتے ہیں۔ اَلْھَلَالُ اور اَلْھِلَالُ پہلی بارش کو بھی کہتے ہیں۔ (لیکن اسی بارش کو جس کے برسنے کی آواز آئے)۔

اَلْھَلَلُ ہاتھی کے مغز کو کہتے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زہر قاتل ہوتا ہے۔ یعنی زہر ہلاہل۔ ھَلَّلَ یہودی اور نصرانی اس لفظ کو تسبیح پڑھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جو عبرانی اور سریانی زبان کا لفظ ہے۔ ہمارے ہاں بھی تسبیح و تہلیل کہتے ہیں۔ ھَلَّلَ کے معنی ہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا۔

قرآن کریم میں (کھانے پینے کی حرام اشیاء کی فہرست میں) ہے: وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ (2/173) یعنی وہ چیز جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا جائے۔ جو چیز بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے وہ قرآن کریم کی رو سے حرام ہو جاتی ہے۔ مومن کے لیے خدا کے سوا کسی اور قوت کا تصور شرک ہے۔ ''منسوب ہونے'' یا خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے نام سے پکارے جانے کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ مثلاً شاہ مدار کے نام پر بکرا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بکرا ویسے تو حلال جانور ہے لیکن چونکہ اسے اللہ کے سوا کسی اور نام سے پکارا گیا ہے، یا اسے اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس لیے اس کا کھانا حرام ہو جائے گا۔ اسی طرح کھانا پکا کر کہہ دیا جائے کہ یہ فلاں پیر صاحب کی نیاز ہے تو اگرچہ وہ کھانا پاک اور صاف، حلال اور طیب تھا لیکن غیر اللہ کی طرف نسبت سے وہ حرام ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نسبت میں شرک کا پہلو آ جاتا ہے اور یہ توحید کے منافی ہے۔ قرآن کریم انسان کے عقائد اور تصورات کو شرک کے شائبہ تک سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ شرک وجہِ تذلیل انسانیت ہے۔

ھمز

سورہ مومنون میں ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ (23/97) آیا ہے۔ سرکش مخالفین کی تمام وہ تدبیریں جن سے وہ جماعت مومنین میں تفرقہ انگیزی چاہتے ہوں۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جسے ہر جگہ خرابی ہی خرابی نظر آئے اور وہ ہر ایک کے کام میں نقص نکالتا رہے۔ وہ نہ کائنات کے حسن کی تحسین (Appreciation) کا جذبہ رکھتا ہو اور نہ ہی کسی کے اچھے کام کی تعریف کرے۔ یہ ذہنیت سرمایہ دار کی ہوتی ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو اس قدر مال و دولت ہے تو اس سے دنیا بھر کی خوبیاں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ جس کے پاس دولت نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں ہو سکتی۔ (المقام المحمود)۔

ھ م م

قرآن کریم میں ہے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (12/24) عزیز کی بیوی نے اپنے دل میں ارادہ کرلیا (کہ یوسف کو اپنے دام ہوس میں پھانس کر چھوڑے گی) اور ہوسکتا تھا کہ یوسف بھی ایسی نیت کر لیتا اگر اس کے سامنے خدا کا واضح قانون نہ آ چکا ہوتا۔ یعنی عزیز کی بیوی چونکہ محض اپنے جذبات کے تابع چل رہی تھی اس لیے اسے اس ارادۂ بد سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے سامنے خدا کا قانون تھا اس لیے وہ ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ غور کیجئے قرآن کریم نے اس داستان کے اتنے سے ٹکڑے میں کیسی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب انسانی جذبات اور کسی مستقل اور بلند قدر میں (Tie) پڑ جائے تو مومن اس بلند قدر کے تحفظ کے لیے جذبات کے تقاضوں کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی کا نام بلند اقدار پر ایمان ہے۔

ھود علیہ السلام

قومِ نوح کی جانشین، قوم عاد ہوئی (7/69)۔ ان کی طرف ان کے بھائی، حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے (7/65)۔ یہ لوگ جسمانی طور پر مضبوط اور طاقتور تھے۔ بڑے ڈیل ڈول والے تھے (7/69) اور ان کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں (26/134)۔ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی وہ قوم نوحؑ سے آگے تھے۔ یہ بڑے بڑے مضبوط قلعے بناتے تھے (26/129) اور پہاڑوں کی بلندیوں پر یادگاریں تعمیر کرتے تھے (26/128) اور علم وبصیرت بھی رکھتے تھے (46/26)۔ لیکن بڑے مستبد اور جبار تھے۔ غریبوں اور مظلوموں کو اپنے فولادی شکنجوں میں کس کر رکھتے تھے (26/130)۔

حضرت ہودؑ نے انہیں خدا کا وہی پیغام دیا جو اس سے قبل حضرت نوحؑ اپنی قوم کو دے چکے تھے۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ... (7/65) اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا الٰہ اور کوئی نہیں۔ حسب معمول سردارانِ قوم (مترفین کے طبقہ) کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوئی (7/66) اور وہ اس شدتِ مخالفت میں اس قدر اندھے ہوئے کہ ان کا علم وبصیرت بھی ان کے کسی کام نہ آیا (46/26)۔ اور تباہ کن آندھی نے انہیں برباد کر کے رکھ دیا (51/41-42) اور ان کی جڑ کٹ گئی (7/72)۔ قرآن کریم نے اس قوم کو ''عادِ اولیٰ'' بھی کہا ہے (53/50)۔

ھ و ن

جب انسان اپنے مزاج میں خود ہی ایسی نرمی اور جھکاؤ پیدا کر لے جس میں اس کی سبکی نہ ہوتی ہو تو یہ نرمی اور جھکاؤ محمود ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مستبد قوت کسی میں نرمی اور جھکاؤ پیدا کر دے جس میں اس کی ذلت و رسوائی کا پہلو ہو تو یہ مذموم ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (2/90) آیا ہے تو اس کے معنی ہیں ایسی سزا جو ذلیل و رسوا بھی کر دے اور

جس سے قوم کی قوت ٹوٹ کر اس میں ضعف اور کمزوری آ جائے۔ محکومیت میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ نیز دوسروں کے آسرے پر جینے والی قوموں میں۔

سورۃ الفرقان میں عباد الرحمٰن کے متعلق ہے: یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (25/63) وہ دنیا میں نہایت اطمینان وسکون سے چلتے پھرتے ہیں۔ نہ ان میں کسی قسم کی افراتفری ہوتی ہے نہ خوف اور گھبراہٹ۔ اس لیے کہ وہ کمزور اور ذلیل نہیں ہوتے، وہ اَعْلَوْنَ ہوتے ہیں (3/138) سب پر غالب۔ اگر اس میں صرف رفتار کے انداز کا ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میانہ روی سے چلتے ہیں اور یونہی اکڑتے نہیں پھرتے (31/17-18)۔ اور اگر یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ کے معنی زمین میں غلبہ وحکومت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت قہر اور استبداد کی حکومت نہیں ہوتی۔

سورۃ الفجر میں ہے کہ جب انسان پر رزق کی تنگی کہ وجہ سے ذلت وخواری کا عذاب آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ (89/16) ''میرے رب نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا۔'' قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ ہر شخص اپنے اعمال کی وجہ سے سرفراز ہوتا ہے اور اعمال ہی کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے۔ تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تمہارے پاس رزق کی فراوانی تھی تو لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ (89/17-18) تم ان لوگوں کی جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے عزت نہیں کرتے تھے اور جن کی چلتی گاڑی رک جاتی تھی ان کی روٹی کے انتظام کے لیے ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے تھے۔ تم وراثت کا مال سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور چاروں طرف سے مال اکٹھا کرتے چلے جاتے تھے (89/19-20)۔ یہ تھا تمہارا وہ غلط معاشرہ جس کی وجہ سے تم پر رزق کی تنگی آئی اور تم ذلیل وخوار ہو گئے۔

ھ و ی

سورۃ النجم میں وحی کے مقابلہ میں انسان کے ذاتی خیالات کو هَوًى کہا ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ○ (53/3-4) یہ قرآن کریم اس رسول کے ذاتی خیالات نہیں بلکہ وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ قرآن کریم انسانی جذبات وخواہشات کے خلاف نہیں (3/13)۔ وہ ان جذبات وخواہشات کے خلاف ہے جو وحی کے تابع نہ رکھے جائیں۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (6/120) ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو اپنے ذاتی خیالات کی بناء پر جنہیں وحی (علم) کی سند حاصل نہیں ہوتی، لوگوں کو صحیح راستے سے بہکا دیتے ہیں۔

یہی وہ جذبات وخیالات ہیں جو انسان کو شرفِ انسانیت کی بلندیوں سے حیوانی سطح کی پستیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰى (20/81) اور جو غلط راستے پر چل کر ہمارے انعامات سے محروم رہ گیا وہ پستیوں میں جا گرا۔ وحی کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو بلندیوں کی طرف لے جائے۔ لیکن انسان اس راستے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد

پرستیوں کے پیچھے لگ جاتا ہے اور اس طرح ذلتوں اور پستیوں میں جا گرتا ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (7/176) اگر وہ ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق چلتا تو ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے۔ لیکن وہ اپنے معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چمٹ گیا۔ یعنی (وحی کو چھوڑ کر) اپنے ذاتی خیالات و مفادات کے پیچھے لگ گیا۔

یہی وہ پستیوں کی زندگی ہے جسے هَاوِيَةٌ کہا گیا ہے (10/9-11)۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان کا دل و دماغ کچھ کام نہ دے اور وہ پریشانیوں اور ذلتوں میں مارا مارا پھرے۔ گری ہوئی حالت، اور قرآن کریم کے الفاظ میں نَارٌ حَامِيَةٌ یعنی بھڑکتی آگ۔ لہٰذا اگر انسانی جذبات وحی کے تابع چلیں تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے اور اگر وہ سرکش و بے باک ہو جائیں (جسے شیطان کہتے ہیں) تو اس کا نتیجہ جہنم کی پستیاں ہیں۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی جذبات کوئی قابل نفرت چیز نہیں کہ جنہیں دبانے یا فنا کر دینے میں ''روحانی ترقی'' کا راز مضمر ہے۔ بالکل نہیں۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جب انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے (جذبہ) اور انسانی سطح زندگی کے تقاضے میں گرہ (Tie) آ پڑے تو اس وقت اسے اس بلند تقاضے کی خاطر پست تقاضے کو قربان کر دینا چاہیے۔ ''انسانی سطح زندگی کے تقاضے'' ان مستقل اقدار سے وابستہ ہیں جو وحی کی رو سے ملتی ہیں۔ انسانی جذبات کو وحی کی روشنی کے تابع رکھنا، یہ ہے وجہٗ بالیدگیٔ شرفِ انسانیت۔ یا انسانی ذات کی نشوونما (Development) کا طریق۔ جب دونوں میں تصادم (Clash) نہ ہو تو انسانی جذبات کی تسکین کوئی مذموم چیز نہیں۔

ھ ی أ

سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ (3/48) اس کے لفظی معنی ہیں ''میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کے مانند شکل بنا دوں گا۔'' اس کا مجازی مفہوم یہ ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی سے اُبھر کر فضا کی بلندیوں میں بال فشاں ہو جاؤ گے۔ تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔ یہاں ہیئت محسوس نہیں بلکہ معقول مراد ہے (یعنی جسے عقل کی آنکھ سے دیکھا جا سکے)۔

ھ ی ل

قرآن کریم میں ہے: يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (73/14) جس دور (یا زمانے) میں زمین اور پہاڑ کانپ اٹھیں گے اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے ریت کا وہ تودہ جو خود بخود ڈھیلا پڑ کر بہہ گیا ہو۔ قرآنی انقلاب کے وقت بڑے بڑے سردارانِ قوم کی عظمت و اقتدار کے ختم ہو جانے کی کیسی عمدہ تشبیہ ہے۔ یعنی دکھائی تو وہ

ایسے دیں گے گویا محکم اور مضبوط پہاڑ ہیں، لیکن درحقیقت ان کی قوت اور استحکام ختم ہو چکے ہوں گے۔ بس یوں سمجھئے جیسے دریا کے کنارے ریت کا تودہ جو خود بخود پھسل کر نیچے گرتا جا رہا ہو۔ غلط بنیادوں پر اُٹھے ہوئے تمدن① کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ زمانے کے تقاضے کے دھچکوں کو سہار نہیں سکتا اور جونہی صحیح انقلاب سے اس کا سامنا ہوتا ہے ریگ رواں کی طرح نیچے آ گرتا ہے۔

ھیم

قرآن کریم نے شاعرانہ ذہنیت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شاعری ایک پیام بر کے شایان شان نہیں ہوتی (36/68)۔ ایک رسول خدا کا انقلاب آفرین پیغام لے کر آتا ہے۔ اس کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اس کا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کرتا کہ کبھی اِدھر نکل گیا، کبھی اُدھر۔ وہ اپنے جذبات کے تابع نہیں چلتا بلکہ قانونِ خداوندی کے بتائے ہوئے راستے پر سیدھا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شاعرانہ ذہنیت کے متعلق کہا کہ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (26/225) وہ ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے شدید پیاس کی بیماری مارے مارے پھرا رہی ہو، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی ان جولان گاہوں میں جا نکلتا ہے۔ اس کا یہ مارے مارے پھرنا جذبات کی پیاس کی وجہ سے ہوتا ہے جسے کبھی اور کہیں بھی سیرابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے۔ یہ ہے فرق ایک پیامبر اور ایک شاعر میں۔ شاعر، جذبات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ایک پیغامبر ایک متعین منزل کی طرف واضح، سیدھے اور توازن بدوش راستے پر نہایت جزم ویقین اور سکون واطمینان کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ شاعری جذبات پرستی ہے اور رسالت حقائق کا اتباع۔ مسلمان کے سپرد ''رسالت'' کا فریضہ ہوا تھا۔ یعنی خدا کے دیئے ہوئے پیغام پر خود بھی چلنا اور اسے دوسروں تک بھی پہنچانا۔ لیکن یہ اس راستے کو چھوڑ کر اس طرح ''شاعری'' میں گم ہوا کہ اب اسے نہ راستے کا پتہ نشان ملتا ہے نہ منزل کا۔

کس قدر عبرت انگیز ہے یہ نقشہ اور کیسی افسوسناک ہے یہ روش؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ امت (جو شاعروں کی قوم بن کر رہ گئی ہے) راستہ دکھانے والا ضابطہ حیات ہر وقت بغل میں دابے ہوئے ہے۔ چشمہ شیریں پاؤں کے نیچے اور تلاشِ آب، صحراؤں کے سراب میں۔ اب ان کی پیاس کیسے بجھے؟

---

① علامہ اقبال نے فرمایا:

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

ھ ی م ن

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تمام کتب سابقہ کا مُهَيْمِنٌ کہا ہے (5/48)۔ یعنی ان تمام صداقتوں کا محافظ جو کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں۔ خود اللہ تعالیٰ بھی اَلْمُهَيْمِنُ ہے (59/23)۔ یعنی جو کائنات کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح بچوں کی ماں اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے۔

هَيْهَاتَ

قرآن کریم میں منکرین حیاتِ آخرت کی زبانی سے کہا گیا ہے: هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (23/36)۔ کس قدر بعید (از قیاس) ہے وہ بات جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی)۔ یعنی وہ اپنے ہم مشربوں سے کہتے ہیں کہ یہ جو رسول تم سے کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد پھر زندہ کیے جاؤ گے تو یہ بات کس قدر بعید از قیاس ہے!

ی أ س

سورہ یوسف میں ہے: فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ (12/80) ''جب وہ اس سے مایوس ہو گئے۔'' وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ۔۔۔ (12/87) اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اس سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

آپ سورہ یوسف کی اس آیت کو سامنے لائیے اس میں آپ کو قوموں کے عروج و زوال کے متعلق ایک عظیم اصول ملے گا۔ آیت ہے: وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (12/87) ''اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید نہیں ہوتا'' اسی کو دوسری جگہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39/53) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے (نیز 29/23)۔ اسلام کسی کو قنوطی (Pessimistic) نہیں بنانا چاہتا۔ مومن وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی محکمیت، نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ اس یقین کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہوتا ہے۔ اگر اسے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا اپنی کسی غلطی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو اپنی روش کی صداقت اور محکمیت پر یقین اسے بددل نہیں ہونے دیتا۔ وہ سنبھلتا ہے۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی غلطی کا ازالہ کرکے، پھر اسی راستے پر چل پڑتا ہے۔ یہ ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونے کا مفہوم۔ ناامید وہ ہوتا ہے جو کسی راستے کو قیاس اور گمان پر تجربتاً اختیار کرتا ہے۔ جب اسے ناکامی ہوتی ہے تو وہ وہیں رُک جاتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے ناامید ہو جاتا ہے۔ لیکن جسے راستے کی صحت پر یقین ہو وہ کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ناامیدی

اور ابلیسیت کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ لیکن خدا کی رحمت یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی۔ اس کے لیے کہا ہے کہ ''وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا'' تم دفع مضرت اور جلب منفعت، دونوں صورتوں میں قوانین خداوندی کو آواز دو۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (7/56) یقین جانو کہ خدا کی رحمت ان کے قریب ہوتی ہے جو حسن کارانہ انداز سے توازن بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسی میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ ایک شخص مصائب کے ہجوم میں گھر جاتا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ اسے نہیں ملتی۔ لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا، دل نہیں چھوڑتا۔ وہ اسے محض طبعی حالات کی مجبوری سمجھتا ہے۔ اپنے اندر شکست خوردگی کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتا۔ یہ شخص ''خدا کی رحمت'' سے مایوس نہیں۔ لیکن اگر وہ ایسی مجبوری کے عالم میں (یا جونہی کوئی مشکل سامنے آئے اس وقت) فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں یا اسے برداشت کر سکوں، تو اس پر مایوسی چھا جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی ذات پر ایمان رکھتا ہے، جسے خود اعتمادی حاصل ہے، وہ کبھی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے پُر امید رہتا ہے۔ لیکن جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں رہتا، جو اس سے انکار کر دیتا ہے، وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس پر مایوسی (Frustration) چھا جاتی ہے یہی چیز ہے جو بسا اوقات انسان کو خودکشی تک لے جاتی ہے۔ خودکشی وہ کرتا ہے جس کی اپنی نظروں میں کوئی قیمت نہیں رہتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے زندہ رہنے میں میرا کچھ فائدہ نہیں۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے۔ مادی نظریہ حیات (Materialistic concept of life) میں چونکہ سارا انحصار خارجی (مادی) اسباب و ذرائع پر ہوتا ہے اس لیے جب وہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو انسان مایوس ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات کی ممکنات کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لیے جس شخص کا انسانی ذات پر ایمان ہوتا ہے وہ کسی مقام پر بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے آگے میں کچھ کر سکنے کے قابل نہیں۔ وہ یہ کہے گا کہ سردست میرے پاس مادی وسائل نہیں رہے۔ لیکن وہ اپنی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہوگا۔ کفر درحقیقت انسان کا اپنی ذات سے انکار اور اس کے بعد اپنی مکمل ترین ذات خداوندی سے انکار ہے۔ علاوہ بریں، انسانی ذات پر ایمان سے انسان بلند اقدار کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو اسے وحی سے ملتی ہیں۔ اس کی قوت سے وہ طبعی مجبوریوں سے نہیں گھبراتا اور مایوسی کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا۔ حتیٰ کہ موت کا سامنا کرتے وقت بھی نہیں گھبراتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے اس کا جسم فنا ہو جائے گا لیکن اس کی ذات [1] پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ نے غور فرمایا کہ مایوسی کیوں کفر ہے۔

---

[1] علامہ اقبالؒ کے درج ذیل دو شعر کیسے حسین انداز میں اس حقیقت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا — تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

ضربِ کلیم

ی ب س

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِيۡقًا فِى الۡبَحۡرِ يَبَسًا (20/77) بنی اسرائیل کو سمندر میں ایسے راستے سے لے جا جس پر پہلے پانی تھا لیکن جو اس وقت خشک ہے۔

سورہ انعام میں ہے: وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ (7/59) کائنات کی کوئی خشک وتر چیز ایسی نہیں (یا خشک وتر پھل ایسا نہیں) جس کے لیے ضروری قانون اور قاعدہ صحیفہ فطرت (کائناتی قوانین کے ضابطہ) میں موجود نہ ہو۔

ی ت م

بن باپ کے بچے کو بھی يَتِيۡمٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ ضرورت کے وقت باپ کا نہ رہنا يُتۡمٌ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بچہ جوان نہ ہو وہ يَتِيۡمٌ کہلاتا ہے، لیکن جب وہ جوان ہو جائے تو اسے يَتِيۡمٌ نہیں کہتے۔ اس کے برعکس لڑکی اُس وقت تک يَتِيۡمَةٌ کہلاتی ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، خواہ وہ بالغ بھی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ بہائم (حیوانات) میں يَتِيۡمٌ ان بچوں کو کہتے ہیں جن کی ماں نہ رہے اس لیے کہ ان میں بچہ کی پرورش ماں کرتی ہے۔ باپ کی انہیں احتیاج نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے اگر انسانی بچہ کی ماں مرجائے تو اسے يَتِيۡمٌ نہیں کہتے۔ يَتِيۡمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو۔ یعنی خواہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو۔ قرآن کریم میں يَتٰمَى النِّسَآءِ (4/127) ایسی ہی عورتوں کے لیے آیا ہے۔

سورہ نساء کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (4/3) اگر تم دیکھو (تمہیں خدشہ ہو) کہ تم ''یتامیٰ'' کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکتے، ان کے حقوق پورے نہیں ہو سکتے، تو تم ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک سے شادی کرلو۔

ظہورِ اسلام کے بعد مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو بے شمار لڑائیاں لڑنی پڑیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں، بہت سے بچے لاوارث رہ گئے، بہت سی بالغ لڑکیاں ایسی رہ گئیں جنہیں خاوند ہی نہیں مل سکتا تھا۔ یہ ایک ایسی ہنگامی اور اجتماعی مشکل پیدا ہو گئی جس کا حل نہایت ضروری تھا۔ یہ مشکل اس لیے تھی کہ

① قرآن کریم کا عام قانون ایک عورت سے شادی کرنے کا تھا فَوَاحِدَةً (4/3)۔

② مسلمان عورتیں نہ کفار سے شادی کر سکتی تھیں، نہ مشرکین سے، نہ اہل کتاب سے۔ انہیں بہرحال مسلمان ہی سے شادی کرنی تھی۔ اور مسلمان مردوں کی تعداد اس قدر کم ہو گئی تھی۔

اس ہنگامی مسئلہ کے حل کے لیے قرآن کریم نے وحدت زوج (Monogamy) کے قاعدے میں وقتی طور پر استثناء (Relaxation) کی اجازت دی اور کہا کہ ان عورتوں میں سے (النِّسَآءِ ۔4/3) جو اس طرح بے شوہر رہ گئی ہیں (خواہ بیوہ ہو کر اور خواہ ناکتخدائی کی حالت میں جنہیں شوہر نہیں ملتا) حسب پسند ایک سے زیادہ نکاح کر کے ان کی حفاظت کا سامان پیدا کر دو۔ یہی ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل ہے۔ قرآن کریم میں بس یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت ہے۔ اگر ایسے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر قانون وہی ایک بیوی کا ہے۔

يَتْمٌ کے معنی فکر وغم کے بھی آتے ہیں اور دیر کرنے اور غفلت کرنے کے بھی۔ اس لیے کہ یتیموں کی خبر گیری میں غفلت کرنے کے بھی۔ اس لیے کہ یتیموں کی خبر گیری میں غفلت کی جاتی ہے اور انہیں مدد پہنچانے میں دیر لگائی جاتی ہے۔ اَلْيَتَمُ کے معنی حاجت اور ضرورت کے بھی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں یتیموں کی نگہداشت کے متعلق بڑی تاکید آئی ہے اور سرمایہ داری کے نظام کی تباہی کا سبب یہ بتایا ہے کہ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (89/17)۔ ان آیات میں يَتِيْمٌ سے مراد وہ نہیں جن کے باپ مر چکے ہوں۔ اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو معاشرے میں تنہا رہ گئے ہوں، جو بے یار و مددگار رہ گئے ہوں۔ لہٰذا جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی مددگار نہیں، اس کی مصیبت تنہا اس کی مصیبت ہے، اس کا کوئی مونس وغمخوار اور کوئی یار و مددگار نہیں، وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں تنہا رہ جانے والے کو واجب التکریم نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن کریم ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کسی فرد کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہے۔ اس کا کوئی پناہ دینے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (93/6) کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس نے تجھے یتیم پایا اور پناہ کا سامان بہم پہنچا دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یتیم وہ ہے جو پناہ سے محروم رہ جائے اور ایسے شخص کے لیے پناہ کا سامان بہم پہنچانا اس معاشرے کا کام ہے جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوا ہو۔

یحییٰ علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت یحییٰؑ کو منجملہ انبیاء بنی اسرائیل بتایا ہے (6/85)۔ آپ حضرت زکریاؑ کے بیٹے تھے (19/7)۔ صاحب کتاب اور بچپن ہی سے عمدہ قوتِ فیصلہ کے مالک (19/12) اور صفاتِ حسنہ سے آراستہ (19/13-15)۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجیل میں جنہیں یوحنا کہہ کر پکارا گیا ہے وہ حضرت یحییٰؑ [1] ہی ہیں۔

---

[1] قرآن کریم میں 25 کے قریب انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے اور حضرت یحییٰؑ واحد پیغمبر ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھا ہے۔ دیکھئے 3/39

ی د ی

قرآن کریم میں بَیۡنَ یَدَیۡهِ کا محاورہ متعدد بار آیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ یعنی سامنے۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ (2/97) کہا ہے۔ لہٰذا لِمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ کے معنی ہیں ''جو اس کے سامنے ہے۔'' قرآن کریم نے اپنے آپ کو ان اخلاقی اقدار کا مُصدّق کہا ہے جو دنیا کے پاس اس سے پہلے آئی تھیں اور ان میں سے بعض نزولِ قرآن کے وقت بھی ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو وغیرہ۔ قرآن کریم ان کی اس قسم کے اقدار کا مُصدّق تھا۔ وہ اہل کتاب کی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا تھا، وہ انہیں خود محرف قرار دیتا تھا۔

سورہ توبہ میں ہے کہ اہل کتاب اسلامی نظام میں جزیہ دیں۔ عَنۡ یَّدٍ (9/29) اس نعمت و آسائش کے بدلے میں جو انہیں اطمینان وسکون کے ساتھ رہنے میں حاصل ہے۔

اعمالِ انسانی کے متعلق بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ (2/95) کئی مقامات پر آیا ہے۔ یعنی جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ خود انسان کے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے: وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡكُمۡ اِلَی التَّهۡلُكَةِ (2/195) اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔

ی س ر

مَیۡسِرٌ کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اگرچہ اس قسم کی دولت سے فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانی طبیعت میں جو سستی اور کسل مندی، جو ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے اس کے نقصانات ان فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں جو اس روپے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس قسم کی دولت کو ''رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ'' کہہ کر اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے (5/90)۔ اور اسے قرآن کریم کے نظام صلوٰۃ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موجب بتایا گیا ہے (5/91)۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان محنت اور کوشش سے کمائے اور جو کچھ اپنی ضروریات سے زائد ہو اسے نوع انسان کی پرورش کے لیے عام کر دے (2/219)۔ ظاہر ہے کہ جو دولت انسان کو آسانی سے بیٹھے بٹھائے ہاتھ آ جائے وہ اسے محنت اور مشقت کا عادی نہیں رہنے دے گی اور اس طرح اس کی صلاحیتوں میں اضمحلال پیدا کرنے کا موجب بن جائے گی۔ جیسے ہر رئیس زادے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خود کمانے کا اہل ہی نہیں رہتا۔ اس طرح حاصل شدہ دولت سے انسان میں دولت کی ہوس اور زر پرستی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسروں کو دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے لیے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ جیسے ہر قمار باز کی کیفیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ دولت جو آسانی سے (بغیر محنت ومشقت) ہاتھ آ جائے قرآنی

تعلیم کی روح کے مطابق مَیۡسِرٌ میں داخل ہے۔ بالخصوص عصر حاضر کی ''تجارت'' جو کہنے میں تجارت ہے لیکن درحقیقت مَیۡسِرٌ ہے۔ اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھئے تو سارا نظام سرمایہ داری ہی مَیۡسِرٌ ہے۔ اس میں ہر سرمایہ دار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اس کا پھل یہ لے جائے۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ زندگی کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل کرنا چاہتے ہو تو مشکلات کا سامنا کرو۔ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا (94/5) جو قوم (یا فرد) مشکلات کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے اسے وہ آسانیاں حاصل نہیں ہوسکتیں جو صحیح خوشگواریوں کا موجب بنتی ہیں۔ البتہ اسے وہ یُسۡرٌ حاصل ہوجاتا ہے جو اِثم (اضمحلال اور ضعف) کا موجب بنتا ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔

یعقوب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ [1] کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر زمرۂ انبیائے کرامؑ میں کیا ہے۔ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ ... (2/136)۔ آپ کا لقب اسرائیل (یعنی مردِ خدا) تھا۔ اسی نسبت سے آپ کی اولاد (در اولاد) بنی اسرائیل کہلائی۔ قرآن کریم نے بھی آپ کو اسی لقب سے یاد کیا ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے: اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِهٖ (3/92) ''سوائے اس کے جسے اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام قرار دے لیا تھا۔'' اور سورہ مریم میں ہے: مِنۡ ذُرِّیَّةِ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اِسۡرَآءِیۡلَ (19/58) ''ذریت ابراہیم اور اسرائیل سے۔''

ی ق ظ

اَلۡیَقَظَةُ: بیداری۔ یہ نَوۡمٌ (نیند) کی ضد ہے۔ اَبُو الۡیَقۡظَانِ مرغ [2] کو کہتے ہیں۔

ی ق ن

سورہ انعام میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ کائناتی قوانین (مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ) کے مشاہدے کے بعد یَقِیۡنٌ کے درجہ تک پہنچ گئے (6/76)۔ سورہ حجر میں جہاں فرمایا کہ وَاعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰی یَاۡتِیَكَ الۡیَقِیۡنُ (15/99) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے نشوونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت کا کامل اتباع کیے جا، حتیٰ کہ تیرا دعویٰ (کہ

---

[1] میں حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے مبارک کو پیغمبران کرام کا گھرانہ کہا کرتا ہوں۔ (ا) حضرت ابراہیمؑ، (ب) حضرت اسمٰعیلؑ، (ج) حضرت اسحٰقؑ، (د) حضرت یعقوبؑ، (ہ) حضرت یوسفؑ، (و) حضرت لوطؑ

[2] مرغ اکثر بیدار رہتا ہے کیونکہ رات کو عموماً اس کے بولنے کی آواز آتی ہے۔

اس نظام کے نتائج حیات بخش اور خوشگوار ہوں گے) ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آ جائے۔(نیز 74/47)۔

لٰہذا اِیْمَانٌ کے معنی ہوں گے کسی پر اعتماد کر کے اس کی بات کو صحیح مالینا اور یَقِیْنٌ کے معنی ہوں گے علم و تحقیق کے بعد اس بات کا ثابت ہو جانا اور اس کا ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آ جانا۔ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (102/9) تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔ قرآن کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سعی و عمل کے ٹھوس نتائج ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ یعنی پہلے وہ اپنے نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (2/4)۔ اس کے بعد جب وہ اس نظام کو قائم کر لیتے ہیں تو اس کے بدیہی نتائج مرئی اور محسوس شکل میں ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا ایمان یقین میں بدل جاتا ہے (2/4)۔ یہ ہیں مستقبل پر یقین کے معنی۔ اسی یقین سے انسان اس امر پر ایمان لے آتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

ہم نے ''ایمان'' اور ''یقین'' میں جو امتیازی خط کھینچا ہے وہ دونوں کا الگ الگ مفہوم سمجھانے کے لیے ہے۔ ورنہ ایمان خود یقین ہی کا نام ہے اور یقین، ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں مرادف المعنی بھی ہو جاتے ہیں۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''یقین'' ''ایمان'' کے نتائج کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ی م ن

اسلام سے پہلے عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا۔ غلام باہر کا کام کاج کیا کرتے تھے اور لونڈیوں کو وہ لوگ گھروں میں ڈال لیتے تھے۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں اسلام نمودار ہوا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ان کے ہاں غلام اور لونڈیاں موجود تھے۔ اسلام غلامی کو مٹانے کے لیے آیا تھا لیکن اگر وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اُس وقت موجود تھے) یک لخت آزاد کر دینے کا حکم دیتا تو اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا۔ یہ جوان لونڈیاں (اتنی بڑی تعداد میں) جب خاوندوں کے بغیر آزاد کر دی جاتیں تو وہ معاشرہ کے لیے سخت خرابیوں کا موجب بن جاتیں۔ اسلام نے اس صورت حالات کو برقرار رہنے دیا اور آئندہ کے لیے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ لیکن جو غلام اور لونڈیاں اس وقت موجود تھیں ان کے متعلق ایسے احکام دیئے کہ رفتہ رفتہ وہ آزاد ہو کر معاشرے کا جزو بنتے جائیں اور جب تک غلام رہیں ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے۔ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے ماتحت لونڈی غلاموں کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ انہی لونڈی غلاموں کے متعلق ہے۔ ان کے بعد لونڈی غلاموں کا سلسلہ ہی بند ہو جانا تھا اس لیے یہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہنے تھے۔ البتہ اگر اس دور کے بعد کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں کوئی ایسی قوم مسلمان ہو جائے جن میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں تو ان غلاموں پر یہی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کی مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں قرآن کریم کے مختلف مقامات کو دیکھئے، بات صاف ہو جائے

گی کہ یہ احکام اس وقت کے لونڈی غلاموں کے متعلق ہیں اور بس۔ مثلاً وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (70/29-30) وہ لوگ جو اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہیں یا ان لونڈیوں کے پاس جن کے وہ مالک بن چکے ہیں (قرآن کریم میں ہر جگہ یہ لفظ ماضی کے صیغے میں آیا ہے)۔

ہماری بدبختی کہ مسلمان سلاطین نے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ کھول لیا اور قرآن کریم کی انہی آیات (اور موضوع روایات) کو اپنے عمل کے جواز کے لیے بطور سند پیش کر دیا۔ قرآن کریم پر اس سے بڑا اتہام اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس سے غلامی کا جواز ثابت کیا جائے۔

یوسف علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ، آپ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ۔ قرآن کریم نے آپ کا تذکرۂ جلیلہ ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان کیا ہے (اور کسی نبی کا تذکرہ اس طرح مسلسل بیان نہیں ہوا)۔ بچپن میں بھائیوں نے انہیں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا (12/15) جہاں سے اُنہیں ایک قافلے والے مصر لے گئے۔ وہاں آپ (مختلف مراحل طے کرنے کے بعد) مملکت کے اقتدار و اختیار کے مالک ہو گئے (12/56؛ 12/101) اور اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو بھی وہیں بلا لیا۔ اس طرح بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوبؑ کی اولاد) کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہوگئی۔

یوم

کائنات میں خدا کا قانون ارتقاء جاری و ساری ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ خدا اپنے امر (ابتدائی قانون مشیت) کے مطابق جب کسی اسکیم کو بروئے کار لانے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے اس کا مکمل پلان اپنے عالم امر (السماء) میں مرتب کرتا ہے۔ پھر اس پلان کو عملاً متشکل کرنے کے لیے اس کی ابتداء پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو اٹھتی ہے۔ یہ منازل ایک ایک یوم میں طے ہوتے ہیں جو انسانی حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32/5) ظاہر ہے کہ یہاں ''يَوْمٌ'' سے مراد دور یا مدت کا زمانہ یا تدریجی مرحلہ ہے۔ یہی دور بعض اوقات پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے (70/4)۔ علمائے طبقات الارض یا محققین نظریہ ارتقاء اس کی شہادت دیں گے کہ یہ تدریجی مراحل کتنے کتنے طویل المیعاد ہوتے ہیں۔

لہٰذا قرآن کریم میں جہاں یَوْمٌ کا لفظ آئے تو ہر جگہ اس کے معنے اس ''دن'' کے نہیں ہوں گے جو چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی وقت (Time) یا دَور (Period) یا زمانہ (Age) یا کسی خاص مدت یا حالت (Stage) کے ہوں گے۔ مثلاً مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1/3) کے معنی ہوں گے وہ دور جس میں تمام مخالف قوتیں شکست کھا جائیں اور غلبہ واقتدار صرف قانونِ خداوندی کا رہ جائے۔ یا وہ دور میں جس میں انسانی اعمال کے نتائج عدل وانصاف کی رُو سے مرتب ہوں۔ یا ظہورِ نتائج کا وقت۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (82/19)۔ جس دور میں حکومت صرف خدا کے قانون کی ہوگی۔

یونس علیہ السلام

حضرت یونسؑ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ان کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں آ کر یونس ہوگیا۔ ان کا زمانہ اندازاً 700 ق۔م کا قیاس کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (37/139) ''یقیناً یونس ہمارے رسولوں میں سے تھا۔''

حضرات انبیاء کرامؑ کا یہ عام طریق رہا ہے کہ جب وہ دیکھیں کہ ان کا اپنا وطن ان کے نظام کے لیے سازگار نہیں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے اس علاقے کی طرف چلے جاتے تھے جہاں کی فضا ان کے مشن کے لیے مساعد ہوتی تھی۔ لیکن یہ ہجرت خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونسؑ نے اپنی قوم سے، اپنے اجتہاد کے مطابق ہجرت کر لی اور ان کا یہ فیصلہ خدا کے پروگرام کے مطابق نہیں تھا۔ قبل از وقت تھا۔ اس لیے وہ بعد میں اس پر نادم ہوئے (37/142)۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس بستی (نینوا) کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اس کی آبادی ایک لاکھ سے بھی اوپر تھی۔ (یعنی اس زمانہ کے اعتبار سے وہ بہت بڑا شہر تھا) (37/147)۔ انہوں نے آپ کی دعوت سے انکار کیا لیکن قبل اس کے کہ ان پر عذاب آ جاتا، وہ ایمان لے آئے اور اس طرح انہیں مہلت مل گئی (37/148)۔ اہل نینوا اس وقت تو تباہی سے بچ گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد (قریب 690 ق۔م میں) انہوں نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا۔ بنی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا لیکن یہود کی روایات میں ان کا پتہ ملتا ہے) انہیں خدا کے عذاب سے متنبہ کیا۔ وہ باز نہ آئے تو ایک طرف سے اہل بابل نے ان پر حملہ کیا اور دوسری طرف دریا سے سخت سیلاب آیا اور اس طرح نینوا کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

قرآن کریم نے آپ کو ذَا النُّوْنِ (21/87) اور صَاحِبِ الْحُوْتِ (68/48) کہہ کر بھی پکارا ہے۔